

یہ جہاں فانی ہے کوئی بھی شے لافانی نہیں
پھر بھی اس دنیا میں نور شاہ کا ثانی نہیں

تقدیرِ انور

امام العصر محدث کبیر بخاری وقت ابو حنیفہ زمانہ

حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری

کی زندگی جاوداں حیات پر الطاف، علوم و کمالات کا آئینہ

از
عبد الرحمن کوئٹہ

تقدیم

شیخ الحدیث امیر مولانا مفتی محمد زبیر علی خان صاحب



الجامعۃ العربیۃ سان ایلوم
گلشن اقبال 2 کراچی

يَهْدِي اللَّهُ لِنُورٍ مَنِ يَشَاءُ وَيُضِلُّ اللَّهُ الْفَاسِقِينَ
 یہ جہاں قانی ہے کوئی بھی شے لافانی نہیں پھر بھی اس دنیا میں انور شاہ کا کوئی ثانی نہیں

لقد سرى النور

امام العصر، محدث کبیر، بخاری وقت، ابو حنیفہ رحمہ اللہ زمانہ
 حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ
 کی زندگی جاوداں، حیات پر الطاف، علوم و کمالات کا آئینہ

ان
 عبدالرحمن کوندو

تقدیم و تعارف
 شیخ الحدیث والتفسیر مولانا مفتی محمد زرولی خان صاحب دامت برکاتہم
 رئیس جامعہ عربیہ احسن العلوم

ناشر

احسنی کتب خانہ

جامعہ عربیہ احسن العلوم گلشن اقبال کراچی

جُمْلَةُ حُقُوقٍ بِحَقِّ نَاشِرٍ مَحْفُوظٌ هَيَّيْنِ

نام کتاب تقدسِ انور

مصنف عبد الرحمن كوندو

اشاعتِ اول دسمبر 2011ء

تعداد 1100

طالب القادر پرننگ پریس کراچی

ناشر

احسنی کتب خانہ

فہرست مضامین تقدس انور

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
۵۲	ثانم چارٹ: ولادت سے وفات تک	۱۴	تعارف
۵۲	ولادت باسعادت	۱۵	پیش لفظ
۵۴	والدین کا متقابل شجرہ نسب	۱۹	تقریظات
۵۵	حضرت شاہ صاحب کا سلسلہ نسب		تقریظ..... از حکیم الاسلام حضرت مولانا
	حضرت شاہ صاحب اور آپ کے		قاری محمد طیب صاحب (دامت برکاتہم)
۵۷	اسلاف کا وطن	۱۹	(مہتمم دارالعلوم دیوبند)
۶۲	نویں صدی ہجری سے پہلے کا وطن		”الانور“ پر ایک نظر..... از جناب پروفیسر
۶۳	نرورہ، لولاب اور نیلم		آل احمد سرور۔ اقبال پھیر پروفیسر (شعبہ
۶۳	حضرت مسعود کا نرورہ میں ورود	۲۱	اقبالیات) کشمیر یونیورسٹی
۶۴	اولاد مسعود کی کثرت و تعداد		شہرہ علی ”لا نور“..... لفضیلۃ الاستاذ
۶۴	نرورہ سے مسعودیوں کا لگاؤ		مولانا بدر الحسن القاسمی مدیر جریدہ ”لہائی“
۶۵	لولاب	۲۳	(نصف شہریہ) دیوبند (ہند)
۶۶	لولاب قدرت کا ایک شاہکار		مکتوب گرامی..... از جناب ڈاکٹر انور
۶۶	حفیظ جالندھری کی منظر کشی		ایس دل پروفیسر یونائیٹڈ سٹیشن انٹرنیشنل
۶۹	مولانا حالی مرحوم کی سیر کشمیر	۲۴	یونیورسٹی سین ڈیگو۔ کیلفورنیا
۷۰	اولاد مسعود کا لولاب		عرض حال..... (پیش نامہ طبع ثانی) از
۷۰	وادی نیلم	۲۶	مؤلف
۷۱	رابعہ شیر احمد خان کی بغاوت	۳۳	پیش نامہ طبع ثالث..... از مؤلف
۷۱	قاضی شاہ عبدالکبیر	۳۵	تصویر انور..... از محمد ضیاء الرحمن ضیاء
۷۲	شاہ صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت	۳۷	آئینہ آراء اکابرین..... مرتب از مؤلف
۷۳	بسم اللہ خوانی		تاریخ (از کوندو) کشمیر کا دور ظلمت.....
۷۳	نوناہال انور اکابر عصر کی نظر میں	۴۳	از مؤلف

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
۹۳	دیوبند کے بعد گنگوہ		حصولِ علم ۱۳۰۵ ہجری کے لئے سفر
۹۴	حضرت گنگوہیؒ کی جامعیت	۷۶	ہزارہ
۹۵	سلوک میں شاہ صاحبؒ کا قدم راسخ	۷۷	ضلع ہزارہ جانے کا خاص سبب
۹۶	مرشد گنگوہیؒ کے ساتھ شیعہ فتنگی		ہزارہ کی درسگاہیں اور حضرت سید احمد شہیدؒ
۹۷	مدرسہ امینیہ دہلی اور شاہ صاحبؒ	۷۸	معمر کہ بالا کوٹ
۱۰۲	وطن میں قیام کے تین سال	۷۹	صوبہ سرحد کا یونان
۱۰۳	سفر حج اور اس کے محرکات	۷۹	کاکول کی درس گاہ اور مولانا فضل الدین صاحب
۱۰۶	حریم میں آپ کے علم کا اعتراف		مدارس ہزارہ کا طرز تعلیم
۱۰۶	روضۂ اطہر کے سامنے انگلی باری	۸۱	ایبٹ آباد
۱۰۷	مدرسہ فیض عام کے قیام کا پس منظر	۸۲	ہزارہ سے واپسی اور انقطاع تعلیم کا سال
۱۰۷	۱۸۵۷ء ۱۲۷۲ھ کی قیامت کبریٰ	۸۳	مولوی عبد المجید شاہ
۱۰۸	سچی نشاۃ ثانیہ		نام کے ساتھ مظفر آبادی
۱۱۰	کشمیر میں کام کی مشکلات	۸۳	۱۳۰۹ھ کا سال انقطاع تعلیم کا برس
۱۱۲	بارہمولہ میں مدرسہ فیض عام کا قیام	۸۴	مردم شماری ۱۸۹۱ء
۱۱۲	فیض عام کی وجہ تسمیہ	۸۶	روانگی دیوبند
۱۱۳	یہ مدرسہ کیوں نہ چل سکا؟	۸۶	دارالعلوم دیوبند میں شاہ صاحبؒ کا داخلہ
۱۱۶	حضرت شاہ صاحبؒ کا فلسفہ تعلیم	۸۷	دیوبند میں شاہ صاحبؒ کا ابتدائی قیام و طعام
۱۲۰	فیض عام کے باقیات صالحات	۸۸	مولوی مشیت اللہ اور شاہ صاحبؒ کی دوستی
۱۲۰	کشمیر سے دیوبند		درسی کتابیں اور ان کی ترتیب
۱۲۲	دارالعلوم میں جلسہ دستار بندی	۹۰	شاہ صاحبؒ کے اساتذہ کرام
۱۲۳	دارالعلوم میں تدریس کا آغاز		
۱۲۳	حضرت شاہ صاحبؒ کا نکاح	۹۰	
۱۲۷	دارالعلوم کی صدر مندری اور حضرت شیخ الہندؒ کی جانشینی	۹۱	
۱۲۹	مولانا آزاد کا مطالبہ	۹۱	
۱۳۶	دارالعلوم کے سابق صدر المدرسین	۹۲	
۱۳۷			

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
۱۶۲	رنج و غم کی ہمہ گیر لہر	۱۳۸	مرحوم مولانا سید محمد میاں صاحب کی تحریر
۱۶۳	ماتم کدہ ڈا بھیل		دارالعلوم سے شاہ صاحبؒ کی مفارقت کا حادثہ
۱۶۶	وادی کشمیر میں صف ماتم	۱۴۲	ایک مقدس قافلہ
۱۶۶	باپ کے آنسو	۱۴۳	مشاجرات اکابر سے کف لسان
۱۶۶	دہلی اور لاہور کے تعزیتی جلے	۱۴۵	علامہ اقبالؒ کی تمنا
۱۶۸	مزایرہ انوار	۱۴۶	دیوبند سے ڈا بھیل
۱۶۹	حضرت شاہ صاحبؒ کا کنبہ	۱۴۷	جامعہ اسلامیہ ڈا بھیل میں نزول اجلال
	مقالات و مضامین	۱۴۸	بہاولپور کا مقدمہ اور قادیانیت پر ضرب کاری
	”نور الانور“..... از حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند	۱۵۱	اُمت پر فتنوں کی بارش
۱۷۶	”قادیانی فتنہ اور حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ“..... از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی سابق مفتی اعظم پاکستان	۱۵۱	سامراجی چال
۲۰۳	”حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ“..... از حضرت مولانا محمد منظور نعمانی	۱۵۲	بہائیت اور قادیانیت کی پیدائش
	مدیر ”الفرقان“ پاکستان	۱۵۳	انگریز کا خود کاشتہ پودا
۲۱۷	”حضرت امام العصر شاہ صاحبؒ اور ان کی تصانیف“..... از حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری سابق شیخ الاسلام پاکستان	۱۵۳	علمائے اسلام کا جہاد
۲۳۶	”اے کہ تو مجموعہ حوبی بچہ نامت خانم“..... از حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی سابق صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۵۴	حضرت شاہ صاحبؒ کا کارنامہ
۲۵۱	”علامہ کشمیریؒ کے تجدیدی کارنامے“..... از حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوری	۱۵۵	قادیانی ایک غیر مسلم فرقہ
	مواف، انوار الباری	۱۵۵	مقدمہ بہاولپور اور اس کی اہمیت
۲۶۳	”امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ“..... از مولانا عبد الحلیم چشتی کراچی	۱۵۶	ہسٹر مرگ سے عدالت کے کٹہرے میں لاہور کا آخری سفر اور مسجد میں کرسی کا مسئلہ
۲۶۸		۱۵۷	مرض الوصال
		۱۵۸	مراجعة بطرف کشمیر کی تمنا
		۱۵۹	مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا بیان
		۱۶۰	وفات حسرت آیات

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
۳۷۱	"یہ ذہن تھا یا مینارۂ حفظ و ضبط واستحضار؟"..... مرتبہ مؤلف	۲۹۴	"بحر العلوم، مولانا محمد انور شاہ کشمیری"..... از حضرت مولانا ابوالحسن ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ
۳۸۲	"حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ" مرتبہ مؤلف	۲۹۵	"حضرت شاہ صاحب ایک مکمل لابھری"..... از سجاد الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی
۳۸۹	اکابر معاصرین کے ساتھ "حضرت شاہ صاحب" اور حضرت شیخ الہند"..... مرتبہ مؤلف	۳۰۷	"کمالات انوری"..... از حضرت مولانا محمد انوری لکھ پوری
۳۹۵	"تھانوی"..... مرتبہ مؤلف	۳۱۷	"علامہ انور شاہ اور فقہ قادنیہ" از جناب مولانا بدر الحسن درہنگوی، مدیر الداعی، دیوبند
۳۹۸	"حضرت شاہ صاحب" اور علامہ سید سلیمان ندوی"..... مرتبہ مؤلف	۳۲۵	"فرعیات کے بارے میں شاہ صاحب کا طرز فکر"..... از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبند
۴۰۰	"حضرت شاہ صاحب" اور علامہ سید رشید رضا مصری"..... مرتبہ مؤلف	۳۲۸	"حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث کی خصوصیات"..... از حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی، سابق شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور
۴۰۴	المحاضرة المراجعة "حضرت شاہ صاحب" اور علامہ اقبال"..... مرتبہ مؤلف	۳۳۱	"قادیانیت کے خلاف حضرت محدث کشمیری کا جہاد"..... مرتبہ مؤلف
۴۱۱	اے دادی لولاب!	۳۳۵	"حضرت شاہ صاحب کے سیاسی نظریات"..... مرتبہ مؤلف
۴۱۸	"حضرت شاہ صاحب" اور مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی"..... مرتبہ مؤلف	۳۴۸	"حضرت شاہ صاحب، آئینہ کمالات صالحین کشمیر"..... از جناب سید میر قاسم، سابق وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر
۴۱۹	"حضرت شاہ صاحب" اور علامہ شبیر احمد عثمانی"..... مرتبہ مؤلف	۳۶۲	"حضرت شاہ صاحب کی ظرفیت طبع"..... مرتبہ مؤلف
۴۲۴	"حضرت شاہ صاحب" اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری"..... از مولانا حافظ محمد ابرار شاہ قیصر	۳۶۸	
۴۲۸	"حضرت شاہ صاحب" اور علامہ علی حبیبی مصری"..... مرتبہ مؤلف		
۴۳۲			

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
۴۷۷	حضرت شاہ صاحبؒ کے اردو کلام کا نمونہ	۴۳۵	”حضرت شاہ صاحبؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد“..... مرتبہ مؤلف
۴۷۸	مراثی المرثا (عربی مرثیہ)..... از حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی	۴۵۸	”حضرت شاہ صاحبؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنی“..... مرتبہ مؤلف
۴۷۹	فارسی مرثیہ (دوازده بند)..... از مرحوم پیر عبدالقادر در شاہ آثم ملارنی کشمیری	۴۴۰	”حضرت شاہ صاحبؒ اور مولانا عبید اللہ سندھی“..... مرتبہ مؤلف
۴۸۵	آہ اے شیخ الحدیث! (اردو مرثیہ)..... از مولانا قاری جمال الدین لبیب	۴۴۵	”حضرت شاہ صاحبؒ اور ہندوستان کے علماء اہلحدیث“..... مرتبہ مؤلف
۴۸۷	تتمہ (۱) حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ..... از مؤلف	۴۴۶	حضرت شاہ صاحبؒ اپنے وطن میں..... (از جناب سید نبیہ احمد اندرابی شہید)
۴۹۷	تتمہ (۲) حضرت الشیخ بابا مسعود زورویؒ..... از مؤلف	۴۴۷	”حضرت شاہ صاحبؒ کا قیام سرینگر“..... از جناب غیبہ احمد اندرابی
۵۱۵	تتمہ (۳) حضرت شاہ صاحبؒ اور مسئلہ سیادت..... از مؤلف	۴۵۶	”حضرت شاہ صاحبؒ کی نظر عنایت“..... از جناب سید مبارک شاہ گیلانی فطرت
۵۲۳	کتبیات کتب اردو، فارسی اور عربی	۴۶۰	نمونہ ہائے ملفوظات حضرت شاہ صاحبؒ کے ملفوظات کا نمونہ
۵۲۷	مخطوطات	۴۶۶	حضرت شاہ صاحبؒ کے عربی کلام کا نمونہ
۵۲۸	رسائل و جرائد کتب انگریزی	۴۷۴	حضرت شاہ صاحبؒ کے فارسی کلام کا نمونہ
	ختم شد		

MUHAMMAD ZAR VALI KHAN
FOUNDER & CHANCELLOR OF JAMIA KHADIMIA
HAIRATH WALI TAFSEELI WALI AL JAMIA TIL
AHMIA AHASAN IL ULOOM QUL SHAN-E-KORAL
BLOCK - 2, KARACHI PAKISTAN
TELEPHONE 488710 488358

محکمہ زوالی خان، جامعہ خدیمیہ
مؤسسہ و کتابخانہ اسلامیہ اعلیٰ تعلیم
بزم تفسیر و حدیث و لغت و تاریخ و طب و فقه و علوم
منطقہ واداعیہ اسلامیہ ریسرچ سوسائٹی، کراچی
تلفون 488710 - 488358

DATE _____
REF _____

نقش اول

تقدیس نور

حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے کہ:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اٰیْمَةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَاْنُوْا بِاٰیٰتِنَا يُوقِنُوْنَ
(سورہ المائدہ: ۲۴)

اور جناب نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی جو امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ ائمہ حدیث نے
نعمان بن بشیر ♦ سے صحیح بخاری وغیرہ میں نقل فرمایا ہے:

ان العلماء ورثة الانبياء (الحديث)

حق تعالیٰ نے اس کے پیش نظر ہر دور اور ہر زمانہ میں ایسی قابل قدر ہستیاں پیدا فرمائی
ہیں جن کا وجود اسلام کی دلیل اور ان کی زندگی رسول اکرم ﷺ کی عالمیت اور خاتمیت کا
اعجاز اور ان کی ہر ہر ادا کردار اور گفتار رہتی دنیا کے لئے مشعلِ راہ ہے، انہی میں سے امام
العصر محدث کبیر آیت من آیات اللہ فی جمیع العلوم والفنون استاذ اساتذہ تناو شیخ مشائخنا حضرت
مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری دیوبندی رحمہ اللہ ہیں جو ایک طرف فقہ و اجتہاد میں امام
ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مظہر تھے تو حدیث میں امام احمد بن حنبلؒ اور علی بن مدینی اور قتیبہ بن
سعید کے آئینہ تھے، تفسیر و تاریخ آداب اور دیگر علوم و فنون میں وہ بغیر شک و شبہ کے امام تھے
حضرت کی حیات جادواں پر کبار محدثین جیسے ہمارے استاد و شیخ شارح بخاری و ترمذی
حضرت مولانا سید احمد یوسف صاحب بنوریؒ نے عنقوان شباب میں ”نفسحة العنبر“ جیسی
کتاب لکھی جس میں حضرت شاہ صاحب کی حیات طیبہ کے تمام اطراف پر ایسے کامل اور
دیدنی تبصرے فرمائے کہ جن کی مثال نہ متقدمین میں ہے اور نہ بعد کے حضرات میں نظر آئی

اور اس پر حضرت کی فصیح و بلیغ و معیاری عربی جس کی وجہ سے مصر کے ایک بڑے ادیب نے حضرت مولانا سے فرمایا: "قمرات کصابک النفعۃ فسحدت لبیانک" میں نے آپ کی کتاب دیکھی آپ کی فصیح و بلیغ رواں دواں عربی کے سامنے میں نے سر نیاز جھکایا بہر حال نفعۃ العنبر جہاں تک امام العصر کی زندگی پر محیر العقول دستاویز ہے وہاں جا حظ کی تمبین اور ابو العباس مبرد کی الکامل اور شبہاب نویری کی نہایۃ العرب کے ٹکڑ کی ایک ادیبانہ اور فنی کتاب سامنے آئی۔ حضرت شاہ صاحب پر ان کے خاص شاگرد مولانا محمد انوری نے بھی ایک مختصر مگر جامع سیرت لکھی ہے۔ جو حسن اتفاق سے ان ایام میں پہلی مرتبہ ان کے صاحبزادے سے ملی ہے حضرت کے صاحبزادے غالباً اظہر شاہ قیصر نے حیاتِ انور لکھی ہے اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت شاہ صاحب کے علوم کے مشتے از خردوارے محدث ہند بزرگوارم انظر شاہ نے "نقشِ دوام" لکھی جو علمی حلقوں میں وقعت کی نظر سے دیکھی گئی اور اس کے علاوہ بہت ساری چھوٹی بڑی کتابیں حضرت شاہ صاحب کے علوم و کمالات سیرت و صورتِ حیا و زندگی الغرض مختلف اطراف و میادین میں لکھی گئی ہیں۔

عبارتِ اتنا شتی و حسنک واحد و کل ذلک الی الحسن یشیر

حال ہی میں ہمارے مخدوم اور محقق عالم مولانا محمد میان صدیقی کاندھلوی کی خاص عنایت و مہربانی سے "الانور" نامی ایک کتاب ملی جو حضرت شاہ صاحب کے عاشق زار اور مقامات کے قدر شناس عبدالرحمن کندو نے حضرت شاہ صاحب کے دیارِ مبارکہ کے مکین و ساکن ہونے کے ناتے لکھی ہے اور مجھ تک پہنچی کتاب کی جامعیت دیدنی ہے مصنف سے کوئی حال اور ماحول جو حضرت شاہ صاحب یا ان کے حسب و نسب کے متعلق ہو۔ چھوٹ نہ سکا بہت ساری وہ معلومات جو عام سیرت نگاروں سے رہ گئیں عبدالرحمن کندو نے حسین پیرائے میں اپنے موقع اور محل کے اندر آشکار کر دیئے اگر علم حدیث کی بعض اصول جس سے روایت اور درایت کے نقد و ابرام کا کام ہو جاتا تو شاید یہ کتاب زبانِ اردو میں کافی حد تک نفعۃ العنبر کی شیرنی و حلاوت آگے بڑھانے والی تھی۔ غالباً ہمارے مخلص اور محسن عبدالرحمن کندو خود باقاعدہ میادین علم کے شناس و نہیں ہیں اس لئے متفق علیہ موضوع اور مکذوب روایت "اطلبوا العلم ولو بالصین" تک نقل کر کے اس کا حکم واضح نہیں فرمایا اس قسم کے چند مقامات ہیں جو قابلِ نظر ہیں مجھے خیال تھا کہ میں اس پر قلم اٹھاؤں اور کتاب کا یہ قرضہ

چکاؤں لیکن افسوس کہ اس وقت یہ کام زیادہ ہے اور وقت کم ہے طبیعت یہ برداشت نہیں کر رہی کہ حضرت شاہ صاحب کے احوال و سوانح پر یہ جامع دستاویز مزید تاخیر کی نظر ہو کر علم و تحقیق کے قدردانوں سے زیادہ فاصلے پر ہے بس یہ چند اشارات کر کے کتاب کا نام "النور" کے ساتھ تقدس کا اضافہ کر کے پریس کے حوالے کر دیا امید ہے کہ علم و تحقیق کے بادہ پھاؤں کے لئے شربت وصال ثابت ہو کر تھنہ دیرینہ کی پیاس بجھانے کے لئے ایک چشمہ مسلسل ثابت ہوگا جو کتاب کے مندرجات سے اپنی قد و قامت منوا کر رہے گی۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو حضرت اقدس امام العصر حضرت مولانا شاہ صاحب کے بہترین ایصالِ ثواب بنائے اور حضرت کے علوم و اعمال تحقیقات و کمالات کے شاہدوں کے لئے حوضِ کوثر و تسنیم ثابت فرمائیں اور جن اکابر اور حضرت کے نسبت برداروں نے آج تک اس دادی سرسبز سے خوشہ چینی کر کے ہم نابکاراؤں کو سیراب فرمانے کی سعی فرمائی ان کے لئے خیرِ دُخردنیا و الآخرة ثابت فرمائے۔ نیز اس عاجز و فقیر جس کے پاس سوائے حضرت شاہ صاحب کی عقیدت اور محبت کے علاوہ علم یا عمل کی پونجی تو درکنار ایک رتی نارسا تک نہیں حضرت شاہ صاحب کے ساتھ علم و عمل کے بہترین انتساب کے قیام و دوام کا شجرِ مشر ثابت فرمائے۔

یہاں تک بڑھ گئے وائٹکی شوق کے نظارہ حجاباتِ نظر سے پھوٹ نکلا حسنِ جانانہ
وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ
اجمعین۔

وانا الاحقر والافقر

محمد زرولی خان عفا اللہ عنہ

خادم الجامعہ العربیہ حسن العلوم

وخادم الحدیث والتفسیر والافتاء بہا

کلشن اقبال بلاک ۲ کراچی، پاکستان

تقدس انور

الحمد لله کفنی و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد
امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے وقت کے عظیم محدث، علی
الاطلاق فقیہ اور مشکل علوم و فنون میں امام اور مجتہد ثابت ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین
کی تقویم اور تقسیم کے لئے ہر دور اور ہر زمانے میں ایسے کاملین پیدا فرمائے ہیں جن کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے زبان نبوت سے اس طرح ارشادات صادر ہوئے ہیں

”ان الله يبعث لهذه الامة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها

دينها“ (ابوداؤد کتاب الملاحم ج ۲ ص ۲۳۰ رحمہ اللہ)

اس کے علاوہ بھی صد ہا ارشادات اور اسرار و رموز آنے والے رجال کاملین کے بارے
میں اعلام اور اعلان نبوت کے طور پر محدثین کے یہاں معروف ہیں۔

ہندوستان کے دورِ آخر میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبد العزیز رحمہم اللہ سے لیکر مولانا رشید
احمد صاحب گنگوہی اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور شیخ العالم شیخ الہند مولانا محمود حسن
صاحب دیوبندی اور مفتی اعظم ہند مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، حکیم الامت مولانا اشرف
علی صاحب تھانوی اور شیخ الاسلام شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ
علیہم ان اسرار اور ارشادات کے آبدار جواہر علم و عمل ہیں۔ اسی جماعت کے گل سربد، محدث
بے بدل، مفسر عجیب الشان، فقیہ علی الاطلاق آیت من آیات اللہ امام العصر حضرت مولانا محمد
انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہر میدان میں تقدس علم، رفعت
مقام اور مجتہدانہ صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں وہ اپنے زمانے کے آسمان پر افق کی طرح مشہور و
معروف ہیں اور علماء اور علم کے نقادین کے قدردانوں کی طرح سبع سموات کی طرح مسلم
ہیں، چنانچہ استاذنا المحترم حضرت بنوری رحمہ اللہ کی ”تھیہ العصر“ مولانا محمد انور صاحب کی
”انوار انوری“ اور حضرت کے صاحبزادے مولانا ازہر کی ”حیات انور“ اور حضرت کے
چھوٹے صاحبزادہ مولانا انظر شاہ صاحب کی ”نقش دوام“ واقعی

ہمت است بر جریدہ عالم دوام ما

کا عکس تسلسل ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے ہمارے بزرگ اور مخدوم مولانا عبد الرحمن کاندھلوی نے کشمیر ہی کی سرزمین پر حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی زندگی مبارک پر ایسی جامع اور مانع کتاب ”الانور“ کے نام سے جمع فرمائی ہے جس کی خوشبو اور کوثر و نسیم سے ذہلے دھلائے مقالے ابد نشان رہیں گے وہ سربستہ زاد یے جو عموماً تشنہ طلب اور عطشان تحقیق رہتے ہیں ان کے کھولنے کے لئے انہی کی ایک اور کتاب ”نقیب انور شاہ“ لکھنے کی توفیق دی جو ان کے بیان کے مطابق ۱۱ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔

چند سال قبل میرے عزیز دوست ”ماہنامہ الاحسن“ کے نائب مدیر اور علوم و کمالات کے جمع و ترتیب اور نشر و اشاعت کے عظیم بارگراں کے اٹھانے کے لئے ایک عفریت جو کہ صلاح و فلاح کے آرزو و تسلسل سے آراستہ ایک منگ کی حیثیت رکھتا ہے عزیزم محمد ہمایوں مغل حسن کی کاوشوں سے ”ماہنامہ الاحسن“ اپنے مقام اور ناموس کے ساتھ تقریباً ہر ماہ شائع ہو رہا ہے جس نے علماء اور علمی میا دین کے قدر شناسوں سے اپنا مقام منوایا ہے۔ جب کہ اس عاجز و فقیر کا نام اور کام اس میں برائے نام بلکہ مخمل کے قالین میں ناٹ کے پیوند کی طرح ہے۔ انہی کے جہد مسلسل سے ”الانور“ ”تقدیر نور“ کے نام سے جامعہ عربیہ احسن العلوم کے شعبہ نشر و اشاعت کی طرف سے شائع ہو چکی ہے جس کی علماء اور بھی خواہوں نے ایک جیسی قدر دانی اور شرف نگاہی فرمائی ہے۔ یہ ”تقدیر نور“ کا نقش ثانی اور دوسرا ایڈیشن ہے جو عنقریب منصف شہود پر آنے والا ہے، اللہ تعالیٰ حضرت اقدس امام العصر مولانا محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کے لئے رفع درجات کا باعث بنائے اور اس کے شائع کرنے والے حضرات کے لئے اجر و ثواب کا باعث بنائے۔

مضمون کے اختتام پر ایک واقعہ یاد آیا کہ چند سال قبل سعودی حکومت نے جامعہ امام محمد ریاض کی طرف سے ایسے چھ علماء جو چودھویں صدی ہجری کے یگانہ روزگار اور تمام علوم و فنون میں آئمہ اور مجتہدانہ صفات کے حامل ہوں ان پر مشتمل ایک وقیع مقالہ تیار کیا جائے چنانچہ بہت سارے اصحاب علم و فضل نے اس پر قلم آزمائی اور مطبع نگاری فرمائی مگر بلا و عرب کے انور شاہ ثانی اور اس صدی کے بڑے محقق اور مدقق عالم دین علامہ شیخ زاہد الکوثری رحمہ اللہ کے علوم و کمالات کے جامع اور لائق و فائق شاگرد ہمارے شیخ حضرت اقدس مولانا عبد

” تراجم مستند من فقهاء العالم الاسلامی فی القرن الرابع عشر و آثارهم الفقہیہ “

کے موضوع پر ایک گراں قدر مقالہ تحریر کیا اور اس میں عالم کے چھ بڑے فقہاء پر مفصل و مدلل کلام فرمایا ہے اور اس میں امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ کو اول نمبر پر ذکر فرمایا ہے۔

جب یہ مقالہ مکمل ہوا اور منعقدہ لجنہ میں پیش کیا گیا تو مقالہ تو یہی اول آیا لیکن اہل انتظام و انصرام نے اپنی خاص طبیعت سے مجبور ہو کر یہ اعتراض فرمایا کہ مقالہ عرب علماء کے حالات پر مشتمل ہے، عربی ادارہ شائع کر رہا ہے، عربی قلم سے لکھا گیا ہے، عربی نفقات سے تیار ہو رہا ہے اور اس پر ایک ہندی اور کشمیری عالم کو اول اور سرفہرست رکھا گیا ہے۔ بہت ساری تنگ و دو کے بعد جب حضرت اقدس شیخ عبدالفتاح ابو غندہ مرحوم و مغفور اپنی مطلوبہ استقامت پر قائم رہے اور فرمایا کہ آپ کی دی ہوئی شرائط کے مطابق صرف مولانا محمد انور شاہ صاحب ہی اس کے پکے اور سچے حقدار ہیں، لہذا وہ اول نمبر پر ہی رہیں گے اور آخر تو درکنار دوسرے نمبر پر بھی نہیں آسکیں گے اگر نیچ پوچھیں تو یہ کتاب حقیقت میں ان ہی کے علم و فضل کے کمالات کا آئینہ ہے، دوسروں کا ذکر طبعاً و تہراً کیا گیا ہے۔

ولنعم ما قال

بحر العلوم فما بحر يشاكله

لو نقب الارض لم يوجد له شبهه

چنانچہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے اول مقام کے دیدہ زیب اور کامل و اکمل اطراف حیات کے انبساط و نشاط کے ساتھ یہ گرانقدر کتاب مذکورہ لجنہ نے ہی شائع کی ”
لَذِيحُوهَا وَمَا كَاذُوا يَفْعَلُونِ“ اور یوں شیخ و مرشد عبدالفتاح ابو غندہ مرحوم و مغفور کی تحریر و تحقیق کا کرشمہ اور حضرت شاہ صاحب جیسے ولی باصفاء کی بین کرامت ظہور پذیر ہوئی۔

ولنعم ما قال ”ما ہی باول برکتکم یا آل ابی بکر“

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین

تعارف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”ندوة المصنفین“ کے قیام وقت سے ہی میری تمنا تھی کہ علمی دنیا کی بے مثال شخصیت شیخ الاسلام حضرت الاستاذ علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ کی سیرت اور کمالات علمی پر حضرت کی شخصیت کے شایان شان کوئی معیاری کتاب شائع کی جائے، کیونکہ ”ندوة المصنفین“ کے تمام بنیادی رفقاء اور خدام نہ صرف براہ راست حضرت کے دامن فیض سے وابستہ ہیں بلکہ ان کی علمی زندگی کا وجود ہی اُس آفتاب علم و عمل اور ماہتاب تقدس و تقویٰ کی ضیا پاشیوں اور ضوافلنیوں کا عکس ہے اور ان کے پاس جو کچھ بھی ہے اسی گنجینہ علم و فضل کے فیض صحبت سے حاصل کیا ہوا ہے لیکن وقت گذرتا گیا اور اڑتیس (۳۸) سال کی یہ مدت ایک خواب کی طرح گزر گئی۔ ادارہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کی لپیٹ میں آ گیا اور اس کے ارادوں کی بساط الٹ کر رہ گئی بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو دوبارہ یکجا کرنا شروع کیا تو یہ دردناک صورت پیش آئی کہ خاص خاص رفقاء جن کی حیثیت ادارے کے جسم و روح میں ریڑھ کی ہڈی کی تھی دنیا سے رخصت ہو گئے، پہلے ”نقص القرآن“ کے مؤلف مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب رحمۃ اللہ سیوہاروی اور چند سال کے بعد ”ترجمان السنہ“ کے مرتب مولانا محمد بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر چلے گئے، ایک مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب رہ گئے جو یہ خدمت نہایت قابلیت اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہیں اور مجھے اس میں ذرا بھی تردد نہیں کہ اکبر آبادی صاحب کا قلم حرکت میں آ گیا تو کم سے کم مولانا الطاف حسین حالی کی ”حیات جاوید“ اور مولانا سلیمان ندوی کی ”حیات شبلی“ کی یاد تازہ ہو جائے گی اور اس آئینے میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ کے سوانح حیات اور اس دور کے حالات و خصوصیات کا عکس خاص طور پر دیکھا جاسکے گا۔

قدرت کی کار فرمایوں کے عجیب و غریب نمونے ہر وقت دنیا کے سامنے آتے رہتے ہیں، تالیف ”الانوار“ کا وجود میں آنا بھی قدرت کی کار فرمائی کا ایک ایسا ہی کرشمہ ہے، کون کہہ سکتا تھا کہ جو کام مسلسل ارادے اور تمنا کے باوجود ”ندوة المصنفین“ کے ذریعہ

سے نہ ہو سکا وہ کشمیر کے ایک سیما ب صفت نوجوان عبدالرحمن صاحب کوندو کے واسطے سے عالم شہود میں آئے گا گذشتہ چالیس پینتالیس سال میں حضرت الاستاذ کی سیرت اور علمی کمالات و خصوصیات پر مختلف زبانوں میں متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں اور بے شمار مضامین رسالوں اور اخباروں میں نکلے ہیں لیکن یہ کہنا شاید مبالغہ نہیں ہے کہ "الانوار" کے وجود میں آجانے سے ایک اہم اور قابل قدر تالیف کا اضافہ ہوا ہے اتنی معلومات کا ذخیرہ اگر کسی منجھے ہوئے اور کہنہ مشق مصنف کو میسر ہو جاتا تو وہ اپنے زور قلم اور تصنیفی تجربے سے اس تالیف کو بام عرش پر پہنچانے کی کوشش کرتا۔ مگر خاندان انوری کے ایک مایہ ناز عالم اور بزرگ اور میرے قابل احترام مخلص دوست مولانا محمد سعید صاحب مسعودی کے فیض تربیت نے نوجوان کوندو صاحب کے قلب و دماغ پر کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ ہر چیز سے بے خبر ہو کر اس خدمت میں محو ہو گئے اور شب و روز کی عرق ریز جدوجہد کے بعد اعلیٰ درجے کا نکھرا ہوا ضخیم مجموعہ مرتب کر لیا۔

کوندو صاحب نے اپنی غیر معمولی لگن سے جس کو جذبہ بیتاب بھی کہا جاسکتا ہے، ثابت کر دیا کہ وہ اس خدمت کے پوری طرح اہل تھے۔ دیگر مباحث سے قطع نظر "الانوار" کا وہ حصہ جس کا تعلق حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان اور ذاتی حالات و کوائف سے ہے کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت ہے مولف نے اس کے لئے قابل رشک محنت اور جدوجہد کی ہے اور ان کی محنت کی وجہ سے کتاب کا پایہ اعتبار نہایت بلند ہو گیا ہے۔ اب جب کبھی حضرت الاستاذ کی سوانح حیات پر کوئی بڑی تحقیقی کتاب لکھی جائے گی کوندو صاحب کی یہ تالیف اس کے لئے نشان راہ کا کام دے گی۔

عتیق الرحمن عثمانی
قدوة المستحقین دہلی
کیم فروری ۱۹۷۷ء

پیش لفظ

از حضرت العلام پر وفیر سعید احمد اکبر آبادی (مدظلہ العالی)

سابق ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اس زمانے میں آیۃ من آیات اللہ اور خُجُوعٌ مِنْ حُجُوجِ الْهَيْبَةِ تھی۔ یوں تو آپ کی عام شہرت ایک محدث جلیل القدر کی حیثیت سے تھی، لیکن درحقیقت علوم و فنونِ مُتَدَوِّلہ میں کوئی علم اور فن ایسا نہیں تھا جس میں آپ کو کمالِ بلوغِ نظر اور دقتِ نگاہ حاصل نہ ہو، چنانچہ جن حضرات کو حضرت موصوف کے درسِ بخاری میں باقاعدہ اور باضابطہ شرکت کی سعادت حاصل ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ درس ایک دریائے بیکراں کی مانند ہوتا تھا جس کی موجیں پانا ساحل و کنار نہیں رہ سکتی تھیں، بلکہ اپنی گزرگاہ کے ہر پست و بلند وادی اور قرب و جوار کے ہر نشیب و فراز سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی آگے بڑھتی تھی، پھر حضرت شاہ صاحب کی سب سے بڑی نمایاں اور علمی خصوصیت یہ تھی کہ مبداءِ فیاض نے آپ کو رسوخ فی العلم کے ساتھ ہر علم و فن کے مباحث و مسائل پر اجتہادی اور ناقدانہ و مبصرانہ نظر عطا فرمائی تھی حضرت موصوف کی تصنیفات و تالیفات اور صحیح بخاری اور سنن ترمذی کی درسی تحریروں کے مجموعے جو مختلف حضرات نے شائع کئے ہیں انہیں ملاحظہ فرمائیے آپ پر خود یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی اس حیثیت سے حضرت الاستاذ ایک فردِ واحد نہیں، بلکہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ حدیقہ علم و فضل کے گلِ سرسبز نہیں بلکہ سرتاسر یک گلشن ہزار لالہ و گل بکنار تھے۔ وہ بیک وقت حافظ ابن حجر بھی تھے اور ابن جریر طبری بھی، ابن دقین العید بھی تھے اور شیخ ابن ہمام بھی، ادب اور بلاغت میں جاحظ بھی اور عبد القاہر جرجانی بھی۔ فارسی شعر و شاعری میں اگر وہ انوری اور خاقانی کے ہم رنگ تھے تو عربی شاعری میں ابوالعلاہیہ اور بختری کے ہم پایہ نظر آتے تھے۔ وَقَسْ عَلٰی ذٰلِكَ۔

ہر انسان کو اپنے نفس کا علم حضوری ہوتا ہے، علوم و فنون پر اپنی اجتہادی نظر کا احساس و اعتراف خود حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تھا۔ جب کبھی موقع ہوتا تھا آپ اس کا ذکر کرتے تھے بلکہ متعدد بار یہ بھی فرمایا ہے کہ بعض علوم و فنون آپ نے ایجاد بھی کئے ہیں جو افسوس ہے کہ مُدَوِّلہ نہیں ہو سکے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی شہرت کا غلغلہ برصغیر ہندوپاک سے باہر اسی زمانے سے

پہنچنا شروع ہو گیا تھا جب کہ ابھی آپ کا عہد شباب تھا اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی میں دارالعلوم دیوبند سے بحیثیت مدرس کے آپ کا تعلق ابھی قائم ہوا ہی تھا۔ چنانچہ ۱۵ مارچ ۱۹۱۲ء کو علامہ سید رشید رضا مصری صاحب المنار دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے، ان کے اعزاز میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عربی میں دیوبند کے مسلک علمی و فقہی پر کم و بیش ایک گھنٹہ ایسی فصیح و بلیغ تقریر کی، کہ علامہ مصری اس سے حد درجہ متاثر اور محفوظ ہوئے۔ چنانچہ مراجعت وطن کے بعد موصوف نے المنار میں اپنے سفر ہند کی روایت ادشائع کی تو اس میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علم و فضل کی کھلے لفظوں میں داد دی۔

اس واقعہ کے بعد حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تہذیب و ترتیب اور مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا سید رضا احمد صاحب بجنوری کے اہتمام و انتظام سے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقاریر بخاری کا مجموعہ فیض الباری کے نام سے قاہرہ میں شائع ہوا اور لب ممالک عربیہ کے علماء اعلام اور محققین کرام کو براہ راست حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم سے استفادہ کا موقع ملا تو وہاں کے علمی ایوانوں کے بام و در حضرت الاستاذ کی علمی اور تحقیقی ژرف نگاہی کی صدا سے گونج اٹھے جس کا سب سے بڑا مظہر وہ مقالہ ہے جو علامہ شیخ محمد زاہد کوثری نے حضرت موصوف پر لکھا اور جو مقالات زاہد کوثری میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں شیخ عبدالمعین انصر نے دارالعلوم دیوبند میں منذوب مصر کی حیثیت سے دو (۲) برس تک قیام کرنے کے بعد علماء ہند پر دو (۲) جلدوں میں ایک بلند پایہ اور تحقیقی کتاب لکھی ہے اس میں شیخ انصر نے جس طرح حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خراج عقیدت و ارادت پیش کیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصر کے علمی اور دینی حلقے گنجینہ دیوبند کے اس گوہر گرانیہ کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ پھر اسی کے قریب زمانے میں شام کے نہایت فاضل اور محقق شیخ عبدالفتاح ابو غندہ نے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی دو معرکۃ الآراء کتابیں عقیدۃ الاسلام اور اکفار الملحدین اپنے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ بڑے اہتمام و انتظام سے اپنے ادارہ کی طرف سے دمشق سے شائع کیں، تو اب حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شہرت اور تعارف کا حلقہ ممالک عربیہ میں قاہرہ سے مراکو تک وسیع ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء میں جب مراکو گیا اور ایک اجتماع میں تقریر کر کے فارغ ہوا تو ایک سن رسیدہ عالم نے دریافت کیا کہ میں نے عربی کہاں پڑھی ہے؟ میں نے کہا دیوبند میں، یہ سنتے ہی انہوں نے پوچھا کہ کیا تم شیخ السید انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو جانتے ہو؟ میں نے کہا کیوں نہیں! مجھ کو تو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے، یہ سنا تھا کہ شیخ پر عالم وجد طاری ہو گیا۔ میری پیشانی کو بوسہ دیا

ہاتھ پو سے اور مجھے ایک کونے میں لے کر بیٹھ گئے اور بولے: اچھا اب تم مجھ کو اپنے اُستاد کے حالات سناؤ کہ صورتِ شکل کیسی تھی، لباس کیا تھا، عادات و خصائل کیا تھے وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ تھا، لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود اپنے وطن میں عملاً گمنام رہے، نہ یہاں کبھی حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ پر کوئی کتاب شائع ہوئی نہ یہاں آپ کے نام پر کسی اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور نہ حضرت کی کوئی یادگار قائم ہوئی، خوشی کی بات ہے کہ کشمیر کے ایک ہونہار اور پُر جوش نوجوان عبدالرحمن صاحب کوندو نے یہ المناک حقیقت محسوس کی اور بقدر ہمت و استطاعت تلافیِ مافات کے لئے کمر ہمت باندھ لی۔ یہ کتاب موصوف کی اسی جدوجہد اور سعی پیہم کا ثمرِ خوش اثر ہے۔ اس کتاب کے لئے مضامین کی فراہم آوری ان کی تربیت و تہذیب اور ان کی کتابت و طباعت کے سلسلے میں انہوں نے جو تکالیف شاقہ دل کی لگن اور دھن کے ساتھ برداشت کی ہیں انہیں وہی لوگ اچھی طرح سے محسوس کر سکتے ہیں جنہیں ان کاموں کا تجربہ ہو۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عبدالرحمن صاحب کوندو نے صرف کتاب کے مرتب اور ناشر کا رول ادا نہیں کیا بلکہ خود کمالِ تحقیق و جستجو سے محنت و مشقتِ بسیار کے بعد حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندانی، مقامی اور ذاتی سوانحِ حیات کا پورا حصہ خود مرتب کیا اور اس جامعیت سے کہ موضوعِ زیرِ بحث کا کوئی گوشہ اور پہلو غفلت نہ رہا ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے علمی اور تحقیقی کمالات کا معاملہ تو یہ ہے کہ اہل علم حضرات نے اس پر بہت کچھ لکھا اور آئندہ بھی لکھا جائے گا اور تحقیق کا قدم جتنا آگے بڑھتا جائے گا اسی قدر حضرت اُستاد کے علمی اور تحقیقی امتیازات و خصائص نکھر کر سامنے آتے رہیں گے، البتہ جہان تک ذاتی احوال و سوانح کا تعلق ہے، کہا جاسکتا ہے کہ عبدالرحمن صاحب کوندو نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس میں جُردی طور پر کوئی ترمیم یا اضافہ ہو سکتا ہے لیکن بنیادی طور پر اس میں نہ اضافہ ہو سکے گا اور نہ تغیر اور تبدل اور اسکی وجہ یہ ہے کہ نوجوان مرتب نے نہایت مستند اور معتبر ذرائعِ معلومات میں سے کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے براہِ راست استفادہ نہ کیا ہو اور ظاہر ہے کہ یہ مواقع ہر شخص کو کہاں حاصل ہو سکتے ہیں؟ اس مجموعہ میں مشاہیرِ علماء و اربابِ قلم کے مقالات جو اچھے سے اچھے اور مفید ہیں، شریکِ اشاعت ہیں۔ اُمید ہے کہ ایک نوجوان کی یہ کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور اربابِ ذوق اس کے مطالعہ سے شاد کام و محفوظ ہوں گے۔

سعید احمد اکبر آبادی

نئی دہلی ۲ اکتوبر ۱۹۷۷ء

تقریظات

تقریظ

از حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب (دامت برکاتہم)

(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے آپ اس زمانہ میں آیۃ من آیات اللہ تھے۔ اگرچہ آپ کی شہرت ایک محدث کی حیثیت سے ہے لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات میں ایک عالم جمع کر دیا تھا۔

لَيْسَ عَلَى اللَّهِ بِمُسْتَكْرٍ أَنْ يَجْمَعَ الْعَالَمَ فِي وَاحِدٍ

اسلامی علوم و فنون کے دائرے کا شاید ہی کوئی علم یا فن ایسا ہو جس سے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ واقف نہ ہوں اور اس کے مسائل کے متعلق خاص تحقیقی نظر نہ رکھتے ہوں، بلاشبہ بیشتر عصری علوم پر بھی آپ کو عبور حاصل تھا اور جذبہ مسائل میں بھی مجتہدانہ رائے رکھتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وسعت نظر، کثرت مطالعہ، استحضار اور رسوخ فی العلم کی مثال گزشتہ کئی صدیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ آپ کا تعلق کشمیر کی وادی لولاب سے تھا، کشمیر سے ہر دور میں سینکڑوں علماء اور محدثین پیدا ہوئے ہیں، بعض ان میں سے اپنی عظمت اور شہرت میں ساتویں آسمان تک پہنچے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی خصوصیات اور خدمات کے لحاظ سے ان سب میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

مجھے جس پہلو پر سب سے زیادہ افسوس رہا وہ یہ ہے کہ کشمیر نے اپنے اس مایہ ناز فرزند کی کما حقہ قدر نہ کی، ضرورت اس کی تھی کہ کشمیر اپنے علمی اور دینی ارتقاء کے سفر میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نقوش پا سے رہنمائی حاصل کرتا، لیکن افسوس اور حیرت اس پر ہے کہ جس شخصیت کے علم کے چرچے ہندو پاک کی سرحدوں سے گذر کر عالم عرب کی علمی مجلسوں تک جا پہنچے ہوں اور وہاں کے ممتاز علماء اس شخصیت کے دلدادہ و شیدائے نظر آتے ہیں وہ خود اپنے وطن میں اس حد تک گمنام ہو کہ اس کا تعارف بس پُرانے زمانے کے ان بوڑھوں تک محدود ہو جنہوں نے

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کو دیکھا ہے اور ان کی مجلسوں میں بیٹھنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ ضرورت تھی کہ کشمیر اپنے اسلاف کو پہچانتا اور وہاں کی نوجوان نسل کے قلوب اپنے آباؤ اجداد کے علوم کی روشنی سے لبریز ہوتے۔ الحمد للہ اب یہ رجحان پیدا ہو رہا ہے اور یہ بات لائق تحسین ہے کہ وادی کے ایک ہونہار اور لائق نوجوان عبدالرحمن صاحب کوندو نے اپنے فرض کا احساس کیا ہے انہوں نے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا اسم گرامی سنا اور اس عظیم المرتبت شخصیت کے تمام علمی روحانی پہلوؤں کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ ”الانوار“ دراصل اسی مبارک احساس کا نتیجہ ہے اور اس تفصیلی مطالعہ کا خوب صورت مرقع، فاضل مؤلف نے ”الانوار“ کی ترتیب و تالیف کے سلسلہ میں بڑی تگ و دو کی ہے خاص طور پر وہ حصہ جو انہوں نے خاندان انوری کے حالات کے سلسلے میں سپرد قلم کیا ہے، بلاشبہ انتہائی محققانہ ہے۔ اپنے اسلوب بیان اور استدلال کی قوت کی بنا پر ”الانوار“ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ سے متعلق لکھی گئی کتابوں میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔

اللہ تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر دے اور انہیں علوم انوری سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

محمد طیب

(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

۲۴ محرم ۱۳۹۸ھ

”الانور“ پر ایک نظر

از جناب پروفیسر آل احمد سرور۔ اقبال چیمبر پروفیسر (شعبہ اقبالیات) کشمیر یونیورسٹی
 پروفیسر کے اُن علماء میں جنہوں نے فکر و نظر، رشد و ہدایت اور درس و تدریس کا علم برصغیر
 میں بلند رکھا حضرت انور شاہ کشمیری کا درجہ بہت بلند ہے کشمیر کے اس فرزندِ جلیل نے علوم
 اسلامیہ خصوصاً حدیث میں وہ بلند مرتبہ حاصل کیا جو اس دور میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس
 بات کی بڑی سخت ضرورت تھی کہ ایسے بلند پایہ عالم اور بزرگ انسان کی سیرت و شخصیت اور
 کارناموں پر قرار واقعی روشنی ڈالی جائے اور ان کی جامعیت کے تمام گوشوں کی اہمیت اور
 قدر و قیمت کا اچھی طرح جائزہ لیا جائے اور افسوس ہے کہ مسلمانوں میں اپنے بزرگوں کے
 کمالات سے ناواقفیت بڑھتی جاتی ہے اور مذہب، تہذیب اور علم و ادب کی جو گرانقدر
 خدمات ان بزرگوں نے انجام دی ہیں اُن سے موجودہ نسل بڑی حد تک بے بہرہ ہے۔

ان حالات میں کشمیر کے ایک نوجوان، مخلص اور باصلاحیت اسکالر، عبدالرحمن کوندو کی اس
 تالیف کا اہل نظر کو خیر مقدم کرنا چاہئے جس کے ذریعہ سے حضرت انور شاہ کشمیری کے حالات
 اور کارنامے اور ان کے اپنے دور کے عالموں اور ممتاز اساتذہ اور مشاہیر سے تعلق کا علم ہوتا
 ہے، عبدالرحمن کوندو نے اس سلسلے میں بڑی محنت کی ہے اور بڑی تلاش و جستجو سے ایک ایسی
 تصویر بنائی ہے جس کا ہر رخ جاذبِ نظر ہے۔ اُن کی تحقیق کے بعد نتائج سے اختلاف ممکن
 ہے، مگر ان کی تلاش اور جستجو اور اتنے اہم مواد کی فراہمی سے کون کا فرائز کار کر سکتا ہے؟

عبدالرحمن کوندو نے دوسرے علماء اور اربابِ فکر کے ساتھ حضرت شاہ صاحب اور علامہ
 اقبال کے تعلقات کا بھی ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں ”مؤلاً زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض“ بھی
 زیرِ بحث آیا ہے۔ عبدالرحمن صاحب کوندو کا خیال ہے کہ ”مؤلاً زادہ ضیغم لولابی کشمیری“ سے مراد
 حضرت انور شاہ ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محرابِ گل کی طرح یہ بھی ایک فرضی نام ہے،
 بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ وادیِ لولاب کا انتخاب اور اس کے ذریعہ سے عالمِ اسلامی اور
 کشمیر کے مسائل کا تذکرہ یہ ضرور ظاہر کرتا ہے کہ اس پردے میں شاہ صاحب کا تصور اور ان کی
 تعلیمات ضرور اقبال کے ذہن میں رہی ہوں گی۔ اقبال کے یہاں براہِ راست شاعری بھی ہے

اور رمزدایمابھی اور سب ہی باتیں انہوں نے رمزدایمابھی کے پردے میں ہی کہی ہیں۔

کشمیر پر حضرت انور شاہ کشمیری کے اتنے احسانات ہیں کہ اہل کشمیر کو حضرت کے شایانِ شان کوئی ایسا علمی ادارہ قائم کرنا چاہیے ہیں جس کے ذریعہ سے اسلامی علوم کی تعلیم جدید معیاروں کے مطابق دی جاسکے۔ اس غرض سے حکومت جموں و کشمیر کو ایک انور شاہ اکیڈمی جلد سے جلد قائم کرنی چاہئے۔ مجھے معلوم ہے کہ جناب شیخ محمد عبداللہ وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر کی خود بھی خواہش ہے مگر اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں اب دیر نہیں ہونی چاہئے۔ بقول غالبؔ

”ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا“

ابھی باقی ہے۔

امید ہے کہ اس کتاب سے حضرت انور شاہ پر تحقیق کی اور بھی نئی راہیں کھلیں گی۔

آل احمد سرور

کشمیر یونیورسٹی، ۸ دسمبر ۱۹۷۸ء

تبصرة على "الأنور"

لفضيلة الأستاذ مولانا بدر الحسن القاسمي مدير جريدة "الداعي" (نصف شهرية) ديوبند (الهند)

كتاب، صدر حديثاً في ترجمة امام العصر الشيخ محمد انور شاه الكشميري قام بتأليفه السيد عبدالرحمن كوندو، والتزم طبعه ونشره المجمع العلمي المعروف بندوق المصنفين في دهلي في ثوب قشيب وطبع جميل براق.

والكتاب عبارة عن مقالات وبحوث علمية مستوعبة كتبها الباحثون ممن تلمذوا على امام العصر واخرون من العلماء البارعين وجمعها السيد عبدالرحمن كوندو و اضاف اليها كثيراً، فكم من مقالات وبحوث طريفة، دبجتها يراع الجامع. والكتاب يقع في سبع مائة صفحة من القطع المتوسط.

ولما كان امام العصر الشيخ محمد انور شاه الكشميري في طليعة المحدثين والاعلام ومن افذاذ الرجال. وله مآثر علمية خالدة. فكانت الحاجة ماسة الى مثل هذا الكتاب الذي يلقي ضوء على كل من بلاده ومولده ونشأته ونموه العلمي ونشاطه ومآثره ومؤلفاته فجاء هذا الكتاب في وقته وسد فراغاً هيباً في المكتبة الاسلامية ونال قبولا ورواجاً في الاوساط العلمية.

والمؤلف يستحق الثناء والتقدير على هذه المائدة العلمية. كافاه الله على ما كابد من المشاق في جمع تلك البحوث القيمة.

والعلم فليس ونورد

A WORD OF APPRECIATION

FROM

Janab Mian Jalal-ud-Din

Honourable Chief Justice

JAMMU & KASHMIR HIGH COURT



MIAN JALAL-UD-DIN,

CHIEF JUSTICE
Sy. H. G. / Jammu

December 22, 1973

greater

I was really delighted to go through the pages of the book entitled 'Al-Anwar' written by its author Mr Abd-ur-Rahman Kondoo. It encompasses the brilliant facets of Kashmir's famous scholar, Allamah Anwar Shah, who grew into prominence at the well-known Islamic sanctuary of Deoband. The Allamah flourished during the early decades of this century. He was an authoritative commentator of the Holy Quran, the Hadith and the Fiqqah (Jurisprudence); He was a prolific writer, an eloquent speaker, a poet of great order and repute and above all a spiritualist of lofty magnitude. ~~Most~~ part of his life was devoted to the teaching at Deoband and writing on Islamiyat.

Unfortunately, before the appearance of the book "AL-ANWAR", this erudite scholar was little known in his own land (The valley of Kashmir), particularly among most of the educated. Mr Kondoo has rendered valuable service by working patiently on available source material and also by conducting interviews with the near and dear ones of the Allamah. The book, 'AL-ANWAR', has filled the gap and fulfilled the need of the world of learners. My own view is that the book be translated into Arabic and English languages so that many outside the country could benefit by this literature and from the mission of Allamah. I feel sanguine that every lover of literature shall take advantage of the book in understanding the works of this great luminary.

I congratulate Mr Abd-ur-Rahman Kondoo for his bold venture and express the hope that he will continue further researches in the realm of Islamic literature and make his sustained contributions in this behalf.

I wish Mr Kondoo all success.

M. G.
(MIAN JALAL-UD-DIN)

عرضِ حال

پیش نامہ طبع ثانی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ وَآلِهِ وَاصْحَابِهِ اَجْمَعِیْنَ وَسَائِرِ عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِیْنَ
اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ.

اَمَّا بَعْدُ: فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی فِی الْقُرْآنِ الْحَكِیْمِ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ
الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ: وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ. وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا
النُّوْرُ. وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ. وَمَا یَسْتَوِی الْاَحْیَاءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ
اِنَّ اللّٰهَ یَسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ.
(الفاطر) وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَالَمَ
یَسْتَغْفِرُكَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْحِیْتَانِ فِیْ خَوْفِ الْمَآءِ.
وَ اِنَّ فَضْلَ الْعَالَمِ عَلٰی الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ عَلٰی سَائِرِ
الْكَوَاكِبِ وَ اِنَّ الْعُلَمَآءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَآءِ.

(احمد ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

اَخُ الْعِلْمِ حَتّٰی خَالَدٌ بَعْدَ مَوْتِهِ ☆ وَاَوْصَالُهُ تَحْتَ الشَّرَابِ رَمِیْمٌ
وَقَوْلُ الْجَهْلِ مِیْثٌ وَهُوَ نَاسٌ عَلٰی الشَّرِّ ☆ یَظُنُّ مِنَ الْاَحْیَآءِ وَهُوَ غَدِیْمٌ

اس کتاب کی پہلی اشاعت کے پیش نامہ میں، میں نے لکھا تھا کہ شیخ الحدیث حضرت
علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے سبق آموز سوانح حیات پر قلم اٹھانا، میرے علم اور تجربے کی
محدودیت اور موضوع کی وسعت و فحاشیت کے لحاظ سے ایک جسارت ہی تصور ہوگی، لیکن کیا
کیا جائے بقول حضرت ترجمان الحقائق ع

”کچھ کام نہیں بنتا بے جرات و ندانہ“

خداوند کریم کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ اہل علم و بصیرت بالخصوص حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کمالات کے وارثوں اور آپ کی عبقریت کے قدر شناسوں نے اس جرأت و ندانہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کتاب کا پہلا ایڈیشن چند ماہ کے اندر اندر ختم ہو گیا اور اب شائقین کے اصرار سے میں دوسری مرتبہ طباعت کے مراحل طے کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ الْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

ایک ضخیم کتاب جو ایک دینی پیشوا اور عالم کے مخصوص حالات پر مشتمل ہے اس کو سمجھنے اور اس سے کما حقہ استفادہ کرنے کی اہلیت رکھنے والوں کی تعداد و رفتار زمانہ کی وجہ سے روز بروز محدود سے محدود تر ہوتی جا رہی ہے لیکن اس کے باوجود ”الانور“ کو جدید و قدیم ہر قسم کے اہل علم کے ہاں قبولیت کی جو سند حاصل ہوئی ہے یہ محض اللہ تبارک و تعالیٰ کا فضل و کرم ہے جس کے لئے مجھے عمر بھر بارگاہ ایزدی میں شکر گزار رہنا چاہئے۔

”الانور“ کے پہلے ایڈیشن کا ملاحظہ کرنے کے بعد آسمانِ علم و فضل کے جن روشن ستاروں نے میری کوششوں کی تحسین کی اور میری ”بضاعت مزاجہ“ کو سلی مشکور کا رتبہ عطا کیا ان سب کے نام یہاں درج کرنا مشکل ہیں تاہم ان میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی (ناظم اعلیٰ ندوۃ المصطفین دہلی) حضرت مولانا منظور نعمانی (مدیر ”الفرقان“ لکھنؤ) حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی (سابق صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) صاحب انوار الباری حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوری اور حضرت اقدس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں۔ میں ان کا فردا فردا ممنون احسان ہوں۔ جَزَّاهُمُ اللّٰہُ خَیْرَ الْجَزَاءِ۔

ریاست جموں و کشمیر کے اہل علم اور ارباب فکر و نظر میں جن حضرات نے ”الانور“ کی پذیرائی میں دل کھول کر میری ہمت بڑھائی، ان میں مندرجہ ذیل اصحاب خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

جناب شیخ محمد عبداللہ (وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر) حضرت مولانا محمد سعید مسعودی، جناب سید میر قاسم (ایم پی)، مولانا محمد فاروق (امیر واعظ کشمیر)، پروفیسر غلام رسول بچہ (چئیرمین مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ، سوپور)، جناب غلام احمد (سیکرٹری وزیر اعلیٰ) جناب محمد یوسف ٹینگ (سیکرٹری جموں و کشمیر کالج اکادمی)، جناب غلام علی بخش (ناظم اطلاعات جموں

دکشمیر) پروفیسر غلام محی الدین حاجی، جناب جی۔ ایم میر (ڈپٹی ڈائریکٹر ایجوکیشن کشمیر) جناب ایم ایم کاظم (ڈپٹی ڈائریکٹر ایجوکیشن ایڈمنسٹریشن)۔

میں ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور صدق دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اجر جزیل سے نوازے۔

عربی مقولہ ہے کہ ”مَنْ صَنَّفَ فَقَدْ اسْتَهْدَفَ“ مصنفین کے دُمرے میں شامل ہونا جرح و قدح اور تنقید کے تیروں کے سامنے سینہ بٹان کر کھڑے رہنا ہے۔ ”الانوار“ مرتب کرنے والا اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ امر موجب مسرت ہے کہ اکثر و بیشتر ناقدین نے موافقانہ اور مؤیدانہ تبصرے لکھے اور ان تبصرہ نگاروں میں بڑی صاحب علم و فضل ہستیاں ہیں۔۔۔ اخبارات اور رسائل نے بھی ”الانوار“ کے اپنے موضوع پر جامع ترین ہونے کا اعتراف پوری فراخ دلی سے کیا ہے۔ اس دُمرے میں کشمیر کے قریباً تمام جرائد کے نام اور بیرون ریاست کے موقر جرائد میں سے ماہنامہ ”معارف“، ”اعظم گڑھ“، ماہنامہ ”نورِ ہان“، ”دہلی اور دارالعلوم دیوبند“ کا عربی ترجمان ”الداعی“ وغیرہ شامل ہیں، فرد افراد بھی درجنوں قارئین نے ”الانوار“ کے مطالعہ کے بعد اپنے تاثرات پریس میں شائع کرائے۔

کچھ مدت تک ”الانوار میری نظر میں“ کے مستقل عنوان کے تحت کشمیر کے پریس میں مختلف قارئین کے تبصرے چھپتے رہے جن میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی سب لکھنے والوں نے ”الانوار“ کی خوبیاں بیان کی ہیں اور مصنف کی مساعی کو خراج تحسین ادا کیا ہے، کتاب شائع کرنے کے وقت ایسا ہوا کہ صفحات کی تعداد جب بہت زیادہ ہو گئی تو بہت سے مقالات اور دیگر جمع شدہ مواد کے لئے گنجائش نہ نکل سکی، کتاب شائع ہو جانے کے بعد مزید تاریخی معلومات فراہم ہو گئے جو کتاب کے مختلف ابواب میں جگہ حاصل کرنے کے مستحق ہیں یہ دیکھ کر ارادہ ہوا کہ کتاب کی ایک اور جلد مرتب کی جائے جس میں یہ بقایات سمیٹ لئے جائیں لیکن اخراجات کا سوال ایک لا جواب سوال ہے، جو ہر ارادے کے راستے میں اپنی دیوار بن کر حائل ہو جاتا ہے اسی دوران میں اشاعتِ اول کا ذخیرہ ختم ہو گیا اور دوسری اشاعت کی نوبت آ گئی تو مزید حاصل شدہ معلومات کو شامل کتاب کر دینے کا لہجہ موقعہ نکل آیا تھا لیکن اس سے پورا استفادہ نہ کیا جاسکا۔ کیونکہ دوسری اشاعت کے لئے تقاضے شدید ہیں اور وقت کی تنگی از سر نو مسودہ تیار کرنے اور نئے سرے سے کتابت وغیرہ کے مراحل سے گزرنے کی محتمل نہیں

ہو سکتی اور اس لئے اس اشاعت میں ترمیمات و اضافات بہت خفیف ہیں، نہایت معمولی ترمیمات اور تصحیحات کے ساتھ یہ دوسری اشاعت قارئین کی خدمت میں پیش کر کے قسم بہ قسم مزید معلومات کے ساتھ کتاب کا تیسرا ایڈیشن ان شاء اللہ عن قریب ہدیہ ناظرین ہوگا۔

وجہ تالیف:

ابتداء اس جہالت کا محرک حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اور دیگر علماء و عرفائے زمانہ حال کی زندگیوں کا سرسری سا مطالعہ ہوا۔ کچھ مدت سے دینی اور تاریخی کتابوں سے استفادہ کر کے میں نے اپنے حاصل مطالعہ کو حسبہ اللہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کے فائدہ کے لئے انگریزی اور اردو میں چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں (مثلاً Divine Commandments Saying's of Prophet Mohammad (s.w.) احکامِ الہی، ارشاداتِ رسول ﷺ فرموداتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ملفوظاتِ حضرت پیر محمد وغیرہ) ہزاروں کی تعداد میں چھاپ کر تقسیم کرنے کا سلسلہ جاری کیا تھا حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے حالات سے اجمالاً باخبر ہونے کے بعد ارادہ ہوا کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ پر ایک رسالہ لکھ کر کشمیر کے ان لکھے پڑھے لوگوں کو بتاؤں کہ ان کے اسلاف جب علم کے سمندروں میں شناوری کرنے اترتے تھے تو تیرتے تیرتے کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتے تھے اسی اثناء میں اپنی مروجہ تعلیم سے فراغت کے بعد ”جامعہ دینیات دیوبند“ کے نصاب کی تکمیل کر کے ”فاضل دینیات“ کا امتحان پاس کیا اور دیوبند جا کر دارالعلوم اور اس کے اکابر کی تاریخ سے قریبی واقفیت حاصل کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا تعارف نامہ لکھنے کا ارادہ پختہ ہو گیا اور کشمیر واپس آ کر اپنے ایک جلیل القدر رفیق الحاج خواجہ عبد المجید صاحب لون (آئی، پی، ایس) نے اس سلسلے میں مجھے اپنے بھرپور تعاون کی پیش کش کی اور اپنی تمام تر شفقتوں سے نوازا۔

یوں تو اس مقصد کے لئے ایک چھوٹا سا کتابچہ یا ڈیڑھ سو دو سو صفحات کی ایک متوسط درجے کی کتاب مرتب کر دینا ہی کافی تھا اور ذہن میں کام کا پہلا خاکہ بھی کچھ ایسا ہی تھا لیکن جب کام شروع کیا تو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے علمی کمالات اور شخصی کوائف و ذاتی صفات و حسنات کا ایک بحر بے کنار آنکھوں کے سامنے موجزن ہو گیا۔ ہر چند اس ساگر کو گام میں سمیٹ لینے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے مگر اختصار کی تمام کوششوں کے باوجود کتاب کا حجم اُمیدوارادہ سے متجاوز ہوتا گیا، پھر بھی موضوع کے بے شمار گوشے گوشے تکمیل رہ گئے اور خدا تعالیٰ کو منظور ہوا تو تیسری

اشاعت میں کتاب کو نقشِ ثانی سے بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی ورنہ ہمارے بعد کسی اور کو خدا تعالیٰ توفیقِ ارزانی کرے گا کہ وہ تلافیِ مافات کر دے۔ کیا عجیب ہے کہ:

”مر دے از غیب بروں آید و کارے بلند“

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخِ وفات ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء ہے، تب سے آج چھالیسواں (۴۶) سال چل رہا ہے تقریباً نصف صدی کی اس طویل مدت میں وہ لوگ جو آپ کے ہم عصر تھے یا آپ کے براہِ راست فیض یافتہ تھے اور جن کے سینے آپ کے تفصیلی حالات کا خزینہ تھے (معدودے چند مستحیات کو چھوڑ کر) اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اس لئے آپ کے حالات کے خاص خاص پہلو جن پر سوانح نگار اپنی تخلیق کی بنیاد قائم کرتا ہے دسترس کی حدود سے باہر ہو چکے ہیں اور عام حالات کے مآخذ کا دائرہ بھی تنگ ہوتے ہوتے آج تک شائع شدہ تحریرات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور یہ تحریرات بھی آسانی سے ہاتھ آجانے والی جنس تو ہیں نہیں، ان کا سب سے بڑا حصہ وہ مضامین ہیں جو آپ کی وفات کے وقت سے ۴۶ سال کی اس طویل مدت میں غیر منقسم ہند میں اور بڑے صغیر کی تقسیم کے بعد ہندو پاکستان اور بنگلہ دیش میں آپ کے مذاہنین اور قد رشناس اہل علم کے قلم سے نکلتے رہے ہیں۔ ایسے مضامین عربی، فارسی، اردو، انگریزی، بنگالی، سندھی، گجراتی، پشتو اور بعض افریقی زبانوں میں بے حد و حساب شائع ہوئے ہیں اور اگر کوئی ان کا یا لاستیعاب مطالعہ کرنا چاہے تو اس کو حجاز، مصر، شام، ایران، افغانستان، افریقہ، ڈھاکہ، کلکتہ، پٹنہ، اعظم گڑھ، الہ آباد، لکھنؤ، علی گڑھ، مراد آباد، بجنور، احمد آباد، سورت، ڈابھیل، دہلی، دیوبند، سہانپور، لدھیانہ، لاہور، راولپنڈی، پشاور، ملتان، حیدر آباد اور کراچی وغیرہ شہروں سے لے کر جموں و سرینگر تک کی تمام لائبریریوں میں محفوظ ادبی اور علمی رسالوں کی ورق گردانی کے مرحلوں سے گزرنا اور ان تمام مضامین کا جائزہ لینا چاہئے جن کو اگر ترتیب دے کر کتابی شکل میں چھاپا جائے تو کئی ضخیم مجلدات تیار ہو جائیں لیکن ایسا کام تو کوئی اکادمی ہی انجام دے سکتی ہے۔ جو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے قائم کی جائے۔ مجھ جیسے فردِ واحد کے لئے بحالات موجودہ چاند اور مریخ پر جا اترنا شاید آسان ہو مگر یہ کام بہت مشکل ہے۔ ان صعب الحصول مآخذ کے بعد جو کچھ رسائی کی حدود میں ہے وہ ہے عربی زبان میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد و رشید مولانا سید یوسف ہوری رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف لطیف ”نفسۃ العنبر من ہذی الشیخ الانور“

مطبوعہ ۱۹۳۶ء اور اردو زبان میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے خلیف اکبر مولانا محمد ازہر شاہ قیصر کا مرتب کردہ مجموعہ مقالات بعنوان "حیاتِ انور" (مطبوعہ دیوبند ۱۹۵۵ء) یہ دوایسے شاہکار رہ جاتے ہیں جن کو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی جدید سوانح حیات کاملاً خذ بنایا جاسکتا ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں بھی اب نایاب ہو چکی ہیں، میرے لئے ان کا حصول بھی جوئے شیر کاٹ لینے سے کم نہ تھا البتہ دارالعلوم دیوبند کا آفیشل آرگن ماہنامہ "دارالعلوم" ایک مفید اور سہل الحصول اور معلوماتی مآخذ ہے جس میں دیگر بزرگانِ دیوبند کی طرح حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات پر بھی وقتاً فوقتاً مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، جس کے مکررات سے قطع نظر حیات و کمالاتِ انور یہ پر قابلِ قدر معلومات کا ذخیرہ ہاتھ آسکتا ہے۔

ہند میں علی العموم مضامین "دارالعلوم" سے ہی استفادہ کر کے بعض اہل قلم نے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی حیات اور کارناموں پر کچھ چیزیں شائع کی ہیں جو کہ میرے مطالعہ سے گزریں۔ لیکن یہ تحریریں یا تو اس قدر سرسری ہیں ان سے کوئی مدد مل ہی نہیں سکتی، یا طالعمانہ مشق ہیں، جن میں "دُرست" کے پہلو بہ پہلو "نا دُرست" بھی کھڑی ہیں۔ البتہ معلوم ہوا تھا کہ پاکستان میں مرحوم مولانا محمد انوری لائپوری نے "انوارِ انوری" کے نام سے حیاتِ انور پر مستقل کتاب لکھی ہے اور مصنف نَفْحَةُ الْعَنْبَرِ مولانا انوری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کو نظر ثانی کے بعد کچھ اضافے کر کے مرتب کیا ہے لیکن ان کتابوں تک رسائی آسانہ تھی میں نے "رسالہ دارالعلوم" اور نَفْحَةُ الْعَنْبَرِ (قدیم ایڈیشن) سے استفادہ کرنے کے علاوہ مولانا محمد ازہر شاہ صاحب قیصر کی مشفقانہ اجازت سے "حیاتِ انور" میں چھپے ہوئے متعدد ایسے مقالات جو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ارشد و انھن تلامذہ کرام کا ہدیہ عقیدت تھے۔ جو کتاب بنا لیے ہیں، حضرت موصوف کے علمی کمالات آپ کا فلسفہ تعلیم اور طریقہ تعلیم بقوتِ حفظ و استحضار ذہانت و فطانت اور عبقریت کی دیگر خصائص کا جو نقشہ ان مضامین کے طفیل پیش نظر ہو جاتا ہے اس تک کسی دوسرے ذریعہ سے رسائی ممکن نہ تھی۔ مگر ان سرچشموں سے اپنے موضوع کے گلشن کی آبیاری کرنے کے بعد بھی سوانحاتِ انور کے بہت سے گوشے پردہِ خفا میں رہ جاتے ہیں اور آپ کی زندگی کے بعض اہم واقعات کے متعلق مطالعہ کنندہ کے بہت سے سوالات کا جواب متذکرہ بالا مآخذ سے حاصل نہ ہو سکتا تھا، اس غلاء کو بھرنے کے لئے مجھے ہندوستان کے بہتیرے شہروں کا سفر کرنا پڑا۔ متعدد کتب خانوں

میں جا کر سینکڑوں کتابوں، رسائل و جرائد اور مخطوطات کی ورق گردانی کرنی پڑی۔ کشمیر کی گذشتہ پانچ سو سال کے تاریخی واقعات کی جھیلوں میں غوطے لگانے پڑے، بالخصوص حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت شیخ بابا مسعود ندوی رحمہ اللہ کے حالات کا گہر مطالعہ کرنا پڑا اور اس کے علاوہ شاہ صاحب کے ہم وطنوں اور ہم قبیلہ لوگوں کے معلومات سے بھی گھر گھر جا کر مدد لی گئی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ بہت کچھ کنج کاوی اور خاک چھاننے کے بعد اکثر حل طلب سوالات کے شافی و کافی جوابات حاصل ہو گئے جس کے بعد جو کچھ لکھا گیا اعلیٰ وجہ البصیرت لکھا گیا۔ اپنی بساط کی حد تک کوشش کی گئی ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کی موجودہ پیڑھی اور نئی نسل حضرت شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیری کی ذات بابرکات سے متعارف ہو جائے تاکہ آپ کی پاکیزہ سیرت کو اپنے لئے نمونہ گردار بنا سکے۔ کیونکہ یہی امر اس کتاب کی تحریر کا مقصد اولین ہے۔

مالکِ ارض و سماوات سے دعا ہے کہ وہ میرے ارادے اور کوشش کو قبول فرمائے اور میری اس ٹوٹی پھوٹی تحریر کو پڑھنے والوں کے لئے حصول فیض و برکت کا موجب بنائے۔
(آمین)

عبدالرحمن کوندو

تحریر یکم مارچ ۱۹۷۷ء

کوکر باغ، نوشہرہ، سرینگر نمبر ۱۱ کشمیر

پیش نامہ طبع ثالث

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُ اللّٰهَ الْعَلِیَّ الْعَظِیْمَ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ

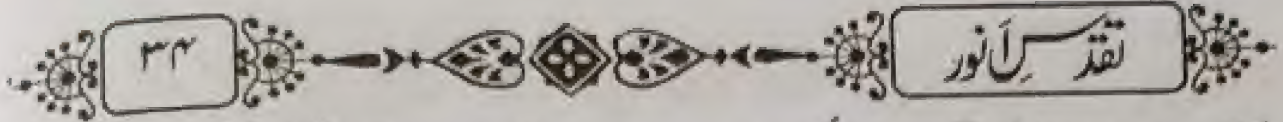
الانٹرنیشنل کاتیسرا ایڈیشن ہے سوا دو سال کے مختصر عرصے میں ایک ضخیم کتاب کے تین ایڈیشن نکل جانا اور وہ بھی کاغذ، کتابت اور طباعت کی حوصلہ شکن مشکلات کو عبور کر کے، یہ مجھے ایسے بے ہمت انسان کا کوئی کمال نہیں بلکہ محض فضل ربی ہے۔

من آں خاتم کہ ایر نو بہاری ☆ زلفش کرد بر من قطره باری
اگر بروید از تن صد زبانم ☆ چو سون شکر نعت کے تو انم؟

۱۹۷۵ء میں الانٹرنیشنل کو جب دوسری بار شائع کیا گیا تو میرا ارادہ تھا کہ کتاب کو نئے سرے سے مرتب کر کے اس کا تیسرا ایڈیشن جو خوب سے خوب تر شکل میں ہو، منظر عام پر لایا جائے لیکن اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری ہے کہ اصل کتاب میں حذف و اضافات کی ”نہم“ سرانجام دی جائے۔ ایک نئی کتاب لکھنے سے یہ کام زیادہ مشکل ہے۔ اس کے لئے جس یکسوئی اور فرصت کی ضرورت ہے افسوس ہے ابھی وہ میسر نہیں ہوئی۔ ان حالات میں الانٹرنیشنل پھر ایک بار اوّلین شکل و صورت میں ہی چھپ رہی ہے۔

مطلوبہ ترمیم شدہ ایڈیشن کی تیاری میں تاخیر تو ہو رہی ہے لیکن اس تاخیر سے ان شاء اللہ یہ فائدہ ہوگا کہ میں اب اطمینان سے ان کتابوں سے بھی استفادہ کر سکوں گا جو ابھی تک ملک کے اندر اور باہر شاہ صاحب رحمہ اللہ پر زیر ترتیب ہیں۔

اس کے علاوہ بزرگ صغیر سے باہر شاہ صاحب رحمہ اللہ کی زندگی اور آپ کے کارناموں پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ اب امریکہ کی ایک بین الاقوامی یونیورسٹی سین ڈیو کیٹھورنیا میں بھی شاہ صاحب رحمہ اللہ پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ ایک پاکستانی فاضل ڈاکٹر انور ایس دل صاحب وہاں (۴) چار بزرگ ہستیوں (۱) مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ۔ (۲) مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ۔ (۳) مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ اور (۴) مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ کی حیات اور علمی کمالات پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ انگریزی زبان میں



یہ کتاب ان شاء اللہ عن قریب شائع ہو رہی ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ الائنور کا جو نیا ایڈیشن زیر ترتیب ہے ان شاء اللہ ہمہ وجوہ جامع ہوگا۔

الائنور چھپنے سے آج تک بیسیوں اہل علم اور صاحبان کمال نے اپنی تقاریظ عنایت فرمائی ہیں، ان سب کرم فرماؤں کا دل عمیق ترین گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ موقع ملنے پر ان سب تقریظات کو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا۔ فی الحال ان میں سے چند تبصرے بزرگ شامل اشاعت کئے جاتے ہیں۔

طالب دُعا

عبد الرحمن کوندو

سری نگر

یکم اپریل ۱۹۷۹ء

تصویر آئینہ

از محمد ضیاء الرحمن ضیاء

- (۱) گلستانِ وادیِ لولاب کا تازہ گلاب
- چہرہٴ انور تھا شرحِ آئینہٴ نور و کتاب
- (۲) تھا چینِ پاک پہ سیمائے من اُسر السُّجود
- دیکھ کر حلقہٴ بگوشِ دیں ہوئے اہلِ سجود
- (۳) سبکِ قرنِ اولین کا گم شدہ دُرِ فرید
- جانِ محمود الحسن "نورِ دل احمد رشید
- (۴) قالبِ روحِ بخاری ہمسرا بنی الحجر
- جاشینِ بوضیفہٴ رشکِ یعقوب و زفر
- (۵) چلتا پھرتا وہ کتب خانہ تھا مثلِ زیلعی
- نکتہٴ دانِ فقہ و میراذکیاء و ترندی
- (۶) تھا لبید و سعدی "پُرگو نظیرِ بنو اس
- خوش اداء و خوش مزاج و باجمال و خوش لباس
- (۷) بوعلی وقتِ فخرالدینِ رازی "زماں
- شہِ ولی اللہ دوران و غزالی زماں
- (۸) فلسفی و آشنائے رمزِ قرآنِ مبین
- شارحِ علمِ حدیثِ پاک و نکتہٴ آفریں
- (۹) دین کی حقانیت کا فحش و دُہاں رہا
- تھا فرشتہٴ اور گمانِ حضرتِ انساں رہا

① حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ میرے نزدیک حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا وجود اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل ہے۔

(۱۰) قول مرداں جان میدارد، کی جو تفسیر تھی

فرق باطل کے آگے وہ زباں شمشیر تھی

(۱۱) بے نیاز خانہ و جاہ و جلال و سیم و زر

مکھو تھا درس و بیان و وعظ میں شام و صبح

(۱۲) تھا دل شیشہ میں انوار جمال کبریا

اشرف و اکذرع سراپا دانش و علم و حیا

(۱۳) علم کے چرخ چہارم پر ضیا افشاں رہا

ہر ستارہ گاسپ انوار بے پایاں رہا

(۱۴) نفع العنبر مکمل داستاں ہے آپ کی

فیض باری بارگاہ جوداں ہے آپ کی

(۱۵) آپ ہی کی ذات تو صد نازش کشمیر ہے

فخر کے قابل ازل سے آپ کی تقدیر ہے

(۱۶) اے خوشا دیو بند جلوہ زار حسن عالماں

مکہ ہندی، زیارت گاہ اربابِ دلاں

(۱۷) ہوئے علم آسمانی، تجھ سے آئی تھی کبھی

مجھ: مسجد میں شانِ درباری تھی کبھی

(۱۸) آج بھی دارالعلوم پر شکوہ سینہ پہ ہے

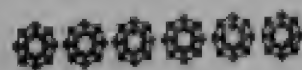
بارشِ انوار و رحمت جس کے ہر زینہ پہ ہے

(۱۹) تیرے دامن میں گلاب و لالہ چیدہ چیدہ ہیں

قاسم و محمود و انوریاں پہ آرامیدہ ہیں

مرکز نور الہ و دارثانِ مصطفیٰ ﷺ

گویا ظلمتِ جاہ میں خورشیدِ انور کی ضیا



حضرت شاہ صاحب کی عبقریت

آئینہ آراءِ اکابرین

☆..... ”خداوند تعالیٰ نے مولانا انور شاہ میں علم، عمل، سیرت، صورت، ورع، زہد، رائے صاحب اور ذہن ثاقب کو جمع کر دیا ہے۔“
(حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن)

☆..... مَا رَأَيْتَ مِثْلَ هَذَا الْأَسْتَاذِ الْجَلِيلِ ۝

(علامہ سید رشید رضا مصری، پر ”المنار“ قاہرہ)

☆..... ایک عیسائی فلسفی نے اسلام کی حقانیت کی یہ دلیل دی ہے کہ غزالی جیسا محقق اور مفکر مذہب اسلام کی صداقت کا علمبردار تھا۔ اس زمانہ میں میرے نزدیک اسلام کی حقانیت کی بہت سی دلیلوں میں سے ایک دلیل حضرت مولانا محمد انور شاہ کا محافظ اسلام ہونا ہے۔ اگر اسلام میں کوئی کمی یا کمی ہوتی تو (زمانہ حاضریہ کی ذہین ترین شخصیت) مولانا انور شاہ دین اسلام سے کنارہ کش ہو جاتے۔“

(حکیم الامت مجددِ ملت مولانا اشرف علی تھانوی)

☆..... ”اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرتے سے عاجز ہیں۔“

(ترجمان الحقائق علامہ اقبال)

☆..... مولانا محمد انور شاہ مرحوم وسعتِ نظر، قوتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے۔ علومِ حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علومِ ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے اللہ تعالیٰ انہیں اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے، کہ مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قَالَ اللَّهُ وَقَالَ الرَّسُولُ كَانِعْرَهُ بِلَنْدُ كَمَا۔“

(وکیل اسلام علامہ سید سلیمان ندوی)

☆..... حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی وفات بلاشبہ وقتِ حاضر کے کامل ترین عالم ربانی کی وفات ہے جن کی نظیر مستقبل (قریب) میں متوقع نہیں۔ طہقہ علماء میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا تبحر، کمال فضل، ورع و تقویٰ، جامعیت و استغناء مسلم تھا۔ موافق ہو یا مخالف ان کے سامنے تسلیم و انقیاد سے گزرنے کا دینا تھا۔

(مفتی اعظم ہند علامہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی)

☆..... ”مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ شیخ تقی الدین بن دینق العید اور سلطان العلماء حضرت شیخ عزالدین عبدالسلام کو دیکھا ہے تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا کہ ”ہاں! دیکھا ہے“

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی

☆..... ”بے نظیر عالم دین رخصت ہو گیا۔“

فاتح قادیان امام المناظرین شیخ الاسلام مولانا مفتی احمد امجد ترمذی

☆..... مولانا محمد انور شاہ صاحب رحمن ولی اللہی کے ایک بار آور اور شرم دار درخت تھے۔ جو اپنے گنجان سایہ سے تمام عالم کو مستفید کر رہے تھے اور جس درخت کے شیریں پھلوں سے ایک عالم اپنی گرسنگی کو دور کر رہا تھا۔ حضرت شاہ صاحب ایک فیض جاری کے ایسے سردار و شیریں چشمہ تھے جس کے پانی کا بہاؤ نہ صرف ہندوستان تک محدود تھا بلکہ تمام عالم اسلامی اس چشمہ سے سیراب ہو رہا تھا۔ اس کا منبع اگر چہ دیوبند میں تھا لیکن اس کا دھارا چین، بخارا، جاوا، مصر اور ترکی میں پڑتا تھا۔

جہان الہند مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم

☆..... میں ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو ایک لاکھ حدیثیں یاد ہیں اور ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو صحیحین حفظ یاد ہیں لیکن ایسا عالم کہ کتب خانہ کا کتب خانہ ہی جس کے سینے میں محفوظ ہو سوائے حضرت مولانا انور شاہ کے کوئی نہیں دیکھا۔

”میں نے ہندوستان، حجاز، عراق، اور شام وغیرہ ممالک اسلامیہ کے علماء و فضلاء سے ملاقات کی اور مسائل علمیہ میں ان سے گفتگو کی۔

لیکن تبحر علمی، وسعتِ معلومات اور علومِ نقلیہ (یعنی قرآن کریم و حدیث رسول اکرمؐ) کے احاطہ میں شاہ صاحبؒ کا کوئی نظیر نہیں پایا۔
شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی

☆..... ”حضرت مولانا نور شاہ صاحبؒ کی نظیر علوم میں خصوصاً علمِ حدیث میں پیش کرنے سے تمام ایشیا عاجز ہے۔ جی چاہتا ہے کہ شاہ صاحب کے چہرے کو دیکھتا ہی رہوں۔“

بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان مرحوم
☆..... ”اس قسم پر کوئی کفارہ نہیں جو اس امر پر کھائی جائے کہ مولانا نور شاہ اس زمانے میں بے نظیر عالم ہیں۔“

امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی
☆..... ”صحابہ کا قافلہ جارہا تھا، یہ پیچھے رہ گئے تھے۔“

خطیب العصر رئیس الاحرار مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری
☆..... ”شاہ صاحبؒ سلف صالحین کا نمونہ ہیں اور علم کا ایک چلتا پھرتا کتب خانہ ہیں۔“

مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی
☆..... ”الشیخ الفاضل العلامة انور شاہ أحد كبار الفقهاء الحنفیہ و علماء الحديث الاجلاء“^①

ابن خلدان ہند حضرت مولانا سید عبدالحی مکنصوی
☆..... ”مجھے جب کبھی کسی مسئلہ میں کوئی دشواری پیش آتی تو کتب خانہ دارالعلوم کی طرف رجوع کرتا، اگر کوئی چیز مل جاتی تو فیما ورنہ پھر حضرت شاہ صاحبؒ سے رجوع کرتا، شاہ صاحبؒ جو جواب دیتے اُسے آخری اور تحقیقی پاتا اور اگر حضرت شاہ صاحبؒ نے کبھی یہ فرمایا کہ میں نے کتابوں میں یہ مسئلہ کہیں نہیں دیکھا تو مجھے یقین ہو جاتا کہ اب یہ مسئلہ کہیں نہیں ملے گا اور تحقیق کے بعد ایسا ہی ثابت ہوتا۔“

مولانا سید اصغر حسین دیوبندی

① نوبۃ الخواطر ج ۸ (خطوط وحدانی میں حضرت کے فرزند ارجمند مولانا علی میاں صاحب مدظلہ العالی کی عبارت ہے جیسا کہ انہوں نے خود تصریح فرمائی ہے) کو مدد

☆..... "اگر مجسم علم کسی کو دیکھنا ہو تو مولانا انور شاہ کو دیکھ لے"

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی

☆..... "میں نے شاہ صاحب کے علاوہ اس درجہ کا کوئی عالم نہیں دیکھا جو امام بخاری، حافظ ابن حجر، ابن تیمیہ، ابن حزم اور شوکانی وغیرہ کے نظریات پر تنقیدی نظر و محاکمہ کر سکتا ہو اور ان حضرات کی جالب قدر کا پورا لحاظ رکھ کر بحث و تحقیق کا حق ادا کر سکے۔"

علامہ محدث علی حنبلی مصری

☆..... "علامہ ابن الہمام (صاحب فتح القدیر متوفی ۸۶۱ھ) کے بعد انور شاہ صاحب کے پایہ کا کوئی دوسرا شخص پیدا نہیں ہوا جو متن احادیث سے نئے نئے مباحث و نکات کے استنباط و استخراج کی اہلیت رکھتا ہو اور یہ وقفہ (شاہ صاحب اور ابن ہمام کے درمیان) کوئی معمولی وقفہ نہیں ہے۔"

محدث مفسر علامہ زاہد بن الحسن الکوثری

☆..... سلطنت ترکی کے سابق شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری نے حضرت شاہ صاحب کی تصنیف "مرقاۃ الطارم" دیکھ کر فرمایا کہ "میں نہیں سمجھتا تھا کہ فلسفہ و کلام کے دقائق کا اس انداز سے سمجھنے والا اب بھی کوئی دنیا میں موجود ہے جتنا کچھ آج تک اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے اس رسالہ کو اس سب پر ترجیح دیتا ہوں اور اسفار اربعہ شیرازی کی ان چار مجلدات کبیرہ پر بھی۔"

شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری

☆..... "واقعی حضرت شاہ صاحب آیۃ من آیات اللہ تھے۔"

حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری

☆..... "چہ فصاحت چہ بلاغت چہ معانی چہ بیان
جلوہ فرماست در آغوش زبان نور"

مولانا غلام قادر گرامی مرحوم

☆..... علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ متاخرین میں جس پائے کے محدث گذرے ہیں وہ اونچے اہل علم سے مخفی نہیں حق یہ ہے کہ حدیث کے وسیع و دقیق فن کی مہارت کا جو مسلک الذہب قرون اولیٰ سے چلا

تھا موصوف اس کی آخری کڑی تھے اور آپ کے بعد پوری دنیا نے اسلام میں اس شان کے محدث اور حافظ حدیث کم از کم ہماری معلومات کی حد تک عنقا کے درجے میں ہیں حدیث کو سمجھنے والے، اس پر عمل کی سے کلام کرنے والے اور اس کے مطالب و مفاہیم کو دلنشین پیرائے میں بیان کرنے والے تو بفضلہ تعالیٰ اب بھی ہیں اور فنی نزاکتوں پر عبور رکھنے والے بھی مفقود نہیں، لیکن جلیل القدر حفاظ حدیث کی یہ مخصوص شان کہ صد ہا احادیث لفظ بہ لفظ حافظے میں محفوظ ہو اور بروقت ان کا استحضار بھی ہو، علامہ انور شاہ صاحب کے بعد کہیں نظر نہیں آتی۔“

مشہور نقاد مولانا غلام عثمانی مرحوم

☆ ”میں حضرت شاہ صاحب کے یگانہ کمالات اور ان کے تبحر علمی، محیر العقول حافظہ اور فن حدیث میں ان کے علو مرتبہ، نیز ان کی حیرت انگیز وسعت نظر سے نہ صرف واقف بلکہ اس کا معتقد ہوں لیکن مجھے ان سے تلمذ کا شرف حاصل نہیں، میری واقفیت بالواسطہ اور ان کے تلامذہ کے ذریعہ سے ہے۔“

فخر ملت اسلامیہ مولانا سید ابوالحسن ندوی دامت برکاتہم

☆ ”حنفیوں میں علامہ انور شاہ کاشمیری علم و فضل خصوصاً علم حدیث میں اپنی نظیر بس آپ ہی تھے۔“

مفسر قرآن مولانا عبد الماجد دریا بادی

☆ ”قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی (بانی دارالعلوم) اپنے عہد میں جس طرح اپنے وہی علوم و افکار کے لئے ممتاز تھے، کہ امامت عصر ان کے حصہ میں آئی تھی، ٹھیک اسی طرح شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کاشمیری اپنے کسی علوم و افکار کی وجہ سے امام العصر ہو کر رہے میرا یقین ہے کہ ماحول اور عمر نے اگر وفا کی ہوتی تو وہ اس صدی کے مجدد ہوتے، اپنی علمی جامعیت اور تبحر کی وجہ سے وہ بجا طور پر عبقری (Genius) اور نابغہ عصر تھے۔“

مولانا شمس تبریز خان آرومی مدظلہ العالی

☆ ”لَمَّا رَأَيْتُ وَجْهَهُ عَرَفْتُ أَنَّهُ عَالِمٌ مُتَوَرِّعٌ مُتَشَبِّعٌ جَامِعٌ“

لَعْلُومِ الْأَلِيَّةِ وَالْإِلَهِيَّةِ

(افسوس کہ ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ بروز جمعہ المبارک (مطابق ۱۶ مارچ ۱۹۷۹ء) کو آپ ۷۸ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے آپ کے تبلیغی کارنامے قریباً ۶۰ سال کی مدت پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے نوازے)

فخر الواعظین میر واعظ الہدیث مولانا غلام نبی مبارکی کشمیری

☆..... "ہر چند مرحوم ہر فن میں مہارت تامہ رکھتے تھے لیکن حدیث اور فقہ

میں بلاشبہ تمام دنیا کے اسلام میں کوئی شخص ان کا ہمسر نہ تھا۔"

(شارح کلام اقبال) پروفیسر یوسف سلیم چشتی

☆..... Among The Ulma of kashmir origin, The Name of the late Shak-ul-hadith Maulavi Muhammad Anwar Shah of the Lolab Valley is worth Mentoning, On Account of His Eminence in Muslim theology.

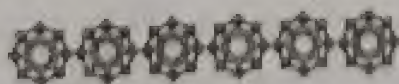
With him Died, Perhaps, The Greatest Scholar of Hadith of The Day."

Ghulm Mohi-ul-Din Sufi (M A D litt)

Kashir vol 2nd Page 383 (1974)

ترجمہ: کشمیری علماء میں سے وادی لولاب کے (رہنے والے) شیخ الہدیث مولانا محمد انور شاہ مرحوم کا نام نامی علوم اسلامیہ میں ان کے علو مرتبہ کے لحاظ سے قابل ذکر ہے ان کی رحلت زمانہ حاضرہ کے عظیم ترین محدث کی وفات ہے۔"

(ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی، مصنف کشمیر)



① — ترجمہ: "جو بھی میری نظر پہلی بار ان کے چہرے مبارک پر پڑی، میرے دل پر یہی عکس پڑا کہ یہ ایک پرہیزگار، پابند شریعت اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے جامع عالم ہیں۔" کوندو

تاریخ کشمیر کا دورِ ظلمت

(از کوندو)

حضرت شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیری شہ دیوبندی کی حیات مجموعہ کمالات کی حکایت شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کے اس دورِ ظلمت کی تھوڑی سی نقاب کشائی کر دی جائے۔ جو آپ کے زمانہ پیدائش اور اس سے قبل اور متصل مابعد وادی کشمیر پر مسلط تھا۔

جنت پر جہنم کا تسلط حضرت محدث کشمیری انور شاہ صاحب انیسویں صدی عیسوی کی چوتھی چوتھائی کی ابتداء یعنی ۱۲۹۲ھ بمطابق ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ اس انیسویں صدی کا قریباً سارا زمانہ کشمیری عوام کے لئے ظلم و تشدد و دوہا اور بدترین سیاسی انقلابات کے بے پناہ طوفانوں سے گزرنے کا زمانہ تھا۔ جب یہ صدی شروع ہوئی تو وادی کشمیر کا بل کے زیرِ نگین تھی اور اس خطہ جنت نظیری بے بس مخلوق کی تقدیر کے فیصلے سرینگر کے بدلے کا بل اور قندھار میں کئے جاتے تھے اور وہاں سے جو حاکم آتے تھے ان کے نام تو بے اشک مسلمانوں کے سے تھے اور وہ کلمہ گو ہونے کے مدعی بھی تھے، مگر وہ کشمیر میں آتے ہی اپنے عمل سے چنگیز اور ہلاکو کی بے رحمی، درندگی اور انسان کشی کے مکمل نمائندے بن جانا لازمہ حکمرانی تصور کرتے تھے۔ ظلم کو پائیداری نصیب نہیں۔ یہ کابلی حکمران بھی جب ایک طرف اپنے پیشہ ستمگری کے صدقے میں عوام کی تائید سے محروم ہوتے گئے اور دوسری طرف اپنے مراکز کا بل اور قندھار اور ہرات میں تاج و تخت کے لئے سازشوں اور برادر کشی کی وجہ سے آپ اپنے ہاتھوں میں تیغ کئی کرتے گئے، تو پہلے لاہور میں اس کے بعد کشمیر اور بالآخر پشاور میں بھی ان کے قدم اکھڑ گئے اور انہوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اسکے جانشینوں کی تازہ دم، ابھرتی ہوئی طاقت کو پنجاب، کشمیر اور صوبہ سرحد سوئپ کر اپنا دامن کوہ سلیمان کے اس پار سمیٹ لیا۔

طوفانِ تعصبات خطہ کشمیر جنت نظیر پر سکھوں کا تسلط ۱۸۱۹ء میں ہوا۔ جو ۱۸۴۶ء یعنی خالصہ راہ کے خاتمہ تک جاری رہا۔ اہل کشمیر کے لئے افغانوں کا جانا اور سکھوں کا آنا ایک ظالم کے پیچھے سے نکل کر دوسرے ظلم کے چنگل میں گرفتار ہو جانے کے مترادف تھا۔ جان و مال تو پہلے کے ہاتھ سے بھی محفوظ نہ تھے، مگر نیا ظالم چونکہ کشمیریوں کے دین اور مذہب پر بھی میز بھی نظر رکھتا تھا اس لئے اس کے ہاتھ سے درسگاہیں، عبادت گاہیں اور زیارات و مساجد بھی نہ بچ سکیں۔

لاہور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اگرچہ اپنی بے تعصبی کے نقارے بجوا رہا تھا لیکن کشمیر میں اس کے

کارندوں نے مذہبی تعصب کا جو ننگا ناچ ناچا، اس کا ادنیٰ سامنہ یہ ہے کہ کشمیر پر قابض ہوتے ہی جامع مسجد سرینگر میں پہلے گھوڑے باندھے گئے اذان، نماز درس و تدریس اور مسجد کی تعمیر و ترقی کے ہر کام کو ناممکن بنا ڈالا۔ اور جو چھوٹی مسجدیں شہر و قصبہ میں درہندی سے بچ گئیں ان میں اذان دینے کی ممانعت ہو گئی اور بار بار بے چارے مؤذن اس خطا پر گرفتاری اور مار پیٹ کا نشانہ بنے کسی "سردار صاحب" کے کان میں صدائے "اللہ اکبر" مل چل کا موجب بن گئی تھی۔ لا قانونیت اور دہشتگری کے اس دور میں کشمیر کے اکثر دینی مدارس اور ہر قسم کی تعلیم کے دوسرے ادارے جو صدیوں سے چلے آ رہے تھے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے اور کشمیر کے لوگوں میں افغانی ظلم کے خاتمہ تک بھی اگر زندگی کی کوئی رقم بچ گئی تھی تو سکھ حکومت کے اہل کاروں نے اس کو پکھل ڈالنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر ڈالی اور وادی کشمیر کی پوری آبادی خاص کر مسلمان آبادی کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ مظلومیت، محکومیت اور زندگی کے ہر اختیار سے محرومیت کو اپنی قسمت ازلی یقین کر کے اپنے قول و فعل سے ہی نہیں بلکہ اپنے تصور اور خیال سے بھی اس کی مخالفت نہ کرے۔

ڈوگرہ دور کی پیدائش:..... ۱۸۴۶ء میں جب رنجیت سنگھ کے جانشینوں کی خانہ جنگیوں نے بھائیوں کے ہاتھوں بھائیوں کا گلا کاٹ کر انگریزی امپیریل ازم کو دلی سے درہ خیبر تک اور ماتان سے سرینگر تک سارا شمالی ہندوستان سوپ دیا، تو انگریزوں نے سکھ حکومت کے ہی ایک سابق رکن اعلیٰ راجہ گلاب سنگھ کو پچتر لاکھ روپے میں پوری ریاست جموں و کشمیر فروخت کر ڈالی۔

چوراسی ہزار چار سو اکتھ (۸۴۴۷۱) مربع میل کا رقبہ اونچے اونچے پہاڑ، سینکڑوں ندیاں، نالے اور دریا، ہزار ہا چشمے، مرغزار اور گلزار، سیبوں، ناشپاتیوں، انگوروں، اخروٹوں، باداموں، شفتالوں، زردالوں، گلاسوں آلوچوں اور دیگر درجنوں اقسام کے میوؤں سے بھرپور باغات، شالی اور دیگر اقسام کی غلہ کے سونا اگلنے والے کھیت اور سب سے بڑھ کر لاکھوں زن و مرد اور ان کے بچے ان کے مال و مویشی گھر بار دیہات و شہر مکان و دکان، اور بازار غرضیکہ جوداشت و نداشت تھی انگریز امپیریل ازم نے اپنے ایک منظور نظر کے ہاتھ صرف پچتر لاکھ روپے میں بیچ ڈالی۔

مہاراجہ گلاب سنگھ صرف حکمرانی میں سکھوں کا جانشین نہ تھا بلکہ کشمیر پر تشدد و تعصب اور حکمرانی بشکل ستمرانی میں بھی دربار لاہور کا وارث تھا۔

افغانوں کی خوں ریزی اور سکھوں کی بے رحمانہ لوٹ کھسوٹ کے بعد ڈوگرہ راج میں خاص کر ان کے ابتدائی دور میں کشمیر کے مسلم عوام کی قسمت میں سیاسی غلامی، بے بسی محکومیت اور مظلومیت کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔

قوے فروختند و چہ ارزاں فروختند:..... ۷۵ لاکھ روپیہ والے اس سودے پر قریباً ۷۵ سال کا زمانہ گزر جانے کے بعد ترجمان الحقائق حضرت اقبالؒ کے حساس دل سے یہ درد بھری اور پراثر صدا بلند ہوئی۔

باد صبا اگر بہ جینو ا گذر کنی
حرفے زما بہ مجلس اقوام بازگو
دہقان و کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قوے فروختند و چہ ارزاں فروختند

ہم اس مرحلے پر صرف انیسویں صدی کے واقعات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ شاعر مشرق اقبال مرحوم کا یہ جائگاہ نالہ جو بیسویں صدی کی چیز ہے اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ جیسا کہ ہم نے سطور گذشتہ میں عرض کیا کہ حضرت شاہ صاحب کی پیدائش کا سال اس انیسویں صدی کا چکچکھرواں سال (۱۸۷۵ء) اور یہ دوسرے ڈوگرہ حکمران مہاراجہ زنبیر سنگھ کا دور ہے۔ (مہاراجہ زنبیر سنگھ نے ۱۸۷۵ء سے ۱۸۸۵ء تک جموں و کشمیر پر حکومت کی) اس مہاراجہ کی حکومت کا اٹھارہواں سال تھا جب حضرت شاہ صاحبؒ پیدا ہوئے اور جب مہاراجہ مراٹو اس وقت حضرت شاہ صاحبؒ کی عمر دس سال کے لگ بھگ تھی۔

شاہ صاحبؒ کے ہوش سنبھالنے اور تعلیم کے مختلف مراحل طے کرنے کا زمانہ زنبیر سنگھ کے آخری دور اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے ابتدائی دور کے واقعات ہیں اور یہ سب واقعات ۱۹۰۰ء کے خاتمہ سے ماقبل کے ہیں۔

کوئی دیرانی سی ویرانی ہے:..... تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ڈوگرہ راج کے پہلے پچپن سال یعنی ۱۸۴۶ء سے ۱۹۰۰ء تک نصف صدی سے زائد مدت کا دور کشمیری عوام کے حق میں عذاب شدید کا دور تھا۔ اس دور میں حکومت کے ظلم و تشدد کے علاوہ حسب ذیل واقعات بھی وادی کشمیر کے لوگوں کی تباہ حالی ترک وطن اور خانہ خرابی کا موجب بنتے رہے۔ ان واقعات سے تاریخ کے صفحات پُر ہیں، یہاں پر چند حادثات کی طرف اشارہ کافی ہوگا۔

ہر طرف آگ ہی آگ:..... مہاراجہ زنبیر سنگھ کے عہد حکومت میں کثرت سے بستیوں کے نذر آتش ہو جانے کے حادثات سے شہر سرینگر کا بیشتر حصہ بار بار تباہ ہو گیا، محلے اور بازار جلے اور راکھ کے ڈھیر بن گئے۔ مؤرخ حسن اپنی مشہور تاریخ ”تاریخ حسن“ کے حصہ اول ۱۹۷۹ء پر لکھتا ہے کہ:

۱۸۵۷ء ۱۲۶ میں جب مہاراجہ سنگھ کی عسکرانی تھی، محلہ نیلکی پورہ سے آگ شروع ہوئی تو محلہ زیندار صاحب وغیرہ (آج کل کے پورے وارڈ نمبر ۳) کے محلوں کو خاکستر میں تبدیل کر گئی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانہ میں آتشزدگی کے واقعات شہر و دیہات میں اس کثرت سے ہونے لگے کہ توہم زدہ لوگ اس کو پراسرار حوادث یقین کرنے لگے۔ خاصکر سال ۱۸۷۸ء ۱۲۹۵ کے دوران و قصبہات اور گاؤں میں آگ کی جو وارداتیں ہوئیں ان سے محلوں کے محلے ختم ہو گئے اور اپنے ساکنین کو زمانہ کے سازگار حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔

مورخ حسن جو زمانہ رنبیر سنگھ کا چشم دید گواہ ہے اور کسی حد تک مہاراجہ مذکور کا مداح بھی ہے۔ ۱۸۷۸ء کی آتشزدگیوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

در حکومت رنبیر در ۱۲۹۵ء در ملک کشمیر قحط واقع شدہ بود مدت شش ماہ بارش و باران موقوف شد۔ در شہر وہ ہزار ہا خانہ سوختہ شدند۔ پنج روزے بغیر آتش نہ بود۔ بتاریخ ۲۲ ماہ بہادون ۱۹۳۵ء از حبہ کدل آتش شعلہ در گشتہ تاسد قاضی زادہ (موجودہ محلہ ستھو بربر شاہ) یک ہزار خانہ در یک دو ساعت فروخت۔

لکڑی سے بنی ہوئی عمارتوں کو لگی ہوئی اور ہوا کی مدد سے محلے پر محلہ ختم کرتی ہوئی آگ پر قابو پانے کا اس زمانہ میں کوئی اونٹنی سا انتظام بھی نہ تھا۔ لوگوں کے گھر بار اور موروٹی داشت و نداشت منٹوں میں دیکھتے انگاروں اور اڑتی ہوئی راکھ میں تبدیل ہوتی جاتی تھی۔ اس طرح اجڑتے ہوئے عوام کو از سر نو آباد کرنا تو کجا ان کی کسی وقتی اور معمولی ہمدردی کو بھی حکومت اپنا فرض نہ سمجھتی تھی۔ یہ بد قسمت آبادیاں جہاں سینک سالی چلی جاتی تھیں اور اکثر حاکمان وقت مکمل بے پروائی سے ان کی تباہی و بربادی کا تماشا دیکھتے رہ جاتے تھے۔

مہاراج گنج بازار کیسے ایجاد ہوا؟..... مہاراجہ رنبیر سنگھ کی تخت نشینی سے پہلے بھی اس صدی کے دوران سولہ بار آگ کی وارداتوں سے سرینگر تباہ ہو گیا تھا۔ تازہ آتشزدگیوں سے شہر کے علاوہ علاقوں کے علاقے ختم ہو گئے۔ رنبیر سنگھ نے ایک بڑی پراثر زدگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شہر سرینگر کا وہ مرکزی بازار بھی ختم کر دیا جو جامع مسجد کے قریب واقع تھا اور جس کا نشیبی حصہ ملا عراقی ہنہ (موجودہ ملارٹھ) کے نام سے اور بالائی حصہ نوہنہ کے نام سے مشہور تھا۔

ملارٹھ اور نوہنہ کی تاریخی اہمیت:..... یہ کوئی معمولی بازار نہ تھا بلکہ ایک مرکزی منڈی تھی۔ جمعہ کے دن جامع مسجد کے چاروں طرف خراسانی رواج اور طرز کے مطابق "ہفت وار بازار" لگتا تھا۔

جہاں گاؤں سے آئے ہوئے لوگ اپنی دیہاتی پیداوار غلہ، گھی، شہد، سبزیاں، لکڑی اور گھاس وغیرہ فروخت کرتے تھے اور اس کے بدلے اپنی ہفتہ بھر کی ضروریات شہر سے لے جاتے تھے۔

ملارٹہ اور نوہشہ کا یہ بازار شہر سرینگر کا ایک تاریخی بازار تھا اور اس کی حیثیت لاہور کے انارکلی بازار اور دہلی کے چاندنی چوک کے بازار کی سی تھی۔ جس طرح شاہجہاں نے دہلی کو آباد کرنے کے وقت چاندنی چوک کی تعمیر کا ماسٹر پلان میں شامل رکھ کر خاص مقصد اور خاص نقشے کے مطابق تعمیر کرایا تھا۔ اسی طرح جب حضرت میر محمد ہدائی کی ہدایت کے مطابق سلطان زین العابدین بڈ شاہ کے والد بزرگوار سلطان سکندر شہمیری نے سن ۸۰۰ھ میں سرینگر کی جامع مسجد تعمیر کی تو اس مسجد کو مسلمانان وادی کشمیر کے لئے دینی اور علمی مرکز بن جانے کی وجہ سے اس کے ماحول کو ملک بھر کی تجارت کیلئے مرکزی منڈی بنادینے کی غرض سے یہ دونوں بازار سرکاری حکم سے تعمیر ہوئے اور بڑے بڑے تاجروں نے سرکاری احکام سے ہی یہاں اپنے کاروبار شروع کئے۔ اس بازار نے شہر کو دیہات سے اور دیہات کو شہر سے ایک ایسی وابستگی عطا کر دی تھی جو اپنی مثال آپ تھی اور پورے معاشرے کی زندگی پر اس ہفتہ وار بازار کا گہرا اثر تھا۔ بڑے بڑے مدرسے اور کتب خانے بھی اس کے آس پاس واقع تھے اور اس طرح جامع مسجد کا یہ ماحول ملکی ترقی تجارت اور پوری اسلامی تہذیب و تمدن کی آئینہ داری کرتا تھا۔

تجارت کشمیر پر حاسدانہ حملہ:..... ڈوگرہ حکومت چاہتی تھی کہ کشمیر کی تجارت پر پنجاب کے ان مہاجنوں کی قوم کا تصرف ہو جائے جنہوں نے کشمیر کی خریداری کے وقت مہاراجہ گلاب سنگھ کو لاکھوں روپیہ قرض دیا تھا۔ مگر اس ارادہ کو عملی شکل دینے کا کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ آج کل جہاں مہاراج گنج بازار ہے یہ علاقہ جب آتشزدگیوں کے صدقے میں خالی ہو گیا تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

پنجابی مہاجن حکماً ٹھونسے گئے: مہاراجہ ربیر سنگھ نے وہاں اپنے نام سے ایک منڈی اور بازار قائم کیا اور پنجاب سے بڑے بڑے مہاجن بیوپاری لا کر تھوک بیوپار کا کاروبار ان کے حوالہ کر دیا مگر اندیشہ تھا کہ سابق مقامی تاجروں کے مقابلے میں کہیں وہ ناکام نہ رہ جائیں۔ اس لئے ۱۲۸۸ھ میں سرکاری حکم اور اعلان کے ذریعہ نوہشہ، ملارٹہ اور جامع مسجد کے مضافات کے بازار بند کر دیئے گئے۔

الغرض چار سو اٹھاسی سال تک یہ بازار نہ صرف سرینگر بلکہ پوری وادی کشمیر کی مرکزی تجارت گاہ رہنے کے بعد ہمیشہ کیلئے ختم ہو گئے۔ آج ان کی حیثیت معمولی گزرگاہوں کی سی ہے۔ اور اب بھی یہ علاقے سرینگر کے سلم ایریا (SLUM AREA) میں شمار ہوتے ہیں۔ مہاراجہ ربیر سنگھ کو

صرف رنج پر مہاجنوں کا تسلط جمانے سے ہی تسلی نہ ہوئی۔ اس نے امیر اکدل پل کے دونوں طرف بھی پنجابی مہاجنوں کی دکانیں قائم کرائیں اور سرائے بالا کی پشت پر مہاراج بازار کے نام سے ایک اور نیا بازار قائم کر کے اپنے منظور نظر سودخواروں کو وہاں لاکر آباد کیا۔

قیامت خیز زلزلے: علامہ اقبال نے عالمگیر حادثات اور بنی نوع انسان کی عمومی مصائب بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

بجلیاں ہیں، زلزلے ہیں، قحط ہے، آلام ہیں

کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں

انیسویں صدی عیسوی کا کشمیر حضرت موصوف کے اس شعر کا پورا مرتع تھا۔ آتش ہائے ناگہانی کی خرمن سوزی اور قحط و آلام سے جو کچھ بچ جاتا تھا وہ مسلسل اور شدید زلزلوں کی نذر ہو کر رہ جاتا تھا۔ اس انیسویں صدی میں کشمیر میں چار بہت بڑے بھونچال آئے لیکن ان میں سے آخری دو (۱۸۶۳ء اور ۱۸۸۲ء اور ۱۹۰۲ء) زلزلوں سے کشمیر کی جاہلی انتہا کو پہنچ گئی۔ بے شمار مکان آنکھ جھپکنے میں زمین بوس ہو گئے۔ ناقص سرکاری اندازے کے مطابق ساڑھے تین ہزار انسان قمرہ اجل ہو گئے۔ جو لوگ بلبے کے نیچے سے دب کر مر جانے سے بچ گئے وہ خوف و ہراس کے مارے مدت تک اپنے مکانوں سے باہر دور میدانوں میں جا کر سوتے رہے۔ ۱۸۸۲ء کا زلزلہ جو ماہ شعبان میں ٹھیک شب برات کو آیا (اور جس کا مادہ تاریخ بھی ”زلزلہ شدید شب برات“ رہا) اس قدر تباہ کن تھا کہ کئی جاگیر زمین پھٹ گئی اور مکان اپنے مکیں کو لیکر ”فخسفنا بہ و بدارہ الارض“ کے مصداق بن گئے۔ جس علاقے پر زلزلہ کا زیادہ اثر پڑا تھا وہاں اس سے ہلاک ہونے والے انسانوں کی تعداد دس ہزار پانچ سو شمار میں آئی اور گائے بیل اور دیگر مویشی کا کوئی شمار نہیں ہو سکا۔

آبادیوں کا خاتمہ کر دینے والا قحط: ۱۸۷۷ء۔ ۱۸۷۸ء میں کشمیر میں قحط عظیم پڑا جس میں انسانوں نے انسانوں کا گوشت کھایا لوگ مردوں کو دفنانے کے بدلے ان کو اپنے حور شکم کے حوالے کر دیتے تھے۔ بے شمار لوگ موت کا شکار ہوئے اور اس طرح سے گاؤں کے گاؤں خالی ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ اس وقت وادی کی آبادی جو قحط سے پہلے آٹھ لاکھ تھی، کم ہو کر صرف دو لاکھ رہ گئی اور باقی چھ لاکھ یا تو ملک چھوڑ کر بھاگ گئے یا بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر گئے، اکثر ایسا ہوا کہ جن لوگوں نے کشمیر سے بھاگ کر آس پاس کے علاقوں ہزارہ سرحد اور پنجاب وغیرہ میں پناہ لینے کی کوشش کی، وہ منزل مقصود تک شاذ و نادر ہی پہنچ پائے۔ راستوں کے دائیں بائیں ان کی ہڈیوں کے

ذہر برسوں تک ان کے دردناک انجام کی یاد دلاتے تھے۔

مہلک وبا میں:..... قحطیوں کے ساتھ ساتھ وبائی امراض کا یہ حال تھا کہ انیسویں صدی میں دس بار کشمیر میں سخت کالرا پھوٹ پڑا، جس علاقہ میں وہاں پکنی وہاں چھ چھ مہینہ تک قدم بھا کر انسانی آبادی کا خاتمہ کرتی رہی۔

کارے کا نیکہ جیسے علاج تب تک کشمیر میں کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے اس وبا کا قدیم طب میں جو علاج تھا حکومت نے کبھی اس پر واہ نہ کی۔ سب سے زیادہ تباہ کن کالرا ۱۸۹۲ء کا بیان کیا جاتا ہے جس میں لگ بھگ بارہ ہزار افراد چند دنوں میں جاں بحق ہو گئے۔

سیلاب ہائے کشمیر: جس زمانہ کا حال بیان ہو رہا ہے، یہ دور سیلابوں کے لحاظ سے بھی دور تباہی تھا یوں تو کشمیر میں سیلاب اکثر آتے ہی رہتے ہیں لیکن ۱۸۹۲ء کے سیلاب کو مسوڑھین کشمیر نے اقلائے عظیم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس ریکارڈ توڑ سیلاب کی تباہ کاریاں کتنی زیادہ تھیں اس میں کمر توڑ مہنگائی اور ضروریات زندگی خصوصاً غذا کی نایابی سے لوگوں کی کیا حالت ہو گئی کتنے مکان گر گئے فصلوں اور مویشیوں کا کیا حال ہوا اور کتنی جانیں تلف ہوئیں یہ بجائے خود ایک المناک داستان ہے۔

سرلارنس کے تاثرات: ان مصائب و شدائد کا مارا ہوا کشمیر تھا جس کی دیہاتی زمینوں کا بندوبست کرنے جب سٹلمنٹ کمشنر مسٹر والٹر۔ آرلارنس آئے تو عوام کے خوں چکاں حالات اور ان کی حیوانوں سے بھی پست تر زندگی کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے۔ چنانچہ مسٹر لارنس نے اپنی مشہور کتاب دی ویلی آف کشمیر (مطبوعہ لندن ۱۸۹۵ء) میں اپنے تاثرات اس طرح بیان کئے ہیں۔

"When I first came to Kashmir in 1889" I found the people sullen, desperate and suspicious. They had been taught for many years that they were serfs without any right but with many disabilities. They were called "ZULM PARAST" or worshippers of tyranny and every facility was afforded to their cult. They were forced by Soldiers to plough and sow, and the same soldiers attended at harvest time. They were dragged away from their houses to carry loads to Gilgit, and every official had a right to their labour and their property.

When I commenced the work of inspecting Villagss in 1889, there was hardly a village where i did not see deserted houses and abandoned fields, the owners of

which had perished in the great famine of 1878".

Ref. Page 2 & 216

THE VALLEY OF KASHMIR by Walter R. Lawrence,
(London 1895)

مفسرہوم: ۱۸۸۹ء میں پہلی دفعہ جب میں کشمیر آیا تو یہاں کے لوگوں کو میں نے اس ناامید اور ہر ایک پر شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہوا پایا۔ سالہا سال سے انہیں (عملاً) یہی ذہن نشین کرادیا گیا تھا کہ وہ محض غلام بے دام ہیں جن کا کوئی حق نہیں ہے، البتہ ان میں بہت سی نالائقیات ہیں۔ انہیں ظلم پرست (یعنی ظلم اور نا انصافی کے سامنے جھکنے والے) کہہ کر کے پکارا جاتا تھا۔ اور ان کی عادت و ذلت پرستی کو بڑھاوا دینے اور اسی پر قائم رہنے کے لئے ان کی ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ (اور چونکہ زمین کی پیداوار کو حکومت ان سے جبراً چھین لیتی تھی اس لئے) زمین جو تنے اور بیج بونے کے لئے انہیں سرکاری پولیس سے مجبور کیا جاتا تھا اور جب فصل پک کر تیار ہو جاتی تھی تو اس اناج کو چھیننے کیلئے یہی سپاہی ان کے پاس پھر آن موجود ہوتے تھے۔ انہیں گلگت تک (سرکاری) بوجھ اٹھانے کے لئے اپنے گھروں سے گھسیٹ کر (بطور بے گار) لیا جاتا تھا۔ اور ہر سرکاری کارندے کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ ان سے بغیر معاوضہ کے کوئی بھی خدمت لے اور ان کی کمائی میں سے بھی جو چاہے بغیر قیمت کے لے لے۔ (اور) جب ۱۸۸۹ء میں (ہندو بست اراضی کا عملی کام شروع کرنے سے پہلے) میں نے دیہات کا جائزہ لینا شروع کیا تو شاذ و نادر ہی کوئی گاؤں ایسا تھا جہاں میں نے اجڑے ہوئے مکان اور بنجر پڑے ہوئے کھیت نہ دیکھے، جن کے مالک ۱۸۷۵ء کے قحط عظیم میں (مرکب کر) ختم ہو چکے تھے۔

سر بنرجی کی شہادت: مسٹر لارنس نے ۱۸۹۵ء میں کشمیر کے لوگوں کی جس تباہ حالی کا رونا رو یا تھا وہ تیس سال بعد تک بھی اسی طرح جاری تھی چنانچہ مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنی تخت نشینی کے بعد ۱۹۲۷ء میں بطور پولیٹیکل اور فارین مسٹر کے بنگال کے ایک بڑے قابل انسان سر البین بنرجی (Sir Albion Bannerjee) کو یہاں لایا تو وہ یہاں کے عوام کی مصائب کو دیکھ کر کانپ اٹھا اور دو سال تک اپنے عہدے پر رہ کر تبدیلی حالات کی کوشش کرتا رہا لیکن جب کامیابی نہ ہوئی تو استعفیٰ دے کر گھر کو روانہ ہو گیا اور جاتے جاتے اس نے ریاست کی بد حالی کی عبرت انگیز تصویر ایک اخباری بیان میں بالفاظ ذیل کھینچی:

Jammu & Kashmir State is labouring under many disadvantages, With a large Mohammadan Population absolutely illiterate, labouring under poverty and very low economic conditions of living in the Villages and

practically governed like dumb driven Cattle"

Ref: Page 650 A History of Kashmir

by P. N. Kaul Mamzai-Delhi-1962

مفہوم: ریاست جموں و کشمیر کے عوام قسم قسم کی محرومیوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اس ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جو بالکل ناخواندہ ہیں اور مختلف مصائب کا شکار ہیں، وہ غربت و افلاس کے پنجے میں گرفتار ہیں اور ان کی معاشی حالت بہت ہی پست ہے، یہ لوگ زیادہ تر دیہات میں رہتے ہیں (ان پر مہذب طریقے سے حکومت نہیں کی جاتی ہے) بلکہ عملاً انہیں چوپایوں کی طرح ہانکا جاتا ہے۔



سوانح حیات

نام چارٹ: ولادت سے وفات تک

- ☆ ولادت: ۲۷ شوال المکرم ۱۲۹۲ھ (۱۷ اکتوبر ۱۸۷۵ء)
- ☆ حصول علم کے لئے سفر ہزارہ: ۱۳۰۵ھ
- ☆ ہزارہ سے واپسی: ۱۳۰۸ھ
- ☆ دارالعلوم دیوبند میں داخلہ: ۱۳۱۰ھ
- ☆ دارالعلوم سے فراغت: ۱۳۱۲ھ
- ☆ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے شرف بیعت و تلمذ: ۱۳۱۵ھ
- ☆ مدرسہ امینیہ دہلی کی صدر مدرس: ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ سے ۸ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ تک
- ☆ سفر حرمین: ۱۳۲۳ھ
- ☆ بارہ مولا کشمیر میں مدرسہ فیض عام کا قیام: ۱۳۲۳ھ
- ☆ فیض عام میں تدریسی خدمات: ۱۳۲۳ھ سے ربیع الاول ۱۳۲۸ھ تک
- ☆ دارالعلوم دیوبند کے جلسہ دستار بندی میں شرکت: ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ
- ☆ دارالعلوم میں بحیثیت مدرس حدیث: ۱۳۲۸ھ سے ۱۳۲۴ھ تک
- ☆ دارالعلوم کی صدر مدرس اور حضرت شیخ الہند کی جانشینی: ۱۳۲۴ھ سے ۱۳۳۳ھ شوال
- ☆ تامل: ۱۳۳۳ھ سے ربیع الاول ۱۳۳۹ھ، ۱۹۱۵ء، ۱۹۲۱ء
- ☆ دارالعلوم کی مستقل صدر مدرس: ۱۳۳۹ھ، ۱۹۲۱ء سے ۱۳۴۶ھ تک
- ☆ جمعۃ العلماء ہند کے آٹھویں سالانہ اجلاس منعقدہ پشاور کی صدارت: دسمبر ۱۳۴۵ھ
- ☆ دارالعلوم دیوبند سے ترک تعلق: ۱۳۴۶ھ
- ☆ جامعہ اسلامیہ انجیل میں تدریسی خدمات: ۱۳۴۶ھ سے ۱۳۵۱ھ
- ☆ مقدمہ بہاولپور میں شہادت اور لاہور کا آخری سفر: اگست ۱۳۵۱ھ، ۱۳۵۱ء
- ☆ وفات حسرت آیات: ۳ صفر ۱۳۵۲ھ، ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء



ولادت باسعادت

۲۷ شوال المکرم ۱۲۹۲ھ - ۱۷ اکتوبر ۱۸۷۵ء

شیخ الحدیث علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری (رحمہ اللہ تعالیٰ) ۲۷ شوال المکرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۷۵ء بروز شنبہ بوقت سحر اپنے نانہال موضع ”دودھ وان“^① علاقہ اولاب (کشمیر) میں پیدا ہوئے۔

آپ کے والد بزرگوار عوام میں پیر محمد معظم شاہ کے نام سے معروف تھے اور آپ کی والدہ محترمہ کا اسم گرامی بی بی مال دیدی تھا۔

بی بی مال دیدی:..... کشمیری زبان میں ”مال“ کے معنی ”پھاڑ کی اونچی چوٹی“ ہے۔ اور ”دیدی“ کا لفظ کشمیری زبان میں عزت و احترام کا مفہوم ادا کرنے کے لئے بڑا جامع لفظ ہے جس کے معنی ماں بھی ہیں اور بڑی بہن بھی۔ یوں بھی اگر کسی خاتون کا عزت یا عمر کے لحاظ سے ادب کرنا ہو تو اس کو بھی ”دیدی“ کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے۔ بنا برآں ”مال دیدی“ کا مفہوم ہے پھاڑ کی اونچی چوٹی کی طرح بلند رتبہ خاتون یعنی سر بلند اور پروقار ہستی۔



①..... ”دودھ وان“ دراصل ”ڈو ڈون“ ہے اور اس کا مفہوم بڑبان کشمیری ہے ”دودھ سے بھرا جنگل“ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس گاؤں کے شمال مشرق کی طرف نہایت سرسبز چراگاہ تھی جس میں گائے، بھینس خوب نشوونما پا کر دافر مقدار میں دودھ دیتی تھیں۔ اس لئے مقامی لوگوں نے اس چراگاہ کو ”ڈو ڈون“ کا نام دیا تھا اور بعد ازاں یہ گاؤں ”دودھ وان“ کے نام سے موسوم ہوا۔

کشمیر میں نقاؤلاً بچیوں کے جواچھے نام اپنی مادری زبان میں رکھے جاتے ہیں ان میں سے مال ایک پسندیدہ نام ہے۔ نسب کے لحاظ سے محمد انور شاہ کے باپ مولانا معظم شاہ کی طرح آپ کی والدہ ماجدہ محترمہ بی بی مال دیدی مرحومہ بھی چند پشتیں اوپر جا کر شیخ بابا مسعود نوری رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تھیں۔

والدین کا متقابل شجرہ نسب: حضرت شاہ صاحب کے والدین کا متقابل شجرہ نسب یوں ہے۔



معظم، مال، انور:..... ذرا ان تین ناموں پر ایک نگاہ ڈالئے معظم۔ مال۔ انور۔ یعنی عظمت۔ سر بلندی اور نورانیت۔ آگے چل کر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کو جو درجاءت عالیہ نصیب ہوئے وہ ان تینوں ناموں کے دعائیہ پہلو کا قبولیت یافتہ عکس معلوم ہوتے ہیں اور الاسماء تنزل من السماء کی تصدیق کرتے ہیں۔

مترمہ مال دیدی کے خدا دوست والد پیر سیف اللہ شاہ نے اپنی اس دختر نیک اختر کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ صرف کی تھی اور یہ بچی جس کو قدرت نے نابغہ عصر علامہ انور شاہ اور آپ کے دیگر پانچ ذہین اور حسین و جمیل بھائیوں کی ماں بننے کے لئے پیدا کیا تھا زمانہ طفولیت سے ہی صوم و صلوة

اور تلاوت قرآن مجید سے والہانہ شغف رکھتی تھی اور خواتین کی مروجہ زیب و زینت سے ان کی بے نیازی ضرب المثل تھی۔ اس پارسا اور پاکباز خاتون میں حضرت رابعہ بصریہ کے اوصاف نمایاں تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی ولادت کے زمانے میں آپ کی والدہ محترمہ اپنے والدین کے ہاں موضع دودھ وان میں وقتی طور تشریف فرما تھیں ورنہ ان دنوں مولانا محمد معظم شاہ مستقل طور ضلع مظفر آباد کی وادی نیلم کے موضع لوات میں بود و پاش رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ کی پیدائش کے بعد آپ کی والدہ صاحبہ نو مولود لے کر واپس اپنے گھر لوات چلی گئیں یہ حضرت شاہ کے بچپن کا زمانہ تھا جب مولانا معظم شاہ صاحبؒ کچھ قلبی شوق سے اور کچھ اپنی زوجہ محترمہ کے برادر پیر اکبر شاہ کے اصرار کے باعث وادی نیلم سے منتقل ہو کر پہلے دودھ وان میں آ کر مقیم ہوئے اور اس کے بعد پر گنہ لولاب کے موضع ورنو کو اپنا مسکن بنالیا۔ جہاں آپ کی ذریت پھیلی اور اب تک موجود ہے۔ ورنو ہی وہ خوش قسمت گاؤں ہے جس کے کھیتوں میں چل پھر کر اور جس کے چشموں کا پانی پی کر شاہ صاحبؒ سن رشد کو پہنچے ورنو کی اس شان امتیازی پر آج تک بھی اس گاؤں کا بچہ بچہ متغیر ہے۔

موضع ورنو دودھ وان سے تقریباً دس بارہ میل کی دوری پر شمال مشرق کی طرف واقع ہے اور قصبہ کپواڑہ جہاں آجکل تحصیل کا ہیڈ کوارٹر ہے، اس کی آبادی بڑھتے بڑھتے موضع دودھ وان سے ملتی ہوئی ہے، اب کپواڑہ اور دودھ وان میں کوئی خاص درمیانی فاصلہ باقی نہیں رہا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا سلسلہ نسب

حضرت شاہ صاحبؒ قدس اللہ سرہ نے اپنا سلسلہ نسب اپنی کئی تصانیف خاصکر نیل الفرقدین اور کشف الستر کے آخر میں خود تحریر فرمایا ہے جو اس طرح ہے۔

محمد انور شاہ بن مولانا محمد معظم شاہ بن شاہ عبد الکبیر بن شاہ عبد الحلق بن شاہ محمد اکبر بن شاہ حیدر بن شاہ محمد عارف بن شاہ علی بن شاہ عبد اللہ بن الشیخ مسعود الزوری الکشمیری الہرقندی۔

وفي المکتوبات الخطیہ عن خلف الشیخ ان سلفه جاء وامن ببغداد

الى الهند و دخلوا ملتان ثم ارتحلوا الى بلدة لاہور ثم الى

الكشمير. واللہ اعلم. ۱۰

حضرت شاہ صاحبؒ کے خاندانی کاغذات کے مطابق مذکورہ بالا سلسلہ نسب اس کی اپنی شاخ

اور حضرت شیخ مسعود زوریؒ کی اولاد کی دوسری شاخوں کے خاندان کا متواتر دستاویزات سے ثابت شدہ شجرہ نسب ہے۔ اور حضرت شیخ مسعود زوریؒ (وفات قریباً ۱۰۰۸ھ ہے) سے حضرت شاہ صاحبؒ تک جن اشخاص کا نام آتا ہے ان میں سے اکثر مشہور و معروف اور تاریخی ہستیاں ہیں۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ شجرہ نسب کا یہ حصہ جو قریباً چار سو سال سے آج تک کی مدت پر حاوی ہے، روایت متواترہ ثابت شدہ ہے۔ حضرت شاہ صاحب جیسے اعظم رجال اور مشہور شخصیتوں کے حسب نسب کا چار سو سال تک پیش منظر ہو جانا سیرت نگاری کے مقاصد کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کی اولاد سے ہونے کی شہرت:..... حضرت شیخ مسعود زوریؒ کے ساتھ نسبی تعلق رکھنے والے اکثر اہل علم میں حضرت مسعود کے از اولاد امام ابو حنیفہؒ ہونے کی شہرت اس کثرت سے ہے کہ اس کو نظر انداز کرنا قرین انصاف نہ ہوگا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت امام اعظمؒ کی اولاد سے ہونے پر بعض تاریخی کتب کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ گو کشمیر کی مطبوعہ تاریخیں اس مسئلے پر قریب قریب خاموش ہیں۔ ان تاریخوں میں حضرت شیخ مسعودؒ کے تصوف اختیار کرنے سے قبل ایک بڑے تاجر ہونے اور تلاش حق میں حضرت میر سید احمد کرمائیؒ تک رسائی حاصل کرنے اور پھر دنیا کو ترک کر کے ریاضت و عبادت اور خدمت اسلام کے لئے وقف ہو جانے اور کمالات عالیہ تک پہنچنے کی مفصل کہانی موجود ہے۔ لیکن سلسلہ نسب کی طرف ان مصنفین نے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ مسعودیوں میں سے بعضوں کے پاس کچھ شجرہ ہائے نسب بھی ہیں مگر ان شجروں میں مذکورہ نام بردہ اشخاص اور ان کے زمان و مکان کے متعلق تاریخی مواد کی تائید دستیاب نہیں ہے۔

خود حضرت شاہ صاحبؒ کے والد ماجد مولانا معظم شاہ صاحبؒ کے پاس بھی اپنے قدیمی کاغذات میں حضرت مسعودؒ سے حضرت امام اعظمؒ تک ایک شجرہ نسب تھا جس کو موصوف نے کسی وقت تفریح طبع کے طور فارسی زبان میں نظم کر ڈالا تھا۔ اس شجرے سے ملتا جلتا ایک شجرہ زورہ میں زیارت علم صاحب کے سجادہ نشین بھی پیش کرتے ہیں۔ اس شجرے کی موجودگی سے علی الاقل یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ زمانہ قدیم ہی سے بعض اہل علم حضرات ایسے چلے آئے ہیں جو حضرت شیخ مسعود زوریؒ کے متعلق اس بات کے قائل تھے کہ آپ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی اولاد سے تھے۔

نام کے ساتھ حنفی:..... حضرت مولانا نور شاہ صاحبؒ نے حضرت شیخ مسعودؒ کے نسب کے بارے میں کوئی تصریح نہیں کی، البتہ اپنی تصانیف میں الفرقہ قدین اور کشف الستر کے خاتمہ پر اپنے نسب نامہ کو حضرت شیخ مسعودؒ تک پہنچانے کے بعد اپنے نام کے ساتھ حنفی لکھا ہے۔ اس میں دو احتمال ہو سکتے ہیں: (۱) ہو سکتا ہے کہ اس سے آپ کی مراد حنفی نسباً ہو۔ جیسا کہ آپ کے والد صاحب اس کے قائل

تھے۔ (۲) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس لفظ سے فقہی مسلک کے لحاظ سے خفی مراد ہو۔ اور آپ نے آگے چل کر اس موقع پر جو واللہ اعلم تحریر فرمایا ہے اس سے تو متبادر ہوتا ہے کہ خفی سے نہا خفی مراد ہے لیکن اس مسئلے پر آپ کے سامنے کوئی تنقیح شدہ تاریخی مواد دستیاب نہیں تھا۔ اس لئے تقویٰ اور احتیاط کے تقاضوں کے پیش نظر آپ نے واللہ اعلم لکھ کر معاملہ اللہ کو سونپ دیا ہے۔ آپ ہی کی پیروی کرتے ہوئے اس مرحلہ پر ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ واللہ اعلم۔

مزید تفصیلات تتمہ میں:..... حضرت شیخ مسعود زوریؒ سے اور آپ کے سلسلہ نسب اور شجرہ نسب کے متعلق اس مرحلہ پر ہم صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں اور مفصل بحث کتاب ہذا کے حصہ ۲ میں آجائے گی۔ یہاں حضرت مسعودؒ کا اس قدر تعارف کافی ہے کہ:

دسویں صدی ہجری کے مشائخ کشمیر میں سے حضرت شیخ مسعود زوریؒ اپنے معاصرین میں مراتب عالیہ پر فائز تھے اور کیا بلحاظ دولت و ثروت ظاہری اور کیا بلحاظ علم و عمل اور تقویٰ و طہارت باطنی اپنے زمانہ کے عوام تک آپ کی فیض رسانی کی نہریں جاری تھیں۔ آپ کے مرشد حضرت میر سید احمد کرمائیؒ اور آپ کے ہم عصر اولیاء حضرت سلطان العارفین مخدوم شیخ حمزہؒ حضرت جامع الکملات علامہ شیخ یعقوب صرئیؒ (محدث) حضرت مخدوم احمد قادریؒ حضرت مولانا بابا داؤد خاکیؒ اور حضرت سید محمد مسافر وغیرہ آپ کے علم و مراتب کے معترف تھے۔ اور اس کے بعد تمام کشمیری تاریخیں آپ کے مناقب میں رطب اللسان ہیں۔ ملا بہاء الدین (م ۱۲۳۸ھ) اپنی منظوم تاریخ خمسہ بہاء الدین میں حضرت مسعودؒ کا تذکرہ شروع کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

آنکہ بر تخت سروری زبید شیخ مسعود زوری زبید

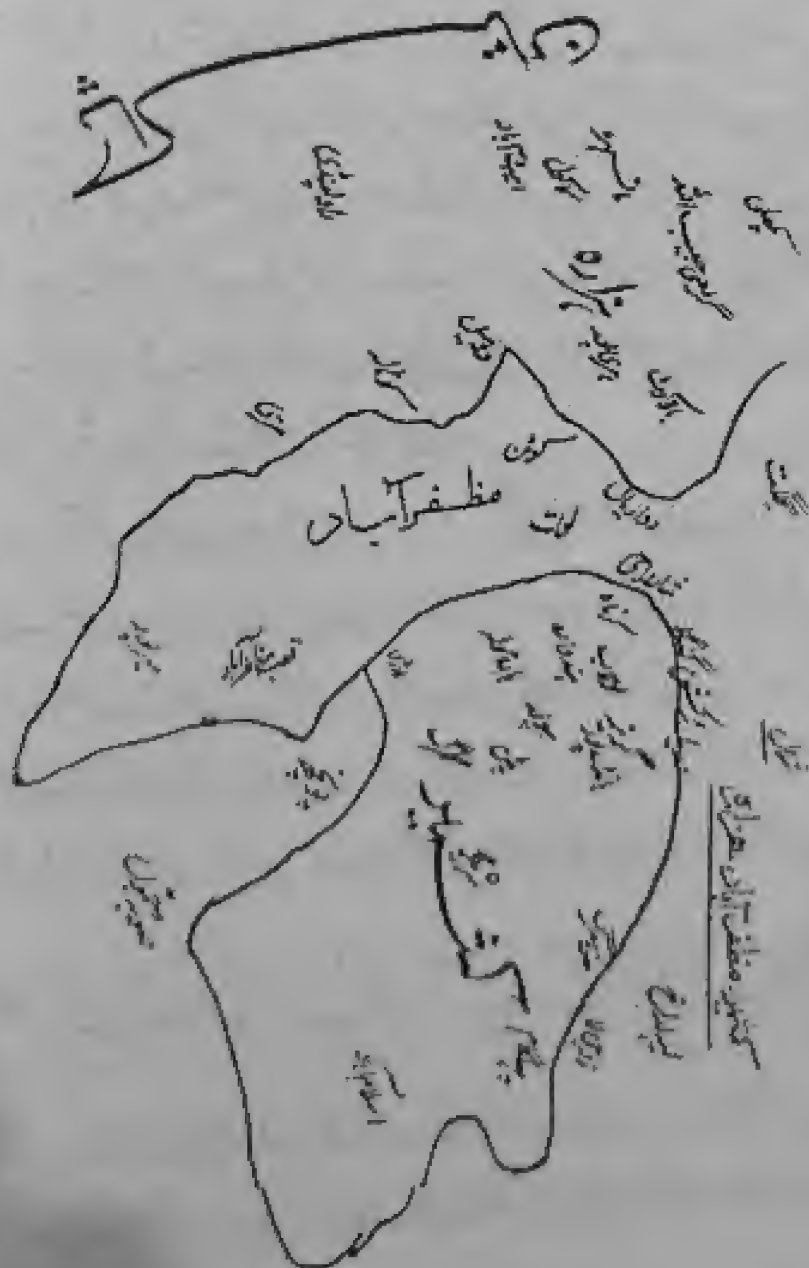
یہاں صرف یہ حقیقت جان لینے سے ہمارا مقصد پورا ہو جاتا ہے کہ فخر المجد ثین علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ حضرت مسعودؒ کے آٹھویں پشت میں خلف الصدق ہیں۔ اور جب خود حضرت شاہ صاحبؒ صرف ان آٹھ پشتوں تک نسب نامہ تحریر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں تو ہم کو بھی آپ ہی کے قدم بقدم چل کر اسی کو کافی سمجھنا چاہیے اور اگلا قدم اٹھانا چاہیے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

حضرت شاہ صاحبؒ اور آپ کے اسلاف کا وطن

وطن؟..... وطن کے سوال کو بطور غور دیکھا جائے تو حضرت شاہ صاحبؒ اور آپ کے آباؤ اجداد کا وطن کوئی واحد متعین مقام نہیں رہا۔ ”ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست“ کے مطابق

خاندانوں سے اس خاندان کے لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں اور ایک مقام سے دوسرے مقام میں منتقل ہوتے چلے آئے ہیں۔

کشمیر کی تاریخی کتابوں کی ورق گردانی سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت الشیخ مسعود صاحب ۹۵۰ھ یا اس سے بھی کچھ مدت پہلے وارد سرینگر ہوئے اور گزشتہ چار سو یا ساڑھے چار سو سال کی مدت میں حضرت مسعود کے خاندان نے کشمیر کے مختلف مقامات میں توطن کا سلسلہ جاری رکھا ہے ۹۵۰ھ سے ۱۱۰۰ھ تک اس خاندان کے بزرگ شہر سرینگر کے علاقہ نرورہ میں پہلے بحیثیت تاجر (اور تاجر بھی معمولی درجہ کے نہیں بلکہ اپنے وقت کے ملک التجار) اور بعد ازاں بحیثیت مرشد روحانی و مبلغ دین اسلام سرگرم عمل دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس کے بعد بارہویں صدی ہجری کے دوران اولاد حضرت مسعود کی وہ شاخ جس کے گل سرسبد مولانا نور شاہ صاحب ہیں، وادی کشمیر کے شمالی حصہ یعنی علاقہ کامراج اور خاص کر



لولاب کے گل بدامان احاطے کو اپنا ٹھکانہ بنالیتی ہے۔

وادئ نیلم کی طرف ہجرت:..... تیرہویں صدی ہجری میں (۱۲۳۴ء) جب ریاست جموں و کشمیر پر لہور کی رنجیت سنگھی حکومت کا قبضہ ہو جاتا ہے تو لہور سے کشمیر پر ایسے حاکم بھیجے جاتے ہیں جن کا مذہب تعصب جنون کی حدوں سے بھی تجاوز کرتا ہے، ان گورنروں کے ہاتھوں ظلم و تشدد کے ایسے واقعات سرزد ہوتے ہیں جو مسلمانان کشمیر کو اپنے گھر بار اور وطن سے ہی بیزار کر دیتے ہیں ہزاروں باشندے بھاگ بھاگ کر وادی سے باہر سر چھپانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور بقول مسٹر لارنس گاؤں کے گاؤں اجاڑا اور کھیت بھڑ بن جاتے ہیں۔ اس سکھ شاہی دور میں لولاب و کامراج کے دیگر ہزاروں تارکین وطن کی طرح حضرت شاہ صاحبؒ کے جد امجد شاہ عبدالکبیر اور مسعودی قبیلہ کی دوسری شاخ کے رکن اعلیٰ شاہ محمد صالحؒ اور اس خاندان کے دوسرے کئی گھرانے لولاب کے لہا ہاتے گلزاروں، سیماب گوں چشموں، سونا اگلتی ہوئی زمینوں اور سو سال سے جمع کی ہوئی جائیدادوں کو چھوڑ کر ہمہ گیر ظلم سے پناہ مانگتے ہوئے لولاب جیسے محبوب وطن کو ترک کر دیتے ہیں اور شمالی دروں کو عبور کر کے وادی نیلم کے اونچے پہاڑوں کے اس پار دیودار کے جنگلات سے گیری ہوئی سرسبز وادیوں میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں کے مواضع کوٹن، لوٹ اور دیواریاں وغیرہ میں مقیم ہو کر اپنی محنت اور قابلیت سے اس نئے وطن میں دینی پیشواؤں کی حیثیت میں باعزت زندگی بسر کرنا شروع کرتے ہیں۔ اس وقت وادی نیلم کا حاکم راجہ منصور علی خان ہوتا ہے جو ان تارکان وطن کو فراخ دلی اور احترام سے جگہ دیتا ہے اور یہ بھی خوشی سے اس کی رعایا بن کر اشاعت اسلام کا فریضہ جاری رکھتے ہیں۔ اس خاندان کے بہت سے گھرانے اب بھی وادی نیلم میں آباد ہیں اور بہت سے واپس وادی کشمیر کی حدود میں آگئے ہیں۔

لولاب کی طرف واپسی:..... زمانہ چند مزید کروٹیں بدلتا ہے۔ سکھ حکومت اپنا سارا پارٹ لاکر کے تاریخ کے سٹیج سے ہٹ چکی ہوتی ہے۔ کشمیر پر ڈوگرہ راج مسلط ہو چکا ہوتا ہے اور ایک وقت ایسا آ جاتا ہے کہ راجہ منصور خان اور اس کے جانشین راجہ شیر علی خان کی وہ چھوٹی سی پہاڑی سلطنت جو پچاس ساٹھ پہاڑی دیہات پر مشتمل ہزاروں مظلوموں کی پناہ گاہ تھی، ڈوگرہ حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے اور شکست سے دوچار ہو جانے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاتھوں ختم ہو جاتی ہے۔ اور وادی، لولاب اور وادی نیلم کے نظام حکومت میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ جب کشمیر سے سکھ شاہی کے اثرات کم ہو جاتے ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا نسبتاً کم تشددانہ زمانہ آ جاتا ہے۔ یعنی تیرہویں صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ آتا ہے تو اس تبدیل شدہ فضا

۶۰

میں مولانا معظم شاہ صاحب اپنے باپ اور دادا کے وطن لولاب کی کشش سے اور اپنے سسرال والوں کے اصرار سے واپس وادیء لولاب میں آ جاتے ہیں، کچھ مدت تک موضع دودھ دان میں قیام فرمانے کے بعد وادیء لولاب کے موضع درنو میں ایک تیز رفتار اور شور مچاتی ہوئی چھوٹی سی ندی کے کنارے دامن کوہ میں قیام پذیر ہو جاتے ہیں۔

موضع درنو..... لولاب کے اس گمنام موضع درنو کی قسمت میں لکھا گیا تھا کہ شہرت کے آسمان پر ستارہ بن کر چمکے مگر اس میں حضرت شاہ صاحبؒ کے حسن انتخاب کا بھی دخل ہے جن لوگوں نے جناب معظم شاہ صاحبؒ کو دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ جہاں ایک بڑے عالم و فاضل، ایک سحر بیان و اعظا اور زاہد شب زندہ دار تھے، وہاں فارسی زبان کے قادر الکلام شاعر اور مناظر قدرت کے رمز شناس اور ولدادہ بھی تھے۔ علامہ اقبالؒ نے ذیل کے اشعار میں نہ صرف اپنے احساسات کی بلکہ مولانا معظم شاہ صاحبؒ جیسے عاشقان جلوہ ہائے فطرت کے جذبات کی بھی ترجمانی کی ہے:

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب

کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا

ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری

دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں

دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

لذت سرور کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں

چشمے کی شورشوں میں باجا سانج رہا ہو

گل کی کلی چمک کر پیغام دے کسی کا

ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

ہو ہاتھ کا سر ہانہ، ہنرے کا ہو بچھونا

سرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ مزا ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
نہنے سے دل میں اس کے کھکانہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بولے ہرے ہرے ہوں

ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دلفریب ایسا کو ہزار کا نظارہ

پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمین کی سویا ہوا سبزہ

پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو، جھک جھک کے گل کی شہنی

جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج، جب شام گی دلہن کو

سرخ لے سنہری، ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم

امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بکلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھادے

جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی موزن

میں اس کا ہموا ہوں، وہ میری ہم نوا ہو۔

کانوں پہ ہو نہ میرے دیہ و حرم کا احسان

روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے

رونا مرا وضو ہو، نالہ میری دعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے

تاروں کے قافلے کو میری صدا دراہو

ہر درد مند دل کو رونا میرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

درو کی دل کشی..... یہ منظر کشی محض خیالی اور تصوراتی نہیں ہے۔ بلکہ قدرت کے ایک شاہکار اور ایک جیتی جاگتی حقیقت کی تصویر ہے۔ اور درو وہ مقام ہے جس کو زندگی بھر کی قیام گاہ بنا کر مولانا معظم شاہ صاحب اس کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ماہ مئی، جون اور جولائی کے ایام میں کوئی شخص معظم صاحب کے درو میں چلا جائے اور اس ندی کے کنارے بیٹھ جائے جو مولانا موصوف کی قیام گاہ، آپ کی مسجد اور مزار کے سامنے سے پتھروں کے ساتھ سرنگراتی، جھاگ اڑاتی اور اونچی سروں میں نہ جانے کیا کچھ گاتی اور شور مچاتی ہوئی گذر رہی ہے۔ ندی کے ایک طرف لہلہاتے کھیت ہیں اور دوسری طرف پہاڑ کی ڈھلوان میں دیودار اور چیل کا دلکش جنگل ہے، بیچ میں ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے جو اب حضرت معظم شاہ صاحب اور ان کے فوت شدہ فرزندوں کی آخری آرام گاہ ہے۔ یہ سارا نظارہ سنگ دل سے سنگ دل انسان کو متاثر کر لینے اور ترجمان فطرت اقبال مرحوم کے مندرجہ صدر اشعار گنگنانے پر مجبور کر دینے کے لئے کافی ہے۔

نویں صدی ہجری سے پہلے کا وطن..... الغرض کشمیر کی حدود میں حضرت شاہ صاحب کے خاندان کا وطن سری نگر کے محلہ نرورہ سے ضلع بارہموار تک پھیلا ہوا ہے، اور اس سے بھی ماقبل یعنی نویں صدی ہجری اور اس سے بھی پہلے آپ کے آبائی وطن کو تلاش کریں تو تاریخیں بتاتی ہیں کہ اس خاندان کے بزرگ کوفہ سے بغداد اور بغداد سے ملتان آ کر بسے اور پھر لاہور کو وطن بنایا اور بالآخر لاہور سے کشمیر چلے آئے ①۔ چنانچہ خود حضرت شاہ صاحبؒ بھی کشمیر میں اس خاندان کے ہائی اول حضرت شیخ مسعود نوریؒ تک اپنے سلسلے نسب کو بیان کرنے کے بعد موصوف کے وطن کے متعلق یوں رقمطراز ہیں کہ:

وفي المکتوبات الخطیة عن خلف الشیخ (مسعود) ان سلفه جاء وا
من بغداد الى الهند ودخلوا ملتان ثم ارتحلوا الى بلدة لاہور ثم الى
الكشمير. واللہ اعلم ②

(یعنی حضرت شیخ (مسعود) کے اخلاف کے پاس قدیم قلمی تحریرات میں درج ہے کہ موصوف

① (۱) فیض الباری جلد ۲، مولانا بدر عالم میرٹھی (طبع مجازی قاہرہ مصر ۱۹۳۸ء) (۲) مقدمہ انوار الباری حصہ دوم
مولانا سید احمد رضا بجنوری ص ۲۳ (طبع سوم ۱۹۶۹ء)

② ملاحظہ ہو خانہ کتاب "کشف السیر عن صلوات الوتر" مولانا انور شاہ کشمیری۔

کے اسلاف کرام بغداد سے ہندوستان آئے اور ملتان میں وارد ہوئے پھر وہاں سے شہر لاہور میں آئے اور بعد ازاں کشمیر کی طرف منتقل ہوئے۔ (واللہ اعلم۔)

جہاں تک کوفہ، بغداد، ملتان اور لاہور کا تعلق ہے یہ چاروں دنیائے تاریخ و جغرافیہ کے جانے پہچانے اور مشہور و معروف مقامات ہیں جن پر تفصیل سے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

نرورہ، لولاب اور نیلم۔۔۔۔۔ البتہ شاہ صاحبؒ کے تذکرہ میں تین دیگر مقامات کا نام بار بار آتا ہے جو کسی حد تک غیر معروف مقامات ہیں اور وہ ہیں: نرورہ، لولاب اور وادی نیلم۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ آگے بڑھنے سے پہلے قارئین کرام کو نرورہ، لولاب اور نیلم سے متعارف کر دیا جائے کیونکہ ان مقامات کی نقاب کشائی شاہ صاحبؒ کی زندگی کے بہت سے گوشوں تک رسائی حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

نرورہ:۔۔۔۔۔ کشتیوں کے ذریعہ بار برداری اور سفر کی سہولتوں کے لئے کشمیر کے محسن حکمران سلطان زین العابدین المعروف بڈشاہ (دور حکومت ۱۴۲۳ء تا ۱۴۷۷ء) نے سرینگر شہر کے وسط میں سے ایک گہری نہر کٹوا کر جھیل ڈل اور جھیل آنچارسر کے پانیوں کو آپس میں ملا دیا تھا۔ اس نہر کو نالہ مار کہتے ہیں۔ شہر کے شمال مغربی کنارے سے یہ نالہ جب جھیل آنچارسر میں جانے سے پہلے جھیل خوش حال سرکار رخ کرتا ہے تو وہاں عید گاہ کے بالمقابل پرانے وقتوں میں نالہ کے آس پاس خالی میدان تھے، جن میں نالے کا پانی جذب ہو کر سرکندے اور دیگر ان نباتات کا مرکز ہو گیا تھا جو مسلسل گیلی رہنے والی زمین میں اپنے آپ پیدا ہو جاتی ہیں۔ سرکندے کو کشمیری زبان میں نر کہتے ہیں۔ چونکہ یہاں دور دور تک اسی گھاس کے پلاٹ دکھائی دیتے ہیں اس لئے عوام اس جگہ کو نرورہ یعنی نر گھاس کا کھیت کے نام سے پکارتے تھے اور بعد ازاں یہ جگہ نرورہ کے نام سے موسوم ہو گئی فارسی زبان میں نرورہ کا معنی خیر ترجمہ کیا جائے تو نیستان ہوگا۔

حضرت مسعود کا نرورہ میں ورود:۔۔۔۔۔ مشائخ کشمیر میں ایک مشہور بزرگ حضرت بابا مسعود دیہی تھے جن کے والد جناب جنید (اور غالب دادا جناب قاسم بھی) ملتان سے آکر لاہور میں ٹھہرے اور کچھ عرصہ کے بعد لاہور سے کشمیر میں بطور تاجرو وارد ہوئے۔ یہ سلطان زین العابدین اور اس کے جانشینوں کا دور حکومت تھا، جن کی راجدھانی سرینگر کے شمال میں وہاں تھی، جہاں آج کل سرینگر کا محلہ نوشہرہ ہے۔ چونکہ قدیم زمانہ کے بادشاہوں کا دستور تھا کہ وہ دوسرے ملکوں سے آنے والے نامی گرامی تاجروں کو اپنے محلات کے قرب و جوار میں جائے رہائش مہیا کرتے تھے، اس لئے

علاقہ نرورہ یا نیستان جو نو شہرہ سے تھوڑے سے فاصلہ پر واقع ہے، نو وارد تاجروں کی بود و باش اور تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کے لئے منتخب ہوا جو رفتہ رفتہ ایک بستی بن گئی۔ حضرت شیخ مسعودؒ جن کو اپنے ہم عصرتا جر ملک التجار کہتے تھے، نرورہ کی اس بستی کے اولین آبادکاروں میں سے تھے۔ آج کل نرورہ کا جغرافیہ یہ ہے کہ نالہ مار کے مغرب میں عید گاہ ہے اور اس کے مشرق میں محلہ نرورہ ہے۔ اس محلہ کے ڈیرہ سویا دو سو گھروں میں سے آج بھی کوئی ۲۵ یا ۳۰ گھر حضرت بابا مسعودؒ کی اولاد کے آباد ہیں۔ اور اسی محلے میں حضرت موصوف کا مزار ہے۔ نیز آپ کے جن فرزندوں اور پوتوں کا تذکرہ تواریخ میں ہے وہ بھی آپ کے پہلو بہ پہلو مدفون ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مسجد اور وہ خانقاہ بھی اسی نرورہ میں واقع ہے جو زیارت علم صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں وہ تاریخی تیرکات محفوظ ہیں جو حضرت مسعودؒ کے مرشد حضرت میر سید احمد کرمانیؒ ملتان سے اپنے ہمراہ لائے تھے اور جو آپ کے فرزند میر سید محمد مسافر کرمانیؒ نے ۹۷۶ھ میں حضرت مسعودؒ کے حوالہ کئے تھے۔

اولاد مسعودؒ کی کثرت و تعداد :..... پچھلے چار سو سال سے اسی نرورہ یا نیستان سے نکل نکل کر حضرت مسعودؒ کی اولاد کے علماء اور فقراء ہر طرف منتشر ہوتے گئے اور وادی کشمیر کے اطراف و اکناف کے علاوہ دوسرے ممالک تک پھیل گئے۔ ریاست کے اندر صوبہ کشمیر کے چاروں اضلاع سرینگر اسلام آباد بارہ مولہ اور مظفر آباد اور صوبہ جموں میں پونچھ بانہال ہر ایک علاقہ میں کہیں کم اور کہیں زیادہ حضرت بابا مسعودؒ نروری کی نسل کے لوگ جا کر بس گئے ہیں اور تعلیم و تدریس اور پیری و مریدی کے علاوہ تجارت ذراعت ملازمت وغیرہ زندگی کے تمام مشاغل میں مقامی لوگوں کے دوش بدوش چل رہے ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر سے باہر لاہور دیوبند کراچی (اور اب امریکہ کی ریاست انڈیانا میں بھی) فرزند ان شیخ مسعودؒ نروری مستقل باشندوں کی حیثیت سے بس گئے ہیں۔ وادی کشمیر میں اندازاً ان کی مجموعی تعداد پانچ ہزار سے کچھ اوپر تصور کی جاتی ہے۔ جو ہر ذہانت و فطانت کے ساتھ ساتھ تعلیم کو خاص کر عربی اور فارسی زبانوں کو ان لوگوں کے ہاں موروثی دولت کا درجہ حاصل ہے اور اب سیاست میں بھی ان کا حصہ بہت نمایاں ہے۔

نرورہ سے مسعودیوں کا لگاؤ :..... اولاد شیخ مسعودؒ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ کہیں بھی چلے جائیں محلہ نرورہ کے ساتھ اپنے قلبی تعلق کو کم نہیں ہونے نہیں دیتے۔ اپنے ناموں کے ساتھ مسعودی کے علاوہ نروری اور اکثر اوقات صرف مسعودی لکھ کر اس تعلق کا اظہار کرتے ہیں۔ خود حضرت شاہ صائبؒ نرورہ کے ساتھ اپنی وابستگی کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور آخر عمر تک عادت شریف یہی تھی کہ سرینگر میں آئیں تو نرورہ ضرور جاتے تھے اپنے جد بزرگوار حضرت الشیخ مسعودؒ

کے مقبرہ پر فاتحہ اور پھر خانقاہ نزورہ یعنی مسجد علم صاحب میں داخل ہو کر تبرکات کچھ نہ کچھ بطور وعظ بیان کرنا آپ کا معمول تھا۔ آپ کے شاگرد رشید مرحوم مولانا سید میرک شاہ اندرابی (کشمیری) نے حضرت شاہ صاحب کی وفات پر لکھے ہوئے مرثیہ کے آخر میں محلہ نزورہ کے ساتھ شاہ صاحب کے اسی تعلق کی طرف اشارہ کیا ہے۔

فبا فخر هند ثم دیوبند مرقد
علیک سلام اللہ ماعاش عائش
یہا ہی بلک الکشمیر ثمت نور
وما دارت الافلاک اونار نیر ❶

لولاب:..... ضلع بارہ مولہ کے شمالی حصہ میں جنگلات سے ڈھانپے ہوئے پہاڑوں کے بیچوں بیچ ایک نہایت حسین وادی ہے جس کو لولاب کہتے ہیں۔ اندرونی حصہ میں یہ وادی دو شاخوں میں بٹ جاتی ہے ایک شاخ ورنو شاخ ہے اور دوسری لال پور شاخ دو میں سے ہر ایک تقریباً ۶ میل لمبی اور ۳ میل چوڑی ہے مشہور انگریز مؤرخ فریڈریک ڈریو (Frederic Drew) اپنی کتاب دی جنوں اینڈ کشمیر ٹریٹیز میں سطح سمندر سے اس کی بلندی پر لکھتا ہے کہ:

"I do not know sureiy its altitude: Probably it is near good feet, The J & K Territories" (london 1875)

”مجھے پورے وثوق کے ساتھ سطح سمندر سے اس کی بلندی کا علم نہیں ہے غالباً چھ ہزار فٹ کے قریب ہوگی۔“

لولاب یا لولو:..... یہ امر قابل ذکر ہے کہ لولاب کا قدیم نام لولو تھا چنانچہ لولاب کے باشندے (جو پچاس ہزار کے قریب ہیں) اب بھی اس علاقہ کو لولاب کے بدلے لولو ہی کہتے ہیں۔ لیکن فارسی اور اردو کی تحریرات میں چونکہ لولاب لکھا جاتا رہا۔ اس لئے اب لکھنے میں لولاب ہی لکھا جا رہا ہے۔ اور کشمیر سے باہر اب نام کا یہی تلفظ مشہور ہو چکا ہے۔

لولاب کی وجہ تسمیہ:..... لولو یا لولاب کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کلام کو طول دینے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختصراً کچھ اس طرح عرض کیا جاسکتا ہے۔

مؤرخ حسن شاہ کھویہا می کے بیان کے مطابق شہر لولوراجہ لونی آباد کیا تھا جو ۱۵۹۰ء میں تخت پر بیٹھا اور ۶۰ سال حکومت کی۔

ڈاکٹر سنیل چندر رے اپنی کتاب ارلی ہسٹری اینڈ کلچر آف کشمیر کے صفحہ ۱۳ پر لکھتے ہیں۔

"Laulaha of Kalhana seems to preserve the old name of the present Lolab"

یعنی مورخ کھن نے موجودہ لولاب کو لولاہا لکھ کر اس کے قدیم نام کو گویا محفوظ کر دیا ہے۔
مسٹر جیمس پی فرگیسن (James P. Ferguson) اپنی کتاب کشمیر ان ہسٹوریکل انٹروڈکشن (Kashmir on Historical Introduction) (مطبوعہ لندن ۱۹۶۱ء) کے ص ۱۱۵ پر رقمطراز ہیں۔

"The Loiab is the ancient Laulahe, but has no historical sifes".

یعنی: (لولاب وہی قدیم زمانہ کا لولاہا ہے لیکن اس میں تاریخی آثار نہیں ملتے)
مسٹر جیمس کا اشارہ اس روایتی قدیم شہر "لولاہا" کی طرف ہے جس کی آبادی راج ترنگنی وغیرہ قدیم کشمیری تاریخوں میں لاکھوں تک بیان کی گئی ہے ❶۔ رہی آثار نہ ملنے کی بات تو اس پر حیرت نہ ہونی چاہیے کیونکہ لولاب کے آس پاس کثرت سے جنگلات ہونے کے باعث اس شہر کی عمارات لکڑی کی ہوں گی۔ اور آتشزدگیوں سے ایسے شہر جب تباہ ہو جائیں تو ان کا نشان نہ رہا تھا۔ یہی معاملہ اس شہر کو بھی پیش آیا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

لولاب قدرت کا ایک شاہکار:..... بہر حال وادی لولاب سرزمین کشمیر پر قدرت کی کاریگری اور صنائی کا ایک دل آویز شاہکار ہے، صاف و شفاف قدرتی چشموں آبشاروں اور کوہساروں میں آباد اس مینوسواد حسین وادی کی جتنی تعریفیں کی گئی ہیں وہ اس کے حسن کو بیان کرنے کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

حفیظ جالندھری کی منظر کشی:..... مشہور شاعر حضرت حفیظ جالندھری نے ایک منظر کشی کی ہے جو وادی لولاب پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے۔

دور انسان کی نگاہ سے دور ✨ دور دنیا کی شاہراہ سے دور
ایک وادی ہے کوہساروں میں ✨ حسن کی فطرتی بہاروں میں

❶۔ ویسے شہر کی کثرت آبادی کے بارے میں کھن پڑت اور تاجگردانوں ہی مبالغہ آمیزی سے کام لینے کے باوجود باہم مختلف ہیں۔ کھن کے نزدیک شہر کے مکانات کی تعداد اسی لاکھ اور تاجگر کے قول کے مطابق اسی ہزار تھی چنانچہ مورخ حسن لکھتے ہیں:

"راہلو۔۔۔ درمیان درہ لولاب شہر لولوہا عمارات کثیر و اسواق و دکانیں و لہذیر معمور ساخت کہ تعداد عمارات آں بقول کھن پڑت ہشتاد و یک خانہ و ہرولہت رتاگر ہشتاد ہزار خانہ مشہور است۔" (تاریخ حسن، ج ۲ ص ۳۰)

نور دن آبشار چار طرف ☆ ندیاں بے شمار چار طرف
پھول اور لالہ زار چار طرف ☆ ایک خود رو بہار چار طرف
پھونچتے ہیں ہزار ہا چشمے ☆ سرد و شفاف و خوشنما چشمے
لپٹ گئی ہے زمین پھولوں سے ☆ بن گئی نازمین پھولوں سے
سرخ پھولوں سے زرد پھولوں سے ☆ اور کہیں لاجورد پھولوں سے
جھاڑیاں ہیں تمام پھول ہی پھول ☆ نہیں کانٹے کا نام پھول ہی پھول

علامہ شبلی کا قصیدہ کشمیریہ:..... حضرت علامہ شبلی نعمانی ماہ جون ۱۸۹۸ء کے آخری ہفتہ میں وارد کشمیر ہوئے۔ وہ چونکہ ملیریا تپ کے مزمین مریض تھے آب و ہوا تبدیل ہوتے ہی ان کا بخار عود کر آیا اور جتنی مدت کشمیر میں رہے اکثر بیمار ہی رہے۔ تندرست رہے تو نہ جانے نظم و نثر میں ان کی کون کون سی علمی تخلیقات کے ساتھ در کشمیر نوشہ شد کے الفاظ نظر نواز ہوتے۔ اس کے باوجود ان کی ایک مایہ ناز کتاب الفاروق کو کشمیر کے ساتھ یہ تعلق پیدا ہو گیا کہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی الفاروق جلد دوم کا خاتمہ کشمیر میں ہی لکھا اور ۵ جولائی ۱۸۹۸ء مقام کشمیر لکھ کر جب قلم ہاتھ سے رکھا تو بستر پر بے ہوش پڑ گئے۔ (حیات شبلی ۳۳۳) تپ اور ضعف نے آپ کو وادی کشمیر کے حقیقی نقارے دیکھنے کی اجازت نہ دی، شکارہ میں لینے لیٹے ایک آدھ بار مشکل سے ڈل اور اس کے ارد گرد کے باغات پر نظر ڈال سکے اور صحت سے مایوس ہو کر ماہ جولائی کے اندر اندر ہی کشمیر سے واپس چلے جانے پر مجبور ہو گئے۔

قریباً اس سے دو سال بعد تک آپ کی صحت اور مرض کی درمیان جنگ جاری رہی اور کام بھی ہوتے رہے۔ اسی اثنا میں عارضی حصول صحت کے بعد ایک موقع پر آپ نے قصیدہ کشمیرہ کے عنوان سے چمچتر اشعار کی کی طویل فارسی نظم میں اپنی علالت کے واقعات بیان کئے ہیں۔ اس نظم میں خلد کشمیر پر آپ کی گلکاری اس قابل ہے کہ لولاب کے تذکرے میں اپنا مقام حاصل کرے۔

دوستان! ایکہ رہہ و رسم وفا کیش شامست

تج دانید کہ شبلی بچہ حال ست و کجا ست

ورند انید ونہ دارید ز حالش خبرے

باید البتہ پڑ و ہش کہ پڑ ہش ز وفا ست

از سید کاری ایام وز خود رائی خویش

ہست یک سال کہ بے چارہ گرفتار بلاست

بود در گوشه تنهایی خود فارغ و شاد

که به ناگاه به عزم سفر از جابر خاست

سوی کشمیر روان گشت بدان گرم روی

که نمی خواست در آن ره نفسی کردن راست

یچ شک نیست که آن ناحیه در زیبایی

گرتزل بکنم خلد برین رامانا ست

بسکه جوشید زهر سوی گل دلاله بدشت

از کران تابه کران روی زمین ناپیدا ست

یچ جائے زگل دلاله تھی نتوان یافت

پائے دیوار اگر هست و گرسقف سراسر

جاده را خود ز خیابان نتوان کرد تمیز

بسکه گل صف زده سرتاسر از چپ و راست

جام گلرنگ که در بزم بآئین چند

هم بدان گونه گل، از پہلو گل جلوه نماست

نقشبند چمن طبع زرد ستی فیض

دشت را هم به گل دلاله و شمشاد آراست

سبز برکوه فرورینخته از سرتابین

یاقبائے ست که بر قامت شخص آید راست

راہر در اندیدول که نہد گام به راه

بسکه بر هر قدمش لاله و گل درت باست

دیدہ طفل کہ بردامن مادر غلطہ

جنبش باد بدان گونه بروی صحر است

گل به ہر شاخ ز برگ ست فزون تر گوئی

ہمہ بر گل ہر دوا نیچہ کہ از برگ پاکست

سرو اگر پای بدامن نکشد خود چه کند

زانکہ از جوش گل دلاله چمن تنگ فضا ست

بسکہ برہر قدم ازلالہ چراغے بہند
 درشب تار کے گم نشود از رہ راست
 آگیرے ۱ کہ بشہرست و بودنامش ڈل
 گو کیا آینہ در دست عروسے زیبا ست
 سینہ صاف دلان ست ہمانا کزلطف
 ہرچہ در بن بود، از صفیہ رویش پیدا ست
 گرد برگرد ڈل آن صف زدن لالہ و گل
 چون طراز لیست کہ بردامن شوخی رعنا ست
 شاملار ست و نشاط ست و نگین ست و نسیم
 باغبائے کہ بہ پیراہن ڈل غالیہ راست

شاملارست ازان جملہ فزون تر بہ جمال
 کہ چونہ چرخ طبق بر طبق و تابرتا ست
 آب بالائے زمین باشد و اینجا بنی
 کہ زمین بر سر آبست وہاں پاہر جاست
 در بن آب دم سبزہ و نیلوفر و گل
 قوت نامیہ بگر زکباتا بہ کجاست
 گرچہ دانم کہ خن خود بہ درازی بکشید
 چہ توان کرد خن ہم ز سر نشود غما ست ۲

مولانا حالی مرحوم کی سیر کشمیر:..... مولانا الطاف حسین حالی کی نظم سیر کشمیر بھی اگرچہ پوری
 داد کی کشمیر سے متعلق ہے لیکن مولانا شبلی نعمانی کے قصیدہ کشمیر کی طرح آپ کی اس نظم میں بھی
 لولاب کی جھلکیاں کشمیر کے دوسرے مناظر کے ساتھ صف بستہ کھڑی دکھائی دیتی ہیں، اس لیے
 اس کے چند اشعار بھی ہدیہ ناظرین ہیں۔

ہر چمن یاں پھول سے اور پھل سے مالا مال ہے
 ہر چمن میں یاں مہیا ہیں مکان بہر مکین

ان مکانوں اور خیابانوں سے جب آگے بڑھے
پھر وہ عالم ہے جہاں غیر از خموشی کچھ نہیں

جیسے ہوتا ہے ابد پر وقت جا کر منتہی
ختم ہو جاتی ہے دنیا بھی یہاں آ کر یونہی

یعنی اقلیم ابد اور یہ جہان خامشی
طاقت انسان کی حد سے ہیں پرے دونوں کہیں

طرفہ سناٹا ہے اس سنان کوہستان پر
جس کی دنیا میں نہیں تمثیل کوئی دلنشین

اے وادی لولاب:..... علامہ اقبال کی دور آخری کی ایک مرصع نظم ملا زادہ حسنین لولابی کشمیری کا
بیاض حضرت شاہ صاحب کی طرف تلمیحات اور اشارات سے لبریز ہے اس میں آپ فرماتے ہیں۔
”پانی ترے چشموں کا ترپتا ہوا سیماب“

اے وادی لولاب! اے وادی لولاب!

اولاد مسعود کا لولاب:..... حضرت بابا مسعود زوری کے سب سے بڑے فرزند (جو مسکور خین کشمیر
کی شہادت کے مطابق علم و فضل اور زہد و تقویٰ کا پیکر تھے) بابا عبد اللہ کے ایک پوتے بابا عارف (بن بابا علی بن بابا عبد اللہ) کی اولاد جنت کشمیر کے اس فردوس بدایاں احاطے یعنی وادی لولاب میں
تبلیغ دین کرتے کرتے ماحول کی دلکشی سے متاثر ہو کر ہمیشہ کے لئے وہیں بس گئی اور مرد و زمانہ کے
ساتھ ساتھ وہاں شاخ در شاخ پھیل کر لولاب کے مواضعات سایہ ون، شاٹھ مقام، کانٹھ پورہ
، گنگ بوگ، دار پورہ، سونہ تار، دودھ دان، ہیری، گلگام، لال پورہ اور لولاب سے باہر علاقہ
کامراج میں ترگہ پورہ، چک شملوہہ اور سوپور تک متوطن ہو گئے۔ اور نئے دور میں موضع ورنو بھی نہ
صرف اس طویل فہرست میں شامل ہو گیا بلکہ حضرت شاہ صاحب کی ذات بابرکات کی وجہ سے اس
کی شہرت کے سامنے باقی سب ماند پڑ گئے۔

خلاصہ یہ کہ ریاست بھر میں جتنے مسعودی ہیں ان کا نصف سے زیادہ حصہ صرف سوپور سے
آگے کامراج اور لولاب میں مجتمع ہے۔

وادی نیلم:..... علاقہ لولاب کے پہاڑوں کے دروں کو شمال مغربی سمت میں عبور کریں تو دریا

کشن گنگا کی وادی پاؤں کے نیچے آ جاتی ہے جو اس دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ قصہ مظفر آباد سے ذرا آگے بڑھ کر دو میل نام کے اس مقام پر ختم ہوتی ہے جو دریائے جہلم اور دریائے کشن گنگا کا سنگم ہے۔ خود قصہ مظفر آباد بھی کشن گنگا میں واقع ہے اس دریا کے دائیں بائیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درجنوں شاخ در شاخ چھوٹی چھوٹی وادیاں ہیں جن سے بہہ کر آنے والی ندیاں دریا کے بڑے دہارے میں شامل ہو جاتی ہیں، پہاڑوں، جنگلوں اور سرسبز چراگاہوں سے گھرے ہوئے متعدد گاؤں ان وادیوں میں پھیلے پڑے ہیں۔

مرکزی وادی کا نصف اعلیٰ خوبصورت زر خیز اور جنگلات کی دولت سے مالا مال ہے۔ قدیم زمانہ میں اس علاقہ کو درادہ کہتے تھے اور آج کل اس کو وادی نیلم کے نام سے پکارتے ہیں درادہ کے علاقہ پر بمبہ قوم کے مورث اعلیٰ راجہ مظفر خان بانی شہر مظفر آباد کے اخلاف بارہویں صدی ہجری سے طویل مدت تک حکمران رہے ہیں آج سے کوئی سو سال پہلے راجہ مظفر خان کا پوتا راجہ منصور خان اور بعد ازاں اس خاندان کا آخری حکمران راجہ شیر احمد خان یہاں راج کرتا تھا یہ خود مختار راجے جو کبھی سلطان اور کبھی راجہ کے خطاب سے مخاطب ہوتے تھے، برائے نام حد تک دربار کشمیر کے تابع اور ماتحت اور تصور ہوتے تھے مگر عملاً ان کو اپنے علاقہ کے سیاہ و سفید میں آزادی کامل حاصل تھی۔

راجہ شیر احمد خان کی بغاوت:..... ۱۲۸۲ء تا ۱۸۶۵ء میں جب مہاراجہ رنبیر سنگھ والئی کشمیر تھا تو راجہ شیر احمد خان نے سرینگر راج کی اس برائے نام ماتحتی سے بھی آزاد ہو جانے کی کوشش میں بغاوت کی، مگر اس کی فوجی قوت ریاست کشمیر کی منظم اور مکمل مسلح افواج کے مقابلہ میں بہت کم تھی، اس لئے اس کی یہ جرات رندانہ کامیاب نہ رہی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے نہ صرف علاقہ درادہ ہی راجہ شیر احمد خان سے چھین لیا، بلکہ اس کو وہاں کے گھربار سے محروم کر کے گلگام (ضلع انت ناگ) کے قریب یاری پورہ نامی گاؤں میں نظر بند رکھا، اور گزراہ کے لئے دو تین گاؤں کی آمدنی بطور جاگیر دے دی۔ چنانچہ راجہ شیر احمد خان موصوف کی اولاد کے لوگ اب تک وہاں موجود ہیں۔

الغرض ۱۲۸۲ھ سے وادی نیلم مکمل طور سے سرینگر کے ماتحت علاقہ بن گیا اور ۱۹۴۷ء میں کشمیر پر جھگڑے کی وجہ سے از سر نو اس کا انقطاع ہو گیا اور سیز فائر لائن کے معاہدات کے نتیجے میں آج اس کا اکثر حصہ آزاد کشمیر کی تحصیل آٹھ مقام میں شامل ہے۔ البتہ دریائے کشن گنگا کے مشرق میں جو چند گاؤں واقع ہیں، وہ اس وقت بھی سرینگر کے تصرف میں ہیں۔

قاضی شاہ عبدالکبیر:..... ڈوگرہ راج سے قبل سکھ راج کے زمانہ میں لولاب سے نکل کر حضرت شاہ صاحب کے دادا مولانا شاہ عبدالکبیر جب وادی نیلم کے موضع لوات میں مقیم تھے، تو راجہ

منصور نے آپ کے علم و فضل اور عوام پر اثر و رسوخ کو دیکھ کر تو راجہ منصور خان نے آپ کو اپنی سلطنت کا قاضی مقرر کیا تھا جنہوں نے راجہ شیر احمد خان کے وقت وہیں وفات پائی۔ اس واقعہ سے کچھ سال قبل لولابی مسعودیوں کی دوسری شاخ کے ایک بزرگ شاہ محمد صالح بھی لولاب کے موضع سایہ ون سے گھر بار ترک کر کے وادی نیلم کے موضع اوات میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی اولاد کو اس علاقہ میں بہت کچھ عروج نصیب ہوا اور علاقہ بھر میں اشاعت اسلام اور تعلیم دین کے کام میں شاہ عبدالکبیر اور شاہ محمد صالح کی اولاد و احفاد کو پیشوائی کا رتبہ حاصل رہا اور آخری دور میں یعنی ۱۹۳۱ء کی تحریک کے بعد نہ صرف وادی نیلم کے علاقوں اور ضلع مظفر آباد میں بلکہ ریاست کشمیر کے دیگر اضلاع میں بھی سیاسی بیداری پھیلانے کا سہرا جن لوگوں کے سر باندھا جاسکتا ہے ان میں ان دونوں بزرگوں کی ذریات میں سے ایسے لیڈر دستیاب ہوئے جن کے شاندار کارنامے اور قربانیاں تاریخ کے صفحات پر نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔

بچہ نامت خوانم؟..... حضرت مولانا انور شاہ صاحب اور آپ کے اسلاف کے بارے میں یہ تفصیلات امید ہے کہ کافی متصور ہوں گی آخر میں یہ عرض کرنا مناسب نہ ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب نے چونکہ دیوبند میں مستقل قیام فرمالیا اور آپ ہمیشہ کے لئے وہیں کے ہو کر رہ گئے اس لئے اب حضرت شاہ صاحب کے وطن کے بارے میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنے ذوق کے مطابق سرینگر کے محلہ نرورہ، شمالی کشمیر کے علاقہ ورنو لولاب، ضلع مظفر آباد کی وادی نیلم کے موضع اوات اور یو۔ پی کے ضلع سہارنپور کے قصبہ دیوبند میں سے جس مقام کو چاہیں آپ کا وطن قرار دے دیں۔ نروری، لولابی، مظفر آبادی، کشمیری اور دیوبندی، جس وطنی نسبت کو آپ کے اسم گرامی کے ساتھ پیوند کرنا چاہیں، کر لیں۔

اے کہ تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم

شاہ صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت

بالائے سرش ز ہوش مندی :..... اللہ تعالیٰ کے ہاں سے حضرت شاہ صاحب دل و دماغ کے غیر معمولی کمالات ساتھ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ آپ ایام طفولیت سے ہی نہایت ذہین تھے اور اپنے ہم عمر بچوں کے مقابلہ میں غیر معمولی ذکاوت و فطانت کے مالک تھے اور شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کے ضرب المثل اور بار بار تکرار شدہ اس شعر کے آپ اصدق المصدق تھے

بالائے سرش ز ہوش مندی ☆ می تافت ستارۂ بلندی

ان خدا داد اوصاف کو صحیح نشوونما دینے کے لئے آپ کے ماہر نفسیات اور علم فراست کے نور سے منور والد ماجد نے ایام رضاعت سے ہی آپ کی ذہنی تربیت کا خاص خیال رکھا۔ جو نہی گویائی شروع ہوئی تو آپ کو کلمات طہیات اور تہلیل و تہجید یاد کرائے گئے جب آپ تین چار سال کے ہوئے تو اکثر اوقات اپنے والد بزرگوار کے اذکار و اور دور و خوانی کے اوقات میں موصوف کی جائے نماز کے پاس بٹھائیے جاتے تھے۔ جو الفاظ آپ کے کان سنتے وہ آپ کی زبان سے جاری ہو جاتے۔

بسم اللہ خوانی:..... خاندانی رواج کے مطابق ٹھیک چار سال، چار ماہ اور چار دن کی عمر میں بسم اللہ خوانی کی تقریب کے ساتھ آپ کو والد صاحب نے قرآن شریف پڑھانا شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ کی عزایات و عطیات کی ایسی بارش ہوئی کہ چھ برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے آپ نے قرآن شریف کی ہفتہ تعلیم کے علاوہ فارسی زبان کے اس زمانہ میں مروج نصاب کی ابتدائی کتابیں نام حق، کریمہ و پند احمد شیخ عطار اور ایسے ہی چند چھوٹے بڑے رسالے اور فارسی کی صرف و نحو کے قواعد دستور الصیان وغیرہ ختم کر لئے۔ اور اس کے بعد عربی زبان میں علم فقہ کی ابتدائی کتابیں منیۃ المصلیٰ اور قدوری وغیرہ کے ساتھ فارسی میں گلستان و بوستان وغیرہ پڑھنے لگے اور آپ کی تعلیم کے ابتدائی مراحل نہایت تیز رفتاری کے ساتھ طے ہونے لگے، پڑھانے والا پڑھاتے پڑھاتے تھک جاتا مگر آپ کا مطالبہ ہل من مزید جاری رہتا اور جو کچھ ایک بار پڑھ لیا وہ ہمیشہ کے لئے حافظہ میں کالچش فی الحجر محفوظ ہو جاتا۔ جس دور میں دوسرے بچے کتاب کے متن اور اصل الفاظ کا بھی پورا پورا ساتھ نہیں دے سکتے، آپ عبارت سے پیدا ہونے والے نکات اور کتاب کے حواشی پر خود غور و فکر میں مصروف پائے جاتے۔

فطری عادت موشگافی:..... آپ کے والد ماجد مولانا معظم صاحب کا بیان ہے کہ:

”جب انور شاہ نے حنفی فقہ کی مشہور و معروف کتاب مختصر القدوری، مجھ سے پڑھنی شروع کی تو مجھ سے بدوران درس بعض ایسے مسائل کے متعلق سوالات پوچھتے تھے کہ مبسوط کتابوں کے مطالعہ کے بغیر جن کا جواب دینا مشکل ہوتا ہے ہر چند میں انہیں ان موشگافیوں سے روک کر صرف کتاب کے متن کو قابو میں لانے کی تلقین کرتا تھا، لیکن محض اپنی کتاب کی عبارت کے مفہوم تک محدود رہ کر چلنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔“

نو نہال انور کا بر عصر کی نظر میں.....

(۱) مولانا معظم صاحب سے منقول ہے کہ: ”اس زمانہ میں تبلیغ دین اور وعظ خوانی کو میرے

مشاغل میں اولیت حاصل تھی۔ علاقوں میں دورہ کر کے گاؤں گاؤں دعوے پڑھنے اور بیماری و مریدی کے لوازمات سرانجام دینے میں میرے اوقات کا بیشتر حصہ صرف ہو جاتا تھا اور میرے پاس انور شاہ جیسے ذہین طالب علم کی حق ادائیگی کے لئے وقت نہ بچتا تھا اور اندیشہ تھا کہ بچے کی تعلیم کو نقصان نہ پہنچے۔ اس لئے میں نے اس کے شوق حصول علم اور خداداد ذکاوت و ذہانت کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اس کی تعلیم کی ذمہ داریاں اپنے ایک بے حد متقی دوست اور جید عالم کے سپرد کر دیں مگر ان کو بھی انور شاہ سے یہی شکایت رہی کہ وہ اپنے سبق کے اصل مسائل تو سرسری اشاروں سے ہی سمجھ لیتے ہیں اور اس کے بعد اندیشہ ہائے دور و دراز کی دنیا میں پہنچ کر بعض اوقات اپنے سوالات سے معلم کو پریشان کر ڈالتے ہیں۔

(۲) حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک بھائی یلین شاہ بھی شاہ صاحبؒ کے شریک درس تھے جو عمر میں آپ سے دو تین سال بڑے تھے اور ذہانت و فطانت میں بڑی حد تک آپ ہی کی طرح تھے۔ وادی نیلم کے ایک گاؤں کیان میں اس زمانہ میں ایک بڑے خدا دوست اور مشہور عارف حضرت میاں نظام الدین صاحبؒ نقشبندی و مجددی رہتے تھے جو نقشبندی اکابر کے دستور کے مطابق نہایت متشخص محتاط اور متقی بزرگ تھے۔

میاں نظام الدین صاحبؒ اپنے مرشد خواجہ محمد صدیق صاحبؒ مجددی کے مزار واقع موضع ماگام ہندوارہ (علاقہ کامراج) میں حصول فیض کے لئے کبھی کبھی آیا جایا کرتے تھے، کسی ایسے ہی موقع پر آپ اس علاقہ کے مبلغ اسلام جاوڑ سلسلہ سہروردیہ کرمانیہ کے پیر مولانا معظم شاہ صاحبؒ سے بھی ملاقات ہوئے۔ بدوران ملاقات مولانا معظم صاحبؒ نے اپنے دونوں بچوں یلین شاہ اور انور شاہ کو اشارہ کیا کہ وہ عارف وقت جناب میاں نظام الدین صاحبؒ کی خدمت میں سلام اور تعظیم بجالائیں اور آپ کی دعائیں لیں۔ عارف نے دونوں کے سر پر اپنی محبت و شفقت کا ہاتھ پھیرا اور دونوں سے ان کے اسباق کے بارے میں پوچھتے رہے۔ میاں صاحبؒ اپنے سوالات کے برجستہ جوابات پا کر بہت خوش ہوئے اور اس کے بعد مولانا معظم صاحبؒ سے مخاطب ہو کر دو میں سے چھوٹے یعنی انور شاہ کے بارے میں یہ خوش خبری سنائی کہ ان شاء اللہ یہ اپنے وقت کے ان علماء میں سے ہوں گے جن سے دنیاۓ اسلام کو فیض پہنچے گا اور سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو فروغ ملے گا۔

(۳) اسی طرح آپ کے عہد طفولیت کے زمانہ کا ایک واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ منطق اور نحو کے بعض ابتدائی رسائل مثلاً ایسا غوجی، قال اقول، مرقات اور میزان منطق وغیرہ

کا مطالعہ کر رہے تھے، اتفاقاً ایک بڑے عالم اس وقت آپ کے والد صاحب کے پاس ملاقات کے لئے آ گئے۔ ان عالم صاحب نے شاہ صاحب کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گئے کہ ان کتابوں پر خود اس شخص سے طالب علم (یعنی انور شاہ) نے نہایت برکت قسم کے حواشی لکھ رکھے تھے۔ اس نو نہال کی یہ ذکاوت، تیز ذہن اور فہم رسا کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے اور بے اختیار پکار اٹھے کہ نظر بد دور! یہ بچہ تو اپنے وقت کا رازی اور اپنے زمانہ کا غزالی ہو گا۔

مہدویت کا چرچا:..... الغرض علم حاصل کرنے کا شوق و ذوق اور عطیہ الہی بشل فہم، ذکاوت و ذہانت اور قوت حافظہ کے ساتھ سلامتی طبع، حسن اخلاق اور اعمال صالحہ کی دولتیں بھی شروع ہی سے آپ کو دافر مقدار میں نصیب ہو گئی تھیں اور ان غیر معمولی اوصاف کی شہرت بھی ان دنوں ہر طرف پھیل گئی۔ ایک نو عمر بچے میں ایسے بلند خصائل کو دیکھ کر کشمیر کے بعض وہ لوگ جو ظلمات زمانہ سے نجات کے لئے امام مہدی کے انتظار میں رہتے ہیں عام طور پر یہ شبہ کرتے تھے کہ کہیں آپ ہی مہدی موعود نہ ہوں۔

چونکہ اس قسم کی شہرت خلاف حقیقت ہونے کے علاوہ فوری نقصانات اور نا دیدہ مصائب کا موجب بھی بن سکتی تھی اس لئے آپ کے والد محترم اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کو عوام کی اس غلط فہمی کی تردید میں بہت کچھ محنت کرنی پڑی تھی اور پھر بھی خوف لگا رہتا تھا کہ یہ مہدویت کی شہرت کسی نامعلوم پریشانی کا سبب نہ بن جائے۔ اور کہیں ہونہار بچے کے علمی اور عملی کمالات کی طرف سفر جاری رکھنے کا راستہ ہی مسدود نہ ہو جائے چونکہ مشیت ازلی یہی تھی کہ آپ سے اسلام کی خدمت اور احیائے سنت نبوی ﷺ کا ہی کام لیا جائے اس لئے اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ سب خطرے ٹل گئے۔

حضرت شاہ صاحب نے خود ایک موقع پر فرمایا تھا کہ میں بارہ سال کی عمر میں فتویٰ دیئے پر قادر ہو گیا تھا۔ اور نو سال کی عمر میں علم فقہ و علم نحو کی مطولات کا مطالعہ کر کے استاد کی مدد کے بغیر بعض مسائل کو حل کر لیتا تھا۔ سچ ہے کہ:

ایں سعادت بزور بازو نیست

نا نہ بخشہ خدائے بخشہ

ابتدائی تعلیم کی تکمیل:..... ذرا بچہ طفولیت کے بارے میں مختلف روایات کو جمع کرنے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ بارہ سال کی عمر تک اپنے گھر میں اپنے شیخ اور فاضل اجل والد ماجد سے اور گھر کے قرب و جوار میں ان خوش قسمت علماء سے جن کو آپ کے اساتذہ کی فہرست میں شمار ہونے کا فخر ملنے والا تھا، آپ

نے زبان فارسی، گلستان دیوستان سعدی اور پنج گنج نظامی اور عربی کی بنیادی صرف و نحو اور علم فقہ کی ابتدائی کتابیں ختم کر لیں۔ تعلیم کے اس درجے تک جن اساتذہ سے آپ نے استفادہ کیا ان میں سے اکثر کے نام اب کسی کو معلوم تک نہیں۔ البتہ مولانا معظم صاحب کے علاوہ اساتذہ کے زمرے میں مولوی عبد الجبار صاحب اور مولوی غلام محمد صاحب (المعروف مولوی محمد جندل ساکن سپہ پورہ متصل کپواڑہ) دواپے بزرگ ہیں جن کا تذکرہ تو کہیں کہیں ملتا ہے مگر پوری طرح یہ تفصیل دستیاب نہیں ہوئی کہ ان میں کس نے آپ کو فارسی اور صرف و نحو کی کون سی کتابیں پڑھائیں۔ البتہ مؤرخ منشی محمد الدین فوق کی تاریخ اقوام کشمیر اور مشاہیر کشمیر وغیرہ کی ورق گردانی سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبد الجبار صاحب موصوف علاقہ کامراج میں فارسی کے بڑے ماہر اور زبردست عالم تھے۔ اس تاریخی اطلاع سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ شاہ صاحب نے فارسی زبان کی تعلیم مولوی عبد الجبار صاحب سے حاصل کی ہوگی اور مولوی غلام محمد صاحب سے صرف و نحو کی کتابیں پڑھی ہوں گی۔ واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم۔

لیکن جہاں تک علم فقہ کا تعلق ہے، چونکہ مولانا معظم شاہ صاحب اپنے وقت کے بڑے مفتی، واعظ اور مبلغ تھے، آپ کو اگرچہ علم حدیث سے مزاولت کم تھی، لیکن تفسیر قرآن اور کتب فقہ حنفی پر آپ کی نظر وسیع تھی، اس لئے اس وقت تک فقہ کی جس قدر بھی تعلیم شاہ صاحب کو میسر ہوئی تھی وہ زیادہ تر والد ماجد ہی کا فیضان نظر تھا۔

رب زدنی علما:..... بارہ سال کی عمر میں جو کچھ آپ کو حاصل ہو گیا تھا وہ اگرچہ اس زمانہ میں آپ کے ہم عصر پیر زادوں اور مولوی زادوں کے معیار ضرورت کے مطابق کافی تصور ہو سکتا تھا لیکن آپ کی ہمت بلند اس پر اکتفا کرنا کب گوارا کر سکتی اس لئے آپ کی نگاہ میں اور آپ سے بھی زیادہ آپ کے عالی دماغ والد بزرگوار کی نگاہ میں یہ اس سمندر میں سے چند قطرات تھے جس کو سینہ ہم چوں آئینہ میں سمیٹ لینے کی استعداد خدائے علیم و قدیر نے شاہ صاحب کو از زانی فرما رکھی تھی۔ بنا براں یہ طے ہو گیا کہ آپ کی تعلیم جاری رکھی جائے اور جہاں تک حد امکان میں ہے حصول علم کا سلسلہ درجہ اکملیت تک پہنچنے سے پہلے کا نا نہ جائے۔

حصول علم ۱۳۰۵ھ ہجری کے لئے سفر ہزارہ

مگر اب سب کے سامنے یہ سوال درپیش تھا کہ باپ کی فاضلانہ تمناؤں اور بیٹے کے عبقریانہ دل و دماغ کے امکانات کے مطابق سلسلہ تعلیم کو اونچے درجے تک جاری رکھنے کے لئے کونسا

راستہ اختیار کیا جائے؟

یہ ۱۳۰۵ھ کا زمانہ ہے اور وادی کشمیر اس زمانہ میں غلامی کے مارے اپنی باقاعدہ دینی درسگاہوں سے قریب قریب خالی ہو چکی تھی، کہیں کہیں انقلابات زمانہ سے بچا ہوا کوئی صاحب علم اگر تعلیم دے رہا تھا تو وہ اس کی شخصی کوشش تھی، جو پڑھنے والوں کی ضروریات کتاب کاغذ اور خوراک و رہائش کا بندوبست کی حد تک جانے سے عاجز تھی، وادی لولاب اور آس پاس کے دوسرے مقامات کا تو ذکر ہی کیا، کشمیر کا مایہ ناز شہر سرینگر جو کسی زمانہ میں علوم و فنون کا گہوارہ تھا، اب مدت سے سونا پڑا تھا، تیرہویں صدی ہجری کے پیہم سیاسی انقلابات اور آئے دن کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے سرینگر کی قدیم دانشگاہوں کے چشمہ ہائے صافی یا تو خشک ہو گئے تھے یا کس پرسی کے اندھیروں میں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ لے دے کر اب کشمیر کے مشتاقان علم و عرفان کے لئے خطۂ کشمیر سے باہر نکلی اور ہزارہ میں علم و دانش کے چشمے تھے جن کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ ریاست کشمیر کا مغربی کنارہ ضلع ہزارہ کے ساتھ ملحق ہے اور ہزارہ کشمیر کے مغرب میں کسی حد تک جنوب مغرب میں واقع ہے، موجودہ صوبہ سرحد کے اس ضلع کی علمی درسگاہیں اس زمانہ میں اہل کشمیر کے لئے کشش کا موجب تھیں۔ چنانچہ اپنے حصول تعلیم کے وقت خود مولانا محمد معظم شاہ صاحب نے بھی وادی نیلم ضلع مظفر آباد سے نکل کر علاقہ ہزارہ ہی کی درسگاہوں سے علم حاصل کیا تھا۔ ضلع ہزارہ اور ضلع مظفر آباد جغرافیائی لحاظ سے آپس میں متصل ہیں اور مشترک رسم و رواج، ایک جیسی زبان اور ملتی جلتی آب و ہوا کے علاقے ہیں۔

ضلع ہزارہ جانے کا خاص سبب:..... تعلیم کے لئے سرینگر پر ہزارہ کو ترجیح دینے کی متذکرہ صدور جوہات کے علاوہ سب سے مؤثر وجہ یہ تھی کہ جس وقت حضرت شاہ صاحب کو حصول تعلیم کے لئے گھر سے باہر بھیجنے کی تدبیر ہو رہی تھی اس وقت آپ کے چار قریبی رشتہ دار، آپ کے چھوٹے زاد بھائی حیدر شاہ، آپ کے چچا زاد بھائی عبدالجید شاہ اور دیگر دور رشتہ دار پیر مختار شاہ اور عبدالاحد شاہ فرزند ان شاہ محمد صالح ضلع ہزارہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

نور شاہ کے والدین اپنے بچے کی دیکھ بھال اور رفاقت کے معاملہ میں ان پر بھروسہ کر سکتے کیونکہ یہ چار رشتہ دار عمر اور تعلیم میں شاہ صاحب سے سینئر تھے اور اپنی تعلیمی مسافرت کے طویل تجربہ کے لحاظ سے اس قابل تھے کہ گھر سے دور ضلع ہزارہ کی اولین بے وطنی کے دور میں اپنے نو عمر بھائی نور شاہ کی سرپرستی کر سکیں۔ ان امور کو پیش نظر رکھنے کے بعد مولانا معظم شاہ صاحب کو نور شاہ کی آئندہ تعلیم کے بارے میں یہ فیصلہ لینے میں کوئی زیادہ دقت محسوس نہ ہوئی کہ آپ کو ہزارہ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ ۱۳۰۵ھ میں عمر (۱۳ سال) اطلبوا العلم ولو کان بالصین کے اس عملی

مصدق کو اپنے والد گرامی مولانا معظم صاحب نے ہزارہ روانہ کر دیا اور اپنے بھتیجے مولوی عبد المجید شاہ کو تاکید کر دی کہ وہ انور شاہ کی ہر طرح حفاظت اور نگہداشت رکھیں۔ اس طرح سے شاہ صاحب نے لولاب کے دلکش نظاروں، بلند آہنگ آبشاروں اور بے نظیر مرغزاروں پر ہزارہ کی تعلیمی مسافرت کو ترجیح دی۔

ہزارہ کی درس گاہیں اور حضرت سید احمد شہیدؒ

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ضلع ہزارہ کے کثیر التعداد دینی مدارس کا مختصر سا تعارف کرا دیا جائے اور جن باتوں نے اس زمانہ میں ہزارہ کو ایک قسم کا یونان بنا ڈالا تھا۔ ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہادت کے واقعہ مئی ۱۸۳۱ء سے متصل قبل ۱۸۲۷ء میں صوبہ سرحد کے آزاد علاقہ میں اپنی تحریک کے مراکز قائم کر کے جو انقلابی کام شروع کیا تھا، کفار کے ساتھ جہاد بالسیف اس کا ایک حصہ تھا اصل کام اس پسماندہ علاقے میں دینی تعلیم اور روحانی و اخلاقی تربیت کو فروغ دینے کا تھا اور تحریک کے یہ سب کام پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ پشاور میں غداران وقت کی دغا بازی کے باعث حضرت سید احمد شہید اور آپ کے رفقاء کو آزاد یا غستانی علاقہ کے پہاڑوں کی طرف پسپا ہونا پڑا، یہ علاقہ ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ کے شمال مغرب میں تھا (سوات، بنیر انب در بند، شکہاری، اور بالا کوٹ تک تمام پہاڑی وادیاں اور کوہستانی بستیاں مل کر یا غستان کہلاتی تھیں) اس لئے حضرت شہید کی تحریک کے آخری دور کا ہزارہ کے ان حصوں پر گہرا اثر پڑا جو بکھلی، مانسہرہ، ایبٹ آباد اور ہری پور سے ہوتے ہوئے چھچھ کے بھونکی گاڑاں اور تربیلہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں کے ہزار ہا لوگ آپ کے مجاہدین کے ساتھ جا کر شامل ہو جاتے رہے۔ معرکہ بالا کوٹ میں یہی خام تربیت یافتہ اور نووارد رضا کار مجاہدین کے دوش بدوش تھے، ان کے اخلاص کے باوجود تربیت میں ان کی خامی کمزوری کا باعث ثابت ہوئی، جس کا افسوسناک نتیجہ حضرت سید احمد اور مولانا شاہ اسماعیلؒ اور دیگر رفقاء کی شہادت کی صورت میں برآمد ہوا۔

الغرض مجاہدین میں مولانا شاہ اسماعیلؒ اور مولانا عبدالحیؒ اور دوسرے درجنوں علماء شامل تھے جو رات دن وعظ و تبلیغ اور درس و تدریس میں معروف رہتے تھے۔ اس لئے ان سے اس علاقہ کے اہل علم کو فیض حاصل ہوتا رہا اور ایک نئی فضا پیدا ہو گئی اور ہر طرف قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر دینی علوم کا چہ چا ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ ہر بڑے قصبے میں تعلیم دین کی درس گاہیں قائم ہو گئیں۔

معمر کہ بالا کوٹ:۔۔۔ جب ۶ مئی ۱۸۳۱ء اور ۱۲۳۶ھ کو بالا کوٹ کی لڑائی میں حضرت سید احمد، مولانا شاہ اسماعیل شہید اور ملت کے دیگر بڑے بڑے رہنماؤں کی شہادت مقدرہ کا واقعہ پیش آیا تو جہاد بالسیف کے کام کو دل ہلا دینے والا صدمہ پہنچا لیکن تبلیغ دین اور درس و تدریس کا کام پہلے سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ شروع ہو گیا اور خدا کے فضل و کرم سے اس علاقہ میں تعلیم دین اور تربیت روحانی جس کی ابتداء حضرت سید شہید کے طفیل ہو چکی تھی، نہ صرف جاری رہی بلکہ وہ جوش و اب تک جہاد کے لئے مالی و جانی قربانیوں کی صورت میں وقف تھا اب المضاعف ہو کر بطور تلافی باقات تعلیم دین و تربیت روحانی پر صرف ہونے لگا اور چند برسوں کے اندر اندر جہاد جس گاہیں قائم ہو گئیں جو سو سال سے زائد مدت تک پورے انہماک کے ساتھ اپنا کام کرتی رہیں۔

صوبہ سرحد کا یونان:۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ تیرہویں صدی ہجری کے نصف ثانی سے چودھویں صدی ہجری کے نصف اول تک ضلع ہزارہ، یوپی کے اضلاع سہارنپور، مظفرنگر اور میرٹھ کی طرح عربی و دینی مدارس کی کثرت کے لئے دور دور تک مشہور و معروف اور انگشت شمار رہا ہے۔ خاص کر اس ضلع کی تفصیلات ایبٹ آباد اور مانسہرہ اور وادی بکھلی کے درجنوں قصبات اور بڑے قریے علم دین کی درس گاہوں اور علوم و فنون کے ماہر علماء پر فخر کرتے تھے، ان عجیب و غریب درس گاہوں کو یونان کے مشائخ کی درس گاہوں سے ایک خاص مشابہت تھی اور یہاں علوم کو زبانی یاد کرنے پر زور دیا جاتا تھا۔

ہزارہ کی دانش گاہوں میں سے (۱) قصبہ مانسہرہ (۲) بٹہ (۳) خاکی کوئی بالا کوٹ شکہاری وائے بانڈی ڈھونڈان دھموٹڑ کا کول نواں شہر وغیرہ میں ایسی مشہور درس گاہیں قائم تھیں جن کی اپنی اپنی خصوصیات تھیں۔ کہیں صرف دُخو کا چر چا تھا اور کہیں منطق اور فلسفہ کا، کسی جگہ فقہ اور اصول کی شہرت تھی اور کسی جگہ تفسیر وحدیث کی۔ چونکہ تحصیل مانسہرہ کی سرحدیں کشمیر کے ضلع مظفر آباد کے ساتھ ملی ہوئی ہیں اس لئے کشمیر کے طلباء اور خاص کر ضلع مظفر آباد کے تشنگان علم ان درس گاہوں سے اپنی علمی پیاس بجھانے میں پیش پیش تھے۔ اور چونکہ یہ درس گاہیں اپنی پیدائش کے لحاظ سے حضرت سید احمد شہید کی تحریک اصلاح کی پیداوار تھیں، اس لئے ان کا ماحول بے حد مستقیم تھا کیا اساتذہ اور کیا طالب علم، سبھی لوگ جدوجہد، صبر و قناعت اور ایثار کے مجسمے اور حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت میں لا ینحافون لومة لائم کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتے تھے۔

ایک فروگزاشت:۔۔۔ ضلع ہزارہ کے ان درجنوں مدارس میں سے حضرت شاہ صاحبؒ نے کس مدرسے میں تعلیم حاصل کی اور کن اساتذہ سے استفادہ کیا، اس کی تفصیلات معلوم کرنا حضرت شاہ

صاحب کی وفات کے فوراً بعد اور تقسیم ملک سے مابقی تک آسان کام تھا مگر بد قسمتی سے اس طرف آپ کی سوانحیات پر قلم اٹھانے والے بزرگوں میں سے کسی نے بھی مناسب وقت پر توجہ نہیں دی اور اب اس راستے میں زمان و مکان کا دو گونہ بعد حائل ہو چکا ہے اگر اس سمت میں اب کوئی کوشش کی بھی جائے تو لا حاصل ہے۔ اگر ۱۹۳۲ء یعنی حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد ان معلومات کے حصول کی کوشش کی گئی ہوتی تو کامیابی چنداں مشکل نہ تھی کیونکہ آپ کی وفات کے بعد بھی قریباً پندرہ سال تک ہندوستان ایک متحدہ ملک تھا اور خود ضلع ہزارہ میں بھی شاہ صاحب کے فاضل شاگردوں کی خاص تعداد تھی، جن میں مولانا عبدالرحمان اور مولانا غلام غوث جیسے لائق و فائق اشخاص شامل تھے، یہ حضرات ہزارہ کی قدیم درس گاہوں اور ان درس گاہوں کے معلمین کا پتہ چلا سکتے تھے اور شاہ صاحب کے ہزارہ والے اساتذہ کے متعلق تحقیقی مواد فراہم کر سکتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد جو مزید زمانہ بیت گیا اس سے دور میں وہاں کے عربی اور دینی مدارس پر کیا مبنی اس کا تو ہم کو علم ہی نہیں ہو سکتا اور جن لوگوں سے یہ حقائق جاننے کی امیدیں کی جاسکتی تھیں وہ اب وہاں بھی کہاں باقی رہے ہوں گے اور اس راستے میں حائل سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان اور پاکستان دونوں کے وجود میں آتے ہی ان دو کے درمیان اختلافات کی جو فلیج حائل ہو گئی (اور جو بد قسمتی سے آج تک چلی آتی ہے) اس نے ان دونوں کے عوام کے لئے یہاں اور وہاں سے تبادلہ معلومات کے دروازے ہی بند کر دیے۔ تقسیم ملک سے کسی دوسرے مقصد کو ممکن ہے کوئی فائدہ پہنچا ہو لیکن جہاں تک علم بحیثیت علم کا تعلق ہے اس کا یہاں بھی اور وہاں بھی نقصان ہی نقصان رہا۔

ایک قیاس اور قرینہ:..... قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب نے ہزارہ کے کسی ایک ہی مدرسے سے فائدہ نہیں اٹھایا ہوگا کیونکہ وہاں کی درس گاہیں مختلف علوم کی سپیشلسٹ (Specialist) درس گاہیں تھیں۔

طریقہ تعلیم کی خصوصیات:..... جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں عرض کیا کہ ان میں سے کسی درس گاہ میں عربی کی صرف و نحو کے ماہرین تھے اور کسی میں فقہ اور اصول فقہ کے باکمال لوگ تھے، کہیں منطق اور فلسفہ کا چرچا تھا اور کہیں فقہ، اصول فقہ اور حدیث و تفسیر کا، اس لئے طالبان علم ایک فن کو ایک درس گاہ میں حاصل کر کے دوسرے فن کے لئے دوسری درس گاہ میں چلے جاتے تھے۔ لازمی بات ہے کہ حضرت شاہ صاحب کو بھی ایسا ہی کرنا پڑا ہوگا۔ کیونکہ آپ نے قیام ہزارہ کے دوران صرف و نحو، بلاغت، منطق، فلسفہ، فقہ اور اصول فقہ وغیرہ علوم کی درمیانہ اور اونچے درجوں کی مروجہ اور اہم کتابیں جو ہزارہ کی درس گاہوں کے نصاب میں شامل تھیں، پڑھ ڈالی تھیں۔ مثلاً علم

صرف میں مراح الارواح اور شافیہ، علم نحو میں ہدایہ النحو، کافیہ، الطیبہ ابن مالک اور شرح لما جاءی، علم بلاغت میں مختصر المعانی اور غالباً مطول بھی۔ منطق میں شرح تہذیب، قطبی اور سلم العلوم، فلسفہ میں ہدیہ سعید، مصیذی اور صدر الفتہ میں کنز الدقائق اور شرح وقایہ، علم اصول فقہ میں اصول الشاشی اور نور الانوار اور حدیث میں مشکوٰۃ شریف۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کے پہلے سال آپ نے جن کتابوں کا امتحان دیا ان پر نظر ڈالنے سے درس نظامی کے نصاب کی واقعیت رکھنے والوں پر خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے کہ درسیات کی مشکل ترین اور محنت طلب کتابیں شاہ صاحب نے ضلع ہزارہ کی درسگاہوں میں مکمل کر لی تھیں۔ اور یہ کتابیں اور یہ فنون چونکہ ہزارہ میں مروج دستور العمل کے لحاظ سے کسی واحد درسگاہ میں نہیں بلکہ مختلف درسگاہوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ اس لئے وہاں کے ہر طالب علم کی طرح شاہ صاحب کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ ہر فن کو اس کے خاص ماہرین سے حاصل کرنے کے لئے مختلف درسگاہوں میں داخل ہو کر استفادہ کریں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا ہو گا مگر زمانہ کی رفتار ہزار ہا واقعات کی طرح ہماری مطلوبہ معلومات کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے گئی ہے۔ جو لوگ ان گم گشتہ نقابات کا کچھ اتنا پتہ بتا سکتے وہ ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اب ہمیں کون بتائے کہ ضلع ہزارہ کے کس کس مدرسہ سے اور کس کس استاذ سے حضرت شاہ صاحب نے کن کن علوم میں استفادہ کیا۔ شاہ صاحب کے یہ اساتذہ یقیناً ان علماء میں سے ہوں گے جن کے اپنے اساتذہ کے سلسلہ تلمذ حضرت مولانا شاہ اسماعیل، حضرت مولانا عبدالحی اور حضرت سید احمد شہید کے دیگر رفیق علماء تک پہنچتا ہوگا۔ کاش کہ ان حقائق کی نقاب کشائی ہو سکتی۔

کاکول کی درس گاہ اور مولانا فضل الدین صاحب: بہت کچھ کدوکاوش کے بعد ہزارہ کے اساتذہ میں سے ہمیں حضرت شاہ صاحب کے صرف ایک استاذ مولانا فضل الدین صاحب کا اسم گرامی ہاتھ آیا جو اس علاقہ کے استاذ الاساتذہ تصور کئے جاتے تھے اور مزید یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مولانا فضل الدین صاحب قصبہ کاکول کی درسگاہ میں اکثر علم فقہ اور علم اصول کا درس دیتے تھے اور ان علوم کے شائقین دور دور سے ہدایہ اور توفیق و تکوین اور فخر الاسلام بزدوی کی کتاب اصول کے مشکل مقامات حل کرنے کے لئے ان کے پاس پہنچتے تھے اس لئے یہ راز اس حد تک منکشف ہو جاتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کو علم فقہ اور علم اصول کے ساتھ جو گہرا تعلق تھا وہ مولانا فضل الدین صاحب کا فیض تھا۔

دارالعلوم دیوبند کی ۱۳۱۱ھ کی روئیداد بتاتی ہے کہ دارالعلوم میں داخل ہونے اور سال بھر تعلیم

حاصل کرنے کے بعد جو پہلا سالانہ امتحان شاہ صاحب نے دیا اس میں علم فقہ کی ہدایہ اولین اور علم اصول کی حاشی شامل تھیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ شرح وقایہ جو حدیث سے پہلے پڑھائی جاتی تھی اور نور الانوار جو حاشی کی پیش رو ہوتی تھی، ان تک درس نظامی کی کتابیں شاہ صاحب نے درس گاہ کا کول اور ہزارہ کی دیگر درس گاہوں میں پڑھائی تھیں۔

علم فقہ اور اصول فقہ میں حضرت شاہ صاحب کو جو غیر معمولی رسوخ حاصل تھا وہ آپ کی مہارت و حدیث علم حدیث سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ اور یہ امر واضح ہو چکا کہ یہ فیض آپ کو مولانا فضل الدین صاحب سے اور ضلع ہزارہ کے دوسرے فقہی و اصولی علماء سے پہنچا تھا۔

مدارس ہزارہ کا طرز تعلیم

طریقہ تعلیم کے لحاظ سے ہزارہ کے مدارس بالکل نرالے تھے۔ وہاں العلم فی الصدور لائق الکتاب کا مشہور جملہ آئین تعلیم کی بنیاد قرار دیا جاتا تھا اور کتاب کو بالائے طاق رکھ کر مسائل فن حفظ کرائے جاتے تھے۔ اگر ہزارہ کی کسی درس گاہ کے قریب سے رات کے وقت کوئی گذرتا تو اس کے کانوں میں طلباء کا اپنا اپنا آموختہ اونچی آواز سے دہرانے اور یاد کرنے کا شور ایک عجیب قسم کی موسیقی بن کر پہنچتا، بعض طلباء کسی گوشے میں بیٹھ کر آموختہ یاد کرنے کے بدلے مدرسے یا مسجد کے صحن میں چلتے رہتے اور اسی گردش میں اپنا سبق با آواز بلند دہراتے جاتے تاکہ نیند پر قابو پا سکیں اور اپنا کام بھی پورا کر لیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ طریق کار مشائخ یونان کی اس عادت سے کتنا ملتا جلتا اور ہم رنگ تھا جس کی وجہ سے ان کا نام ہی مشائخ پڑ گیا۔ مدارس ہزارہ میں یہ بھی دستور تھا کہ کسی فن کی اونچی تعلیم دینے سے پہلے اس فن کی ایک مختصر کتاب کی عبارت طالب علم کو زبانی حفظ کرائی جاتی تھی۔ مثلاً علم صرف میں صرف میرز بانی یاد کرنی ہوتی تھی۔ یہ مسائل صرف پر مشتمل میر سید شریف جرجانی کا مشہور رسالہ ہے۔ مقامی زبان میں اس کا ترجمہ قانونچہ کیہوئی کے نام سے حفظ لرایا جاتا تھا، یہ قانونچہ تو انہیں صرف کا نہایت جامع مجموعہ تھا اسی طرح علم نحو میں کافیہ ابن حاسب اور علم فقہ میں ابوالبرکات نسفی کی کنز الدقائق کا حصہ عبادات لفظاً و معناً حفظ کرایا جاتا تھا درجہ حفظ ہی ان مدارس میں مشکل ترین مرحلہ تھا جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا تھا تو اس کے بعد اس فن کی مطلوبات اور شروح کی تعلیم دی جاتی تھی۔

یہ بہت مفید طرز تھا۔ اس طریق تعلیم کا فائدہ یہ تھا کہ متعلقہ فن کے مسائل پر ہر سمجھدار اور اوسط درجہ کے فہیم طالب علم اگر چھٹی خاصی دسترس حاصل ہو جاتی تھی اور وہ اکثر صورتوں میں اس فن کی

مطلوبات و شروح کے سرسری مطالعہ سے ہی پورے فن کے مسائل پر حاوی ہو جاتا تھا۔

یوں تو شاہ صاحب کے معجزہ قوت حافظہ مختصرات و مطلوبات سب کو ایک بار پڑھ لینے کے بعد آپ کے دماغ میں محفوظ کر لیتی تھی دوسروں کو اگر صرف متن کے الفاظ راتوں کو جاگنے اور لفظ باللفظ اور جملہ بجمہ سو سو بار تکرار کرنے سے یاد ہو جاتے تھے تو آپ کو متن اور اس کی شروح و حواشی دلائل کے ساتھ نظر اول میں ہی مختصر ہو جاتے تھے مگر مدارس ہزارہ کا ہر فن کے ایک مختصر متن کو لازمی طور حفظ کرنے کا طریق تعلیم اس سونے پر سہاگے کا کام دے گیا اور اس نے آپ کی قوت استحضار فنون کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا جس کے نتائج و ثمرات آپ کی معلمانہ حیات میں ہمیشہ نمایاں رہے۔

کاکول:..... قصبہ کاکول جس کا تذکرہ گذشتہ سطور میں متعدد بار آیا، ضلع ہزارہ کی تحصیل، ایبٹ آباد کا ایک پُر فضا اور قدیم قصبہ ہے، جو اس علاقہ کے ایک دوسرے تاریخی مقام دھموڑ اور نوشہرہ کے قریب واقع ہے۔ کاکول اور اور ایبٹ آباد کے درمیان ایک کف دست سرسبز میدان ہے جو قریباً آٹھ دس میل تک چلا گیا ہے۔ بجائے خود ایبٹ آباد بھی اپنی عمدہ آب و ہوا کے لحاظ سے کشمیر کا ایک ٹکڑا نظر آتا ہے۔ موسم گرما میں یہاں کی آب و ہوا قریباً کشمیر کی طرح صحت بخش اور خوشگوار رہتی ہے جس سے لطف اندوز ہونے کے لئے پشاور، راولپنڈی اور لاہور تک کے سیاح آ جاتے ہیں۔ اور سردیوں میں کشمیر سے کسی قدر کم مقدار میں بھی مگر یہاں بھی برف باری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علاقہ ہزارہ کے مدارس میں کشمیری طلباء موسم گرما کے دنوں میں تکلیف محسوس نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب بھی نازک اور نوعمر ہونے کے باوجود ہزارہ کے ان مدارس میں بغیر کسی دقت کے کئی سال تک اپنی تعلیم جاری رکھ سکے اور جب واپس کشمیر آئے تو صحت کے بارے میں آپ کو آب و ہوا کی اجنبیت کے متعلق کوئی شکایت نہ تھی۔

ایبٹ آباد:..... خود ایبٹ آباد متحدہ ہندوستان کے ان نئے شہروں میں سے ہے جو انگریزی حکومت کے دور میں عالم وجود میں آئے ۱۸۴۷ء میں جب لاہور کی سکھ حکومت کے خاتمہ پر ضلع ہزارہ اور صوبہ سرحد کے دیگر اضلاع انگریزوں کے قبضہ میں آئے تو شہر ایبٹ آباد کا اس وقت تک نام و نشان بھی نہ تھا چونکہ سرحد پر قبضہ کے بعد انگریزی حکومت کو آزاد قبائلی علاقوں اور خاص کر ستخانہ کے مقام پر حضرت سید احمد شہیدؒ کے بچے ہوئے مجاہدین کے عوام پر اثر و رسوخ کا خوف لگا رہتا تھا۔ اس لئے برٹش راج کے کارپردازوں نے سرحد کے مقبوضہ علاقہ میں بہت سی فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ ان چھاؤنیوں میں سے ایک چھاؤنی کاکول اور دھموڑ کے جنوب مغرب میں اس خوشنام حصہ میں قائم کی گئی جہاں ایک طرف کھلا میدان ہے اور دوسری طرف جنگل، پہاڑ اور

پٹنہ ہیں۔ بعد میں صوبے کے ایک انگریز حاکم مسٹرایٹ آباد کے نام پر اس جگہ کا نام ایبٹ آباد رکھ دیا گیا، جو اب تک مروج و مشہور ہے، ابتداء میں ایبٹ آباد ایک بازار اور اہل بازار کے چند گھروں، فوجی چھاؤنی میں کام کرنے والے بیروں اور مزدوروں کے کوارٹروں پر مشتمل تھا۔ لیکن ۱۸۴۷ء سے ۱۹۴۷ء تک یعنی پورے سو سال میں یہ بازار اور چھوٹی سی بستی ترقی کرتے کرتے آج ایک بہت بڑا خوبصورت شہر بن گیا ہے۔

پہلے ہزارہ ضلع کے ڈی، سی وغیرہ حاکموں کے دفاتر کا مرکز قصبہ ہری پور ہزارہ ہوا کرتا تھا مگر اب ایبٹ آباد ہی ضلع کا صدر مقام ہے۔ آزادی ہند اور قیام پاکستان کے بعد ایبٹ آباد کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے، اب پہلے سے زیادہ مستحکم فوجی چھاؤنی اور ضلع کی کچھ بیروں کے دفاتر کے علاوہ یہاں بڑے بڑے ہسپتال، مخصوص صحت خانے ہر قسم کے کالج اور کئی ایک کارخانے بھی قائم ہو گئے ہیں۔ اور کاکول تک سارا میدان ان اداروں سے پر ہو گیا ہے، اب ایبٹ آباد کاکول تک پھیل گیا ہے اور کاکول جو پہلے دینی علوم کی درس گاہ کے لئے مشہور تھا آج اس کی شہرت اس ملٹری اکیڈمی کی وجہ سے ہے جس سے ہر سال فوجی افسروں کی نئی کھیپ اپنی تعلیم و تربیت مکمل کر کے برآمد ہوتی ہے۔ وہاں کی وہ عربی درس گاہ جو فقہ اور اصول فقہ کے لئے مشہور تھی، آج کل اس کا کیا حال ہے اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے بد قسمتی سے ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔

ہزارہ سے واپسی اور انقطاع تعلیم کا سال

بہر حال ضلع ہزارہ کے مدارس میں تین سال تک کچھ اپنے ذہن اور کچھ ہر فن کے ماہر اور حاذق اساتذہ کی شفقت سے مولانا انور شاہ صاحب نے اتنے علمی مدارج طے کر لئے جو دوسرے طلباء چھ سات سال میں بھی نہیں کر سکتے اور ۱۳۰۸ میں آپ کافی حد تک اپنی علمی پیاس بجھا کر لولاب واپس آ گئے۔ اب آپ جہاں علوم و فنون سے بہرہ وانی حاصل کر چکے وہاں عمر شریف سولہ سال سے متجاوز ہو چکی تھی اور ذہنی و جسمانی ہر اعتبار سے اب آپ کی شخصیت میں پختگی آ چکی تھی اور مستقبل کے بارے میں ضروری اقدامات میں اب آپ کو اعزہ و اقرباء میں سے کسی کی دیکھ بھال کا احتیاج باقی نہ رہا تھا بائیں ہمد اپنے والد گرامی کی ہدایات و ارشادات کو اب بھی آپ حرز جان تصور کرتے تھے۔

مولوی عبد المجید شاہ:..... ضلع ہزارہ میں شاہ صاحب کے دیگر رفقاء سفر اور رشتہ داروں میں سے تین صاحب حیدر شاہ، مختار شاہ اور عبد الاحد شاہ تو آپ کی واپسی سے بھی قبل ہی تعلیم ختم کر کے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ البتہ آپ کے چچا زاد بھائی مولوی عبد المجید شاہ ہزارہ سے اپنی واپسی

تک آپ کے ساتھ رہے اور واپسی کے بعد گھر جانے کے بدلے تکمیل تعلیم کے شوق میں اسی سال یعنی ۱۳۰۸ھ میں ہزارہ سے سیدھے دیوبند پہنچ کر دارالعلوم میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ ۱۳۰۹ھ میں مولوی عبد المجید صاحب موصوف نے تفسیر جلالین و بیضاوی مختصر المعانی و مطول اور ملا حسن و معینی پڑھ کر ۱۳۱۰ھ میں ان کتابوں کا امتحان دیا۔ (ملاحظہ ہو روانہ دارالعلوم دیوبند ۱۳۱۰ھ)

چونکہ مولوی عبد المجید شاہ حضرت شاہ صاحب کے مشفق بھائی و رفیق سفر اور نہایت ہی خیر خواہ تھے۔ اور دارالعلوم دیوبند میں آپ کے پیشرو اور اپنے خاندان میں سے پہلے فاضل دیوبند تھے اس لئے مولوی عبد المجید شاہ کے تذکرہ کے بغیر مولانا نور شاہ کا تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ ہزارہ سے واپسی کے بعد اگرچہ ۱۳۰۹ھ کا سال شاہ صاحب نے اپنے وطن میں ہی بسر کیا لیکن مولوی عبد المجید شاہ کی مؤثر تحریرات نے آخر کار آپ کو بھی دیوبند پہنچا کر ہی چھوڑا اور ۱۳۱۱ھ میں شاہ صاحب نے دیوبند میں جب پہلا امتحان دیا تو یہ سال عبد المجید صاحب کے لئے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کا سال تھا۔

مولوی عبد المجید صاحب نے جیسا کہ اوپر آچکا ۱۳۰۹ھ میں ہزارہ سے دیوبند پہنچ کر ۱۳۱۰ھ میں پہلا امتحان دیا اور اس کے بعد ۱۳۱۱ھ میں دورہ حدیث میں شامل ہو گئے اور جامع ترمذی، صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد نسائی، ابن ماجہ اور ہدایہ نامی کتابیں پڑھیں اور صحاح ستہ میں تکمیل کا امتحان ۱۳۱۱ھ میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اور دیگر اساتذہ دارالعلوم سے سندات حاصل کیں۔ مگر چونکہ صاحب عیال تھے (ہزارہ اور دیوبند کی تعلیم سے بھی پہلے آپ دو بیٹوں اور ایک دختر کے باپ بن چکے تھے) اس لئے تکمیل کے فوراً بعد حضرت شاہ صاحبؒ کو اللہ کے حوالے کر کے اسی سال واپس اپنے وطن موضع لوات وادکی غلیم میں پہنچ گئے۔ اور وہاں کی آبائی درسگاہ کی مسند پر بیٹھ کر علمی فیوض و برکات کے دریا بہانے لگے۔ اور مختصر سی ہی مدت میں اپنے کمالات کی وجہ سے مرجع خلافت بن گئے۔ اور اگر زندہ رہتے تو بڑے بڑے کارنامے کر دکھاتے۔ لیکن بد قسمتی سے آپ کی عمر نے وفات کی اور دو تین سال کے اندر اندر انتقال کر گئے اور اپنے والد ماجد پیر موسیٰ شاہ اور دیگر اقرباء کو بادیہ گریان و دل بریان چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ و برد مغفوعہ۔ (قاضی شاہ عبد الکبیر کے سب سے چھوٹے دو فرزند تھے پیر موسیٰ شاہ اور مولانا معظم شاہ۔ دونوں کے متعدد فرزندوں میں سے ایک ایک فرزند۔ مولوی عبد المجید شاہ اور مولانا نور شاہ نے کمالات علمی کی سرحدات کو پار کیا اور دارالعلوم دیوبند سے سندات فضیلت حاصل کیں۔ دو بھائیوں کے یہ لائق فرزند ان اپنے باپ کی حیات میں ہی فوت ہو کر دونوں کو صبر و استقامت کے مشکل ترین امتحان میں ڈال کر چلے گئے۔ مولانا معظم

صاحب حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد بھی کئی سال تک زندہ رہے اور پیر موسیٰ شاہ مولوی عبد المجید صاحب کے بعد اٹھارہ سال زندہ رہ کر ۱۳۲۹ھ میں انتقال کر گئے۔

نام کے ساتھ مظفر آبادی:..... چونکہ مولوی عبد المجید صاحب موصوف جب دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، آپ کا دولت خانہ موضع لوات ضلع مظفر آباد میں تھا، اس لئے آپ کے نام کے ساتھ دارالعلوم کے رجسٹر کے سکونت اور وطنیت کے خانے میں مظفر آبادی لکھا ہوا ہے۔ اور عام حالات میں یہی درست بھی ہے لیکن قابل توجہ اور معنی خیز بات یہ ہے کہ جب شاہ صاحب کا اسم گرامی دارالعلوم دیوبند کے رجسٹر داخلہ کی زینت بنا تو آپ کو بھی انور شاہ مظفر آبادی لکھا گیا۔ حالانکہ دارالعلوم میں داخل ہونے کے وقت آپ کشمیر کے موضع ورنو علاقہ لولاب ضلع بارہ مول سے گئے تھے۔ اور مناسب یہ تھا کہ آپ کو لولابی کشمیری لکھا جاتا۔ مگر چونکہ آپ کی نشوونما موضع لوات ضلع مظفر آباد میں ہوئی تھی اور آپ کے بھائی نے آپ سے قبل اپنے نام کا اندراج بطور مظفر آبادی کر رکھا تھا اور تاریخی واقعات اور برادرانہ یگانگت کے لحاظ سے لولاب اور لوات ان کی نظر میں کسی بڑے فرق کا موجب نہ تھے۔ اس لئے آپ نے بھی مظفر آبادی لکھوانے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ اور بلا تردد ساکن ضلع مظفر آباد لکھوادیا۔ اغلباً شاہ صاحب کے اندراج نام کے وقت آپ کے بھائی مولوی عبد المجید صاحب بھی دفتر دارالعلوم میں موجود ہوں گے جنہوں نے بتایا ہوگا کہ میں نے اپنی وطنیت مظفر آبادی لکھوائی ہوئی ہے۔ اس لئے شاہ صاحب نے بھی اپنے برادر مکرم کی موافقت کرتے ہوئے اپنے آپ کو مظفر آبادی تحریری کروایا ہے۔

۱۳۰۹ھ کا سال انقطاع تعلیم کا برس:..... شاہ صاحب ہزارہ سے ۱۳۰۸ھ کے آخر میں واپس آئے، دارالعلوم دیوبند میں آپ کا داخلہ ۱۳۱۰ھ میں ہوا، جس سے ظاہر ہے کہ آپ سال بھر گھر میں ہی مقیم رہے اور اسی طرح سے ایک سال سے کچھ زیادہ مدت تک آپ کی تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا۔ اس انقطاع کے اسباب و وجوہات تلاش کرنے سے پتہ چلا ہے کہ اس زمانہ میں کشمیر میں زمینوں کا پہلا قانونی بندوبست ہو رہا تھا اور یہ وہ سال تھا جب علاقہ لولاب میں بھی زمینوں کی پیمائش ہو رہی تھی، پیمائش زمین علم ہندسہ و حساب اور مساحت ارض کے بہت سے علمی اصولوں پر مبنی ہے۔ چونکہ ہر نئے علم کے حصول کی تڑپ حضرت شاہ صاحب کے متلاشی حقائق دل میں ازل سے ودیعت ہو چکی تھی۔ اس لئے بندوبستی کام کو ذرا قریب سے ملاحظہ کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحب کو علم مساحت، علم ہندسہ و حساب اور پیمائش سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہوئی کہ آپ نے سال بھر کے لئے سب کا ملتوی کر کے اپنی تمام دلچسپیاں اسی پر مرکوز کر دیں۔

ان واقعات کی مزید تفصیل یوں ہے کہ ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء سے ہی وادی کشمیر کے مختلف اضلاع میں ریاست کے برطانوی ہند سے ادھار لائے ہوئے ایک لائق انگریز آفیسر مسٹر والٹر آئرلارنس نے بحیثیت سٹیشنڈ کمشنر ہندو بست اراضی کا کام جاری کر رکھا تھا اور اس سال یعنی ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں یہ کام تحصیل ہندو وارہ اور خاص کر وادی لولاب میں جاری تھا۔ جا بجا ہندو بست کے تحصیلدار، گردوارہ، پنواری، منصرم اور شجرہ کش زمینوں کی پیمائش کر رہے تھے۔ اور ٹھہرے خسرے مرتب کرتے تھے اور حقیقت قابضان و تشخیص پیداوار جیسے فنی محنت اور باریک بینی کے کام انجام دے رہے تھے جس سے ایک نئی فضا جنم لے رہی تھی۔ شاہ صاحب کے لئے اس کام میں اس لئے بھی دلچسپی تھی کہ کوئی سو سال کے بعد پہلی بار کشمیر کے دیہاتی باشندوں کے حقوق کی کسی حد تک ظالموں اور جابروں کے ہاتھ سے محفوظ ہو جانے کی سبیل پیدا ہو رہی تھی۔ اور ہندو، حساب اور مساحت کا علمی پہلو بجائے خود آپ کے دل پر جستجو کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا اور یہ شاہ صاحب جیسی فتانی العلم ہستی کے لئے دلچسپی کا باعث رہا تھا۔ مزید برآں ہندو بست کے بعض علم دوست افسر جو شاہ صاحب کی ملاقاتوں کے وقت آپ کے علم و دانش سے آگاہ ہو گئے تھے، ان سے بے تکلفانہ روابط تازہ رجحان کو بڑھا رہے تھے۔

ہندو بست کے ان ماہر افسران میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کو مسٹر لارنس پنچاپ کی برطانوی حکومت سے عاریتہ لائے تھے۔ اور ان مسلمان پنجابی افسروں اور خود مسٹر لارنس کو بھی مسلمانان کشمیر میں تعلیم کے فقدان کا بہت دکھ تھا۔ جب ان کی نظر حضرت شاہ صاحب جیسی ہمہ دان ہستی پر پڑتی تھی تو ان کو ایک قسم کی تسکین قلب حاصل ہوتی تھی اور یہ شاہ صاحب کو اپنی طرف کھینچ لینے کی کوشش میں الگ جاتے تھے۔

مسلمانان کشمیر کی بے علمی:..... وادی کشمیر میں اس وقت مسلمانوں کی تعلیمی حالت کیا تھی اس کا اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے لگایا جاسکتا ہے، جو مسٹر لارنس نے اپنی کتاب دی ویلی آف کشمیر کے صفحہ ۲۲۴ پر تحریر کئے ہیں:

مردم شماری ۱۸۹۱ء

وادی کشمیر کی کل آبادی مسلمان ہندو سکھ متفرق (عیسائی اور پارسی وغیرہ)

۱۴۰

۳۰۹۲ ۵۲۵۷۶ ۷۵۷۳۳۳

۸۱۳۳۱

(مسلمان زائد از ۹۳ فیصدی جبکہ ہندو ۷ فیصدی سے کم)

سرکاری مدارس میں زیر تعلیم

مسلمان

ہندو

سکھ

متفرق

طلبا کی کل تعداد ۱۵۸۵

۲۳۳

۱۳۲۷

۲۱

۴

واضح رہے کہ کل آبادی یعنی ۸۱۳۲۳۱ افراد میں سے ۱۱۸۹۶۰ شہر سرینگر میں رہتے تھے اور باقی طرح ۱۵۸۵ طلباء میں سے ۱۲۲۰ شہر سرینگر میں زیر تعلیم تھے۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ شہر کا تعلیمی نقشہ یہ تھا تو دیہات میں تعلیمی حالت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بہر حال جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے کہ مسٹر لارنس اور اس کے ساتھ دیگر افسروں کو کشمیر کے مسلمانوں کے فقدان تعلیم کا احساس اور دکھ تھا، جیسا کہ موصوف نے بار بار اپنی رپورٹوں اور اپنی کتاب دی ویلی آف کشمیر میں لکھا ہے۔

عنقار ابلند است آشیانہ: اس لئے اب وہ یہ چاہتے تھے کہ عربی اور فارسی کی تعلیم کشمیر میں جن گئے چنے لوگوں کو حاصل ہے ان کو سرکاری ملازمت کی ترغیب دیں۔ کشمیر میں تب تک دفتری زبان فارسی ہی تھی، اور اچھی فارسی جاننے والوں کے لئے ترقی کے اچھے مواقع تھے۔ ان پنجابی افسروں نے چند سرسری ملاقاتوں میں جب شاہ صاحب کے علم و فضل اور خاص کر فارسی زبان پر آپ کے تصرف کا اندازہ کیا تو آپ کو محکمہ بندوبست میں شامل ہونے پر راغب کرنا چاہا اور انہیں تحصیلداری اور اس سے بھی آگے کے عہدوں کی امیدیں دلانے لگے۔ لیکن شاہ صاحب نے ان پر واضح کر دیا کہ آپ سرکاری ملازمت سے تو طبعاً بے زار ہیں۔ البتہ محض علمی شوق پورا کرنے کے لئے بندوبست اراضی کا علم اور اس کے نکات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر آپ نے ان بندوبستی دوستوں پر واضح کر دیا کہ:

بروایں دام بر مرغی دگر نہ

کہ عنقار ابلند است آشیانہ

چنانچہ وہ لوگ بھی ذہنی بلندیوں کو دیکھ کر اپنے اصرار سے باز آ گئے اور کچھ مدت تک آپ پیمائش و مساحت ارض اور طریقہ بندوبست کے دیگر لوازمات سے محض فنی اور علمی دلچسپی لیتے رہے اور آپ کا یہ شغل ایک معصومانہ علمی شغل بن کر صرف یادگار رہ گیا۔ مگر اس کی وجہ سے ۱۳۰۹ھ کا سال آپ کی اصلی تعلیم کے حق میں انقطاع کا سال ثابت ہوا۔

روانگی دیو بند: آپ کا یہ نیا شغل عزیز واقارب کے لئے موجب تعجب تو تھا اور شاید کسی کسی کو یہ غلط فہمی بھی ہوئی ہوگی کہ شاہ صاحب سرکاری ملازمت کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ افواہ

آپ کے برادر بزرگوار مولوی عبد المجید صاحب تک دیوبند میں پہنچی جس سے ان کا بے چین ہو جانا قدرتی تھا۔ وہ پہلے ہی آپ کو دیوبند بلانے پر مصر تھے، اب انہوں نے شاہ صاحب کی تعلیم کے انقطاع کا خطرہ محسوس کر کے شاہ صاحب کے بزرگوں اور خود شاہ صاحب کو زیادہ مؤثر خطوط لکھے جن کا خاطر خواہ اثر ہوا اور شاہ صاحب بندوبستی علوم کی دلچسپیوں کو خیر یاد کہہ کر روانہ دیوبند ہو گئے۔



دارالعلوم دیوبند میں تکمیل

(۱۳۱۰ھ) تا (۱۳۱۴ھ)

دارالعلوم دیوبند میں شاہ صاحبؒ کا داخلہ :..... مدارس ہزارہ میں علوم مروجہ کے مدارس عالیہ تک رسائی حاصل کر لینے کے باوجود حضرت شاہ صاحبؒ کی علمی پیاس کو تسکین نہ ملتی تھی کچھ ایسا اشتیاق تکمیل، کچھ والد محترم کی طرف سے ہمت افزائی اور کچھ دیوبند سے برادر محترم مولوی عبدالحجید شاہ کے تاکید خطوط اور سب سے بڑھ کر مشیت ایزدی۔ ان سب مسببات ظاہری و باطنی نے شاہ صاحب کو کشاں کشاں دیوبند پہنچا دیا۔ اور ۱۳۱۰ھ کے تعلیمی سال میں وادی کشمیر کے اس جوہر تابان نے دارالعلوم دیوبند کے چشمہ فیض میں داخلہ حاصل کر لیا۔ دارالعلوم کی کتاب روئداد سال ۱۳۱۱ھ واضح ہے کہ انور شاہ نامی مظفر آباد کے طالب علم نے ماہ شعبان ۱۳۱۱ھ میں حسامی اور ہدایہ اولین کا امتحان دے کر شاندار کامیابی حاصل کی۔

دارالعلوم دیوبند میں اس وقت منشی فضل حق صاحبؒ کا دور اہتمام تھا اور صدر المدرسین کے عہدہ جلیلہ پر محدث وقت جنید زمن حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن جیسی باکمال ہستی رونق افروز تھی۔ حضرت مدوح علیہ الرحمۃ حجتہ الاسلام قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (بائی دارالعلوم دیوبند) اور قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (قدس اللہ اسراہما) کے شاگرد خاص اور جانشین بااختصاص تھے۔

دیوبند میں شاہ صاحبؒ کا ابتدائی قیام و طعام :..... جس زمانے میں حضرت شاہ صاحبؒ نے دارالعلوم میں داخلہ لیا ان دنوں ابھی دارالعلوم میں مطبخ سے طلباء کو پکا پکایا کھانا مہیا کرنے کا انتظام بہت محدود تھا۔ امداد کے مستحق طلباء کو دارالعلوم سے نقد وظیفہ ملتا تھا اور مستطیع طلبہ اپنے کھانے کا خرچ خود برداشت کرتے تھے۔ یہ سب لوگ اپنے طور پر کسی مقامی نان پز کے یہاں کھانے پینے کا انتظام کر لیتے تھے۔

دوسری وقت رہائش گاہ کی تھی۔ طلبہ کی کثرت تعداد کی وجہ سے دارالاقامتہ (Hostel) میں کمروں کی قلت کے سبب تمام طلبہ کو جائے قیام مہیا کرنا منتظمین کے لئے ناممکن ہو رہا تھا۔ اس لئے اس تنگ دامانی کی تکلیف ہر نووارد کی طرح ابتداء میں اس غریب الوطن طالب علم کو بھی برداشت کرنی پڑی، منتظمین دارالعلوم نے یہ دستور رائج کر رکھا تھا کہ جن طلباء کو دارالاقامتہ میں جگہ نہ ملتی تھی

دو دیوبند۔ کم ساجد کے ملحق طلباء کی رہائش کے لئے تعمیر کردہ کمروں میں ٹھہرائے جاتے تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب کو بھی ایک عرصہ تک دارالاقامۃ میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے مولوی مشیت اللہ صاحب بجنوری نام کے ایک دورے طالب علم کے ساتھ دیوبند کی ایک مسجد کے حجرے میں قیام کرنا پڑا۔

مولوی مشیت اللہ اور شاہ صاحب کی دوستی:۔۔۔ یہ مشیت قدرت الہی تھی کہ مولوی مشیت اللہ صاحب موصوف حضرت شاہ صاحب کے محض وقتی اور عارضی ساتھی ثابت ہونے کے بدلے زندگی بھر کے دوست اور رفیق بن گئے، پہلے ہی دن سے وہ آپ کے اخلاق و عادت پاکیزہ سے متاثر ہو کر ہمیشہ کے لیے آپ کے عقیدت مند بھی بن چکے تھے۔ یہ تعلق گہرا ہوتا چلا گیا اور تا دم آخر قائم رہا۔ زمانہ تعلیم کے ایام تعطیلات میں اکثر حضرت شاہ صاحب مولانا موصوف کے پاس بجنور بھی جاتے تھے۔

مولانا مشیت اللہ صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ جن دنوں بحیثیت طالب علم شاہ صاحب اور میں دیوبند کی ایک مسجد کے حجرے میں قیام پذیر تھے، میں نے مشاہدہ کیا کہ میرا یہ ہم عمر کشمیری نوجوان رات گئے تک کتب بینی میں محو رہتا اور نصف شب کے بعد نیند کا غلبہ ہوا تو وہیں کنڈلی بکریٹ جاتا اور تھوڑی دیر آنکھ جھپک کر پھر اٹھ بیٹھتا اور وضو کر کے نوافل تہجد میں مشغول ہو جاتا، تہجد سے فراغت ہوئی تو پھر مطالعہ میں مشغول۔

درسی کتابیں اور ان کی ترتیب:۔۔۔۔۔ دارالعلوم دیوبند کے عربی درجات میں درجہ بندی کا قاعدہ کبھی بھی رائج نہیں ہوا۔ دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں ہر ایک فن کی خاص خاص کتابیں متعین ہیں، جو طالب علم کو پڑھنی پڑتی ہیں۔ کچھ فنون اور کچھ کتابیں اعطاء سند کے لئے لازمی ہیں۔ باقی فنون اور کتابوں کے پڑھنے نہ پڑھنے کا طالب علم کو اختیار ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے خود اپنی رائے سے یا اپنے اساتذہ کے مشورہ سے جس ترتیب سے کتابیں پڑھیں وہ دور حاضر کے طلبہ کے لئے حیرت انگیز ہے۔ دارالعلوم کی سالانہ روکداؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دارالعلوم میں داخلہ سے اگلے سال یعنی ۱۲-۱۳ھ میں بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھی۔ حدیث کی ان کتابوں کے ساتھ ہی آپ نے تفسیر میں جلالین شریف اور فقہ میں ہدایہ جلد ثانی پڑھی۔ اور اسی سال منطق میں قاضی مبارک پڑھا۔ (روکداؤ ۱۳۱۲ھ)

یعنی ۱۳۱۳ھ میں آپ نے حدیث میں ابوداؤد شریف اور مسلم شریف پڑھی۔ تفسیر میں بیضاوی شریف، ہیئت اور فلسفہ میں تصریح۔ شرح چغمنی اور صدر اپڑھا، امتحانات میں درجہ اول کی کامیابی

حاصل کی۔ (رونداد ۱۳۱۳ھ)

۱۳۱۴ھ میں آپ نے کتب احادیث میں موطا امام مالک، سنن نسائی شریف اور سنن ابن ماجہ پر پڑھیں۔ اور فلسفہ میں شمس بازغہ کا اور علم طب میں نفیسی کا امتحان دیا۔ (رونداد ۱۳۱۴ھ) ۵

اسی امتحان پر شاہ صاحبؒ کے حصول تعلیم کی تکمیل ہوئی اور آپ کو دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ نے سند فراغت عطا فرمادی، دورہ حدیث سے فراغت کی ایک سند صدر المدرسین حضرت شیخ الاسلام مولانا محمود الحسنؒ نے دی تھی اور دوسری مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے دی جس کا ذکر دوسری جگہ آئے گا۔ یہاں صرف اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے پر فضلاء دیوبند جو سند دی جاتی ہے اس میں اساتذہ کرام اپنے شاگرد کی نسبت اپنے تاثرات بھی قلمبند کرتے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے شاگرد رشید حضرت شاہ صاحبؒ کو جو سند فضیلت اور سند اجازت عطا فرمائی تھی اس میں اپنے تاثرات عالیہ کو ان الفاظ میں تحریر فرمایا تھا کہ ”خداوند تعالیٰ نے مولانا نور شاہ میں علم، عمل، سیرت، صورت، ورع، زہد، رائے صائب اور ذہن ثاقب کو جمع کر دیا ہے۔“

شاہ صاحبؒ کے اساتذہ کرام:..... دارالعلوم دیوبند میں جن اساتذہ کرام سے حضرت شاہ صاحبؒ کو شرف تلمذ رہا ہے ان میں مندرجہ ذیل حضرات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔
قدوة العلماء، شیخ الہند، الحاج مولانا محمود الحسن صاحبؒ..... حضرت مولانا الحاج الحافظ خلیل احمد صاحب سہارنپوری..... حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری (مہاجر مدنی)..... حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی الدیوبندی رحمۃ اللہ علیہ۔

ان سبھی حضرات علماء میں سے آپ نے سب سے زیادہ استفادہ حضرت شیخ الہندؒ سے کیا ہے۔
دارالعلوم دیوبند میں معاصر طلبہ:..... سن ۱۳۱۰ھ - ۱۳۱۴ھ) حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت طالب علمی مقیم رہے، اس مدت میں ایک مختاط اندازہ کے مطابق ڈیڑھ ہزار طلبہ نے دارالعلوم میں داخلہ لے کر تعلیم حاصل کی۔ شاہ صاحبؒ کے ان معاصر طلبہ میں چند ممتاز طلبہ ایسے بھی نکلے جو اپنے مستقبل میں علم و عمل کے آفتاب و ماہتاب بن کر روشن ہوئے۔ چند ایک کے اسماء گرامی یہ ہیں:

حضرت علامہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ۔ مفتی اعظم ہند و صدر جمعیتہ العلماء ہند۔ قدس اللہ سرہ العزیز۔
امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ۔

حضرت مولانا امین الدین صاحب بانی مدرسہ امینیہ دہلی۔
 حضرت مولانا ضرغام الدین صاحب صدر المدرس و بانی مدرسہ حنفیہ فیض آباد۔
 حضرت مولانا محمد صادق صاحب بانی مدرسہ اسلامیہ کراچی۔
 حضرت مولانا محمد شفیع صاحب صدر المدرسین مدرسہ عبدالرب دہلی۔
 حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب (مہاجر مدینہ)
 حضرت مولانا سید احمد صاحب مہاجر بانی مدرسہ الشرع مدینہ منورہ ۵۔

دارالعلوم سے فراغت بہر حال دارالعلوم دیوبند کی نورانی وادی میں چار سال رہ کر
 مشاہیر وقت اور یگانہ روزگار علماء کرام سے علوم متداولہ کی تکمیل سے حضرت شاہ صاحب
 ۱۳۱۲ھ میں فارغ ہو گئے، اس سفر حیات کی یہ پہلی منزل تھی جو یہاں پر ختم ہو گئی۔ اور اس کا راستہ
 وادی لولاب سے مدارس ہزارہ اور ہزارہ سے ہوتا ہوا دیوبند تک پہنچتا تھا۔ جہاں تک علم بحیثیت علم
 کا تعلق ہے، اب تک آپ نے جو کچھ حاصل کر لیا وہ بہت کچھ ہو نیکی باوجود اس علم کا ایک جز و قلیل
 ہے جو آگے چل کر اپنی ذاتی محنت سے آپ نے حاصل کیا، آپ کا وہ علم و فضل جس کو دیکھ کر
 مصر و ہندوستان اور حجاز و شام کے ممتاز و مقتدر علماء حیرت زدہ ہو جاتے تھے اور آپ کی فوقیت علمی
 کا پورے ایتقان اور خلوص کے ساتھ اعتراف کرتے تھے امتحان کے لئے مقرر شدہ کورسوں کے
 اسباق و دروس سے ماوراء کوئی اور ہی حقیقت تھی۔

دیوبند کی مروجہ تعلیم کی تکمیل پر جو سند ات آپ کو ملیں وہ سب کو ملتی تھیں اور آئندہ بھی ملتی رہیں
 گی۔ لیکن جس بات نے آپ کو اپنے اقران میں امتیاز خاص کے ساتھ انور شاہ کا شمیری کی حیثیت
 میں عالم اسلام کا چمکتا ہوا ستارہ بنا کر پیش کیا وہ آپ کی ان تھک محنت، بے نظیر شوق مطالعہ اور
 خدا واد قوت اخذ و تحفظ اور بے پناہ ملکہ استحضار کی برکت تھی۔ جس کے بعض گوشوں سے نقاب
 سرکانے کی کوشش اس کتاب کی تحریر کا مقصد اولین ہے۔

دیوبند کے بعد گنگوہ

(۱۳۱۴ھ)

ہندوستان میں علماء حقانی کا یہ دستور چلا آیا ہے کہ علم کے اونچے درجات سے فارغ ہو جانے کے

بعد فارغ شدہ اشخاص کی کسی شیخ وقت اور مرشد کی نگرانی میں ذکر و اذکار کی ریاضت کے ذریعے چنی تربیت کی جائے تاکہ اگر ان میں غرور علم، حب جاہ اور حرص اموال کے امراض پیدا ہو گئے ہوں تو ان سے نجات دلائی جائے اور وہ علم و عمل اور تقویٰ و طہارت کے جامع ہو کر اہل اللہ کے زمرے میں داخل ہو جائیں۔ اور اسلام اور اہل اسلام کے حق میں رحمت بن جائیں۔ کیونکہ ہادی برحق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ علم بغیر عمل عالم کی ذات تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ متجاوز ہو کر ان تمام لوگوں کے ضلال کا موجب بن جاتا ہے جن کا واسطہ عالم بے عمل سے پڑتا ہے۔ اس لئے حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ سے لے کر بانیان دارالعلوم دیوبند تک اور ان کے بعد آج تک بھی اس تربیت کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ اور دارالعلوم سے علوم دین کی تکمیل کرنے والوں کو برابر اس امر کی ترغیب دی جا رہی ہے کہ وہ عملی زندگی کے دائرے میں قدم رکھنے سے پہلے کسی روحانی پیشوا کے پاس رہ کر اپنی عملی تربیت و ریاضت کا مرحلہ طے کر لیں تاکہ حصول علم کا جو اصلی مقصد ہے وہ پورا ہو جائے اور ان کا وجود اسلام اور اہل اسلام کے لئے ایک قیمتی وجود بن جائے۔

حضرت گنگوہیؒ کی جامعیت :..... دارالعلوم کے قیام کے زمانے میں اہل اللہ کی کثرت تھی اور اس کے بانی حضرات مثلاً مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا شاہ رفیع الدین دیوبندیؒ، شیخ حاجی عابد حسین دیوبندیؒ، مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ، مولانا فضل الرحمن دیوبندیؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ تو سب کے سب اپنے مراتب کے مطابق ایسے بزرگ تھے جن کے ہاتھ پر لوگ مختلف سلسلہ ہائے تصوف میں بیعت ہوتے تھے۔ جس زمانہ میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے تعلیم سے فراغت حاصل کی، دارالعلوم کے سرپرست قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ قدس اللہ سرہ العزیز تھے جو شریعت و طریقت کے جامع اور مرجع علماء حقانی تھے۔ آپ منطق اور فلسفہ کے بغیر تمام درسی کتابوں کا درس دیا کرتے تھے۔ لیکن ۱۳۰۰ھ سے ۱۳۱۳ھ تک صرف کتب حدیث کا درس دیا ہے۔ آپ کا درس حدیث نہایت ہی محققانہ، محدثانہ اور فقیہانہ ہوتا تھا اور ہر کتاب کا درس علم سلوک کا درس ہوتا تھا۔ عادت شریف یہ تھی کہ ماہ شوال سے ماہ شعبان کے آخر تک محتاج ست کا درس دیتے تھے۔ ماہ رمضان کو ریاضات اور قرآن پاک کی تلاوت کے لئے خالی رکھتے تھے۔ لیکن ۱۳۱۳ھ کے بعد درس کا مشغلہ بالکل ترک فرما دیا تھا اور پھر آخر عمر تک صرف افادات باطنیہ اور تربیت نفوس کی طرف توجہ فرمائی۔

دارالعلوم دیوبند سے تکمیل علوم کی سند حاصل کرنے کے بعد ہر صحیح الخیال سند یافتہ ضروری سمجھتا تھا کہ وہ قصبہ گنگوہ میں جا کر سال چھ ماہ یا جس قدر بھی وقت میسر ہو جائے، حضرت گنگوہیؒ کی

ترہیت میں بسر کرے۔ ایسے طالبین کو حضرت گنگوہی سلسلہ ہائے قادری چشتی، نقشبندی اور سہروردی میں کسی نہ کسی سلسلہ میں بیعت بھی کر لیتے تھے۔ اور درائشادہ تربیت تفسیر یا حدیث یا علی الاصل فقہ کی کسی کتاب کے درس میں بھی شامل رکھتے تھے۔ کچھ وقت کے بعد طالب کو اس کی استعداد کے مطابق مستقبل کے بارے میں نصیحت فرما کر رخصت کر دیتے تھے۔

سلوک میں شاہ صاحب کا قدم راسخ..... حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے بھی جب ۱۳۱۴ھ میں دورہ حدیث مکمل کر کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تو حسب دستور آپ بھی گنگوہ چلے گئے۔ اور وہاں حضرت گنگوہی کی خدمت میں فیض یاب ہونا شروع کیا۔ یہ کہنا ہمارے لئے وقت کے ساتھ مشکل ہے کہ شاہ صاحب نے حضرت گنگوہی سے کوئی کتاب وہاں پڑھی ہے یا آپ نے شاہ صاحب کے علمی استعداد کو دیکھ کر ہی آپ کو روایت حدیث کی اجازت دی۔ البتہ یہ امر مسلمہ ہے کہ سند حدیث عطا فرمانے کے علاوہ حضرت گنگوہی نے آپ کو تصوف کے ایک مشہور سلسلہ چشتیہ میں بیعت کر کے رخصت کر دیا۔ سلسلہ سہروردیہ، کرمانیہ کے اذکار و اوراد کا ورو زمانہ طفولیت سے ہی حضرت شاہ صاحب کے وظائف میں شامل تھا، ہوش سنبھالتے ہی آپ نے اپنے والد بزرگوار کو جن اذکار و اوراد میں مصروف پایا تھا وہ آپ نے بھی اختیار کر لئے تھے۔ لیکن باقاعدہ بیعت انابت کا تعلق آپ نے حضرت گنگوہی سے ہی مربوط کیا اور بعد ازاں ہمیشہ ان ہی کے تلقین کردہ اشغال پر کار بند رہے۔ دہلی اور کشمیر کے قیام طویل کے دوران آپ نے سلوک میں محنت و ریاضت کی بہت سی منازل طے کیں۔ خاص کر کشمیر میں قیام (۱۳۲۰ھ - ۱۳۲۷ھ) کے زمانہ میں اعمال باطنی اور زہد و تقویٰ میں آپ کے قدم راسخ کی وجہ سے کئی موقعوں پر آپ سے بے ارادہ کرامات کا ظہور ہوتا رہا۔ یہی سبب تھا کہ کشمیر کے عوام جو آپ کے علوم کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ کرنے سے قاصر تھے، آپ کو صرف ولی کامل سمجھ کر آپ پر فدا ہونا چاہتے تھے، مگر آپ نے چونکہ اشاعت علم اور تبلیغ دین کو نصب العین بنا رکھا تھا، اس لئے پیری مریدی قسم کے ہر تعلق کی آپ ہمت شکنی کرتے تھے۔

آپ کے علم اور آپ کی تدریس و تعلیم میں جن برکات کا ظہور ہوا اس کو اگر آپ کی سالکانہ ریاضتوں کا ثمرہ قرار دیا جائے تو بعید از حقیقت نہ ہوگا۔

حضرت گنگوہی نے شاہ صاحب کی مرشدانہ صلاحیت کا اندازہ کرنے کے بعد آپ کو دوسروں سے بیعت انابت لینے کی اجازت دے رکھی تھی اور حضرت شیخ الہند نے بھی جس وقت آپ کو اپنا جانشین بنا کر سفر حجاز کا عزم کیا تو اپنے چند مسترشد علماء (جو حضرت شیخ الہند سے بیعت ہو کر سلوک

کی منازل طے کر رہے تھے) کو تربیت و سلوک کے لئے حضرت شاہ صاحبؒ کے سپرد کیا تھا۔
 حضرت شاہ صاحبؒ کے تلمیذ ارشد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ تحریر فرماتے ہیں کہ
 حضرت شاہ صاحبؒ کے درس و تدریس کے ساتھ ارشاد و تلقین کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔
 بیعت بھی فرمالتے تھے۔ اپنے اکابر سے سنا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کی طرف سے مجاز بیعت
 بھی تھے۔ دیوبند کے بھی بعض لوگ آپ سے بیعت تھے، الہ دین دیوبندی جو حضرت نانوتوی
 رحمہ اللہ کے دیکھنے والوں میں تھے، حضرت مدوح ہی سے بیعت تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد میں نے اور جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
 مفتی اعظم پاکستان مقیم کراچی نے بھی ساتھ ہی ساتھ حضرت مدوح کی طرف رجوع کیا۔ ہمیں
 طریق چشتیہ کے مطابق اذکار تلقین فرمائے۔ اور ہم اس میں کھلی تاثیر و تصرف محسوس کرتے تھے۔
 مرشد گنگوہیؒ کے ساتھ شیفنگی..... شیخ یگانہ کبیر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی علمی و روحانی
 قدر و منزلت حضرت شاہ صاحبؒ کے دل میں کتنی تھی، اس کا اندازہ اس امر سے بآسانی لگایا جاسکتا
 ہے کہ شاہ صاحب پوری زندگی کے دوران اکثر و بیشتر اپنے مواعظ حسنہ اور درس و تدریس میں بھی
 حضرت گنگوہیؒ کے ارشادات عالیہ کو بطور حجت پیش فرماتے تھے مؤلف انوار الباری مولانا احمد
 رضا صاحب بخوری تحریر فرماتے ہیں کہ:

”حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ فرمایا کرتے تھے کہ امام ربانی حضرت گنگوہیؒ نہ
 صرف مذہب حنفی کے ماہر تھے بلکہ چاروں مذاہب کے فقیہ تھے۔ میں نے ان کے سوا کسی کو نہیں
 دیکھا جو چاروں مذاہب کا ماہر ہو۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ حضرت گنگوہیؒ کو فقیہ فی النفس کا رتبہ حاصل
 تھا۔“ (مقدمہ انوار الباری ج ۲ ص ۲۳۱)

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کا بیان ہے کہ درس ہی میں کسی سلسلے میں حضرت شاہ صاحب
 نے ایک بار فرمایا:

ہم یہاں آئے یعنی کشمیر سے ہندوستان تو دین حضرت گنگوہیؒ کے پاس دیکھا اس کے بعد
 حضرت استاذ یعنی حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت رائے پوری یعنی شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ
 کے یہاں دیکھا اور اب جو دیکھنا چاہے وہ حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ کے یہاں جا کر دیکھے۔
 ۱۳۴۲ھ میں جب حضرت شاہ صاحب کشمیر تشریف لائے تو شہر سرینگر کے متعدد مقامات پر علامت

اسلمین کے اجتماعات سے خطاب فرمایا۔ سرگرمی کر کے منافقاں و تہمتیہ میں وہ وسط کے دوران دس مرتبہ قرات رکع اللہ ام پر تقریر فرما رہے تھے تو حضرت امام بخاری بطور لٹریچر قورہ کے لکھ کر ان کے پاس لے کر گئے۔

”حضرت امام بخاری نے جو اعتراضات کے نام سے ایک رسالہ تالیف فرمایا ہے جس کا ریخوہد قرات خلف اللہ ام کے مسئلہ پر طاری ہے۔ بہرستہ امتداد الاساقفہ ذریعہ اچھڑ شیخ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے ایک رسالہ میں اس کا جواب باصواب لکھا ہے اور مضامین رسالہ پر کھڑا کھڑا فرمایا۔“

حضرت گنگوہی کی شان میں شاہ صاحبؒ نے ایک عربی تفسیر و محکمہ رقم فرمایا ہے، جب وہ حلیہ طائفہ میں علامہ رشید رضا مسخر کی دارالعلوم دیوبند کو کہتے کے لئے آئے تو جلسہ اجتماع میں حضرت شاہ صاحبؒ نے جو شیخ و مدرسہ عرف تقریر کی اس میں ان کا یہ بیان دارالعلوم کے تذکرہ کی تقریب سے حضرت گنگوہی کے علمی و روحانی کمالات کے بارے میں لکھا ہوا ہے کہ یہ تفسیر و خطبہ۔

العلم حضرت شاہ صاحبؒ کو صرف مولانا محمود الحسنؒ ہی کے علوم کا خازن نہیں سمجھتے بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا بھی دارالحدیثین کرتے ہیں۔ متعدد شعرا و کرام نے حضرت شاہ صاحبؒ کی شان میں جو نظمیں اور ان کی وفات پر جو مرثیے لکھے ہیں ان میں حضرت شاہ صاحبؒ کے امتداد اعلیٰ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے اسم کریم کے ساتھ حضرت گنگوہی تفسیری و عربی لڑائی کی تسلیات ہیں۔ مثلاً جناب محمد بن ابی الخضرؒ نے لکھے ہیں:

سک قرن اولین کا کم شدہ در فرید

جان محمود الحسنؒ نورانی احمد رشید

کثیر کے مشہور قاری شاعر مرحوم جبریل القادریؒ علامہ علی حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات پر لکھے ہوئے مرثیہ میں ایک جگہ یوں برخطراز ہیں:

عقل محمود حسن داشت آن رشید

یافت دان قاسم فیض نبوی دین تجدید

”مدرسہ امینیہ دہلی اور شاہ صاحبؒ

ریخ المانی ہاں اسلحہ سے رتخہ الاول و اسلحہ تک

گنگوہی سے بگنوزن..... دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل اور گنگوہی جا کر حضرت مولانا رشید

احمد صاحب سے مستفید ہونے کے بعد شاہ صاحب نے دیوبند کی طالب علمی کے وقت کے اپنے اولین رفیق اور گہرے دوست مولانا مشیت اللہ صاحب بجنوری مرحوم کے اصرار پر بجنور میں کچھ عرصہ قیام فرمایا اور وہاں پوری یک سوئی اور گوشہ تنہائی کا فائدہ اٹھا کر مرشد گنگوہی سے حاصل کردہ فیض باطنی کی عملی مشق کرنے میں مصروف ہو گئے، مولانا مشیت اللہ صاحب موصوف کے پاس ایک عمدہ کتب خانہ تھا جس میں کچھ موروثی اور کچھ ذاتی کوشش سے جمع کردہ کتابیں اچھی خاصی تعداد میں تھیں۔ اس لئے بجنور میں مطالعہ میں محویت بھی حضرت شاہ صاحب کے لئے وہاں کے قیام کا ایک خاص سبب تھی۔

مولانا امین الدین کی نظر انتخاب اسی اثناء میں شاہ صاحب کے ایک اور ہم درس اور مجلس دوست مولانا امین الدین صاحب نے بعد فراغت تحصیل علم اس شاندار اقدام کا عزم کیا کہ ہندوستان کے دل شہر دہلی میں دینی و عربی علوم کی تعلیم و تدریس کے لئے دیوبند کے طرز پر ایک موزون دانش گاہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ سب سے پہلے اس کام میں رفاقت کے لئے مولانا امین الدین صاحب کی نظر حضرت شاہ صاحب پر پڑی اور آپ نے طے کیا کہ شاہ صاحب کو بھی اس مہم میں اپنے ساتھ شامل کر کے تدریس کی ذمہ داری ان پر ڈال دی جائے اور خود انتظام و اہتمام کا کام سرانجام دیں۔

یہ ارادہ لے کر مولانا امین صاحب موصوف شاہ صاحب کو تلاش کرتے ہوئے بجنور جا پہنچے اور اپنی سکیم کے ہر پہلو پر بحث و مباحثہ کرنے کے بعد شاہ صاحب کو اپنے ارادہ کے ساتھ متفق کر کے دہلی لے گئے۔

بجنور سے دہلی اور مدرسہ امینیہ کی بنیاد چنانچہ مولانا امین الدین اور شاہ صاحب کے متوکلانہ عزم بالجزم اور دہلی کے چند نیک دل علم دوست ہستیوں کے تعاون سے دہلی کے چاندنی چوک بازار کی سنہری مسجد میں ماہ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ میں مدرسہ کا قیام عمل میں آ گیا۔ یہ وہی مدرسہ ہے جو آگے چل کر مدرسہ امینیہ کے نام سے موسوم ہوا اور جس کو مولانا امین الدین صاحب مرحوم کی وفات کے وقت سے اپنی حیات کے آخری لمحات تک ہند کے مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب سنہری مسجد سے منتقل کر کے دہلی کے کشمیری گیٹ کے باہر مدرسہ امینیہ کے نام سے چلاتے رہے۔ اور خدا کے فضل و کرم سے آج بھی یہ دینی مدرسہ اچھے ڈھنگ اور بڑے پیمانہ پر چالو ہے۔

بہر کیف ۱۳۱۵ھ میں جب اس مدرسے کا افتتاح ہوا تو سب سے پہلے شہر سے ہی چند طلباء کو جمع کر کے سنہری مسجد میں تعلیم کا آغاز کیا گیا۔

مولانا محمد ادریس سکھروڑوی کا بیان حضرت مولانا شاہ صاحب کے ایک مشہور

معروف شاگرد اور خادم خاص مولانا محمد ادریس صاحب سکھر وڑوی کی روایت ہے کہ خود حضرت شاہ صاحب کو اس بات کا اطمینان نہ تھا کہ مولانا امین الدین صاحب کی یہ کوشش جس قدر کامیاب ثابت ہوگی واقعی اتنی کامیاب ہو جائے گی مولانا ادریس صاحب کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے:

”جب مولانا امین الدین صاحب مجھے لینے کے لئے بجنور پہنچ گئے تو چونکہ زمانہ قیام دہراعلوم میں مولانا امین الدین صاحب بہت اخلاص اور محبت سے پیش آتے رہے تھے۔ تو یہ خیال کر کے کہ مدرسہ چلے یا نہ چلے مگر مولوی صاحب کی دل شکنی نہ ہو، میں مولوی صاحب کے ساتھ ہولیا اور دہلی پہنچ کر سولہ سترہ روپے جو میرے پاس تھے وہ بھی میں نے مولانا کے حوالہ کر دیئے یہی روپے مدرسہ کا سب سے پہلا مالی سرمایہ تھا۔ چنانچہ مولانا امین الدین صاحب نے اس رقم ہی سے کاغذ لا کر مدرسہ کے لئے رجسٹر بنائے اور طلبہ کو داخل کرنا شروع کر دیا۔ مولانا کا توکل خدا کے فضل سے کامیاب رہا اور کسی انتظار کے بغیر طلبہ کا اچھا خاصا اجتماع ہو گیا مسلمانوں نے بھی توجہ کی اور مدرسہ کی مالی حالت قابل اطمینان ہو گئی“ ①۔

بہر حال حضرت شاہ صاحب ۱۳۱۵ھ سے ۱۳۱۸ھ تک مدرسہ امینیہ میں بحیثیت صدر مدرس بابتخواہ کام کرتے رہے ②۔ البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۱۵ھ سے ۱۳۱۸ھ تک تین چار سال کی مدت میں جب مدرسہ کی مالی حالت کسی حد تک سدھر گئی تو مدرسین کو حق الخدمت دینا ضروری سمجھا گیا اور حضرت شاہ صاحب نے بھی اقل قلیل وجہ کفاف قبول کرنا مان لیا جس ۱۳۱۹ھ پر میں مبلغ تین روپے ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا۔

حضرت رائے پوری کا بیان:..... مشہور شیخ وقت حضرت مولینا عبدالقادر رائے پوری کا بیان ہے کہ میں جن ایام میں حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں مدرسہ امینیہ میں پڑھتا تھا، حضرت شاہ صاحب ڈیڑھ پیسہ کی روٹی منگا کر کھایا کرتے تھے۔ (اور اس برائے نام فوراک پر) سارا دن درس متعدد علوم و فنون کا دیتے تھے شدت گرما (جون اور جولائی کے مہینے)

① حیات النور ص ۲۷۵ و ص ۳۳۵۔ ② مولانا میاں محمد صاحب دیوبندی مرحوم کا بیان ہے کہ اس دوران حضرت شاہ صاحب کے کھانے کا انتظام مدرسہ ہی کی طرف تھا اور نقد بابتخواہ تین روپے ماہانہ مقرر کی گئی تھی (حیات النور ص ۲۷۵) مگر بابتخواہ کا لفظ حضرت میاں صاحب مرحوم نے رواج استعمال کیا ہے ورنہ یہ حقیقت ظاہر ہے کہ یہ وہ تین روپے ہیں جو شاہ صاحب مہینہ بھر میں اپنی خورد و نوش اور لباس کی مرمت و دشت شو پر خرچ کرتے تھے۔ چنانچہ مدرسہ کے اس زمانہ کے قبض الوصول کے رجسٹر اور روایات و دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں بھی شاہ صاحب کے لئے تعین بابتخواہ کا ذکر تک نہیں بلکہ ”بالتعین“ کا لفظ درج ہے۔

میں دوپہر کے وقت بھی آپ کتب بینی میں مصروف رہتے جبکہ ہر شخص دوپہر کی نیند کے مزے لیتا تھا۔ اور موسم سرما میں دیکھا گیا کہ آپ نماز عشاء سے صبح صادق تک مطالعہ فرما رہے ہیں۔ اور آپ کی رضائی جو لپٹ رکھی تھی کھسک کر کہیں سے کہیں جا پڑی ہے اور آپ کو مطالعہ میں محویت کی وجہ سے اس کا احساس بھی نہیں رہا، مغرب کی نماز سے عشاء تک کا وقت تو یہ ذکر و مراقبہ میں مشغول رہنے کیلئے مخصوص تھا (حیات انور ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵ مفہوم)

حضرت رائے پوری کا یہ مختصر بیان مدرسہ امینیہ دہلی کے بیچ سالہ دور میں شاہ صاحب کی مصروفیات، مشاغل و عادات اور زہد و تقویٰ وغیرہ زندگی کے تمام گوشوں پر ایک مفصل و مکمل تبصرہ ہے جو قابلِ داد ہے اس میں آپ کی وہ مکمل تصویر جھلک رہی ہے جس پر صفحات در صفحات لکھے جاسکتے ہیں۔

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے اعترافات :..... حضرت علامہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ مدرسہ امینیہ دہلی کو زندہ رکھنے اور اس کو ترقی دینے میں قوم پران کا احسان عظیم ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے (امینیہ کو ترک کر کے کشمیر آجانے اور مولانا امین الدین صاحبؒ کے زمانہ جوانی میں ہی وفات پا جانے کے بعد مفتی صاحبؒ مرحوم اکیلے اس مدرسہ کو چلاتے رہے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے ”روض الریاحین“ کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے جو عربی فصاحت و بلاغت کا قابلِ قدر آئینہ ہے۔ یہ رسالہ علم و علماء کا ایک اجمالی تذکرہ ہے اور مدرسہ امینیہ دہلی کی مختصر تاریخ بھی ہے اس کے آخر میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ کی شان میں بھی ایک طویل عربی قصیدہ ملتی ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی شان میں بھی ایک طویل عربی قصیدہ ملتی ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی عربی نظم میں مدرسہ امینیہ کے اساتذہ کے مناقب کے دوران شاہ صاحبؒ کے علم و عمل کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے ان سے کچھ وہی لوگ پورا پور حظ حاصل کر سکتے ہیں جو عربی زبان کے اسرار سے واقف ہیں۔

ولنحکم ذا الکلام بذكر حبر ☆ فقیہ المثل علام فرید

اب ہم ایک بڑے عالم کے ذکر پر کلام ختم کرتے ہیں۔ وہ بے نظیر علامہ یکتائے زمانہ ہیں۔

مربیع العلم مقتض الفنون ☆ لد کل المزایا کالمصید

وہ علم کو حوض نکالنے والے فنون کو شکار کرتے ہوئے ہیں۔ تمام فضیلتیں انکے فراک کا شکار ہیں۔

نیسہ فائق الاقران بدعی ☆ بانور شاہ موقوف الحسود

بزرگ مرتبہ ہمسروں پر فائق جن کو۔ انور شاہ کہہ کر پکارا جاتا ہے حاسدوں کے محبوب ہیں۔

فہذا الحبر غار من ذالنجیل ☆ واول موقوف القوم الرقود
یہی علامہ وہ ہستی ہے جس نے اس باغ (یعنی مدرسہ امینیہ) کے پودے نصب کیے، یہی
ہیں جو سوتی قوم کو نیند سے جگانے والوں کے پیش رو ہیں۔

امینیہ اور شاہ صاحب:..... حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے اسی رسالہ کے ۸ پر اپنے اشعار
کی وضاحت حاشیہ کی شکل میں کی ہے جس کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدرسہ امینیہ کے مدرس کی
نیشیت سے حضرت شاہ صاحبؒ نے جناب مفتی صاحبؒ جیسے فاضل معاصرین کے ذہن پر جواثر
مرتب کیا تھا وہ کتنا گہرا اور کتنا بلند تھا۔ بہر کیف اس حاشیہ میں مفتی صاحبؒ یوں رقمطراز ہیں:

”علامہ فہامہ جناب مولینا محمد انور شاہ صاحبؒ ساکن کشمیر بے نظیر شخص ہیں ذہن و ذکا
ورع و تقویٰ میں مرد کامل، مدرسہ ہذا میں ابتداء مدرس اول تھے بلکہ آئندہ اشعار میں ذکر
کیا گیا ہے کہ اس شجر علم کے لگانے والے آپ ہیں کیونکہ مولینا محمد امین صاحبؒ جب
دہلی تشریف لائے اور مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا تو اس وقت ان کے پاس نہ سامان
تھا، نہ روپیہ آپ نے محض متوکلا علی اللہ سنہری مسجد میں پڑھانا شروع کیا مولینا محمد انور شاہ
صاحبؒ آپ کے شریک تھے۔ دونوں صاحبوں نے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائیں
فاتحے کئے مگر استقلال کو ہاتھ سے نہ چھوڑا آہستہ آہستہ اہل دہلی کو خبر ہوئی اور لوگ متوجہ
ہونے لگے یہاں تک کہ مدرسہ اس حالت میں پہنچا جو آپ کی نظر کے سامنے ہے، عرض
یہ ہے کہ ابتدائی زمانہ کی کس سپرسی کی حالت میں مولینا مولوی محمد انور شاہ صاحبؒ اس
مدرسہ کے اعلیٰ و اول محسن ہیں ان کا شکریہ ادا کرنا اور ہمیشہ ان کو یاد رکھنا اہل مدرسہ پر فرض
ہے مولینا نے ایک عرصہ تک مدرسہ ہذا میں درس دیا اور طلبہ کو مستفید فرمایا۔ پھر والدین
سلمہا اللہ تعالیٰ کے تقاضے اور اصرار پر وطن تشریف لے گئے۔ ۱۳۲۳ھ میں حج کو تشریف
لے گئے واپسی پر دہلی میں دو ماہ قیام فرمایا اور اب بھی وطن میں تشریف رکھتے ہیں خدا
تعالیٰ مولینا کو تادیر سلامت رکھے اور ان کے بے نظیر عمل سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔“

مدرسہ امینیہ میں شاہ صاحبؒ کا درس:..... نقل ہے کہ جب حضرت شاہ صاحبؒ مدرسہ
امینیہ دہلی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ اور وہاں شرح چغمنی اور صدر پڑھاتے
تھے تو یہ دنیاۓ درس و تدریس میں ایک انقلاب تھا اس خاص وقت میں دہلی کے تمام عربی مدارس
بند ہوتے تھے (اور قدردان طلبہ حضرت شاہ صاحبؒ کے درس میں شامل ہو کر مستفید ہوتے تھے۔

دہلی سے لولاب بہر صورت مدرسہ امینیہ کے قائم ہونے کے وقت سے لیکر ۸ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ تک کچھ ایک ماہ کم پانچ سال مسلسل اس درسگاہ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے بحیثیت معلم المدرسین فرائض انجام دیئے۔ اس اثناء میں مدرسہ دن دو گنی اور رات چو گنی ترقی کے مدارج پر کرتا گیا۔ اگرچہ شاہ صاحبؒ کے خاص دل میں یہ تمنا کروٹیں لیتی رہتی تھی کہ آپ اپنی تعلیمی خدمات کیلئے دہلی کے بدلے کشمیر کو میدان بنائیں لیکن موافق حالات کے فقدان کی وجہ سے یہ ارادہ ملتا جاتا تھا۔ اسی اثنا میں یہ حادثہ پیش آیا کہ ماہ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ میں ان کے بڑے بھائی مولوی یسین شاہ صاحبؒ کا انتقال ہو گیا اور آپ کے غمزدہ پدر بزرگوار مولینا معظم صاحبؒ نے حادثہ کی اطلاع کے علاوہ آپ کو تاکید گھر آجانے کو لکھا تا کہ والدین ایک جوان بیٹے کے ہم کو دوسرے قابل بیٹے کی ملاقات سے دور کر سکیں بہر کیف اس حادثہ جانکاہ کی وجہ سے حضرت شاہ صاحبؒ کو دہلی سے کشمیر کیلئے روانہ ہوئے ہوں تو آپ کو مدرسہ امینیہ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونے کا ارادہ نہ ہو، لیکن جب آپ کشمیر آ گئے تو غمگین والدین نے آپ کو کشمیر سے باہر رہنے کی اجازت نہ دی۔ مزید برآں خود آپ بھی اہل کشمیر کے سامنے معارف کی جمع روشن کرنے کے مدت سے آرزو مند تھے اس لئے چاروٹا چار آٹھ سال کا زمانہ وطن میں ہی گزارنا پڑا جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی (ان شاء اللہ تعالیٰ وہ بہ نستعین)

وطن میں قیام کے تین سال

(۱۳۲۰ھ تا ۱۳۲۳ھ)

یوں تو ۱۳۲۰ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ کی کشمیر اور اپنے گھر کو واپسی کا بڑا سبب اپنے برادر اکبر پیر یسین شاہ کی وفات پر غمگین والدین کی دلجوئی کرتا تھا لیکن جب آپ نے واپس آ کر ایک دردمند مہصر اور رہنما کی نظر سے اپنے وطن اور اہل وطن کی خستہ حالی کو دیکھا تو دہلی یا دیوبند جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور کشمیر میں ہی رہ کر دین اسلام کی تعلیم اور عوام کو بیدار کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ چونکہ آپ دہلی اور یوپی میں قوم کی بیداری کیلئے جدید مدرسے قائم کرنے کی تحریک اور اس کے مقاصد کو نہ صرف دیکھ کر آئے تھے بلکہ مدرسہ امینیہ دہلی (جو اسی تحریک کا ایک قدم تھا) کے بنانے میں عملاً حصہ بھی لے چکے تھے۔ اور ۱۳۱۵ھ سے ۱۳۲۰ھ تک اس میں تعلیم دیکر اس راستہ میں قربانی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تحریک تعلیم کا تجربہ بھی حاصل کر چکے تھے۔ اس لئے کشمیر میں بھی قومی بیداری کا ذریعہ آپ کی نظروں میں یہی ہو سکتا تھا کہ دیوبند کے دارالعلوم

سہارنپور کے مظاہر العلوم اور دہلی کے امینہ کی طرز کا ایک مدرسہ کشمیر میں بھی قائم کیا جائے مگر اس وقت وادی کشمیر کے عوام انتہائی گہری فیند میں بہ خیر اور غافل نہ سے ہو رہے تھے غلامی اور حکومت کے طویل مصائب نے اس کے اعصاب کو شل کرا لیا تھا۔ وہ اپنی اس حکومت پر قانع تھے اور اس کے دائرہ سے باہر جھانک کر دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ رہے خواص تو وہ ایک طرف حاکم وقت کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے میں مصروف تھے اور دوسری طرف آلپسی رقابت اور محاصرت کو حاصل زندگی سمجھ کر ایک دوسرے کی چکڑی اچھالنے کی فکر میں شب و روز سرگردان رہتے تھے۔ ایسے لوگوں کو دیوبند کے طرز پر مدرسہ قائم کر کے اس کو بیداری عامہ اور اس کے حوالہ میں انقلاب حالات کی جدوجہد کا فلسفہ سمجھانا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔

ایک تلخ تجربہ:..... حضرت شاہ صاحب کا ارادہ تو مدرسہ قائم کر کے اشاعت تعلیم کے ذریعہ عوام کو بیدار کرنے کا تھا۔ مگر جب آپ نے اندازہ کیا کہ مدرسہ کے قیام کیلئے جو سازگار ماحول مطلوب ہے اس کا فقدان ہے تو آپ نے ماحول کو سازگار بنانے کی غرض سے وادی میں وعظ و تلقین اور تبلیغ و تذکیر کا سلسلہ شروع کیا اور اس کام کی ابتداء اپنے ہی علاقہ لولاب اور علاقہ کامراج سے کی۔ زیادہ تر دیہاتی بستیوں میں اور کبھی کبھی سوپور اور بارہ مولہ کے قصبائی لوگوں میں وعظ و ارشاد کی یہ مہم چلتی رہی۔

آپ کی ذات اور شخصیت اس قدر پرکشش تھی کہ بہت جلد آپ کو قبولیت عامہ حاصل ہو گئی۔ جہاں کہیں آپ وعظ و تبلیغ کرنے جاتے عوام اپنے کام کاج چھوڑ کر جمع ہو جاتے اور اتنے بڑے اجتماعات ہوتے کہ سب لوگوں تک اپنی آواز پہنچانا شاہ صاحب کیلئے مشکل ہو جاتا۔ کچھ مدت تک شاہ صاحب ہجوم خلائق کو پر امید نظروں سے دیکھتے رہے اور اشاعت تعلیم و قیام مدرسہ کے اپنے اصل مقصد کے حق میں اسے مفید اور فال نیک سمجھتے رہے لیکن مرور ایام کے ساتھ ساتھ آپ پر یہ عجیب انکشاف ہوا کہ آپ کے رہنمایانہ ارشادات کی جو چیز روح ہے اس تک ان اجتماعات کے شرکاء کی نہ رسائی ہے اور نہ اس سے ان کی کوئی دلچسپی ہے اور آپ کی زبان سے نکلے ہوئے دینی مسائل و نصیحت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو وہ محض رسائی سن لیتے ہیں ان کو اگر دلچسپی ہے تو صرف اس بات سے کہ وہ آپ کو دلی کامل اور مجموعہ کرامات سمجھتے ہوئے آپ کی ذات سے برکت حاصل کریں اور قریب سے دیدار کر لیں اور آپ سے اپنی روزمرہ کی مشکلات کے حل کیلئے تعویذ حاصل کریں اور چونکہ آپ تعویذ لکھنے سے شدت کے ساتھ انکار کرتے تھے لہذا آپ سے اپنے لئے دعا کی درخواست کرنا ان لوگوں کا منہجائے مقصود تھا جس کو لیکر بعض اوقات یہ لوگ بہت دور سے لمبی

مسافٹیں طے کر کے اور پیدل چل کر شاہ صاحب کی مجلسوں میں شریک ہونے کو پہنچتے تھے۔

مایوس کن صورت حال: تین سال تک شاہ صاحب نے وعظ و نصیحت کی یہ مہم جاری رکھی اور ان لوگوں کو یہ سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے کہ آپ کا مقصد کشمیر کی خواب غفلت میں پڑی ہوئی خلقت کو بیدار کرنا اور یہ کہ آپ دین اسلام کے ایک معلم اور مبلغ ہیں اور چاہتے ہیں کہ کشمیر کے عوام تعلیم یافتہ ہو جائیں اور بے علمی اور مبلغ ہیں اور چاہتے ہیں کہ کشمیر کے عوام تعلیم یافتہ ہو جائیں اور بے علمی اور جہالت کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنے دین اور اپنی دنیا کے مسائل پر غور کریں اور اپنے حقوق اور فرائض کو سمجھیں لیکن اس وعظ و تذکیر کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس مدت میں شاہ صاحب کی شہرت گھر گھر پہنچ گئی مگر محض مستجاب الدعوات اور کثیر الکرامات ولی کی حیثیت سے نہ کہ علمی و عملی انقلاب کے داعی کی حیثیت ہیں۔

پیری مریدی کی دکام چکانا مقصود ہوتا تو یہ عوامی مقبولیت بہت بڑی چیز تھی لیکن اس قسم کے لا حاصل رجوع خلق سے شاہ صاحب فطرۃً سخت متنفر اور بیزار تھے اور اس قسم کی مقبولیت کو آپ تحسین ناشناس قرار دیتے تھے اور اپنے مقاصد کے راستے میں رکاوٹ یقین کرتے تھے اسلئے تین سال کی جدوجہد کا نتیجہ جب حسب آرزو نہ نکلا تو آپ اہل کشمیر سے مایوس ہو کر ترک وطن پر تیار ہو گئے۔

سفر حج اور اس کے محرکات

(۱۳۲۳ھ)

جب کشمیر میں قیام مدرسہ کا ارادہ کامیاب نہ ہو سکا تو اب آپ کے سامنے سوال یہ تھا کہ کشمیر سے ہجرت کر کے کہاں جائیں؟ اور اپنی زندگی کا مقصد جب تعلیم و تدریس کو قرار دے دیا ہے تو اپنے ارادوں کو عملی شکل دینے کیلئے میدان کہاں تلاش کریں؟ اس سوال پر غور کرتے کرتے آپ کو خیال آیا کہ آپ حجاز مقدس چلے جائیں۔ حجاز کی طرف ہجرت کو جانے کا خیال آپ کو جب آیا ہوگا تو یقیناً آپ کے سامنے اس وقت بڑے بڑے بزرگان دین کا اسوہ بھی رہا ہوگا۔ جو ہندوستان میں پیدا ہوئے اور تدریس و تعلیم سے خدمت اسلام کرتے رہے پھر ہجرت کر کے حجاز چلے گئے اور وہاں اپنے علم و عرفان کے خزانے تقسیم کرنے کے بعد دیار محبوب میں ہی نحو خواب ہو گئے۔ مثلاً حضرت مولینا محمد اسحاق محدث دہلوی حضرت مولینا شاہ محمد یعقوب، حضرت مولینا شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی اور اپنے پیر طریقت حضرت مولینا رشید احمد گنگوہی کے مربی و مرشد حضرت شاہ امداد اللہ (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) آپ نے ضرور سوچا ہوگا کہ جس طرح ان حضرات علماء نے ہندوستان

سے ہجرت کر کے حرمین میں مقیم ہو کر خود بھی فیض و برکات حاصل کئے اور دوسروں کو بھی فیض پہنچائے اسی طرح میں بھی کشمیر سے ہجرت کر کے اپنی زندگی کو اپنے وطن کے تعویذ پرستوں سے بچا کر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں کسی بڑے مقصد پر صرف کر دوں اور حیات مستعار ختم کرنے کے بعد وہاں ہی پیوند خاک ہو جاؤں۔

رفقاء سفر حج:..... یہ تھا وہ تصور جس نے آپ کو حج بیت اللہ کی تیاری پر آمادہ کیا، چنانچہ ۱۳۲۳ھ کے ذی الحج میں واقع ہونے والے ایام حج میں اداۓ فریضہ کی نیت کر کے آپ زاد سفر کی فکر میں لگ گئے اس زمانے میں زاد سفر حج کے طور سے بہت تھوڑی رقم کافی ہو جاتی تھی جو غالباً مولانا معظم شاہ صاحبؒ کی توجہ سے آپ کو مہیا ہو گئی۔ اب آمادہ سفر ہو جانے کے بعد ”السرفیق قبل الطريق“ کے مطابق رفقاء سفر کی فکر کرنا قدرتی امر تھا قیام وطن کے تین سال کے عرصہ میں قصبہ بارہ مولہ کے ایک رئیس خواجہ عبدالصمدؒ نہ صرف حضرت شاہ صاحبؒ کے مداحوں میں شمار ہوتے تھے بلکہ آپ کے محبین و معتقدین کی صف اول میں شامل ہو چکے تھے۔ جب خواجہ صاحبؒ موصوف کو حضرت شاہ صاحبؒ کا ارادہ سفر حج معلوم ہوا تو آپ نے بھی حج کا ارادہ کر لیا تاکہ ان کے ساتھ حج حضرت شاہ صاحبؒ کی معیت میں ادا ہوں۔ اس طرح آپ کو رفاقت سفر کیلئے ایک بار شامیر آ گیا۔ اور جب شاہ صاحبؒ اور خواجہ صاحبؒ کے حج پر روانہ ہونے کا چرچا ہوا تو خواجہ صاحبؒ کے چند دوسرے دوست احباب بھی آمادہ حج ہو گئے جن میں سے ایک ضلع ہزارہ میں واقعہ جاگیر گدھی حبیب اللہ کے نواب کے وزیر سید مردان علی شاہ بھی تھے۔ جو حضرت شاہ صاحبؒ کے قدر دانوں میں شمار ہوتے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ، خواجہ عبدالصمدؒ اور سید مردان علی شاہ کے علاوہ اس قافلہ میں مزید چھ کس رفقاء سفر تھے جن کے ناموں کا پتہ نہیں چل سکا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اگرچہ اپنے لئے سرنج کا انتظام اپنے طور کر رکھا تھا لیکن خواجہ عبدالصمدؒ کو نے اصرار کیا کہ وہ اس قافلہ کے نو ارکان کے اخراجات خود برداشت کریں گے اور شاہ صاحبؒ نے اس کو مان لیا تاکہ ان کے دوست کے جذبہ فیاضی کو ٹھیس نہ لگے۔

حجاز سے واپس آ جانے کا فیصلہ:..... بدوران سفر حج خواجہ عبدالصمدؒ کو باتوں باتوں میں یہ پتہ چلا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کشمیر کے عوام کی عدم بیداری سے مایوس ہو کر ہمیشہ کے لئے حجاز میں مقیم ہو جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ کو یہ بات سخت گراں گزری اور سوچنے لگے کہ اس دورِ ظلمت

میں ایک شمع ہے جو کشمیر میں مستقبل کی امیدوں کو روشن کر رہی ہے۔ اگر یہ بھی ہم سے دور ہو جائے تو کشمیر میں ہجرت تاریکی کے اور کیا رہ جائے گا یہ سوچ کر خواجہ صاحب نے حضرت شاہ صاحب کو ہجرت کے ارادہ سے باز رکھنے میں اپنی ساری منطق اور قوت بیان صرف کر دی اور بار بار کی طویل گفتگو کے بعد جب خواجہ صاحب نے کشمیر میں ایک دارالعلوم قائم کرنے میں شاہ صاحب کو مکمل تعاون دینے کا وعدہ کیا تو شاہ صاحب نے ترک کشمیر کا اپنا فیصلہ منسوخ کر دیا اور مراجعت وطن پر آمادہ ہو گئے اور ۱۳۲۳ھ میں سفر حج سے واپس آ کر وہلی دیوبند سے ہوتے ہوئے کشمیر پہنچ گئے۔

حرمین میں آپ کے علم کا اعتراف سفر حجاز میں طرابلس، بصرہ، مصر، شام اور دوسرے کئی مقامات سے آئے ہوئے جلیل القدر حضرات علماء نے حضرت شاہ صاحب کی بہت عزت کی اور سب نے آپ کی خداداد اور بے نظیر لیاقت اور علمی استعداد دیکھ کر تبرکاً ادا و اعزاز اسنادات حدیث عطا فرمائیں یہ اعتراف فضیلت علمی کا ایک طریقہ تھا جو عالم اسلام میں مروج تھا ان اسنادات میں آپ کا نام نامی اکثر مقامات پر ”الفاضل الشیخ محمد انور شاہ بن مولینا محمد معظم شاہ کشمیری“ وغیرہ القاب کے ساتھ لکھا گیا تھا۔

مدینہ منورہ میں قیام کے دوران اپنے ذاتی ارادے سے جن بزرگ سے آپ نے علم حدیث میں استفادہ کیا ہے وہ محدث کبیر حضرت شیخ حسین طرابلسی تھے جن سے آپ کو حدیث کی باقاعدہ اجازت بھی حاصل تھی۔

شاہ صاحب نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کافی دن قیام فرمانے کے دوران روحانی فیوض و برکات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کے علمی کتب خانوں سے کامل استفادہ بھی کیا۔ اور ایک عرصہ تک آپ وہاں کے نوادرات علمی کا مطالعہ کرتے رہے۔

روضۃ اطہر کے سامنے اشکباری مدینہ پاک میں جب یکم محرم الحرام ۱۳۲۳ھ کو آپ روضۃ اطہر نبوی (علی صاحبہا الف تحیات مبارکہ طیبہ) پر عرض سلام کے لئے حاضر ہوئے تو سوچا کہ آج تک دربار محمد میں فصحاء عرب و عجم نے فصیح و بلیغ زبانوں میں عقیدت کے نذرانے پیش کئے ہیں کس زبانوں میں سلام عرض کروں؟ چونکہ آپ کو عربی اور فارسی زبان پر یکساں قدرت حاصل تھی اس لئے یکا یک نطق انور سے ایسی نعت جاری ہوئی جس کا ایک مصرعہ فارسی اور دوسرا عربی ہے تہر کا چند شعر یہ حاضرین ہیں:

اے صبا عالم رسان نزد رسول اذمالی نحو مولی قدیباؤ

گرچہ اززدانی ختم دے ☆ عمل ان اروی اذہبت قبول
چوں گدا ہستم نہ رانداز درم ☆ اللہ لا یسہر الرجہ سنول
چوں رسیدی نور ابر کوئے او

انک الآسی بخیر فی القفول ۵

مدرسہ فیض عام کے قیام کا پس منظر

مدرسہ فیض عام قائم کرنے کے فوری محرکات کی طرف کچھ اشارات سابق سطور میں آچکے ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ جس زمانہ کے یہ واقعات ہیں وہ مسلمانان ہند کے حق میں انتہائی اہتمام اور آزمائش کا دور تھا جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے رہنمایان وقت بلا امتیازات طرز فکر تعلیم دین اور مروجہ تعلیم پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر رہے تھے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے حساس دل پر اس تحریک کا اثر گہرا تھا اور یہ اثر کسی وقتی حادثہ کا نہیں بلکہ حالات کا کئی برسوں تک مسلسل اور ہر پہلو سے مطالعہ اور غور و خوض کا نتیجہ تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے وطن سے باہر اپنی تعلیم کی تکمیل ہزارہ کی درسگاہوں اور دارالعلوم دیوبند سے کی تھی۔ دارالعلوم دیوبند اور ہزارہ کی درسگاہیں ہند میں انیسویں صدی عیسوی (تیرہویں صدی ہجری) میں پیش آمدہ شدید قسم کی قومی شکستوں اور ناکامیوں کے تباہ کن اثرات سے بچا کر از سر نو جہد للبقا کے میدان میں مسلمانان ہند کو ہف آراء کرنے کے لئے وجود میں لائی گئی تھیں۔

حادثہ بالاکوٹ :..... مئی ۱۸۳۱ء میں ضلع ہزارہ کے ایک شمالی مقام بالاکوٹ میں جب حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک جہاد بالسیف کو شدید صدمے سے دوچار ہونا پڑا تو اس بات کا سخت خطرہ محسوس کیا گیا کہ عوام جو کل تک حضرت شہید کی کامیابیوں کے ساتھ روشن مستقبل کی بڑی بڑی امیدیں باندھ رہے تھے اور آپ کو نہ صرف امام جہاد تسلیم کرتے تھے بلکہ آپ کے امام مہدی ہونے کے چرچوں سے بھی دلچسپی لیتے تھے کہیں اب مایوسی کے پہاڑ کے نیچے دب کر شکست خوردگی اور مرعوبیت کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس لئے ہزارہ میں ہر طرف دینی درسگاہیں قائم کر کے علم و دانش کے آب حیات سے قوم کی رگ حیات کو سیراب کیا گیا۔

۱۸۵۷ء ۱۲۷۲ھ کی قیامت کبریٰ :..... حضرت سید کی شہادت پر ابھی مشکل پچیس یا

چھبیس سال گزرنے پائے تھے کہ مسلمانان ہند کو ایک دوسری قیامت کا سامنا کرنا پڑا ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے طوفان میں زوال آمادہ مغل راج کو ختم ہونا ہی تھا مگر پوری قوم کو عزت و وقار کی ہر علامت سے ہاتھ دھو لینے پڑے، ہر طرف خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ہزاروں مجبان وطن کو سرِ خاک کے کنارے پھانسیاں دی گئیں۔ علماء اور سربراہانِ آئندہ لوگوں کو قطاروں میں کھڑا کر کے توپوں سے اڑایا گیا۔ شہر اور بستیاں اجاڑ ڈالی گئیں اور پورے ملک پر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک برطانوی سامراج کا وہ تسلط قائم ہوا جس کو اکھاڑ پھینکنے میں پورے نوے سال کا عرصہ لگا۔

سچی نشاۃ ثانیہ:..... غرضیکہ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ذرا تھا تو درد مند ان قوم نے تعلیم کو ہی غلامی کے دریادوا کا علاج قرار دیکر قدم اٹھایا۔ ۱۸۶۷ء (۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ) میں مولینا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء نے پہلے دیوبند میں اور اس کے فوراً بعد سہانپور میں مدرسے قائم کئے اور اس کے بعد قیام مدارس نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ مولینا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے رفقاء کے یہ مدارس دینی بنیادوں پر قائم ہو رہے تھے اور ان میں پڑھنے والوں کے ذہن پر ملت کی خستہ حالی کو دور کرنے اور وطن کی از سر نو آزادی کا راستہ تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ سات سمندر پار سے آئی ہوئی برٹش حکومت کی نفرت اپنے آپ کندہ ہو جاتی تھی۔

مساعی علیگزہ:..... دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہانپور اور کئی دوسرے دینی مدارس ملک کے طول و عرض میں قائم ہو جانے کے کئی سال بعد سر سید احمد خان مرحوم (المتوفی ۱۸۹۸ء) کی قیادت میں ایسے لوگ بھی میدان میں نکلے جن کے نظریہ ترقی کے لحاظ سے صرف دینی تعلیم تک محدود رہنا مستقبل کی ضرورتوں کے لئے ناکافی تھا۔ اس لئے انہوں نے حکومت وقت کے تجویز کردہ نصاب تعلیم کی بنیاد پر ادارہ ہائے تعلیم قائم کرنے کی وکالت شروع کی۔

سر سید گروپ اور مولینا محمد قاسم نانوتوی گروپ دونوں کے بنیادی مقصد میں کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں یہی چاہتے تھے کہ مسلمانان ہند کو بذریعہ تعلیم اس قابل بنادیا جائے کہ وہ ملک کے بدلے ہونے والی حالات میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور وقت کے طوفانوں کا لقمہ تر بن جانے سے بچ جائیں۔ البتہ طریق کار اور ترجیحات عمل میں نمایاں فرق تھا اور نصاب تعلیم اور طریقہ تربیت کے بارے میں اختلافات تھے لیکن یہ اختلافات دونوں طرف خلوص نیت پر مبنی تھے۔

بہر حال مسلمانان ہند میں تعلیم کو عام کرنے کے لئے دو تحریکیں متوازی خطوط پر چلنے لگیں پہلی تحریک ۱۸۶۷ء میں قیام دارالعلوم دیوبند کی شکل میں نمودار ہوئی اور دوسری تحریک کے نتیجے

میں ۲۳ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں محمدن اینگلو اورینٹل کالج قائم ہوا جس کے نقش قدم پر چل کر جابجا اسلامیہ مڈل اسکول اور اسلامیہ ہائی اسکول بننے لگے اور اسی دوران پنجاب میں لاہور کا اسلامیہ کالج بھی معرض وجود میں آیا۔

کشمیر بھی پیچھے نہ رہا:..... کئی برس مزید بیت جانے کے بعد جب اشاعتِ تعلیم کا پروپیگنڈا ملک کے کونے کونے کو متاثر کر چکا تو یہ لہر کشمیر کے پہاڑوں سے بھی ٹکرائی اور سرینگر میں ایک حساس دل کی مالک ہستی حضرت مولینا میر واعظ رسول شاہ صاحب (المتوفی ۱۳۲۷ھ) کی مساعی جمیلہ سے ۱۳۱۷ھ میں انجمنِ نصرۃ الاسلام قائم ہوئی۔ جن کے ذریعہ پہلے اسلامیہ پرائمری سکول پھر مڈل اسکول اور ۱۳۲۵ھ میں اسلامیہ ہائی سکول اور بعد ازاں اورینٹل کالج جیسے مدرسے قائم ہوئے۔ (الحمد للہ یہ اپنے بانیوں کے خلوصِ نیت کی برکت سے کسی نہ کسی شکل میں آج تک زندہ ہیں)

حالاتِ زمانہ کا تقاضا:..... خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہزارہ، دیوبند اور یوپی وغیرہ علاقوں کی جن فضاؤں میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی ان میں تعلیم کا فلسفہ یہی تھا کہ قوم کی انیسویں صدی کے حادثات سے جو مصائب پیش آئے ہیں ان کا علاج تعلیم کے سوا اور کچھ بھی نہیں اور جو کوئی بھی قوم کی خدمت کرنا چاہے اس کا فرض ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق چھوٹا یا بڑا، دینی یا دنیاوی مدرسہ قائم کر کے ملتِ اسلامیہ کے دین اور دنیا دونوں کو سدھارے۔ چنانچہ دیوبند سے اپنی تعلیم کی تکمیل اور سند فراغت حاصل کرنے کے بعد شاہ صاحبؒ نے جب عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھا تو سب سے پہلے اپنے ہم درس مولینا امین الدین صاحب (المتوفی ۱۹ رمضان ۱۳۳۸ھ) کی رفاقت میں دہلی کا مدرسہ امینیہ قائم کیا اور کامیابی کے ساتھ چلایا۔

کشمیر کے حقِ مقدم کا احساس:..... حضرت شاہ صاحبؒ جیسی بڑی ہستیاں اپنے فیوض کو علاقائیت اور صوبائیت کے محدود دائروں میں بند نہیں کر سکتیں۔ خدا تعالیٰ کی ساری دنیا ان لوگوں کا وطن ہوتی ہے اور اس کی ساری مخلوق ان کا کنبہ ہوتا ہے۔ لیکن اپنے زاد بوم اور ابتدائی مقام نشوونما کے ساتھ فطرتی لگاؤ سے کوئی مفر نہیں۔ شاہ صاحبؒ اس لحاظ سے کشمیر اور کشمیریوں کا حقِ مقدم سمجھتے تھے اور تیار رکھتے تھے کہ اس مقدم مخلوق کی آنکھوں سے جہالت اور بے علمی کے پردے ہٹا دینے میں اپنا فرض انجام دیں۔ بنا براں دہلی کے زمانہ قیام میں آپ لازمی طور پر دل ہی دل میں یہ محسوس کرتے رہے ہونگے کہ ان کی جدوجہد کا اصلی میدان کشمیر ہے کیونکہ دہلی جیسے بیدار شہروں میں قوم کی اجتماعی خدمات کا فرض انجام دینے والوں کی قلت نہیں ہے۔ لہذا اپنے مظلوم وطن

(ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ پسماندہ علاقہ یعنی خطہ کشمیر کے مظلومین کی فکر کیوں نہ کی جائے۔ لازمی طور پر آپ نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ اگر تعلیم کی اشاعت باقی ہندوستان کے مسلمانوں کی مشکلات کا حل ہے تو کشمیر جنت نظیر میں اولاد آدم کی جو تذلیل اور انسانیت کی جو پائے مالی ہو رہی ہے اس کا علاج بھی تعلیم ہی کی اکسیر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ان تصورات نے رفتہ رفتہ اس تجویز کی شکل اختیار کر لی کہ اگر حالات سازگار ہو جائیں اور موقع مل جائے تو خود کشمیر میں ایک اچھا مدرسہ قائم کر کے مسلمانان کشمیر کو خواب غفلت سے بیدار کیا جائے اور ان کو زبور تعلیم سے آراستہ کر کے ترقی دارین کی شاہراہ پر ڈالنے کا فرض انجام دیا جائے۔

کشمیر میں کام کی مشکلات:..... یہ ایک قدرتی امر تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے درجہ تکمیل سے امتیازی فراغت کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ اپنی علمی خدمات اور فیوض و برکات کا اولین مستحق وادی کشمیر کے عوام کو تصور کریں جو نہ صرف یہ کہ آپ کا گوشت و پوست تھے بلکہ محکومیت اور غلامی کے شکنجہ میں گرفتار ہونے کی وجہ سے تعلیم کے دینی اور دنیاوی دونوں شعبوں میں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے لوگوں سے زیادہ پسماندہ تھے اور زندگی کے ہر میدان میں اپنی ہمہ گیر پستی کے لحاظ سے بھی شاہ صاحبؒ کی طرح ہر ایک حساس دل رکھنے والے صاحب بصیرت شخص کی ہمدردی اور توجہ کے مستحق تھے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کشمیر میں کام کس طرح شروع کیا جائے اور کہاں سے کیا جائے؟ کسی سابق موجود درس گاہ سے نئے مقاصد پورے کئے جائیں یا نئے کام کے لئے کوئی نئی درس گاہ قائم کی جائے اس وقت بھی محدود پیمانہ پر کشمیر میں خاصکر سرینگر میں بعض دینی درس گاہیں موجود تھیں جو پرانے ڈھنگ سے اپنی بساط کے مطابق ایک حد تک کام کر رہی تھیں لیکن وہ آپ کے متصورہ معیار اور زمانہ کے جدید تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق نہ تھیں۔ اس لئے ان سے کسی انقلابی مقصد کو پورا کرنے کی امید باندھنا ممکن نہ تھا اور ایک موزون قسم کی جدید درس گاہ کی شکل میں جو تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے اس کے لئے اولین ضرورت تھی پختہ کار اور بالغ الذہن رفقاء کی اور دوسری ضرورت تھی ایثار پیشہ معاونین کی اور تیسری ضرورت تھی ذہین اور حساس دل رکھنے والے طلباء کی یہ اہم عناصر وادی کشمیر میں تب بھی مفقود تھے اور اب بھی ستر سال گزرنے کے بعد شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ بقول مولانا روم علیہ الرحمۃ

دین ہر ہاں ست عناصر دلم گرفت
شیر خداور ستم دستاخم آرزوست

اس لئے آپ کو دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہو جانے کے فوراً بعد کشمیر میں اپنا کام شروع کرنے

میں بہت کچھ تامل تھا بالفاظ دیگر مدرسۂ امینیہ دہلی میں تعلیم دینے کے دوران شاہ صاحب کا وطن میں مدرسۂ قائم کرنے کے منصوبے سوچتے رہنا تو فطری امر تھا مگر جب تک اس کے ذرائع مہیا نہ ہو جائیں ان ارادوں کو عمل میں لانے کی کوئی صورت نہیں تھی اسلئے آپ کئی سال تک قدم الخروج قبل الولوج کے مطابق ارادہ کے باوجود اقدام میں متردد رہے اور غور و خوض کا سلسلہ طویل ہوتا گیا۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ کشمیر کے عوام کے احساس خودی کو طویل زمانہ محکومیت نہ کچل ڈالا تھا مطلوبہ معیار کے انقلاب آموز مدارس کے قیام کے لئے قوم کے سربراہ آوردہ افراد میں جس قسم کی بیداری اور جذبہ ایثار کی ضرورت ہے اس کا نام و نشان دور دور تک پایا نہ جاتا تھا۔ اس لئے آپ اپنے ادارے کو آج سے کل اور کم سے پرسوں پر ملتوی کرتے رہے۔ ناگہان خاندان میں آپ کے جوان سال بھائی کی وفات کا وہ حادثہ پیچ آیا جس کا ذکر سطور گزشتہ میں آچکا، اس المناک حادثہ کی اطلاع ملنے ہی آپ کشمیر آگئے اور تعزیت کے لوازمات سے فراغت کے بعد قیام مدرسہ کے متعلق اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے امکانات کا جائزہ لینے لگے (جن کی تشریح اوپر آچکی) تو آپ کو روشنی کی کوئی کرن کہیں بھی دکھائی نہ دی کچھ مدت تک اپنے وطن میں ہی قیام فرمایا اور اس دوران مقامی طور پر کچھ وعظ و تبلیغ اور کچھ اپنے خاندانی امور کی انجام دہی میں مصروف رہے۔

کامیابی کی جھلک:..... سطور سابقہ میں اس امر کی تفصیلات آچکیں کہ ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء سے ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۷ء تک حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنا سارا وقت اور ساری توجہ کشمیر میں رہ کر ایک نئی اور نمونے کے لائق دینی تعلیم گاہ قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف کی اور نامساعد ماحول سے اکتا کر حجاز کی طرف ہجرت کر جانے کا ارادہ بھی کر لیا لیکن بدوران سفر حج خواجہ عبدالصمد مکر و کی اس یقین دہانی پر یہ ارادہ منسوخ کر دیا کہ وہ قیام مدرسہ کی مہم میں شاہ صاحبؒ کی معاونت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کریں گے اس دوست اور رفیق سفر کی ہمدردانہ باتوں سے فطری اقتضا کے مطابق حضرت شاہ صاحبؒ کی مایوسی از سر نو امید میں تبدیل ہو گئی اور آپ نے ترک وطن کا ارادہ ترک کر دیا اور آپ کے دل میں مدرسہ قائم کرنے کا داعیہ جو پھر تازہ ہو گیا تھا اس کی تکمیل میں مصروف ہو گئے اور آپ نے یہ بھی طے کیا کہ مجوزہ مدرسہ وادی کے کسی دوسرے مقام کے بدلے قصبہ بارہ مولہ میں قائم کیا جائے۔ اب بارہ مولہ کو ترجیح دینے کی وجہ بظاہر یہی تھی کہ مدرسہ کے معاونین اولین خواجہ عبدالصمد مرحوم اور اس قصبہ کے چند دیگر معززین تھے اس کے علاوہ بارہ مولہ چونکہ وادی کشمیر کا وہ دروازہ تھا جہاں سے کشمیر کا تعلق ہزارہ، پشاور، راولپنڈی، لاہور، امرتسر و اردہلی تک تمام بیرونی علاقوں کے ساتھ قائم ہو رہا تھا۔ اس لئے بیداری عامہ کی غرض سے قائم کی جانے والی

درس گاہ کے لئے بارہ مولہ کا مقام وادی کے دوسرے سب مقامات سے زیادہ موزون مقام تھا۔

بارہ مولہ میں مدرسہ فیض عام کا قیام

(۱۳۲۲ھ)

۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۷ء میں جب شاہ صاحبؒ سفر حج سے واپس آئے تو آپ نے لولاب کے بدلے بارہ مولہ میں قیام فرمانا شروع کیا اور بعض مقامی علماء اور قصبہ بارہ مولہ کے بعض سربراہان و تاجروں اور رئیسوں خصوصاً خواجہ عبدالصمد بکرو، خواجہ امیر الدین بکرو اور خواجہ امیر شاہ (تحصیلدار) وغیرہم کے تعاون سے قصبہ میں اسی سال یعنی ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۷ء میں مدرسہ فیض عام کے نام سے ایک دینی ارادہ قائم کیا۔

فیض عام کی وجہ تسمیہ:..... مدرسے کا نام فیض عام رکھتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ کے ذہن پر کونسا جذبہ کارفرما تھا۔ اس کا علم تو سوائے علیم بمافی الصدور کے کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ قیاس یہ ہے کہ چونکہ مدرسہ قائم کرنے سے آپ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ کشمیر کی محکوم و مظلوم دہشت زدہ آبادی کو غلامانہ خوف زدگی کے اندھیرے سے نکالیں اور چونکہ حریت کی روشنی سے آشنا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے خواص ہی کو نہیں بلکہ ان کے عوام کو دینی تعلیم کے ذریعے خدا شناس کے ساتھ ساتھ خود شناس اور خود داری کا درس دیا جائے اور فحوائے لیخربہم من الظلمت الی النور وادی کشمیر کے گاؤں گاؤں اور گھر گھر تک صحیح اور حقیقی علم کی روشنی پھیلا دی جائے اس مقصد کی ترجمانی فیض عام کا جملہ ہی کا حقہ کر سکتا تھا اس لئے آپ نے اس نئے پودے کو اس نام سے پکارا۔

وجہ تسمیہ:..... بارہ مولہ کا مدرسہ فیض عام تو ۱۳۲۲ھ میں قائم ہو رہا تھا۔ اس سے کوئی اڑتالیس سال قبل یعنی ۱۲۷۷ھ میں صوبہ یورپی کے شہر کانپور میں جہاد ۱۸۵۷ء کے ایک بڑے مجاہد اور ایک بہت بڑے نامور عالم قبل از ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے منصف اور ہنگامہ کے بعد کے بحیثیت باغی اور مجاہد کالے پانی کے جلائے وطن قیدی) مولینا مفتی عنایت احمد صاحبؒ نے جزیرہ انڈمان سے رہا ہونے کے بعد فیض عام کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا اور خود قیام مدرسہ کے دو سال بعد سفر حج کے موقع پر آپ جہاز کے غرقاب ہو جانے کی وجہ سے سینکڑوں دیگر حجاج کے ساتھ شہید ہو گئے مگر مدرسہ فیض عام کانپور اس کے بعد بھی جاری تھا اور جن بزرگوں نے بعد میں لکھنؤ کا مدرسہ ندوۃ العلماء قائم کیا انکی سرگرمیوں کا پہلا مرکز کانپور کا مدرسہ فیض عام ہی تھا۔ چنانچہ ۱۳۱۰ھ میں مدرسہ فیض عام کانپور کے

سالانہ جلسہ میں مولینا سید محمد علی نے ندوۃ العلماء کی تجویز پیش کی جو آگے چل کر ایک زندہ تحریک بن گئی۔ حضرت مفتی عنایت احمد صاحب کے بعد مدرسۃ فیض عام کانپور میں جو لوگ صدر المدرسین کے عہدے پر فائز ہوتے رہے ان میں حضرت مولینا احمد حسن صاحب، استاذ العلماء حضرت مولینا لطف اللہ صاحب علی گڑھی اور حکیم الامت حضرت مولینا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی جیسے بزرگ قابل ذکر ہیں (مولینا تھانوی ۱۳۰۱ھ میں مدرسۃ فیض عام کانپور کے صدر مدرس مقرر ہوئے تھے۔

اس طرح فیض عام کے نام کو تعلیم اور حریت کی تحریکوں سے جو تعلق تھا اس کی تاریخ حضرت شاہ صاحب سے پوشیدہ نہ تھی اس لئے یہ بھی امکان الغلب ہے کہ بارہ مولہ کے مدرسہ کو کانپور کے مدرسہ کا ہم نام بنانے سے شاہ صاحب کی یہ تمنا رہی ہوگی کہ یہ فیض عام اپنے پیشتر کی طرح اپنے نام کا حرف بحرف مصداق بن جائے اور کشمیر کے عوام ہر اعتبار سے اس کی فیوض و برکات سے بہرہ یاب ہو جائیں۔

اہل کشمیر کی کم نصیبی :..... مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایمان کی حرارت والوں نے دل اپنا پرانا پانی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا۔

یہ دوسری بات ہے کہ وادی کشمیر کی ملت اسلامیہ کی اپنی کم نصیبی کا کوہ گراں حضرت شاہ صاحب کی تمناؤں اور مساعی جمیلہ کے راستے میں حائل رہا اور وہ اپنی شامت اعمال کی تاریکیوں میں ہی پڑے سوتے رہے اور فیض عام کی شمع اپنی روشنی سے ان کے راستے کو نور نہ کر سکی۔

گلیم بخت کسے راکھ بافتند سیاہ
بآب زمزم و کوثر سفید نتواں کرو

یہ مدرسہ کیوں نہ چل سکا :..... بہر حال بارہ مولہ کا مدرسۃ فیض عام ۱۳۲۳ھ سے ۱۹۰۷ء میں قائم تھا اور ربیع الاول ۱۳۲۸ھ سے ۱۹۱۰ء تک چلتا رہا۔ مگر جس طرح موسم بہار سے بہت پہلے بیجا ہوا ختم زمین کے اندر ہی گل سر جاتا ہے یا جس طرح مخالف آب و ہوا میں نصب کیا ہوا درخت سب مرجھا کر سوکھ جاتا ہے بالکل اسی طرح مدرسۃ فیض عام بارہ مولہ بھی تقریباً چار سال کی عمر پا کر ختم ہو گیا۔

مورخ کو اس کے ختم ہو جانے پر تعجب نہیں ہو سکتا البتہ اگر یہ مدرسہ ختم نہ ہوتا تو واقعی موجب حیرت ہوتا۔ مدرسۃ فیض عام بارہ مولہ کے قیام کے زمانہ سے آج تک ستر سال کا عرصہ ہوا۔ تب سے دنیا بدل گئی اور برائے نام ہی کشمیر میں تحریک آزادی کے نام سے بھی برسوں تک وہ ہنگامے ہوئے کہ کانوں میں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اور لوگوں کو اپنے بیدار اور باشعور ہو جانے کے

دعوے پر یقین بھی رہا، لیکن اس کے باوجود آج بھی اس قسم کی بلند پایہ درس گاہ کے لئے فضا سازگار نہیں ہوئی جس قسم کی درس گاہ حضرت شاہ صاحبؒ بارہمولہ کے فیض عام کو بنانا چاہتے تھے۔

معاونین میں استقلال کا فقدان :۔۔۔۔۔ یہ امر تو ثابت شدہ ہے کہ مدرسہ فیض عام بارہمولہ ۱۳۲۳ھ کے ۱۹۰ء میں قائم ہوا لیکن اس کے قیام کی معین تاریخ کو کسی بھی، کون سا دن تھا اور کون سا مہینہ تھا؟ ان سوالات کا جواب ابھی تک ہمیں ہاتھ نہیں آیا۔ بہر کیف جب مدرسہ قائم ہوا تو ابتدا میں خواجہ عبدالصمد، خواجہ امیر الدین خواجہ امیر شاہ اور قصبہ بارہمولہ ضلع بارہمولہ کے بعض سمجھدار لوگوں نے بہت جوش کے ساتھ حضرت شاہ صاحبؒ کا ساتھ دیا۔ لیکن وادی کشمیر کی آب و ہوا میں کچھ اس قسم کی تاثیر پوشیدہ ہے کہ ہم لوگ کسی بھی بڑے اور اہم کام کو جتنے زیادہ جوش کے ساتھ شروع کرتے ہیں، چند قدم آگے چلکر اس سے کئی گنا زیادہ بے پروائی کے ساتھ اس مقصد سے منہ موڑ کر کسی دوسرے شغل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس کلیہ سے خواجگان بارہمولہ بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ خاص کر مرحوم خواجہ عبدالصمد صاحبؒ مگر جو اپنے مقام کشمیریوں کے مقابلہ کافی بیدار مغز اور اپنی حد تک بہبودی قوم کا احساس رکھنے والے افراد میں سے تھے۔ اور اپنی دیگر بہت سی خوبیوں کے لحاظ سے اپنے ہم عصر تاجروں اور کشمیر کے دوسرے سرکردہ لوگوں میں خاص امتیازات کے مالک تھے لیکن اس کے باوجود متلون مزاجی اور بے استقامتی میں دوسرے معاصرین ہم وطنوں سے مختلف نہ تھے اس لئے جوں جوں وقت گزرتا گیا معاونین کی توجہ مدرسہ فیض عام سے ہٹتی گئی جب ابتداء کی گئی تھی تو مدرسے کے لئے درس گاہوں اور طلباء کے لئے دارالاقامہ (HOSTELS) کی تعمیر کے بڑے بڑے اعلان کئے گئے تھے اور برب جوش ٹھنڈا پڑ گیا تو طلباء کے قیام و طعام کے لئے ایک معمولی دارالاقامہ کی تجویز بھی عملی جامہ نہ پہن سکی بالفاظ دیگر حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ مدرسہ فیض عام کی ترقیات کے جو لمبے چوڑے وعدے کئے گئے تھے وہ خالی خولی وعدے ہی رہے اور تین چار سال تک شاہ صاحبؒ حالات کی بہتری کا صبر کے ساتھ انتظار کرتے رہے جب تھک گئے تو آپ کو اپنا قیمتی وقت ضائع ہو جانے پر بہت صدمہ ہوا اور آپ نے انتہائی مایوسی کی حالت میں ایک بار پھر کشمیر کو ترک کر دینے کا ارادہ کر لیا۔

دل برداشتگی کے اسباب :۔۔۔۔۔ اگر ایک طرف مدرسہ کے معاونین کی سرد مہری آپ کے لئے مدرسہ کے مستقبل سے مایوس ہو کر دل برداشتہ ہو جانے کا موجب تھی تو دوسری طرف قابل تعلیم عنصر کی ذہنی تاریکی آپ کے لئے سب سے بڑا سواہان روح تھی۔ تین سال کی مدت میں ایسے طالب علم آپ کو بہت کم ملے جو شاہ صاحبؒ کے نقطہ نگاہ کے لحاظ سے کسی بلند مقصد کو اپنا

نصب العین بنا کر تعلیم حاصل کرنے آئے ہوں۔ کشمیر کی آبادی تب بھی اور آج بھی زیادہ تر زراعت پیشہ اور محنت مزدوری کرنے والوں پر مشتمل ہے آج کے زمانہ میں بھی یہ لوگ رسمی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہی اپنے بچوں کو سکول بھیجنے پر تیار ہو جاتے ہیں لیکن آج سے ساٹھ ستر سال قبل یہ صورت نہ تھی بلکہ ان عام لوگوں کے سوچنے کا ذہنک اس زمانے میں کچھ اس طرح کا تھا۔

بھلا ہمارے بچوں کو کسی نے تحصیلدار بنادینا ہے جو ہم ان کو پڑھنے بٹھا دیں۔ ہم غریب ہیں اور ہمارے بچوں نے وہی کچھ بننا ہے جو کچھ ہم ہیں۔ سکول بھیج کر ان کے دماغ خراب کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ یہ آج ہی موروٹی کام کاج کی عادت ڈالیں بھیڑ بکریاں چرا کر لائیں مل چلائیں اور محنت مزدوری کر کے کمائیں تاکہ سرکار کے ٹیکس ادا ہو سکیں۔

اہل ثروت کی تاریک خیالی:..... اس کے بعد رہ جاتے تھے کشمیر مسلمانوں میں چند ایک صاحب ثروت، تجارت پیشہ یا زمینوں کے بڑے مالک۔ ذہنیت کے لحاظ سے ان کے بچے نہ گھر کے تھے نہ گھاٹ کے کیونکہ ان کو کسی کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنا ذلت دکھائی دیتا تھا۔ وہ اتنا بھی نہیں پڑھتے تھے کہ اپنی دکان کے لین دین کا حساب خودتہ رکھ سکیں، مدرسہ فیض عام کا قصہ تو ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۰ء تک کے زمانہ کا ہے۔ کشمیر کے تجارت پیشہ مسلمان ۱۹۲۱ء تک بھی اپنی دکان اور گاہ بار کا حساب رکھنے کے لئے بطور منشی کسی کشمیری پنڈت کو رکھنے پر مجبور ہوتے تھے اور اپنے بچوں کو اتنی سی ادنیٰ تعلیم دینے پر بھی آمادہ نہ ہوتے تھے جو ان کو حساب و کتاب اور یہی کھاتہ رکھنے کے قابل بناسکے۔ ایسے لوگوں کو مدرسہ فیض عام سے کیا واسطہ؟ الا ماشاء اللہ دینی تعلیم حاصل کرنے پر ثواب کی بات کسی کے ذہن پر بیٹھ جائے تو وہ دوسری بات ہے۔

جمود و جمود کے مریض:..... لے دے کہ مدرسہ فیض عام میں جس طبقے کے بچے حصول کے لئے آسکتے تھے یا آتے تھے وہ طبقہ کشمیر کے پیر زادوں، مولوی اور مفتی زادوں، آخون زادوں اور خاندانوں کا طبقہ تھا۔ اس طبقے سے جو طالب علم فیض عام میں آئے ان میں بلاشبہ بعض ہونہار ذہین اور مفتی تھے۔ مگر ان طلباء کی اکثریت کی حالت اپنی تاریک ذہنیت، مقصد کی محدودیت اور خیالات کی پستی کے لحاظ سے نہایت مایوس کن تھی۔ چونکہ ان میں سے زیادہ تر زیارتوں کے مجاوروں یا مساجد کے اماموں کے فرزند تھے جو ہوش سنبھالتے ہی لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی وجہ سے فطرت مسلمہ کا خدا و انعت کو مسخ کر چکے ہوتے ہیں اور بقول علامہ اقبالؒ

ضمیرش تھی از خیال بلندے

کا پورا نمونہ بن چکے ہوتے ہیں اس لئے ان کی حالت یہ تھی کہ جب کبھی شاہ صاحبؒ یہ جانے کی کوشش کر رہے تھے کہ حصول علم کے اغراض و مقاصد کے بارے میں ان لوگوں کی نیت کیا ہے اور مستقبل میں یہ لوگ کیا بننے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ تو معلوم ہوتا تھا کہ کسی مسجد کی امامت کو پیٹ پائے کا ذریعہ بنالینا یا ختم خوانی اور تعویذ نویسی کے پیشے کی آڑ میں لوگوں کے صدقات و خیرات سمیٹنا یا جان بلب موروٹی پیری مریدی کو چمکانے کے کچھ گر سیکھ لینا ان کے بڑے بڑے مقاصد ہیں جو ان غالب علموں میں سے اکثر کے دماغ میں ان کے ماں باپ کی طرف سے ٹھونسنے گئے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا فلسفہ تعلیم:..... حضرت شاہ صاحبؒ کا اپنا ایک فلسفہ تعلیم تھا اور آپ مدرسہ فیض عام کو اپنے اسی فلسفہ کا نمونہ دیکھنا چاہتے تھے ایک دینی مدرسے کے قیام کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ پڑھنے والے تاریکیوں سے نکل کر علم و عقل اور دانش و خردمندی کی روشنی میں آجائیں لیکن جو لوگ تعلیم کو تعویذ نویسی اور ختم خوانی کے لئے حاصل کر رہے ہیں وہ علم و عرفان کی نورانیت سے بے بہرہ رہتے ہیں شاہ صاحبؒ ان لوگوں کو یہ حقیقت سمجھانے کی بہت کوشش کرتے تھے کہ دینی تعلیم کو ان ادنیٰ مقاصد کے لئے حاصل کرنا ان علوم کی توہین کرنا ہے اور آپ کا یہ مقولہ آپ کے شاگردوں میں مشہور تھا کہ:

”جو شخص قرآن و حدیث اور دوسرے دینی علوم کو محض شکم پروری کے لئے پڑھتا ہے وہ بازار سے قیمتی شال اس لئے خرید کر لاتا ہے کہ اس سے اپنے جوتے صاف کرے“

جو لوگ شاہ صاحبؒ کی شاگردی کے دائرہ میں شامل ہو جاتے تھے شاہ صاحبؒ ان کو صرف کتابوں کا مضمون پڑھادینے پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ان کے اخلاق و اطوار اور عادات و خصائل کو سنوارنے کی طرف زیادہ توجہ دیتے تھے اور درس کے درمیان میں مسائل کی تشریح کے ساتھ ساتھ نہایت دلنشین پیرایہ میں آپ ان مستفیدین کو ذہن نشین کراتے رہتے تھے کہ علم حاصل کرنے کا اصل مقصد اپنی اپنی شخصیت کی تکمیل، تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس ہے کیونکہ یہی وہ عناصر ہیں جو روح کی بالیدگی اور حصول عرفان کی اساس ہیں شاہ صاحبؒ کے نزدیک علم، تعلیم، معلم اور متعلم کی دنیا ملاء علی کی دنیا ہے جس کو پاک و صاف رکھنے کے لئے شکم پروری اور تن پرستی کی دنیا سے دور اور بلند و بالا رکھنا پڑھنے اور پڑھانے والوں کا پہلا فرض ہونا چاہئے یہ وہ فلسفہ تعلیم تھا جس کے مبلغ اور منادی شاہ صاحبؒ تھے۔ اور یہ فلسفہ تعلیم آپ کو اپنے اساتذہ کرام خاص کر حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے ملا تھا۔ اور اسی فلسفہ تعلیم کے سانچے میں آپ نے اپنی ذات کو ڈھال دیا تھا اور آپ چاہتے تھے کہ مدرسہ فیض عام کو اسی فلسفہ کا قالب بنا دیں تاکہ جو سکے اس میں ڈھل کر

تکلیں وہ زر کامل عیار ثابت ہوں لیکن جو خام مواد (Raw Material) آپ کے سامنے تھا بد قسمتی سے اس کا بیشتر حصہ ”اوساخ اموال الناس“ یعنی خیرات و صدقات کی روٹیوں کی پیداوار تھا۔ ان لوگوں کا خمیر ہی دوسرا تھا ان کے ذہن کی تاریکیاں کسی طرح بھی حقیقی علم کی نورانیت کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتی تھیں۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ کو اس قرآنی صداقت کا تجربہ درپیش تھا۔ ”انک لا تہدی من اجبت ولكن اللہ یهدی من یشاء“ انتہائی دلسوزی کے ساتھ سادہ اور عام فہم الفاظ میں شاہ صاحبؒ ان پر واضح کرنے کی کوشش کرتے کہ۔

حصولِ علم کا مقصد ہے اپنے دل اور دماغ کو جہالت کی تاریکیوں سے پاک کر کے خود بھی اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آجانا اور خلقِ خدا کو بھی تاریکیوں سے نکال کر نورِ ہدایت کی شاہراہ پر لانا۔ وہ بے چارے اس آسمانی اصول کو سمجھ ہی نہ سکے اور ”کانہم خشب مسندہ“ کی تصویر بن کر سمجھانے والے کام نہ تکتے رہ جاتے۔

احساسِ ناکامی:..... جب مدر سے کوچلانے والوں کا وہ حال تھا اور مدر سے میں پڑھنے والوں کا یہ حال تھا تو مولینا انور شاہ صاحبؒ جیسا شخص اگر یہ محسوس کرے کہ میں یہاں بیٹھ کر اپنی زندگی کو ملا سازی (اور وہ بھی نہایت محدود پیمانے کی اور نہایت تاریک دماغ کی ملا سازی کے شغل میں ضائع کر رہا ہوں تو اس پر کسی کو متعجب نہ ہونا چاہئے ۱۹۰ء ۱۳۲۲ھ سے ۱۹۱۰ء ۱۳۲۸ھ کے اوائل تک مدر سے فیض عام کو چلانے کے بعد آپ کو پورا اندازہ ہو گیا کہ کشمیر کے عوام کی ذہنی بے بسیگی اس قدر سنگین اور شدید ہے کہ اس کلیشہ کو پگھلانے میں تغیراتِ زمانہ جدید کے سورج کو ابھی مزید چند سال تک اپنی تیز کرنوں کو ایک نقطے پر مرکوز کرنا ہوگا لے بہتر ہے کہ میں اپنی کوششوں کی یہاں پر ناکامی کا احساس ہی نہیں بلکہ اعتراف کر کے کسی دوسرے مقام پر چلا جاؤں اور اللہ کے دین اور اس کی خلقت کی خدمت کے لئے امکانِ بھر سعی و عمل کو جاری رکھوں۔ چنانچہ آپ نے بارہ مولہ کے مدر سے فیض عام کو اپنے حال پر چھوڑ کر اپنی جدوجہد کے لئے کشمیر سے باہر میدانِ تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

مورخِ فوق کی ملاقات:..... یہ ربیع الاول ۱۳۲۸ھ کا زمانہ تھا جن دنوں آپ بارہ مولہ سے رختِ سفر باندھ کر ہندوستان جا رہے تھے۔ مورخِ منشی محمد دین فوق نے آپ سے ملاقات کی غالباً خواجگانِ بارہ مولہ کی خواہش پر یا منشی صاحبؒ نے اپنے قلبی احساس کی بنا پر شاہ صاحبؒ سے باصرا عرض کیا کہ آپ کشمیر سے باہر نہ جائیں اور یہاں ہی اپنے فیوضات کا سلسلہ جاری رکھیں یہ واقعہ منشی صاحبؒ کے الفاظ میں یوں ہے۔

”آپ بمقام بارہ مولہ خواجہ امیر الدین (شاہ) مرحوم تحصیلدار کے مکان پر رونق افروز تھے کہ سب سے پہلی مرتبہ راقم الحروف نے آپ سے نیاز حاصل کیا۔ میں نے دیوبند کی نسبت جہاں بہت سے اور علماء دارالعلوم میں کام کر رہے ہیں۔ کشمیر کے زیادہ حقوق عرض کئے، جہاں چاروں طرف سناٹا مچایا ہوا ہے آپ نے فرمایا کہ کوئی ایسا آدمی پیدا کیجئے جو ہماری باتیں سن سکے۔ ہمیں خدمت وطن سے انکار نہیں میں نے عرض کیا کہ جہاں زمین ناہموار ہو، نا صاف ہو، اگر تکلیفیں اور صعوبتیں اٹھا کر اس کو صاف و ہموار کر دیا جائے تو وہاں بھی جو چیز ہوئی جائے وہ نشوونما حاصل کر سکتی ہے لیکن آپ کے عزم مصمم نے کوئی پیش نہ جانے دی“ ۱

مولینا امین الدین صاحبؒ کے نام خط: ایک موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ نے کشمیر سے دل برداشتگی کے متعلق اپنے دیرینہ رفیق مولینا امین الدین صاحبؒ (بانی مدرسہ امینیہ دہلی) کے نام ایک مکتوب مورخہ ۲۷ جمادی الاول ۱۳۲۰ھ میں لکھا ہے کہ:

”یہاں سے دل برداشتگی کا سبب یہ ہے کہ یہاں آکر مخلوق کی بد ملکگی کا زیادہ احساس ہوتا رہا“ ۲

حضرت شاہ صاحبؒ کا صبر جمیل: اس سلسلہ کی تمام پیش آمدہ مشکلات کی تفصیلات پر اس لئے پردہ پڑا ہوا ہے حضرت شاہ صاحبؒ چونکہ صبر و استقامت کا ایک کوہ گراں تھے اور اپنے گزرنے والے صدقات کی شکایت سے گریز کرتے تھے خاص کر ایسی شکایت جس کی زد کسی دوست پر پڑتی ہو۔ آپ کو کسی حالت میں گوارہ نہ تھی۔ فیض عام ہی نہیں بلکہ دیوبند کے مدرسہ دارالعلوم سے بھی جب آپ کو تعلق کاٹ لینے پر مجبور ہو جانا پڑا تو آپ کا یہی صلح جمیل کا صابرانہ طرف علم نمایاں رہا۔

یہ تھا مدرسہ فیض عام جو اپنی مختصر حیات کے دوران بارہ مولہ کے لئے موجب افتخار رہا اور آج حسب تاریخوں کے صفحات پر حضرت شاہ صاحبؒ کے دیگر کارناموں کی فہرست میں اس کا رنامے کا بھی تذکرہ آتا ہے تو قصہ بارہ مولہ اور خواجگان بارہ مولہ کو بھی اس یاد عہد گزشتہ کی جھلکیوں سے اپنا حصہ نصیب ہو جاتا ہے۔

”واللارض من کاس الکرام نصیب“

① — ملاحظہ ہو مشاہیر کشمیر از محمد الدین فوقی ۱۹۳۰ء، مطبوعہ لاہور ۱۹۳۰ء۔

② — مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ دہلی ۲۹ بحوالہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ستمبر ۱۹۴۷ء۔

سوچتے تو سہی ہے کہ یہ دینی مدرسہ اگر جاری رہتا تو واقعی اپنی نظیر آپ ہوتا اور اس کے وجود پر کشمیر کو آج اسی طرح فخر ہوتا جس طرح دارالعلوم دیوبند پر دیوبند کو مدرسہ مظاہر العلوم پر سہانپور کو مدرسہ مدوۃ العلماء پر لکھنؤ کو اور مدرسہ امینیہ پر دہلی کو فخر ہے لیکن غلامی کی زہریلی آب و ہوا کی وجہ سے کشمیر کا ماحول اس وقت ایسے ادارہ کے لئے سازگار نہ تھا اس لئے یہ پودا کوٹلیس اور شاخیں نکالنے اور پھول پھل لانے سے قبل ہی مرجھا گیا بقول ظفر۔

عمر دراز مانگ کر لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئیں دو انتظار میں

ایک صدمہ:..... یہ امر قابل ذکر ہے کہ عمران شاہ نامی ایک طالب علم موضع لوات (علاقہ مظفر آباد) سے مدرسہ فیض عام میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئے تھے جو حضرت شاہ صاحبؒ کے محسن چچیرے بھائی مولانا عبدالحمید شاہ (فاضل دیوبند) کے یتیم بیٹے تھے اور ذکاوت و ذہانت اور دیگر اوصاف میں اپنے والد مرحوم اور حضرت شاہ صاحبؒ کا نمونہ تھے۔ چنانچہ حصول تعلیم کے دوران پورے مدرسے میں اپنے کمالات کے لئے انگشت نماتھے۔ ناگاہ ان پر سرسام کا حملہ ہوا اور جان بحق ہو گئے۔
حضرت شاہ صاحبؒ کو اس کے مستقبل کے ساتھ بہت امیدیں قائم تھیں۔ اس لئے آپ کو اس کی موت کا سخت صدمہ ہوا۔

شاہ صاحبؒ کی زندگی کے آٹھ سال (ربیع الاول ۱۳۲۰ھ تا ربیع الاول ۱۳۲۸ھ

مدرسہ فیض عام کو قائم کرنے چلانے اور آخر کار مایوس ہو کر ختم کر ڈالنے میں حضرت شاہ صاحبؒ کو ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۸ھ تک اپنی قیمتی زندگی کے آٹھ سال صرف کرنے پڑے۔ نتیجہ ناکامی لگا مگر آپ نے اس صدمہ عظیم کو انتہائی صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیا اور پروقار طریقے سے زندگی کا دوسرا قدم اٹھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور ان تمام واقعات کو اس طرح پس پشت بھینک دیا کہ ”سکان لم یکن شینا مذکوراً“ یہ واقعات جن میں تنہا آپ آٹھ سال تک جدوجہد کے میدان میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں جہاں آپ کی عظمت کے آئینہ دار ہیں وہاں کشمیری عوام کی آج کے ستر سال قبل کے افسوسناک ذہنی تنزل، ان کی مردہ گانہ خواب غفلت، دماغی جمود اور قلبی شہود کا اندازہ بھی ان ہی واقعات سے ہوتا ہے۔ اس وقت مسلمانان کشمیر خود فراموشی اور خود ناشناسی کی جس دنیا میں تھے اس کا مرقع ترجمان حقیقت حضرت اقبالؒ نے یوں کھینچا ہے۔

کشمیری کہ باندگی خو گرفتہ ہے
تراشد ز سنگ مرارے

ضمیرش تہی از خیال بلند ہے ☆ خودی ناشنا سے از خود شرمناک
 بریشم قبا خوابہ از محنت او ☆ نصیب تنش جامہ تار تارے
 نہ دردیدہ او فروغ نگاہ ہے ☆ درد سینہ او دل بے قرار ہے
 ازاں سے فشاں قطرہ بر کشیری ☆ کہ خاکسترش آفریند شرابے

فیض عام کے باقیات صالحات:..... بہر حال مدرسہ فیض عام چونکہ بہت قلیل مدت زندہ رہا
 ختم ہو گیا اس لئے اس کے فیض یافتہ لوگ کسی خاص اور معقول تعداد میں پھیلنے نہ پائے۔ ایک علمی
 درسگاہ برسوں تک قائم رہتی ہے تب ہی اسکے نتائج کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر بایں ہمہ حضرت شاہ
 صاحب کے اس دور کے چند سرکردہ شاگردوں اور فیض عام کے فیض یافتہ افراد کا پتہ چلایا جاسکا ہے جو
 علاقہ میں اپنے وقت کی نمایاں شخصیتیں ثابت ہوئے ان میں حسب ذیل اصحاب قابل ذکر ہیں۔
 (۱) مفتی پیر عبد الجبار صاحب سابق خطیب جامع مسجد سوپور (آپ نے سالہا سال تک قصبہ
 سوپور کی جامع مسجد میں خطابت اور افتاء کے علاوہ عربی، فارسی اور دینی علوم کی تعلیم دی اور
 سینکڑوں لوگ آپ سے مستفید ہوتے رہے۔

- (۲) مولوی مفتی محمد اکبر صاحب سابق خطیب خانقاہ معلے سوپور و امام جی۔
- (۳) مولوی مفتی محمد نور الدین صاحب خطیب مسجد صوفی حمام سوپور
- (۴) پیر غلام محی الدین صاحب مخدومی سابق امام عید گاہ باہمولہ
- (۵) پیر غلام احمد شاہ قریشی مسکین بارہ مولہ
- (۶) سید علی شاہ صاحب اندابی سابق مفتی بارہ مولہ و مرشد علاقہ مظفر آباد
- (۷) سید احمد اللہ شاہ صاحب اندرابی بارہ مولہ

کشمیر سے دیوبند

(ربیع الاول ۱۳۲۸ھ)

ارادہ ہجرت بسوئے حجاز:..... جب ۱۳۲۸ھ شروع ہوا تو مدرسہ فیض عام بارہمولہ اس جاں
 بلب مریض بچے کی طرح تھا جس کے والدین معالج اور سب چاہنے والے اس کی زندگی سے

میں ہو چکے ہوں اور سوچتے ہوں کہ

پھول تو دو دن بہار جان فزا دکھلا گئے
حسرت ان پتھروں پہ ہے جو بن کھلے مر جھا گئے

حضرت شاہ صاحبؒ کے لئے فیض عام کی ناکامی سب سے زیادہ صدمہ شدید تھا۔ سات آٹھ سال کی بہترین تمنائیں آنکھوں کے سامنے خاک میں مل رہی تھیں۔ آپ کے حساس اور نازک دل نے آپ کو یہی مشورہ دیا کہ کشمیر اور اہل کشمیر کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے حوالہ کر کے اپنے قیمتی اوقات کو کسی دوسری جگہ کسی زیادہ نتیجہ خیر مصرف میں صرف کیا جائے اور نہ صرف وطن کو ہی ترک کر دیا جائے بلکہ ہندوستان کو بھی خیر باد کہہ دیا جائے۔ اور حج کے زمانے میں جو یہ ارادہ کیا تھا کہ حجاز میں قیام پذیر ہو کر خدمت اسلام کے لئے زندگی وقف کر دی جائے گی۔ اس ارادے کو اب عمل کی صورت دے دی جائے۔

اس قسم کی ذہنی کیفیت کے ساتھ شاہ صاحبؒ نے اپنے والدین اقرباء اور کشمیر میں سب دوست و احباب کو الوداع کہا اور کشمیر سے دیوبند پہنچ گئے تاکہ اپنے اساتذہ کرام سے بھی ملیں

اکابر کی نظر انتخاب:..... حضرت مولینا سید حسین احمد مدنیؒ اپنی خودنوشت سوانح نقش حیات مطبوعہ مکتبہ دینیہ دیوبند جلد اول کے ۱۲۱ پر رقمطراز ہیں کہ

غالباً ۱۳۲۵ھ یا ۱۳۲۶ھ میں ایک ایسے مجمع میں جس میں دارالعلوم کی علمی ترقی پر غور و خوص ہو رہا تھا۔ حضرت حافظ احمد صاحبؒ مرحوم نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ اگر مولوی انور شاہ کشمیری، مولوی عبید اللہ سندھی، مولوی مرتضیٰ حسن چاند پوری، مولوی سہول بھاگل پوری، مولوی عبدالصمد کرپوری اور حسین احمد (مدنی) یہاں آکر جمع ہو جاتے تو دارالعلوم کی علمی ترقی بڑے اعلیٰ پائے پر پہنچ جاتی۔ اس زمانہ میں حضرت مولینا انور شاہ صاحبؒ مرحوم دہلی چھوڑ کر کشمیر میں اقامت پذیر ہو گئے تھے مولینا عبید اللہ صاحبؒ عرصہ سے سندھ ہی میں مقیم تھے۔ دیوبند کی آمد و رفت بھی عرصہ سے منقطع تھی۔ مولینا مرتضیٰ احسن صاحبؒ درجہ نگہ میں مدرس اول اور بہت بڑے صاحب نفوذ تھے۔ مولینا محمد سہول صاحبؒ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں بڑی تنخواہ پر ملازم تھے۔ مولینا عبدالصمد مرحوم رڑ کی مدرسہ رحمانیہ میں مدرس اول تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بات پسند آئی اگرچہ بظاہر سکوت کیا مگر خدا جانے کیا باطنی تصرف کیا کہ یہ سب اشخاص بغیر کسی ظاہری جدوجہد اور خط و کتابت کے یکے بعد دیگرے دیوبند پہنچ گئے ممکن ہے کہ بعض اشخاص سے کچھ ظاہری جدوجہد کی نوبت آئی

ہو مگر اکثروں سے کسی قسم کی خط و کتابت اور طلب و فہمائش کی نوبت نہیں آئی۔

مولینا مدنی کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ اکابر دارالعلوم کی یہ طے شدہ رائے تھی کہ حضرت صاحب اور ان ہی جیسے چند دوسرے لائق و فائق فرزند ان دارالعلوم کو یک جا کر کے مستقبل کی قیادت تعلیم کے لئے ان کو تیار کرنا ہی اس ادارہ کی بقا و دوام اور ترقی کی ضمانت ہو سکتا ہے۔ بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ ان بزرگوں کی رائے کس قدر پر از خلوص اور صائب تھی۔

دارالعلوم کا جلسہ دستار بندی

(ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء)

جیسا کہ سطور گزشتہ میں بیان ہوا کہ حضرت شاہ صاحبؒ بارہ مولہ کشمیر سے دل برداشتہ ہو کر ربیع الاول ۱۳۲۸ھ کو بہ عزم ہجرت حرمین شریفین اپنے وطن سے روانہ ہوئے لیکن اپنے استاد مکرم حضرت شیخ الہند اور دیگر اکابرین و شیوخ سے ملنے کے لئے پہلے دیوبند تشریف لے گئے۔

ان ہی دنوں دارالعلوم میں دستار بندی کا وہ جلسہ ہونے والا تھا۔ جو قیام دارالعلوم کے پہلے دور میں ہر سال منعقد ہوتا تھا اور اب بعض موانع کی وجہ سے کئی سال سے نہیں ہو رہا تھا اور فارغ شدہ طلباء کو صرف سند دے کر دستار بندی کے بغیر ہی رخصت کر دیا جاتا تھا۔ اس نقصان کی تلافی مافات کے طور پر ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ (مطابق ۱۶، ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۱۰ء) میں صدر المدرسین حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مہتمم دارالعلوم مولانا حافظ محمد احمد اور دیگر اکابر نے ایک تاریخی جلسے کا اہتمام فرمایا۔ یہ جلسہ چونکہ کئی سال کے بعد منعقد ہو رہا تھا اس لئے کوئی ہزار بھر سے زائد ان علماء کی دستار بندی ہونا بھی جو اس عرصہ کے فارغین تھے ان ہی فارغین میں حضرت شاہ صاحبؒ بھی شامل تھے۔ جلسہ کے دوران آپ کا جو نمایاں کردار رہا اس نے ثابت کیا کہ نہ صرف اپنے ہم سبق فارغین میں بلکہ دارالعلوم سے کئی سال کے دوران فارغ شدگان میں محمد انور شاہ کشمیری کی شخصیت کو وہی امتیازات حاصل ہیں جو شب چہارہم کے ماہ تابان کو اپنے ارد گرد کے ستاروں پر حاصل ہوتے ہیں۔

جلسہ دستار بندی کے واقعہ کو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ وہ اس جلسہ کے منتظموں میں سے بھی تھے اور ان لوگوں میں سے بھی جن کی اس موقع پر دستار بندی سے عزت افزائی کی گئی اس لئے اس بارے میں ان کا بیان ایک چشم دید گواہ کا بیان ہے جس کو نقش حیات سے یہاں نقل کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

دستار بندی یعنی چہ؟..... مولینا مدنی تحریر فرماتے ہیں کہ زمانہ ہائے قدیمہ میں اس امر کے ظاہر کرنے کے لئے کہ ایک طالب علم کتب درسیہ پڑھ کر اور علوم و فنون، فقہ و حدیث میں ماہر ہو کر اس درجہ میں پہنچ گیا کہ اس کے فتاویٰ قابل اعتماد سمجھے جائیں اور اس کی تعلیم و تدریس قابل اطمینان قرار ہو، دو طریقے جاری کئے گئے تھے ایک سند دینا جس میں اساتذہ اپنے تلامیذ کی کتب خواندگی اور اس کی صلاحیت علمی اور عملی اور اپنی اجازت ظاہر کیا کرتے تھے اور دوسرا طریقہ دستار بندی یا خرقة عطا کرنے کا ہوتا تھا، مجمع عظیم میں اساتذہ تلمیذ کے سر پر اپنے ہاتھ سے دستار باندھتے تھے یا اپنا جبہ وغیرہ خرقة ہائے علماء عطا کرتے تھے اس طریقہ ثانیہ سے عام و خاص میں تلمیذ کی قابلیت کا علم اور چرچا ہو جاتا تھا۔ بخلاف سند کے کہ اس کو سمجھنا اور پڑھنا صرف اہل علم سے ہو سکتا تھا۔

دارالعلوم میں دستور دستار بندی:..... دارالعلوم دیوبند قائم ہونے کے بعد فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا طریقہ جاری کیا گیا۔ دوسرے تیسرے سال اجتماع عظیم کیا جاتا تھا اور دستار بندی سند امتحان اور تقریر علمی کی رسوم جاری ہوتی تھیں۔ اس طریقہ سے دارالعلوم کی شہرت بہت زیادہ ہونے لگی۔ نیز تعلیم عربی اور تحصیل علوم دینیہ کا جذبہ لوگوں میں بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گیا۔ یہ طریق غالباً ۱۳۰۲ھ تک جاری رہا مگر بعد میں کچھ ایسے عواقب پیش آئے کہ اس کی انجام دہی نہیں ہو سکی طلبہ کو صرف سند دی جاتی تھی۔ مگر عام لوگوں اور بالخصوص فارغ التحصیل طلبہ کے تقاضے دستار بندی کے برابر ہوتے رہتے تھے۔ جن کو لطائف حیل سے ارباب اہتمام مائلتے رہتے تھے۔

بہر حال ۱۳۲۸ھ کی اس تاریخی دستار بندی اور تقسیم اسناد کے اجلاس کی خاص بات یہ ہے کہ دارالعلوم سے فارغ التحصیل طلباء میں سے سب سے پہلے جس صاحب کی دستار بندی کی گئی وہ حضرت شاہ صاحبؒ ہی کی ذات گرامی تھی۔

جلسے کی کیفیت:..... مولینا مدنی نے جلسے کی رونداد ذیل کے الفاظ میں قلمبندی کی ہے:

”جلسہ میں اولاً جناب قاری عبدالوحید خان صاحبؒ مرحوم مدرس تجوید اور ان کے (نوعمر) شاگردوں بالخصوص مولینا محمد طیب صاحبؒ اور (آپ کے برادر) مولینا (قاری) محمد طاہر صاحبؒ وغیرہ نے باتجوید قرآن سنایا۔ اس کے بعد حضرت مولینا حافظ محمد احمد صاحبؒ مرحوم و مغفور نے اپنا مطبوعہ خطبہ موسومہ دارالعلوم دیوبند کا زریں ماضی اور مستقبل جو کہ نہایت مبسوط تھا اور اس میں دارالعلوم کی ماضی کی خدمات دینیہ اور علمیہ کو واضح طور پر ظاہر کیا گیا تھا سنایا اس میں مستقبل کی ضروریات اور اراکین کے ارادوں پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس کے بعد سب سے

پہلے عربی زبان میں حضرت مولینا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مبسوط تقریر فرمائی اس کے بعد میں نے تقریر کی جو کہ جناب رسول اللہ کے فضائل کے متعلق تھی۔ پھر دو تین طلبہ نے تقریریں کی مگر طلبہ کی انگلیں مایوسی سے تہدیل ہو گئیں جبکہ حاضرین نے مطالبہ کیا کہ تقاریر اردو میں ہوں چاہئیں وہ لوگ کچھ نہیں سمجھتے چنانچہ۔ ارباب انتظام نے مجبور ہو کر عربی تقریریں بند کر دیں اور دو میں تقریروں کا سلسلہ جاری کیا۔ اس کے بعد دوسرے اجلاس میں دستار بندی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ سب سے پہلے حضرت مولینا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دستار بندی ہوئی اس کے بعد میری دستار بندی کی گئی۔ (نقش حیات جلد اول ۱۲۳، ۱۲۵)

دارالعلوم میں تدریس کا آغاز

(۱۳۲۸ھ)

التوائے ارادہ ہجرت ۱۳۲۸ھ میں کشمیر سے روانہ ہو کر دیوبند پہنچنا اور حضرت شیخ الہند اپنے دیگر اساتذہ کرام کی ملاقات اور زیارت کے لئے وہاں کا عارضی قیام بظاہر حضرت شاہ صاحب ہجرت کے ارادے کی تکمیل کا پہلا قدم تھا لیکن بقول حضرت شاہ ولایت علی مرتضیٰ کریم اللہ وجہ "عرفہ ربی بفسخ العزائم" شاہ صاحب کو بھی دیوبند کا دانہ پانی زندگی بھر کے لئے نصیب ہو گیا۔

یرید المرء ان يعطی مناه ریابی اللہ الا ما یشاء

دارالعلوم دیوبند کے جلسہ دستار بندی کی تقریب سے کامل فراغت کے بعد جب شاہ صاحب نے پھر حضرت شیخ الہند اور حضرت مولینا حافظ محمد احمد صاحب سے عرض کیا کہ میں حجاز مقدس چلا جاؤں تو انہوں نے شاہ صاحب کو ہجرت کی اجازت نہ دی اور باصرار شاہ صاحب کو فرمایا کہ آپ کو اب دارالعلوم میں ہی کام کرنا ہے۔

چونکہ شاہ صاحب کو اپنے استاد جلیل حضرت شیخ الہند قدس سرہ اور مولینا حافظ محمد احمد صاحب کے حکم کے آگے یارائے خن نہ تھا اسلئے حضرت شیخ الہند (صدر المدرسین) اور مولینا حافظ محمد احمد صاحب (مہتمم دارالعلوم) کی دیرینہ خواہش اور تازہ اصرار کا احترام کرتے ہوئے دارالعلوم میں تدریس

خدمات انجام دینے کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دینے کے بغیر آپ کے لئے کوئی چارہ نہ رہا۔ بہر صورت اکابر دارالعلوم کے اصرار سے شاہ صاحب نے تدریس کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے اگرچہ ہجرت کا ارادہ اب بھی آپ کے دل کے کسی گوشے میں محفوظ و مستور تھا۔ دیوبند میں حضرت شاہ صاحب شمع انجمن ہونے کے باوجود قناعت و توکل اور زہد و تقویٰ کا جو

ملی نمونہ پیش کر رہے تھے اس کی بہترین تصویر حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب نے اپنے اہلین مقالہ نور الانور میں کھینچی ہے یہ مضمون اگلے صفحات میں من و عن مجموعہ ہذا کی زینت بنایا گیا ہے یہاں اس کے چند متعلقہ اقتباسات دیئے جاتے ہیں تاکہ شاہ صاحب کی حیات دیوبند کے صف گوئے یک جا پیش نظر ہو جائیں۔

دارالعلوم کے ساتھ معلمانہ تعلق:..... آپ کے شیوخ و اساتذہ نے جو آپ کے جوہروں کو جاننے اور پہچانے ہوئے تھے یہ دیکھتے ہوئے کہ دارالعلوم کی مسند درس کے شایان شان یہ ایک ہستی ہے جسے دارالعلوم نے گویا اپنے ہی لئے پیدا کیا ہے آپ کو دیوبند روک لیا اور آپ نے بھی ذات تواضع و انکسار نفس سے اپنے اساتذہ کی بات اونچی رکھتے ہوئے قیام دیوبند کا ارادہ فرمایا۔

حضرت ممدوح کے ٹھہرانے سے ابتدائی منصوبہ اور مقصد یہ تھا کہ ترمذی اور بخاری کی شرح حضرت ممدوح سے لکھوائی جائے لیکن عملاً یہ معاملہ آگے نہیں بڑھا جس کی وجہ نامعلوم ہیں شاید یہاں کہ درس کی مصروفیات بڑھ گئیں واللہ اعلم۔

بہر حال آپ نے باقتضال اکابر دارالعلوم میں درس شروع فرمایا البتہ غلبہ زہد و قناعت سے مشاہدہ لینے پر راضی نہ ہوئے۔ اور لوجہ اللہ کام شروع کر دیا اس اصرار پر ان کے اکابر نے بھی سکوت رضا سے کام لیا اور تنخواہ کا مسئلہ کلیہ ان ہی کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

فلس بریں بطور فرد خاندان قاسمی:..... لیکن حضرت والد ماجد حضرت مولینا حافظ محمد احمد صاحب نے ان کے بعد یہ گوارہ نہیں کیا کہ طعام و ضروریات طعام کے مصارف خود ان کے سر ڈالے جائیں لہذا فرمایا کہ اگر مدرسہ سے حضرت ممدوح لینا نہیں چاہتے تو ان کے سر میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

قیمری متعین صورت یہ ہے کہ کھانا میرے ساتھ کھائیں اسے حضرت ممدوح نے منظور فرمایا۔ اور اس طرح تقریباً دس برس تک یہ صورت قائم رہی حضرت والد ماجد علیہ الرحمۃ نے بھی اپنا معروف آبائی اور روایتی مہمان نوازی سے آپ کو مثل اپنے اہلیت کے سمجھا اور نہایت پورے انشراح و انبساط کے ساتھ یہ دور پورا ہوا۔

علمی مجالس کا دلکش منظر:..... اس دور میں حضرت مولینا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی حضرت شیخ الہند اور حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، اور قیام دیوبند پر مجبور فرمایا ممدوح بھی یہاں رک گئے، اور وہ بھی اس پوری مدت میں حضرت والد ماجد ہی کے مہمان رہے یہ دستر خوان بظاہر کھانے کا دستر خوان ہوتا تھا لیکن حقیقۃً اہل علم و فضل کی ایک پاکیزہ مجلس ہوتی تھی جس

میں حضرت والد ماجد قدس سرہ حضرت مولینا حبیب الرحمن صاحب قدس سرہ حضرت مولینا شاہ صاحب قدس سرہ حضرت مولینا عبید اللہ سندھی اور اکثر و بیشتر حضرت مولینا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور متعدد دوسرے اکابر اساتذہ دارالعلوم شریک رہتے تھے۔ علمی مسائل میں مکالمے ہوتے بحثیں ہوتیں، معارف و حقائق کھلتے اور خصوصیت سے حضرت شاہ صاحب اور مولینا سندھی مختلف علوم و فنون کے کافی دلچسپ مباحث چھیڑتے اور آخر کار بزرگان مجلس کی طرف سے کبھی مزاحیہ رنگ میں اور کبھی سنجیدہ اور مٹھین رنگ میں فیصلے اور مکالمے سنائے جاتے حاضر الوقت خدام و طلبہ شاید درس و تدریس کی لائن سے برسہا برس میں وہ تحقیقات ہاتھ نہ لگ سکتی تھیں جو اس حلقہ طہار میں پکی پکائی ایک دم مل جاتی تھیں۔ ان دنوں بزرگوں میں حاضر الوقت اکابر کے کمال ادب و احترام کے ساتھ سلسلہ مسائل حق گوئی میں کبھی کوئی ادنیٰ ضحکالال یا تہاون پیدا نہ ہوتا تھا اور ہر ایک دوسرے کے خلاف برملا اور بہت صاف ریمارک کرتا۔

اسی طرح کھانے پینے کا یہ دسترخوان ماندہ علم و فضل بن جاتا اور اس دسترخوان پر صرف بدنی غذا ہی جمع نہ ہوتی تھی بلکہ روحانی غذاؤں کے قسم قسم کے الوان جمع ہو جاتے تھے اور دسترخوان اس شعر کا مصداق بن جاتا۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد

بہ رنگ اصحاب صورت را بہ بوار باب معنی را

فتاوت فطری:..... حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں غذاء کے بارے میں لطافت تھی مگر شوقینی نہ تھی۔ غذاؤں کے تنوع اور کھانوں کے الوان کی طرف طبیعت جھکی ہوئی نہ تھی۔ جو مل گیا کھا لیا اور جو آگیا شکرو رضا سے اسے قبول کر لیا میری جدہ محترمہ رحمۃ اللہ علیہا (جن کی مہمان نوازی اپنے دور میں مشہور تھی اور خود حضرت نانوتوی قدس سرہ نے بھی اس بارہ میں یہ کہہ کر شہادت دی تھی کہ ہماری مہمان نوازی تو احمد کی والدہ کی بدولت ہے) کبھی کبھی حضرت شاہ صاحب سے میری معرفت یہ کہلا کر بھیجتیں کہ حضرت کبھی تو اپنے کسی مرغوب کھانے کی فرمائش کر دیا کیجئے۔ تو متاثر اند لب و لہجہ سے جواب دیتے کہ میری طرف سے گزارش کیجئے اور عرض کر دیجئے کہ دسترخوان پر ہمہ نعمت موجود ہوتے ہوئے میں کاہے کی فرمائش کروں مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں میری جنت کی نعمتیں یہیں تو نہیں تمام کی جا رہی ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کا نکاح

(۱۳۳۶ھ)

حضرت شاہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے قلب معصوم اور نفس مطمئنہ کی دولت سے سرفرازی بخشی تھی اب اظہارِ حضور واقع ہوئے تھے چنانچہ ۳۳ سال کی عمر تک آپ نکاح اور تامل سے پرہیز کرتے رہے۔ آخر کی زندگی کو ترجیح دیتے رہے۔ اس کا بنیادی سبب تو یہ تھا کہ فنا فی العلم ہو جانے کی وجہ سے آپ الہامی زندگی کا ایک ایک لمحہ پڑھنے اور پڑھانے میں ہی صرف کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ آپ کے دل و دماغ پر حرمین کی طرف ہجرت کر جانے کا شوق ابتداء ہی سے جاگزیں تھا اور جب کچھ ناملائم حالت پیش آجاتے تو دماغ میں جاگزیں داعیہ ہجرت تازہ ہو جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس طویل عرصہ میں آپ نے دیوبند دہلی اور بارہ مولہ وغیرہ میں اپنا قیام عارضی شکل کا رکھا اور کہیں بھی مستقل طور توطن اختیار نہ کیا ظاہر ہے کہ نکاح اور ازدواج اس قسم کی طرزِ حیات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔

اب جب آپ کی عمر چوالیس ۳۴ سال سے متجاوز ہو چکی تھی تو روز بروز آپ تجرد و تنہائی کو دوام دینے کی طرف زیادہ سے زیادہ راغب ہو رہے تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا حافظ محمد احمد صاحب مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی اور دیگر اکابرین دیوبند بھی اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ شاہ صاحب کے تجرد کے بواعث میں سے ایک باعث ہجرت کا ارادہ بھی ہے۔ اس لئے ان کو کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کسی وقت یہ شہباز دیوبند کے مرغزار سے پرواز کر کے کوہستان حجاز کو اپنا مسکن نہ بنائے اور ہندوستان اس کے فیوضات سے ہاتھ دھو بیٹھے بنا براں دارالعلوم کی ملا اعلیٰ میں مشورے ہوئے اور اس آہوئے گریز پاکو از دواج اور تامل کی زنجیریں پہنا ڈالی گئیں۔

مولانا حبیب الرحمن عثمانی کی حسن تدبیر:..... چنانچہ اکابرین دیوبند خصوصاً مولانا حبیب الرحمن عثمانی (جو اس وقت دارالعلوم کے مہتمم ثانی تھے) نے وہ تدبیر اختیار فرمائی جو اہل خانہ نے حضرت معمرؑ کے روکنے کے لئے کی تھی۔

۱۔ حضرت معمر بصرہ کے رہنے والے تھے اور اس جلیل القدر عالم اور حافظ حدیث کو یہ شرف و مجاہد بھی حاصل تھا کہ مولانا حبیب الرحمن عثمانی نے اسے روکا اور سفیان ثوری شعبہ سفیان بن عیینہ اور عبد اللہ بن مبارک جیسے اکابر کو آپ ہی سے شرف تلمذ حاصل تھا

لما دخل معمر الیمن مکرہوا ان یخرج من بینہم فقال رجل قیدوہ فزوجوہ
(شرح الامام النوری علی البخاری ص ۴۶)

معمر (بصرہ) کے رہنے والے تھے جب یمن میں داخل ہوئے تو اہل یمن نے یہ گوارہ نہ کیا کہ معمر یہاں سے واپس چلے جائیں ایک شخص نے کہا کہ اگر ان کو روکنا چاہتے ہو تو معمر کو یہاں قید کر لو یعنی انکا نکاح کر دو

حضرت شاہ صاحب کی شادی کی اجمالی تفصیل حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب سے
بایگانہ ایجاز کے ساتھ یوں رقم فرمائی ہے۔

ہجرت سے روکنے کی سعی قیام دیوبند کی یہ صورت قائم ہو جانے پر حضرت شاہ صاحب
نے ہاشارہ اکابر درس و تدریس کا مستقل سلسلہ جاری تو فرمادیا لیکن ہجرت کی پاک نیت سے
دستبردار نہ ہوئے اور برابر حاضری حرم نبوی و حرم الہی کا جذبہ آپ کو دیوبند چھوڑنے کی طرف مائل
کرتا رہتا تھا۔ جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا اور اکابر باطنف تعبیر اسے ملاتے جاتے لیکن خطرہ نہیں
بھی رہتا تھا کہ نہ معلوم کس وقت یہ جذبہ غالب ہو جائے۔ اور دارالعلوم کو ایسی جامع اور مستقبل کی
بڑی بڑی امیدوں کی محور ہستی سے دستبردار ہونا پڑ جائے اس لئے یہ حضرات بھی نہیں مستقل
دینے کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔

ازدواجی علاقہ آخر کار انہیں پابند بنانے کے لئے ان بزرگوں نے ان کے پیروں میں بڑی
ڈالنے کی تدبیر سوچ لی اور ارادہ کیا کہ حضرت ممدوح کا نکاح کر دیا جائے گو اس سے حضرت ممدوح
کو انکار تھا مگر باطنف تدبیر انہیں راضی کر کے گنگوہ کے سادات کے ایک خاندان میں نکاح کر دیا
گیا۔ ۱۰ میری دادی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا اور حضرت والد ماجد قدس سرہ نے اس کی کفالت فرمائی اور ان
کی اس تقریب کو اس طرح انجام دیا جس طرح وہ اپنی اولاد کی کوئی بھاری تقریب کر سکتے تھے۔

بارات بھوپال ۱۱ گئی۔ علماء کی ایک جماعت ساتھ تھی، بڑی پر مسرت فضا میں نکاح ہوا اور
آئی تو حضرت جدہ محترمہ نے اسی طرح گھر میں اتارا جیسے اپنے گھر کی دلہن اتاری جاسکتی ہے ورنہ
کی لمبی چوڑی دعوت کی اور احقر کے زمانہ مکان کے بالا خانہ پر حضرت شاہ صاحب مع اہلیہ محترمہ
فرہ بخش ہوئے۔

اس پر تقریباً ایک دو سال ہی گزرے تھے کہ اولاد کی امید ہوئی ہمارے گھر میں اس کی وہی خوشی
تھی جو اپنے گھر میں اہلیت کے اولاد ہونے کی ہوتی ہے اس وقت تک میری شادی نہیں ہوئی تھی
گھر میں عرصہ ید گزر چکا تھا کوئی بچہ نہیں تھا جس کی سب کو تمنا تھی اس امید سے کہ حضرت ممدوح
کے یہاں بچے ہوئے والا ہے سب گھر والوں کو بالخصوص میری دادی صاحبہ مرحومہ کو بے حد خوشی تھی
اور جیسا کہ عورتوں کا قاعدہ ہوتا ہے انہوں نے عقیقہ کی تقریب کا سامان بھی شروع کر دیا تھا کہ

۱۔ یہ ۱۳۲۱ھ کا واقعہ ہے جب شاہ صاحب کی شادی ہوئی اس وقت آپ کی عمر ۳۳ سال تھی کوئٹہ۔

۲۔ چونکہ حضرت شاہ صاحب کی زوجہ محترمہ کی والدہ گرامی سیدہ یعقوب علی صاحبہ ۱۸۵۵ء میں گنگوہ سے بھوپال
چلے گئے تھے اس لئے بارات کو بھوپال جانا پڑا۔

اچانک حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کو مشورہ دیا گیا اور ممکن ہے کہ خود ان کے قلب میں ہی داعیہ از خود پیدا ہوا ہو انہوں نے حضرت جدہ مرحومہ سے عرض کرایا کہ دس سال تک تو میں تنہا تھا اب دو سال سے متاہل ہوں اور آپ ہی کے یہاں مقیم ہوں اب اولاد کی امید ہے تو اب میں ایک اور دو کے ساتھ ایک عائلہ کا بار ڈالنے اور ڈالتے رہنے میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں مجھے اجازت دی جائے کہ الگ مکان لے کر رہوں۔

حضرت ممدوحہ اور والد ماجد اس پر راضی نہیں ہوئے تھے لیکن ادھر سے اصرار بڑھا تو انہوں نے بادل ناخواستہ اسے قبول فرمالیا اور حضرت شاہ صاحب محلہ دیوان کے ایک مکان میں فروکش ہو گئے۔

تنخواہ لینے پر رضا مند ہونا پڑا..... اس صورت واقعہ کے بعد ذمہ داران مدرسہ کے لئے موقع آ گیا کہ وہ تنخواہ لینے کے لئے حضرت ممدوحہ پر اصرار کریں چنانچہ کیا اور تاہل کی زندگی اور اس کے وسیع ہوتے رہنے کی صورت حال کے ماتحت طوعاً کرہاً ممدوحہ کو بھی یہ اصرار قبول کر کے تنخواہ لینے پر راضی ہو جانا پڑا۔ اور اب ایک گھر ہستی کی طرح ان کی عائلی زندگی کا دور شروع ہو گیا۔

اس مکان کی رہائش کے بعد عزیزم مولوی ازہر شاہ سلمہ کی بہن عابدہ مرحومہ پیدا ہوئی اور پھر میاں ازہر شاہ سلمہ معرض وجود میں آئے تجرد سے تاہل ہوا تھا اور اب تاہل سے عائلی اور خاندانی زندگی کی داغ بیل پڑ گئی اور زندگی کے علاقہ ایک ایک کر کے بڑھتے رہے اس کا قدرتی نتیجہ وہی نکلا جو ایک تدبیر کے اختیار کرنے والے بزرگوں نے سوچا تھا کہ حضرت شاہ صاحب متعبد ہو گئے اور ہجرت کر جانے کا وہ جذبہ سست پڑ گیا بالآخر ترک کر دینا پڑا اور باطمینان خاطر دارالعلوم میں مشغول رہے۔

دارالعلوم کی صدر مدرس

اور

حضرت شیخ الہند کی جانشینی

توال ۱۳۳۳ھ الگسنہ ۱۹۱۵ء

ایک مقتدر انتظامی..... دارالعلوم دیوبند کے عظیم الشان صدر مدرس حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ جامع الکملات ہستی تھے۔ محدث جلیل اور فقیہ نبیل ہونے کے لحاظ سے اپنے معاصرین

میں بے مثال تھے۔ حدیث اور فقہ میں اس امتیاز نے آپ کو دارالعلوم کی صدارت کے معلمین کا صحیح ترین مسند نشین بنادیا تھا۔ بے نظیر علمی کمالات کے ساتھ ساتھ آپ نے زہد و تقویٰ اور تصوف و طریقت میں بھی آخری منزلیں طے کی تھیں اور اپنے وقت کے ان اولیاء کبار میں سے تھے جن کی عظمت کا مخالفین کو بھی اعتراف تھا۔ پھر ان تمام خصوصیات کے علاوہ آپ کو یہ ذاتی امتیاز حاصل تھا کہ ہندوستان کی سیاست اور بین الاقوامی سیاست کے بارے میں آپ کے مخصوص نظریات اس قسم کے تھے جو آپ کو حال سے زیادہ مستقبل کا مفکر ثابت کر رہے تھے آپ انگریزی امپریل ازم کے شدید ترین مخالف اور انگریزوں کے اثر و تسلط کو ہندوستان، مصر اور تمام مشرقی ممالک سے مکمل اور غیر مشروط طور اکھاڑ پھینکنے کے زبردست داعی تھے۔ جس زمانہ میں اکثر سیاسی لیڈر انگریز کے زیر سایہ چند ایک رعایات کا نام ہوم رول رکھ کر آنکھیں اصلاحات کی بھول بھلیوں میں سرگردان رہتے تھے۔ شیخ الہند اس زمانہ میں بھی مکمل انقلاب اور آزادی کامل کے سوا ہندوستان کے مستقبل کے لئے دوسرے کسی نقشے کا تصور کرنا بھی لایعنی سمجھتے تھے آپ کی عادت شریف تھی کہ اپنے شاگردوں پر بہت گہری نظر رکھتے تھے اور تد ریس کے زمانہ میں ہی ایک طرف ان کی علمی اور عملی خصائل کو ابھارنے اور اجاگر کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے، اور دوسری طرف اپنے بیچ مشن کی ضرورتوں کے لحاظ سے یہ بھی دیکھتے رہتے تھے کہ ان شاگردوں میں سے کسی کو حدیث سے، کسی کو فقہ سے اور کس کو سیاست اور انقلاب کے کام سے فطری مناسبت ہے آپ ہر شاگرد کے فطری اور خدا داد رجحان کو متقل دینے اور جلا دینے کا حکیمانہ فرض درس کے ساتھ ساتھ ہی انجام دیتے جاتے تھے۔

استاد پر شاگرد کی صلاحیتوں کا انکشاف..... حضرت مولینا انور شاہ کشمیری کی دینی صلاحیتیں حضرت شیخ الہند پر ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۱۴ھ تک طالب علمانہ مراحل کے زمانہ میں ہی روشن ہو چکی تھیں اور آپ پر واضح ہو چکا تھا کہ ذہانت و فطانت متانت و دیانت کا پتلا یہ کشمیری نوجوان میدان سیاست کے لئے نہیں بلکہ مسند تد ریس علوم دین کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔ وقت آنے پر اس سے یہی کام لینا اس کی قابلیتوں کا صحیح استفادہ کرنا ہوگا۔ تحصیل علم سے فراغت کے بعد مدرسہ امینیہ دہلی کے بیچ سالہ دور تد ریس میں شاہ صاحب کی جو عالمانہ و معلمانہ شہرت علمی حلقوں میں پھیل گئی اس سے حضرت شیخ الہند نہ صرف آگاہ تھے بلکہ اس پر گہری نظر رکھتے تھے دہلی سے کشمیر واپس آ کر ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۸ھ تک مدرسہ فیض عام کے سلسلہ میں شاہ صاحب سے دینی اور ملی ترقی کے لئے جس بے تابی اور بے چینی کا ظہور ہوتا رہا اس سے بھی حضرت شیخ الہند جس طرح بھی بے خبر نہیں ہو سکتے تھے اسی زمانہ کا واقعہ ہے اور یہ واقعہ حضرت شیخ الہند کی شاہ صاحب کے حالات پر توجہ مسلسل کا ثبوت ہے کہ جب علامہ ظہیر احسن شوق نیوی نے اپنی معرکہ الآراء تالیف "آثار السنن" کے کچھ

اجزاء، بغرض ملاحظہ حضرت شیخ الہند کی خدمت میں بھیجے تو حضرت ممدوح نے انہیں وہ اجزاء واپس ارسال کئے اور مولینا شوق نیوی کو مشورہ دیا کہ اس بارے میں میرے ایک شاگرد رشید انور شاہ کشمیری سے مرسلت کریں اور ان سے مشورہ لیں۔ چنانچہ آپ ہی نے محدث نیوی کو شاہ صاحب کا پتہ بھی لکھ دیا شاہ صاحب ان دنوں کشمیر میں ہی تھے۔ حضرت شیخ الہند کی امید کے مطابق مولینا شوق نیوی کے مسودات پر شاہ صاحب نے اتنے اضافے فرما دیئے کہ بقول خود حضرت شاہ صاحب کے کہ میں نے جو اضافے کئے وہ مقدار میں ان کی اصل کتاب سے زیادہ تھے۔

۱۳۲۸ھ سے ۱۳۳۳ھ تک (تقریباً چھ سال) حضرت شاہ صاحب دارالعلوم دیوبند کے درجہ علی کے معلمین میں شامل رہے اور حضرت شیخ الہند کی آنکھوں کے سامنے مختلف علوم کے اونچے درجے کی کتابیں پڑھاتے رہے حدیث میں صحیح مسلم، ابن ماجہ اور ابوداؤد کا درس آپ کے ذمہ تھا۔

پہلا مرحلہ۔ مدرس درجہ عالیہ..... جب اکابرین دیوبند نے حضرت شاہ صاحب کو ۱۳۲۸ھ میں دارالعلوم کی معلمی قبول کرنے پر آمادہ کیا تو شاہ صاحب کی شخصیت کے متعلق ماضی کے یہی تجربات ان کی خواہشات کے متحرک اور رہبر تھے۔ ان حالات میں شاہ صاحب کی ذات کے ساتھ ان حضرات کا اونچی اونچی توقعات وابستہ کرنا جی برحقائق تھا۔

حضرت شاہ صاحب کے شاگرد خاص مولینا محمد صدیق نجیب آبادی نے "انوار المحمود فی شرح سنن ابی داؤد" حضرت شاہ صاحب کی اسی زمانہ کی مالیات کی بنا پر لکھی ہے (اس کتاب کے تسمیہ میں حضرت شاہ صاحب اور حضرت شیخ الہند مولینا محمود الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام کی تبلیغ کی گئی ہے) صحیح مسلم کے درس کی انوری تقاریر پر مشتمل ایک مجموعہ امالی شاہ صاحب کے ایک اور مشہور شاگرد اور عالم و فاضل مولینا سید مناظر احسن صاحب گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی تیار کی تھی جو چھپ نہ سکی اور ضائع ہو گئی ①۔

① کتابات تقدیر میں سے اس چیز کا شمار کرنا چاہئے کہ حضرت شاہ صاحب کے قابل شاگردوں نے اپنی تقاریر و درس حدیث کی جو مالیات مرتب کی تھیں ان میں سے متعدد گم ہو گئیں یا عاریتہ لینے والوں نے واپس نہ کیں مولینا قاری محمد حبیب صاحب نے کافی عرق ریزی سے چار پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک المانی بیاض تیار کی تھی جس میں حضرت شاہ صاحب کی ہر علمی تحقیقات درج کی گئی تھیں انہوں نے یہ مولینا طیب صاحب سے یہ کاپی ایک طالب علم نے مستعار لی اور اچھالی حضرت موصوف کے انہوں نے وہی کیا جو کتاب کو عاریتہ مانگنے والے طلبہ کرتے ہیں۔

صاحب ترجمہ الخواطر مولینا سید عبدالحی لکھنوی کے فرزند ارجمند اور مولینا سید ابوالحسن ندوی مدظلہ کے برادر محرم مولینا حکیم ذاکر سید عبدالحی صاحب (فاضل دیوبند بی ایس سی ایم بی بی ایس، سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے ۱۳۲۶ھ میں دورہ علم شاہ دیوبند میں پڑھا حضرت شیخ الہند سے بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھی (بقیہ اگلے صفحے پر)

مولینا گیلانی مرحوم ۱۳۳۰ھ کے دورہ احادیث کے طلباء میں سے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ شیخ الہندؒ کی موجودگی میں ہی سوائے شیخ بخاری اور جامع ترمذی کے صحاح ستہ کی دیگر سب کتابیں پڑھا رہے تھے۔ جب حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت شاہ صاحبؒ کے مدرسہ کمالات اور علم حدیث میں آپ کے تجربہ کا براہ راست اندازہ لگا لیا تو آپ کو شاہ صاحبؒ کے وجود میں خود اپنی ذات کا عکس دکھائی دینے لگا اس مرحلے پر حضرت شیخ الہندؒ نے یقیناً یہ محسوس کر کے اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ ضرورت کے وقت میری ذمہ داریوں کو اپنے کاندھوں پہ لیے کی اہلیت کی مالک ایک شخصیت منصبہ شہور پر آگئی ہے۔

شیخ الہندؒ کا تاریخی اقدام:..... جب ۱۹۱۴ء کی پہلی عالمگیر جنگ (First World War) کا شعلہ بھڑک اٹھا، حضرت شیخ الہندؒ مشرق سے انگریزی تسلط کے خاتمے کی تمنا اور ہندوستان کی آزادی کے جذبے سے بے تاب ہو گئے سرحدات، افغانستان اور خود ہندوستان کے اندر سعی آزادی کو بے شردیکھ کر آپ نے سرزمین حجاز کو اپنی مساعی کا مرکز بنا کر انگریزی راج کے خلاف ایک وسیع محاذ منظم کرنا چاہا اور دیوبند سے حرمین شریفین کا سفر اختیار کیا۔

چونکہ آپ دارالعلوم کو ایک امانت مان کر اپنے آپ کو پہلے اللہ تعالیٰ کے سامنے اور اس کے بعد قوم کے سامنے اس امانت کی حفاظت کا ذمہ دار سمجھتے تھے اس لئے اس نازک موقع پر آپ کو ایسے انسان کی تلاش تھی جو آپ کی عدم موجودگی میں دارالعلوم کو آپ کے وضع کردہ طریقہ کار پر چلانے اور خاص کر تدریس حدیث میں آپ کے طرز فکر کی ترجمانی کما حقہ کر سکے۔

دوسرا مرحلہ مسندِ صدارت المدبرین:..... حضرت شیخ الہندؒ کو دارالعلوم کے تمام معلمین میں سے حضرت مولینا محمد انور شاہ صاحبؒ ایک ایسے معلم دکھائی دیئے جن میں یہ مطلوبہ اوصاف بدرجہ اتم پائے جاتے تھے اس لئے آپ نے اپنی نیابت کے لئے شاہ صاحبؒ ہی کو منتخب فرمایا۔ حضرت

(بقیہ گذشتہ صفحہ سے آگے) حضرت شاہ سے ابو داؤد شریف پوری اور مسلم شریف کا بڑا حصہ پڑھا مولینا عبدالعلی صاحبؒ موصوف اور آپ کے ایک اور ہم درس ساتھی مولینا خواجہ عبدالحی صاحبؒ فاروقی حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ کے نو اور علیہ کو مشترکہ طور قلمبند کر چکے تھے ان دونوں حضرات کے تحریر کردہ امالی کے نوٹ کا یہ نادر مجموعہ بھی کوئی صاحب اڑا کر لے گیا۔ کسی کا مشہور شعر ہے۔

دیوانِ ظہیر فارابی در گمہ بدو اگر بیابی

ظہیر فارابی کے دیوان کو تو صرف چرانے کی ترغیب دی گئی تھی مولینا انور شاہ کشمیری کی مالیات کو عاریتاً لینے کے بعد واپس نہ کرنے کا دستور رائج ہو گیا۔

مولینا سید محمد میاں صاحب دیوبندی کے الفاظ میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دارالعلوم کی جانشینی ایک ایسا بابت تھا جو بلا کسی قطع برید کے حضرت شاہ صاحب کے قیامت موزون پر راست آ رہا تھا۔

حضرت شیخ الہند کے سفر حجاز اختیار فرمانے کے وقت اوروں کو نو یہ فکر تھی کہ اب آپ کی جگہ دارالعلوم کا صدر مدرس کون ہو؟ قیاس یہی تھا کہ حضرت شیخ الہند کے بہت سے سینئر فقہاء ہیں (جن میں سے بعض حضرت شاہ صاحب کے استاد بھی تھے) (اللہ ان ہی میں سے کوئی ہوگا جس کو حضرت شیخ الہند سفر حجاز اختیار کرنے کے وقت اپنی جگہ پر بٹھائیں گے۔ لیکن حضرت شیخ الہند نے ایک تعجب خیز (اور بہت سے لوگوں کے لئے حیرت انگیز) قدم اٹھایا اور دارالعلوم کے مدرسین میں سے ایسے مدرس کو اپنی جگہ مسند آرائے صدارت معلمین بنادیا، جس کی مدرسہ کی مدت پانچ چھ سال سے زیادہ نہ تھی اور وہ تھے مولینا انور شاہ کشمیری اس طرح حضرت شاہ صاحب کچھ چالیس یا اسیالیس سال کی عمر میں دینی اور علمی مقام عزت کے اس بلند ترین مینار پر پہنچ گئے جس سے اونچا ہندوستان بھر میں کوئی اور مقام نہ تھا۔

ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم

مولینا طیب صاحب کی تحریر:..... حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ عم فیضہم کے مضمون مطبوعہ حیات انور میں سے یہاں کچھ حصے عنوان زیر بحث پر بصیرت افروز روشنی ڈالتے ہیں اس لئے ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

”(جب) حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ نے حجاز مقدس جانے کا قصد فرمایا اور شہرت ہوئی کہ حضرت بہ نیت ہجرت تشریف لے جا رہے ہیں۔ یہ شہرت تو غلط ثابت ہوئی لیکن تشریف بڑی محقق تھی۔ مگر شیخ زمانہ اور دارالعلوم کے شیخ الحدیث کا دارالعلوم سے جانے کا ارادہ کرنا کوئی معمولی حادثہ نہ تھا۔ زمانہ بھی پر آشوب ہو گیا تھا۔ حضرت کی نسبت برطانوی حکومت کو شکوک و شبہات پیدا ہو چکے تھے اور حضرت شیخ اور دارالعلوم کے بھی خواہوں کو ایک تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں گورنمنٹ آپ کو تھام نہ لے اور سب سے بڑا خطرہ دارالعلوم کی ایسی فرد فرید شخصیت نمونہ اکابر و اسلام اور یگانہ روزگار ہستی سے محروم ہو جانے کا تھا جو کچھ کم حادثہ نہ تھا۔ لیکن دارالعلوم کے ذمہ دار مہرین نے حضرت شاہ صاحب کو دارالعلوم میں روک کر پہلے ہی آنے والے خطرے کی روک تھام کر لی تھی اور حضرت شاہ صاحب جیسی یکتائے زمانہ ہستی کو دارالعلوم میں لا کر بٹھا دیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت شیخ کی دارالعلوم سے ایک

عارضی جدائی اور مخصوص روحانی برکات سے برائے چندے محرومی کا اثر تو ضرور ہوا لیکن علمی حلقہ کے خلاء کا خطرہ رو براہ نہ آسکا۔ مسند بھری بھرائی گویا موجود تھی اگر شیخ الہند برائے چندے سامنے نہ رہے تو شیخ کے مثل سامنے تھے۔

چنانچہ حضرت (شیخ الہند) کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے قائم مقام مدرس کی حیثیت سے درس ترمذی و بخاری کو سنبھال لیا اور علمی پیاسوں کو یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ علم کے ایک بحرِ خار سے محروم ہو گئے ہیں۔ بلکہ انہیں یہ محسوس ہوا کہ اگر مسند سامنے نہیں رہا تو اس مسند سے نکلا ہوا ایک عظیم الشان دریا ان کے سامنے ہے جو اپنی بعض امتیازی خصوصیات کیساتھ بدل الغلط نہیں بلکہ بدل صحیح ہے۔ جن سے بلا تامل علوم کے پیاسے سیراب ہونے لگے اور آبِ حیات سے قدیم وجہ یہ سیرابی میں انہیں کوئی زیادہ فرق محسوس نہ ہوا۔ بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے درس حدیث میں کچھ ایسی امتیازی خصوصیات نمایاں ہوئی جو عام طور سے دروس میں نہیں تھیں اور حضرت شاہ صاحبؒ کا انداز درس و تحقیق دنیائے درس و تدریس میں ایک انقلاب کا باعث ثابت ہوا (حیات انور ۲۰۸، ۲۰۹)۔

تقسیم کار:..... صاحب التعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح مولینا محمد ادریس کاندھلوی مرحوم (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ لاہور) حضرت شاہ صاحبؒ کے ان تلامذہ میں سے تھے جن کو فن حدیث کی مناسبت کے لحاظ سے آپ سے خصوصی فیض حاصل ہوا تھا۔ اور یہ فیض آپ کی وساطت سے ان ہزاروں لوگوں تک پھیلا جو دارالعلوم اشرفیہ لاہور سے ہر سال حدیث کا دورہ ختم کر کے نکلتے رہے۔

مولینا محمد ادریس صاحبؒ نے اپنے ایک مضمون میں حضرت شیخ الہند کی رواں گئی حجاز کے موقع پر شاہ صاحبؒ کی جانشینی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ آپ نے رخصت ہونے سے پہلے احادیث کی کون کون سی کتابوں کا درس اپنے کس کس شاگرد کے ذمہ کیا۔ مولینا کاندھلوی تحریر فرماتے ہیں:

”حضرت مولینا محمد حسن صاحبؒ دیوبندی قدس اللہ سرہ اپنے زمانہ میں علم اور ورع کے لحاظ سے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا نمونہ تھے۔ حدیث کے پروانے آپ کے گرد جمع تھے۔ آپ کے بے شمار شاگردوں میں حضرت مولینا انور شاہ امام بخاری کا نمونہ تھے۔ اور حضرت مولینا شبیر احمد عثمانی دیوبندی امام مسلم کا نمونہ تھے اور حضرت مولینا سید اصفہر حسین دیوبندی ابو داؤد کا نمونہ تھے۔ شیخ الہند حضرت مولینا محمود حسن صاحبؒ نے جب ہندوستان سے حرمین محترمین کا قصد فرمایا تو صحیح بخاری کا درس مولینا انور شاہ کے سپرد فرمایا اور صحیح مسلم مولینا شبیر احمد عثمانی کے اور سنن ابی داؤد مولینا

سید اصغر حسین صاحب کے سپرد فرمائی چنانچہ یہ تینوں حضرات ساری عمر یہی تین کتابیں پڑھاتے گزر گئے جو ان کے امام احمد ان کے سپرد کر گئے تھے۔ آج ہندوستان کی سر زمین میں صد ہا جگہ بخاری مسلم اور ابوداؤد کے درس جاری ہیں جن کے درس دینے والے شیخ الہند کے خدام اور خدام الخدام ہیں۔ لیکن ان اسباق ثلاثہ کی خصوصی تقسیم کی خصوصیت سوائے ان حضرات ثلاثہ کے اور کسی کو نہیں۔ (حیات النور ۱۱۳)

اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند ۱۳۳۳ھ میں جب حضرت شیخ الہند دیوبند سے سفر حجاز پر روانہ ہو گئے تو کس کے وہم و گمان میں تھا کہ سات سمندر پار سے آئے ہوئے ظالم انگریز حکمران حضرت موصوف اور آپ کے دیگر رفقاء سفر (خاص کر آپ کے خصوصی فیض یافتہ مولینا سید حسین احمد دہلوی) کو گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں نظر بند رکھیں گے اور اس طرح سے تقریباً پانچ سال تک حضرت شیخ الہند کو دیوبند سے دور رکھا جائے گا۔

قیام حجاز میں حضرت شیخ الہند نے آزادی وطن کے لئے کیا کیا اور اقدامات کئے اور جب آپ کو گرفتار کر کے مالٹا کے جزیرہ میں نظر بند کیا گیا تو آپ نے کیا کیا تکلیفیں برداشت کیں؟ یہ ایک بہت بڑا موضوع ہے اور اس پر باقاعدہ تصنیفیں بھی منصہ شہود پر آئی ہیں۔ خاص کر مولینا سید حسین احمد دہلوی کی تصنیفات اسیر مالٹا اور نقش حیات میں اس کی کافی تفصیل ہے۔ اس لئے اس واقعہ کی تفصیلات درج کرنے کا یہ موقع محل نہیں ہے۔ بایں ہمہ چونکہ حضرت شیخ الہند علم حدیث میں شاہ صاحب کے سب سے بڑے استاد اور مربی تھے اسلئے آپ کے معاملات پر مشتمل ایک مختصر خاکے کو ہم کتاب ہذا کے تہمت میں درج کر رہے ہیں (انشاء اللہ)

یہاں صرف اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند دیوبند سے روانہ ہوئے اور ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ ۱۹۲۰ء کو طویل اسارت کے بعد واپس وطن آ گئے وطن پہنچ کر آپ کو چند اسفار پیش آئے اور واپسی سے رحلت تک کل ۶ ماہ تک بقید حیات تھے۔ آخر ۱۸ ماہ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۱ء کی صبح کو آپ نے انتقال فرمایا۔ (رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ)

تیسرا مرحلہ۔ مستقل صدر المدرسین :..... اس وقفہ قلیلہ میں سیاسی مشاغل اور حالات مسلسل کی وجہ سے حضرت شیخ الہند کو دارالعلوم کے صدر المدرسین کی حیثیت سے از سر نو مسند تدریس پر رونق افروز ہونے کی فرصت ہی نہ ملی اور حضرت شاہ صاحب اس امید پر اپنی ڈیوٹی انجام دینے میں لگے رہے کہ جلد ہی حالات تبدیل ہوں گے۔ اور حضرت الاستاذ اپنا کام سنبھال

لیں گے لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا چنانچہ ان ہی حالات میں حضرت شیخ الہند کے انتقال کا حادثہ پیش آیا تو متعلقین دارالعلوم کو حضرت موصوف کا عہدہ جلیلہ پر کرنے کے لئے شخصیت کی تلاش میں پریشان ہونے کی نوبت نہ آئی۔ حضرت شاہ صاحب کو بذات خود پانچ چھ سال قبل حضرت شیخ الہند نے اپنی جگہ پر بٹھایا تھا اور اس مدت میں شاہ صاحب کے محدثانہ و مد سانہ کمالات اکابر اہتمام کو اور دارالعلوم کے تمام مدرسین اور طلباء کو اور مدرسہ کے باہر ملک کے اہل علم کو گرویدہ بنا چکے تھے اس لئے سب کی نظروں میں اب حضرت شیخ الہند کی خالی کردہ نشست کو کرنے کے لئے حضرت شاہ صاحب سے موزوں تر ہستی ملک بھر میں موجود نہ تھی۔ حضرت شیخ الہند نے جس طرح چھ سال قبل سفر حجاز کا قدم اٹھانے کے وقت شاہ صاحب کو اپنے فرائض سنبھال کر اپنی پسند اور اپنے انتخاب کا اظہار کر دیا تھا۔

مولینا آزاد کا مطالبہ:۔۔۔ اسی طرح اپنی وفات سے چند دن پہلے بھی شاہ صاحب کو دارالعلوم کے لئے ضروری ترین شخصیت قرار دیتے ہوئے مولینا آزاد کا یہ مطالبہ مسٹر دفرمایا تھا کہ شاہ صاحب کی خدمات کلکتہ کے جدید مدرسہ کے لئے عطا کی جائیں۔ اس کی تفصیلات حضرت مولینا سید حسین احمد مدنی نے اپنی خودنوشت سوانح نقش حیات میں لکھی ہیں۔ آپ کے ارشاد کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند مالک کی اسارت سے رہا ہو کر جب واپس اپنے ملک کو وارد ہوئے تو آپ کی وفات سے چند دن قبل کا ہی واقعہ ہے کہ مولینا ابوالکلام آزاد مرحوم نے بنگال میں بہت اعلیٰ پیمانہ پر عربی اور دینی مدرسہ قائم کر کے حضرت شیخ الہند سے استدعا کی کہ دارالعلوم کلکتہ کے لئے مولینا انور شاہ صاحب کشمیری کی خدمات عطا کی جائیں تاکہ آپ (شاہ صاحب) درجہ اعلیٰ کے طلبہ کو درس حدیث دیں اور تازہ قائم شدہ درس گاہ کامیاب ہو جائے۔ حضرت شیخ الہند نے مولینا ابوالکلام آزاد کا یہ مطالبہ یہ کہہ کر مسٹر دفرمایا کہ شاہ صاحب تو کسی صورت میں بھی دارالعلوم دیوبند کو نہیں چھوڑ سکتے ہیں جس میں ان کی ذمہ داریاں نہایت ہی گراں ہار ہیں البتہ میں ان کے بدلے ایک دوسرا مدرسہ سمجھوں گا چنانچہ مولینا مدنی کو ہی حضرت شیخ الہند نے کلکتہ روانہ کیا لیکن ابھی آپ راستہ میں ہی تھے کہ شیخ الہند کے انتقال کا واقعہ پیش آ گیا۔

ان تاریخی حقائق سے واضح ہے کہ اپنی وفات سے قبل ۱۳۳۹ھ ۱۹۱۲ء میں بھی حضرت شیخ الہند شاہ صاحب ہی کو اپنا صحیح جانشین تصور کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ جس طرح سفر حجاز کے وقت شاہ صاحب نے ان کی خالی کردہ نشست کو پر کیا اسی طرح آپ کے سفر آخرت کے وقت بھی اس نشست پر آپ ہی جئے رہیں۔ چنانچہ جب حضرت شیخ الہند انتقال کر گئے تو حضرت شاہ صاحب

حسب سابق صدارت المعلمین کے منصب جلیل پر فائز رہے۔ یہاں تک کہ ۱۳۲۶ھ میں آپ نے عہدہ اہتمام کے ساتھ اختلافات ہونے پر دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کی۔ اور دیوبند کے بجائے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کو اپنے فیوض و برکات کا مرکز بنایا۔

دارالعلوم میں کوئی ۱۹ سال تک تدریسی خدمات انجام دینے کے دوران حضرت شاہ صاحب نے علماء کی ایک بڑی تعداد کو تیار کیا جو اپنے وقت کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔
دنیا کے درس میں آپ نے کیا انقلاب لایا وہ بھی ایک اہم ترین اور دلچسپ موضوع ہے اس سلسلے میں مجموعہ ہذا کے بیشتر مقالات میں اس امر کی وضاحت آچکی ہے۔

دارالعلوم کے سابق صدر المدرسین :..... دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ۱۵ محرم ۱۳۸۳ھ کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ڈالی ہے تب سے آج تک بہت سی برگزیدہ اور نادرہ روزگار ہستیاں اس ادارہ کے صدر المدرسین کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہ چکی ہیں۔ دارالعلوم کے اولین صدر مدرس مولانا محمد یعقوب نانوتوی (م ۱۳۰۲ھ) سے پانچویں صدر مدرس مولانا سید حسین احمد مدنی (م ۱۳۷۷ھ) تک مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ نے ان حضرات کی تدریسی خصوصیات کی نہایت بلیغ انداز میں جو تصویر کھینچی ہے وہ ہدیہ ناظرین ہے۔

دارالعلوم کے اول صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ اپنی جامعیت علوم و فنون جوہر طبع ذکاوت احساس اور رموز ولایت میں شاہ عبدالعزیز ثانی تسلیم کئے جاتے تھے اور فن حدیث میں آپ کا انداز درس حکیمانہ عارفانہ اور ساتھ ہی عاشقانہ تھا آپ کے بعد ایک قلیل عرصہ کے لئے حضرت مولانا سید احمد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ صدر نشین مسند درس ہوئے آپ فنون عقیدہ و ربانیہ میں امام وقت سمجھے جاتے تھے اس لئے دینیات کے درس میں آپ کا انداز درس عاقلانہ مسند لادار مفکرانہ تھا آپ کے بعد حضرت شیخنا شیخ الہند مولانا محمد حسن قدس سرہ اس گدی پر بٹھائے گئے، آپ جامعیت علوم کے ساتھ شیخ کامل، عارف باللہ، جامع معقول و منقول اور اخلاق فاضلہ میں راسخ القدم تھے اس لئے آپ کا انداز درس اپنے استاد حضرت قاسم العلوم قدس سرہ کے نقش قدم پر عالمانہ متکلمانہ فقیہانہ اور فانیانہ تھا ان کے بعد آپ کے ارشد التلامذہ آیتہ من آیات اللہ استاذنا حضرت اقدس علامہ دہر مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ مسند رائے درس کتاب و سنت ہوئے۔

آپ کا بغیر معمولی حافظہ تبحر علمی حفظ کتب و سفاہن اور وعاء علوم و فنون گویا ایک اعجازی شان رکھتا تھا عقل و نقل کا ہر علم و فن اور اس کے تفصیلی اصول و فروع آپ کو اس طرح مستحضر تھے کہ آپ کو اپنے معاصر علماء و فضلاء میں وقت کا چلتا پھرتا کتب خانہ کہا جانے لگا اس لئے آپ کا انداز درس

حدیث حافظانہ داعیانہ محدثانہ اور تبحرانہ تھا آپ کے بعد حضرت اقدس مولینا سید حسین احمد صاحب مدظلہ (مرحوم) سے اس گدی کی رونق بخشی گئی۔ تو آپ کے جوش جہاد و ذوق علم ہمت ہاشمی اور وسعت اخلاق نے علم کو عمل کے ہر گوشہ میں دوڑا کر عملی سانچوں میں پیش کیا اور عملی کمالات پر دواعی عمل کو غلبہ پانے کا موقع ملا اور اس لیے آپ کے درس کا انداز عالمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہدانہ اسپرٹ سے بھرپور اور جذبات عمل سے زیادہ سے زیادہ لبریز ہوتا ہے جس سے طالبوں کے قوی عمل کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور جذبات عمل زیادہ سے زیادہ مشتعل ہو جاتے ہیں۔ (مکتوب شیخ السلام ج ۱ مرتبہ مولینا نجم الدین اصلاحی)

مرحوم مولینا سید محمد میاں صاحب کی تحریر:..... مولینا سید محمد میاں صاحب مرحوم فضلاء دیوبند اور حضرت شاہ صاحب کے ان تلامذہ میں سے تھے جو ہندوستان کے رجال علم کے حالات قلم بند کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ علماء ہند کا ماضی اور علماء ہند کے مجاہدانہ کارناموں پر آپ نے ہزار ہا صفحات تحریر کئے ہیں جو ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں زندگی کے آخری برسوں میں آپ جمعیۃ العلماء ہند کے جنرل سکریٹری اور مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث اور صدر المدبرین تھے اس منصب پر آپ اپنی وفات تک فائز رہے جو ماہ محرم ۱۳۹۶ھ ۱۹۷۵ء میں واقع ہوئی۔

حضرت شاہ صاحب کی سوانح حیات کے متعلق میاں صاحب مرحوم کا جو مضمون حیات انور میں شامل ہے ہم یہاں اس کا ایک اہم حصہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

دارالعلوم کی علمی زندگی میں تغیر و اضافہ:..... حضرت شاہ صاحب کے علمی فیوض سے دارالعلوم دیوبند کی علمی زندگی میں کیا تغیر اور اضافہ ہوا؟ یہ بہت ہی دلچسپ موضوع ہے مگر اس کے لئے ایسے عالم کے قلم کی ضرورت ہے جو درس و تدریس کا پورا تجربہ رکھتا ہو اور جس نے حضرت شاہ صاحب سے پہلے ہی دارالعلوم کی عملی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو، احقر ان دونوں سعادتوں سے محروم ہے۔ لہذا اس موضوع کا حق تو ادا نہیں کر سکتا تاہم اپنی فہم ناقص و استعداد ناقص کے مطابق آپ کے درس کی چند خصوصیات قلمبند کرتا ہے انہیں کو تغیر و اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۱) تحقیق و تفتیش:..... حضرت شاہ صاحب کا درس اس پر قناعت نہیں کرتا تھا کہ عبارت کا مطلب سمجھا دیا جائے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس مسئلہ سے متعلق تحقیق و تدقیق کا سیر حاصل خلاصہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں ہر دعوے کی دلیل کتاب کے حوالہ سے پیش کی جاتی تھی۔ یہ خصوصیت حضرت شاہ صاحب ہی کی تھی کہ آپ کے سامنے ایک شیخ پر کتابوں کا انبار رہتا تھا اور مسئلہ پر بحث

کرتے ہوئے آپ زبانی حوالہ پر قناعت نہیں کرتے تھے بلکہ کتاب کھول کر اصل عبارت پیش فرما دیتے تھے کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جس کتاب کا حوالہ دیا جاتا وہ انبار میں موجود نہ ہوتی تو اس کو منقوٰۃ عبارت پیش فرماتے اور اگر وہ کتاب اس وقت دستیاب نہیں ہو سکی تو اگلے روز وہ کتاب اپنے ساتھ لاتے اور عبارت پڑھ کر سنا دیتے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی قوت حافظہ کا کمال تھا کہ جس عبارت کا حوالہ دیتے تھے اس کے صفحات بھی گویا آپکو محفوظ ہوتے تھے۔ چنانچہ فہرست مضامین سے آپ شاذ و نادر ہی مدد لیتے تھے بلکہ عام طریقہ یہی تھا کہ سینکڑوں صفحات کی کتاب میں بھی عبارت منقولہ کو اس طرح پیش کر دیتے تھے جیسے پوری کتاب آپ کو حفظ ہے اور اس کے مضامین کے صفحات آپ کے ذہن میں مستحضر ہیں اس کمال کا حیرت انگیز مظاہرہ اس وقت ہوتا تھا جب طلبہ کے سوالات پر کوئی تازہ بحث شروع ہو جاتی اور حوالہ کے لئے کوئی ایسی کتاب منگائی جاتی جس کا مطالعہ سالہا سال پہلے کیا ہو۔ یہ کتاب خواہ کتنی ہی ضخیم ہوتی محولہ عبارت اس طرح پیش کر دی جاتی گویا اس کے صفحات اور سطور آئینہ قلب پر نقش ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اس طریق کار نے تلامذہ میں تحقیق و تفتیش کا نیا ذوق پیدا کر دیا۔ یہ ذوق فقط حوالہ کتاب سے مطمئن نہیں ہوتا بلکہ اس کی کاوش اس وقت ختم ہوتی ہے جب اصل عبارت اصل کتاب میں مطالعہ کر کے بحوالہ صفحات اس کو نوٹ کر لیا جائے۔

(۲) تاویل کے بجائے تطبیق و تو جیہہ:..... فن حدیث وسعت نظر چاہتا ہے روایت بالحق کرتے ہوئے ایک ہی مفہوم کو راوی حضرات نے موقع اور محل کے لحاظ سے مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اختلاف الفاظ کے ساتھ بسا اوقات انداز میں بھی فرق پیدا ہو گیا۔ مثلاً ایک بات جو ازب و تشوہق کے طور پر لسان رسالت سے صادر ہوئی تھی۔ اسکو قطعی حکم کی صورت میں بیان کر دیا گیا ہے کہیں ایسا ہوا ہے کہ کوئی حدیث طویل تھی۔ راوی نے کسی وقتی ضرورت کی بنا پر پوری حدیث نہیں بیان کی۔ بلکہ ضرورت کے مطابق اس کا ایک حصہ نقل کر دیا ہے راوی نے اس جملہ کا وہی مفہوم لیا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء مبارک تھا لیکن بعد کے راویوں نے جب تنہا اس جملہ کو نقل کیا تو اصل مفہوم ذہن میں نہیں رہا۔

اس طرح بعد کے علماء میں ایک اختلاف کی بنیاد پڑ گئی۔ اب اس جملہ کا صحیح منشاء ہی معلوم کر سکتا ہے جن کی نظر ذخیرہ احادیث پر ہو اور جس نے کتب حدیث کے ہزاروں صفحات کا مطالعہ کر کے سمجھ لیا ہو کہ اصل واقعہ کیا ہے اور فقط اس ایک جملہ کے نقل کر دینے سے کیا فرق پیدا ہو گیا لیکن قاصر الہمت اور کوتاہ دست ایک ہی روایت کے الفاظ لے کر اپنی مرضی کے مطابق ان میں

معنی ڈالتے رہتے ہیں یہ بدعت اس امت میں بہت ہی زیادہ قابل ملامت بن جاتی ہے جس کی دوسری روایت میں اس کے خلاف الفاظ واقع ہوں۔

حضرت شاہ صاحبؒ اس قسم کے معنی پہنانے کے سخت مخالف تھے۔ اس کو مدرسین کا طریقہ نہ کرتے تھے یعنی جو محض کارگزاری کے لئے درس دیتے ہیں۔ درس میں اپنی ذاتی تحقیق پیش نہیں کرتے۔ اس معنی پہنانے کو تاویل فرمایا کرتے تھے اور ارشاد ہوتا تھا کہ میں تاویل نہیں کرتا بلکہ توجیہ و تطبیق کرتا ہوں یعنی روایت کے تمام الفاظ جو مختلف انداز میں ذخیرہ احادیث میں وارد ہوئے ہیں ان سب کو سامنے رکھ کر ایک معنی معین کیا کرتا ہوں اور جس جملہ کا جو حقیقی محل ہے اس پر منطبق کرتا ہوں۔

(۴۴) فن حدیث اور سلف صالحین کا احترام:..... حضرت شاہ صاحبؒ کے اس طرز سے تلامذہ میں دو باتیں خاص طور پر پیدا کیں۔

(الف) وہ مثلاً ترمذی شریف پڑھاتے وقت یہ جائز نہیں سمجھتے کہ ترمذی شریف کی روایت کے الفاظ پر ان کی نظر منحصر رہے اور اس موقع کے لحاظ سے حدیث کے معنی پہنا کر سبکدوش ہو جاتے بلکہ اس روایت کے وہ الفاظ لامحالہ ان کے پیش نظر رہیں گے جو کم از کم صحاح ستہ میں وارد ہوئے ہیں اس طرح شوق مطالعہ کے ساتھ فن حدیث کا خاص احترام ان کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

(ب) جب وہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دریائے ناپیدا کنار کے ساحل پر کھڑے ہو کر اس کی وسعتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو جس طرح امام ابو حنیفہؒ کی عظمت ان کے دل میں گھر گئی ہے اسی طرح ان کے قلوب امام شافعیؒ امام احمدؒ حنبلؒ امام مالکؒ وغیرہ ہم ائمہ مجتہدین اور ان حدیث کے احترام سے بھی لبریز ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح اس بحر محیط اور قلمزم اعظم میں ساری عمر شنواری کر کے اس کی گہرائیوں سے فقہی مسائل کے موتی برآمد کئے ہیں اور اس طرح اس سمندر کی لہروں کو کتب احادیث کے آئینوں میں سمویا ہے۔ (فجزاهم اللہ وشکر سبعین)

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے ائمہ کے مقلدین یا علماء حدیث سے نفرت نہیں کرتے۔ ان کی تحقیر و توہین سے ان کے ذہن پاک ہوتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فقہی مسائل کا یہ اختلاف ایک علمی بحث اور خوشگوار نظریاتی اختلاف بن جاتا ہے جو اختلاف امتی رحمت کی تصدیق پیش کرتا ہے جو متعصبانہ جنگ و جدل اور نفرت و حقارت کے بجائے وسعت مطالعہ و تحقیق و تفتیش کی دعوت دیتا ہے۔

(ج) تحقیق فن:..... شرح ملا جامی ایک تصنیف کی حیثیت سے قابل قدر کتاب ہے مگر

درسیات میں سے اس کا شمول دماغوں میں ایک خطرناک مرض کے جراثیم پیدا کر دیتا ہے۔ طلبہ کی توجہ فی سہ سے ہٹ جاتی ہے اور ان کے دماغ اس قیل وقال اور عبارت سے متعلق مباحثہ میں پھنس جاتے ہیں جن کا تعلق فن کے بجائے منطقی موشگافیوں سے ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منطقی موشگافیوں میں تو مہارت ہو جاتی ہے لیکن فن سے متعلق مسائل میں مہارت تو درکنار ان پر پوری طرح عبور ہی نہیں ہوتا۔ منطقی موشگافیوں کی گرم بازاری حضرات مدرسین کے دماغوں کو بھی متاثر کرتی ہے اور وہ فن کے متعلق وسعت نظر پیدا کرنے کے بجائے پوری توجہ شعرو حواشی اور منہیات وغیرہ معقبات عبارت میں صرف کر دیتے ہیں اور انہیں چیزوں کے استحضار کو مدرسہ کی مہارت مانا جاتا ہے اس کا افسوسناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حضرات مدرسین کا علم درسیات کے حواشی، شروح اور منہیات تک محدود ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ اس مرض سے بہت زیادہ بیزار تھے الفاظ کی روایت کی میں مشغول ہوتا آپ کے نزدیک تصحیح اوقات تھا آپ کی تمام توجہ فن کی تحقیق پر مبذول رہتی تھی۔ اس کا مظاہرہ آپ کے درس میں ہوتا تھا۔ آپ کی تقریر شروح اور حواشی کے اقتباسات کا مجموعہ نہیں ہوتی تھی بلکہ مسئلہ پر محققانہ تبصرہ ہوتا تھا۔

(۲) ائماء اور درس:۔۔۔ آج ہمارے مدرسوں میں درس کا طریقہ جاری ہے یعنی کتاب سامنے رکھ کر اس کی عبارت کی تفہیم میں وقت صرف کیا جاتا ہے لیکن سلف کا طرف یہ نہیں تھا۔ ان کے یہاں طریقہ لہجہ جاری تھا۔ یعنی وہ مسئلہ کے متعلق اپنی تحقیق پیش فرمایا کرتے تھے طلبہ اس کو نوٹ کر لیا کرتے تھے عبارت کا سمجھنا اور اس سے مطلب اخذ کرنا طالب علم کا کام ہوتا تھا۔ اس سے طلبہ میں قوت مطالعہ کے فلسفے کے ساتھ فی واقفیت پیدا ہوتی تھی اور وہ اپنے زمانہ کے ابن ہمام و ابن حجر بن جاتے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے حلقہ درس میں کتابیں بے شک نکلی رہا کرتے تھیں طلبہ عبارت بھی پڑھتے تھے مگر حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر کا تعلق عبارت سے زیادہ تحقیق و تنقیح مسئلہ سے ہوتا تھا۔ آپ الفاظ کی بندشوں سے بلند ہو کر مسئلہ کے متعلق اپنی ذاتی تحقیق پیش فرماتے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اس طرز کے لئے مناسب یہ تھا کہ درس کے بجائے ائماء کا طریق اختیار کیا جاتا تا کہ طلبہ کی توجہ بھی تقریر کے قلمبند کرنے کی طرف رہتی اور اس طرح معلومات کا ایک ذخیرہ فی فراہم ہو جاتا اور آئندہ کے لئے مدارس عربیہ میں سلف کا طریقہ ائماء دوبارہ جاری ہو جاتا جس سے حضرات مدرسین میں وسعت نظر اور طلبہ میں قوت مطالعہ پیدا ہوتی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اساتذہ حدیث (شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گڑھی) وسعت نظر مہارت فن حدیث نفقہ اور خداقت میں یکمائے

روزگار تھے حضرت شاہ صاحبؒ بھی انکی جلالت و عظمت اور تبحر علمی کے قائل تھے حضرت مولانا گنگوہی کے متعلق فرمایا کرتے تھے۔ آپ سے زیادہ ائمہ اربعہ کے مذہب کا ماہر میں نے نہیں دیکھا۔ حضرت شیخ الہند کی تحقیقات اپنی تقریروں میں پیش فرمایا کرتے تھے۔ مگر ان بزرگوں کا طریقہ درس بالکل مختلف تھا۔ ان بزرگوں کی ابتدائی تقریر عبارت کتاب سے متعلق نہایت مختصر ہوتی تھی ان کی مفصل تقریر اس وقت ہوتی تھی جب طلبہ سوال کرتے اور طلبہ کے سوالات کا تقاضا ہوتا کہ مطمئن کرنے کے لئے مفصل تقریر کی جائے مگر حضرت شاہ صاحبؒ طلبہ کو اصرار کی زحمت نہیں دیتے بلکہ آپ کی ابتدائی تقریر ہی مفصل ہوتی اور پہلے ہی مرحلہ میں آپ طلبہ کو موقع دیتے کہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کر لیں۔ (حیات انور ۲۰۰ تا ۲۸۸)

دارالعلوم سے شاہ صاحبؒ کی مفارقت کا حادثہ

(۱۹۲۸ء تا ۱۹۲۶ء)

دانشکدوں میں اختلاف آراء..... تعلیمی ادارات چاہے وہ خالص دینی اور عربی تعلیم کے ہوں یا مروجہ جدید علوم کی دانشگاہیں ہوں ان میں طلبہ اور اہل اہتمام کے درمیان اختلافات ایک قاسم کا امر طبعی ہے دارالعلوم دیوبند، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، مدرسہ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مدرسہ عالیہ کلکتہ بلکہ ان سے اتر کر دوسرے درجے کے قومی مدارس سب کی تاریخ کو اٹھا کر پڑھ جائے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہر جگہ کبھی نہ کبھی ایسا موقع ضرور آیا ہے جب پڑھنے اور پڑھانے والوں کے درمیان اختلافات کی ہوا چلی اور چھوٹے چھوٹے اختلافات بڑھتے بڑھتے ناقابل عبور خلیجوں میں تبدیل ہو گئے۔

علیگڑھ اور ندوۃ العلماء کی مثال..... علیگڑھ میں تو گزشتہ سو سال کے دوران درجنوں طوفان آئے ہیں اور گزر گئے ہیں سب کی تاریخ بیان کرنے کا یہ محل نہیں۔ ابھی چند سال پہلے سے یونیورسٹی کی تاریخی حیثیت کو قائم رکھنے یا بدلے ہوئے ماحول سے دب کر تبدیل کر ڈالنے کے سوال نے جو رخ اختیار کر رکھا ہے وہ اس دانشکدہ کی حدود سے نکل کر پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے ذہنی زلزلے کا موجب بنا ہوا ہے۔ اور سات کڑوڑ مسلمانان ہند آئے دن اپنے لئے جن اقلیتی تعلقات اور ثقافتی و تعلیمی حقوق کی آزادی پر بحشیں کرتے رہتے ہیں۔ ان کی فہرست میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا کردار بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جو ملت اسلامیہ کے مطالبات میں شامل

ہو گیا ہے یونیورسٹی کے وائس چانسلروں اور طلباء کے درمیان رائے کا اختلاف تو اب علی گڑھ کی
آب و ہوا کا ضروری عنصر بن کر رہ گیا ہے۔

جہاں تک ندوۃ العلماء کا تعلق ہے الحمد للہ عصر حاضر میں وہاں کا ماحول پر سکون ہے لیکن اس
صدی کے ابتدائی دس پندرہ سال میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اکابر کے درمیان اختلاف کی وجہ
سے طلباء اور ناظمین کے درمیان بھی کشمکش کے ہنگامے برپا ہوتے رہے۔ جس وقت مولینا شبلی
نعمانی مرحوم مدرسہ ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم مقرر ہوئے تو آپ کی علمی شہرت کا آفاق نصف
عالم پر تھا اور ہندوستان سے لیکر مصر اور قسطنطنیہ تک علمی حلقے آپ کے تاریخ اسلام کے محقق و مبصر
اور بہترین ترجمان ہونے کے معترف ہو چکے تھے۔ اس لئے ندوۃ العلماء کے ساتھ مولینا مرحوم
کی وابستگی مدرسہ کی اندرونی تعلیمی ترقیات کے ساتھ ساتھ ملک بھر میں اس کی شہرت میں بھی چار
پائے لگانے کا موجب بنی۔ لیکن طرز فکر کے لحاظ سے چونکہ آپ کی بعض آراء اور مدرسہ کے بہت
سے دیگر فاضل ارکان خاص کر مدرسہ کے ناظم حضرت مولینا خلیل الرحمن صاحب سہارن پوری کی
آراء میں فرق تھا۔ مولینا خلیل الرحمن صاحب مشہور محدث مولینا احمد علی صاحب سہانپوری کے
فرزند اور مولینا شبلی کے استاد زادہ تھے مگر علم کلام کے بعض مباحث میں دونوں کا اختلاف رائے تھا
اور اس اختلاف نے بڑھتے بڑھتے افسوس ناک شکل اختیار کر لی تھی جس کے نتیجے میں ایک مرحلہ
ایسا بھی آیا کہ پورا ادارہ اس اختلاف سے اثر پذیر ہو گیا۔ اور طلباء کی ہڑتال نے مولینا ابوالکلام
کے الہامال مولینا محمد علی کے ہمدرد اور مولینا ظفر علی خان کے زمیندار کے صفحات کو حمایت اور
ممانعت کی بحثوں کا میدان کارزار بنا ڈالا یہ تینوں اہل قلم جو مولینا شبلی نعمانی کے ہی فیض یافتہ تھے
اور کانگریس کی طرفداری اور تعلیمی رجحانات میں مولینا شبلی کے مکتبہ فکر (SCHOOL OF
THOUGHT) کے ترجمانوں میں شمار ہوتے تھے اپنی اپنی شہرہ آفاق انشاء پردازی سے اپنے
مذہب کی کوئی زیادہ مدد نہ کر سکے اور مولینا شبلی کی زندگی کے یہ آخری سال جو پہلے ہی پاؤں کٹ
جانے اور بعض مزمن امراض کی شدت کی وجہ سے تلخ تھے اور ندوۃ العلماء کے اس جھگڑے نے تلخ
ترکڑا لے۔ آپ نے مدرسہ کے معتمد تعلیم کے منصب سے استعفیٰ بھی دے دیا۔ مگر مصالحت کا
مقصد تب بھی حاصل نہ ہو سکا حتیٰ کہ آپ کی اجل پختی جس نے آپ کو دنیا کے تمام جھگڑوں سے
نجات دلا دی۔ آپ کی وفات کے صدے نے ارکان ندوۃ العلماء کو بمشکل اتنا متاثر کیا کہ وہ
مرحوم کی وفات کے قومی نقصان کا احساس کر کے دوبارہ شیر و شکر ہو جانے پر آمادہ ہو جائے
اور ”الصلح خیر“ پر علم پیرا ہو گئے۔ اس مصالحت کو ممکن العمل بنانے کا سہرا آج الملک حکیم محمد

اجمل خان اور مولینا ابوالکلام آزاد کے سر رہا۔

شاہ صاحب کو صدمہ جال گداز..... دارالعلوم دیوبند کے ساتھ حضرت مولینا انور شاہ صاحب کا تعلق ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۱۴ھ تک بحیثیت طالب علم، ۱۳۲۸ھ سے ۱۳۳۳ھ تک بحیثیت استاذ اور ۱۳۳۳ھ سے ۱۳۳۶ھ تک بحیثیت صدر المدرسین کے قائم رہا۔ ۱۳۳۶ھ میں صدر مدرس کے منصب سے مستعفی ہو کر اس مادر علمی سے جدائی گوارا کرنے کا جو صدمہ جان گذار حضرت شاہ صاحب کو برداشت کرنا پڑا اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے وہ اس قسم کے حالات کا نتیجہ تو جن کی طرف مسلم یونیورسٹی اور ندوۃ العلماء میں پیش آمدہ اختلافات کا ابھی سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے۔ تقاضائے وقت کے مطابق دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں رد و بدل طلباء کی رہائش اور خوراک کے انتظام میں اصلاحات طلباء اور معلمین کے بعض حقوق اور سہولتیں در اس طرح سے کچھ چھوٹے کچھ بڑے سوالات دوسرے تعلیمی ادارات کی طرح دیوبند میں بھی پیدا ہوتے رہتے تھے اور حل بھی ہوتے رہتے تھے۔ اور بعض اوقات ہچکچاہٹیں سوالات صیغہ اہتمام میں تغیر و تبدل کا موجب بھی بن جاتے تھے لیکن ۱۳۴۰ھ میں جب یہ سوالات اٹھے تو طلباء کے مطالبات کو اونچے درجہ کے اساتذہ میں سے صدر المدرسین حضرت شاہ صاحب اور چند دیگر بڑی شخصیتوں کی ہمدردی حاصل ہوگئی جس سے ضرور ہے کہ صیغہ اہتمام کے لئے پیش آمدہ مسئلہ سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو گیا ہوگا۔ ادھر دہلی اور لاہور کے مسلم پریس نے بھی طلباء کے مطالبات کی حمایت کچھ اس شد و مد سے کی کہ طلبہ بھی اپنے کسی مطالبہ میں نرمی پیدا کرنے کے قابل نہ رہے۔

مصالحانہ مساعی کی ناکامی..... جب کشمکش نے انتہائی نازک شکل اختیار کر لی تو باہمی مصالحت کی کوئی کوشش بار آور نہ ہو سکی ایک موقع پر مہتمم دارالعلوم حضرت مولینا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم نے براہ راست حضرت شاہ صاحب سے ملکر کوشش کی کہ کس طرح یہ دردناک باب ختم ہو جائے اور شاہ صاحب اس کو ختم کرنے پر آمادہ بھی ہو گئے لیکن اب حالات دونوں بزرگوں کے تصرف سے باہر ہو چکے تھے اس لئے یہ ذیل مندرجہ سے نہ چڑھ سکی اور آخر کار وہی ہوا جو اللہ تعالیٰ کی مشیت ازیلی میں مقدر ہو چکا تھا۔

ایک مقدس قافلہ..... حضرت شاہ صاحب، مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولینا مفتی عزیز الرحمن صاحب، مولینا بدر عالم صاحب، میرٹھی، مولینا سراج احمد صاحب رشیدی، مولینا حفظ الرحمن صاحب، سید ہاروی، مولینا محمد ادریس صاحب، سکھر ڈوی اور مولینا مفتی قلیق الرحمن صاحب عثمانی وغیرہم وہ مقدس

حضرات تھے جن کا استغنیٰ ادارہ اہتمام دارالعلوم نے منظور کر لیا اور قافلہ کے سالار حضرت مولینا انور شاہ صاحب اور آپ کے رفقاء کرام نے جمع ۲۵ طلباء درجات عالیہ اپنے محبوب دانش کدہ دارالعلوم پر نگاہ حسرت ڈالی کہ حالیہ کی گود میں واقع مقام دیوبند سے روانہ ہو گئے اور قریب ایک ہزار میل کے فاصلے پر ہندوستان کے جنوب مغرب میں بحیرہ ہند کے ساحل کے قریب یہ اپنی قسم کا نرالا قافلہ جاپہنچا جس نے اپنے فرشتہ برت سالار قافلہ حضرت شاہ صاحب کی قیادت میں (سورت بندر کے حوالی میں) واقع ڈابھیل نامی ایک قصبے میں دارالعلوم دیوبند کا ایک ہمزاد قائم کر دیا اور دیوبند کا یہ منٹے قائم کر ڈالنے کے بعد خود دیوبند کی درازی عمر و سلامتی کی دعائیں مانگنے لگے سچ ہے کہ مقدسین کا ہر قدم مقدس ماند ہوتا ہے۔

مشاجرات اکابر سے کف لسان:..... دارالعلوم کی یہ اصلاحی تحریک جو حضرت شاہ صاحب کے استغنیٰ کا موجب بنی اس کے ساتھ آپ کا واسطہ براہ راست نہ تھا محض بہبودی دارالعلوم کی تحریک کو آپ کی پر خلوص تائید حاصل تھی۔ آپ کے دل میں مہتمم دارالعلوم حضرت مولینا محمد احمد صاحب اور دارالعلوم کی مجلس مشاورت کے دیگر ارکان خصوصاً مولینا حکیم مسعود صاحب گنگوہی کا احترام انتہا درجہ کا تھا اور یہ تمام حضرات بھی حضرت شاہ صاحب کے احترام میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت کرنے کے روادار نہ تھے لیکن تقدیر الہی قضائے مبرم بن کر پیش آئی اور ہر دو فریق کو باہل و خواستہ ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑا۔

اہل سنت والجماعت کا مشاجرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق یہی طرز عمل ہے کہ اس میں کف لسان کیا جائے اور ان تنازعات کی تفصیلات میں پڑنے سے اجتناب برتا جائے۔ حدیث کے ہر مرحلے پر یہی طریقہ کار مسلم معاشرہ کے حق میں خیر و برکت کا موجب رہا ہے اس سبق پر عمل کرتے ہوئے اگر مشاجرات صحابہ کرام کی طرح مشاجرات اکابر ملت سے بھی کف لسان پر عمل کیا جائے تو قوم کے لئے اس میں بے شمار فوائد مضمر ہیں اس لئے ہم دارالعلوم دیوبند کے اکابر اور حضرت شاہ صاحب کے مابین واقع شدہ اختلافات و مشاجرات کی کسی تفصیل میں جانا نہیں چاہئے ان واقعات سے متعلق خود حضرت شاہ صاحب کا عمل یہ تھا کہ آپ اس واقعہ کے بعد چار پانچ سال غور ہے مگر کبھی بھولے سے بھی ان واقعات کا تذکرہ زبان پر نہ لاتے تھے اور

”در میان ما و جانان ما جرائے رفت و رفت“

کے مطابق اس معاملے کو آپ نے کسان لم یکن شینا مذکورہ کا مقصد انا بناؤ الا اس لئے ہم اس کی تفصیلات کو حوالہ طاق نسیان کر ڈالیں تو ہم کو حضرت شاہ صاحب کی قابل تقلید مثال پر عمل پیرا ہونے کا ثواب ملے گا۔ حسبن اللہ ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

بقول مرحوم مولینا سید محمد میاں صاحب دیوبندی،

”داستان بہت طویل ہے۔ اور اس کا آخری باب استغنیٰ ہے جو تحریک (اصلاح) کے رہنماؤں نے بطور احتجاج پیش کیا اور اہتمام کے تدبیر قلم نے اس پر منظوری صادر کر کے احتجاج کو ناکام بنا دیا۔ اس موضوع کا آخری فقرہ یہ ہے کہ سات سال طبقہ علیا کے مدرس اور تیرہ سال صدر مدرس رہنے کے بعد ۱۳۳۶ھ میں آپ نے دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی اختیار کی اور دیوبند کے بجائے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کو اپنے فیوض و برکات کا مرکز بنایا۔“

ہر طرف چشم فرش راہ:..... یہ امر قابل ذکر ہے کہ جب حضرت شاہ صاحب دارالعلوم دیوبند سے مستغنی ہوئے اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو مدرسہ امینیہ دہلی ندوۃ العلماء لکھنؤ ڈھا کہ اور گلبرگ یونیورسٹی کے علاوہ بہت سے مشہور و معروف اداروں نے معقول مشاہروں پر آپ کی خدمت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن آپ نے بڑی بڑی تنخواہوں کو اہمیت دیئے بغیر اپنے تخلص شاعر الحاج مولینا محمد میاں سملکی افریقی کی استدعاؤں اور مشوروں پر ڈابھیل جانے کو ترجیح دی۔

علامہ اقبالؒ کی تمنا:..... یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جب شاہ صاحب نے دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کی تو علامہ اقبالؒ نے خوشی کا اظہار کیا اور سخت اصرار سے شاہ صاحب کو ایک تار ارسال کیا کہ آپ لاہور تشریف لے آئیں لیکن چونکہ وہ تار حضرت شاہ صاحب کو اس وقت ملا جب آپ نے ڈابھیل والوں سے وعدہ کیا تھا اس لئے شاہ صاحب لاہور نہ جاسکے۔

مولینا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدظلہ نے اپنے مضمون میں اس سلسلے میں جو کچھ رقم فرمایا ہے وہ ہدیہ ناظرین ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں اختلافات کے باعث جب حضرت الاستاد نے اپنے عہدہ صدر الاستاذہ سے استغنیٰ دیا اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چند روز بعد میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا فرمانے لگے کہ آپ کا یا دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو میں بہر حال شاہ صاحب کے استغنیٰ کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا

①..... مولینا سید محمد میاں صاحب مرحوم نے حضرت شاہ صاحب کا زمانہ قیام دیوبند میں سال قرار دیا ہے لیکن حقیقت میں حضرت شاہ صاحب دارالعلوم دیوبند سے صرف ۱۸ سال تک وابستہ رہے ہیں مولینا سید احمد رضا صاحب بخاری راقم الحروف کے نام ایک مکتوب گرامی میں رقمطراز ہیں کہ میری بیاض درس بخاری ۹۵۳ھ میں حضرت کا یہ ارشاد نقل ہے کہ میں ۱۸ سال دیوبند میں رہا (کوئٹہ)

کیا آپ کو دارالعلوم دیوبند کے نقصانات کا کچھ ملال نہیں؟ فرمایا کیوں نہیں؟ مگر دارالعلوم کو تو صدر المدین اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی لیکن اسلام کے لئے جو کام اب میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں اس کو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد انہوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی سیاسی، معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کو میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کر سکتے ہیں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اس وقت عالم اسلامی میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہو سکے۔ پھر فرمایا مسائل کیا ہیں اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے؟ میں ایک عرصہ سے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں یہ سب مسائل میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کروں گا اور ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے یہ شاہ صاحب بتائیں گے۔ اس طرح ہم دونوں کے اشتراک و تعاون سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آجائے گی چنانچہ باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ اسی جذبہ کے تحت ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح شاہ صاحب دیوبند کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور تشریف لے آئیں اور وہیں مقیم ہو جائیں لیکن افسوس! حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ ایسا نہ ہو سکا اور حضرت شاہ صاحب لاہور کے بجائے ڈابھیل تشریف لے گئے۔ جس کا ڈاکٹر صاحب کو واقعی بڑا ملال اور صدمہ ہوا۔ (حیات انور ۱۶۵، ۱۶۶)

دیوبند سے ڈابھیل

(۱۳۴۶ھ - ۱۴۲۸ھ)

اختلاف امتی رحمۃ:..... امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام والفق الف تحسبہ) کا اختلاف رحمت ثابت ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اختلاف جن کے درمیان پیدا ہو گیا ہو وہ متقیین و مخلصین ہوں۔ تاریخ اسلام میں پیش آمدہ اختلاف کی فہرست کو پیش نظر رکھ کر ہر اختلاف کے نتائج و ثمرات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اختلاف جو نیک نیتی پر مبنی تھا آخر کار اس کا نتیجہ مشترکہ مقاصد کی ترقی کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ دارالعلوم کے اکابر صیغہ تعلیم اور صیغہ اہتمام کے درمیان جو اختلاف ۱۳۳۶ھ میں پیدا ہوا وہ ہمارے اس دعوے کی روشن مثال ہے۔ چونکہ جانبین مخلص تھے اس لئے خدا کے فضل سے اس اختلاف نے دارالعلوم دیوبند کو بھی کوئی ناقابل تلافی نقصان نہ پہنچایا اور

نہوں نے (خاص کر حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک شاگرد مولانا محمد بن موسیٰ میاں سملکی نے
اب اور آپ کے سب رفقاء کو جہیم اصرار کے ساتھ ڈا بھیل پہنچنے پر آمادہ کر لیا۔

حضرت شاہ صاحب اور پڑوسیوں نے ان کو اپنے مدرسے میں جب ہندوستان کے سب سے بڑے علماء نے درجات عالیہ کے امتحان چھوٹے سے مدرسے میں دیا تو اس مدرسہ کا نام جامعہ اسلامیہ ڈابھیل رکھا گیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ دارالعلوم سے مستعفی شدہ حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت مولانا سراج احمد رشیدی جیسے علماء کی ایک جماعت کے ساتھ دورہ حدیث اور دوسری اونچی سطح پر پڑھنے والے دو سو پچتر (۲۷۵) طلباء پر مشتمل ایک قابل توجہ اور لائق اعتناء تعداد بھی تھی۔

اس لئے ڈابھیل جا کر اساتذہ درس و تدریس اور طالبان علم استفادہ کرنے میں مصروف ہو گئے اور اپنے اپنے مشاغل کو اس سنجیدگی سے آگے بڑھانا شروع کر دیا کہ گویا کوئی بڑا حادثہ پیش ہی نہ آیا تھا۔

ابن اسلام کی ہمیشہ سے یہی شان رہی ہے کہ ان کے لئے بڑے بڑے حوادث کا تاثر لحاظی ہوتا ہے

11



اور جوں ہی وہ حادثہ گزر جاتا ہے وہ پہلے سے زیادہ توجہ اور انہماک کے ساتھ اپنے اصلی کام میں مصروف ہو جاتے ہیں بلکہ حادثہ کی وجہ سے متنبہ ہو کر منزل مقصد کی طرف اپنی رفتار کو بھی تیز کر دیتے ہیں۔

جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے ہیں

ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے (اقبال)

ڈابھیل سے دیوبند آتے جاتے مدرسہ امینیہ دہلی کا قیام..... جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں شاہ صاحبؒ نے ۱۳۵۱ھ ۱۹۳۲ء تک قال اللہ وقال الرسول کی مجلس گرم رکھی یہاں تک کہ آپ کے قویٰ نے بالکل جواب دے دیا۔ ڈابھیل کے اس پانچ سالہ قیام کے دوران آپ کبھی کبھی دیوبند آیا کرتے تھے کیونکہ دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کرنے کے باوجود وطنیت دیوبند کو آپ کی حالت میں بھی ترک کر ڈالنے پر آمادہ نہ تھے۔ آپ کا دولت خانہ دیوبند میں تھا اور دیوبند میں ہی رہا۔ اس دوران آپ ڈابھیل سے دیوبند آتے جاتے دہلی کے مدرسہ امینیہ میں اپنے رفیق خاص حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ سے بھی ملتے تھے اور ایسے ہی اکثر موقعوں پر مولینا ابوالکلام آزاد بھی شاہ صاحبؒ سے ملنے کے لئے دہلی کے مدرسہ امینیہ میں تشریف لاتے تھے اس سلسلے کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ مولینا آزاد شوق ملاقات سے امینیہ میں وارد ہوئے اور یکدم شاہ صاحبؒ کے سامنے زانو بیٹھ گئے۔ چونکہ حضرت شاہ صاحبؒ علم و انکسار کے کوہ گراں تھے انہوں نے مولینا آزاد مرحوم کی یہ بیعت کڈائی گوارا نہ فرمائی اور مولینا آزاد کو مناسب نشست پر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

قیام ڈابھیل کے دوران علامہ عثمانی کا استفادہ..... قیام ڈابھیل کے دوران علامہ شبیر احمد عثمانی نے حضرت شاہ صاحبؒ سے علم تفسیر علم حدیث اور دوسرے علوم کے دقائق و مشکلات میں رجوع فرما کر صحیح معنی میں اپنی علمی تشنگی بجھائی اسی لئے مولینا عثمانی کے علم و فضل میں (خاص کر حذافت علم حدیث میں) ڈابھیل جا کر بہ نسبت دیوبند کے نمایاں فرق ہو گیا تھا۔

اس سلسلے میں مولینا سید احمد رضا صاحبؒ بجنوری کا بیان ہے کہ مجلس علمی ڈابھیل کے قیام کے زمانہ میں یہ بات خاص طور پر میں نے محسوس کی کہ اساتذہ جامعہ میں کم و کیف دونوں کے اعتبار سے زیادہ علمی استفادہ حضرت شاہ صاحبؒ سے مولینا عثمانی نے کیا چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے جو رجال کی مدح و توصیف میں انتہائی محتاط تھے ایک بار مولینا مفتی محمود احمد صاحبؒ ناٹو توئی سے فرمایا:

”تمہیں ایک خوش خبری سناتا ہوں کہ مولینا شبیر احمد صاحبؒ کو علم حدیث سے

مناسبت ہو گئی ہے“ (نطق الوریج ۹)

بہاولپور کا مقدمہ اور قادیانیت پر ضرب کاری

(1955 2101)

امت پر فتنوں کی بارش: محسن اعظم مفسر صادق حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اپنے زمانہ کے بعد آنے والے بے شمار فتنوں کی خبر دی ہے اور ان سے بچنے کا اور ان کا مقابلہ کرنے کا راستہ بیان فرمایا ان فتنوں میں سب سے زیادہ شدید فتنے وہ ہیں جن کا رخ اسلام کے عقائد و عقائد پر حملہ کر کے ملت کو تشکیب کا ہدف بنانا اور اعدائے دین کے بالواسطہ مدد کرنا ہوتا آیا ہے گزشتہ چودہ سو سال کی امت میں امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کو قدم قدم پر ان فتنوں کا سامنا رہا ہے مسیلہ کذاب اور اسود غسی جیسے مدعیان درجہ نبوت کا فتنہ، خوارج کے پے در پے فتنے اور معتزلوں کا فتنہ اور ان کے بعد ایسے ہی بے شمار فتنے ہر ملک اور ہر دور میں اپنے اپنے زمانے میں پوری اسلامی آبادی کے لئے تو عذاب و ابتلا کا موجب رہے ہیں لیکن چودہویں صدی ہجری میں مغربی استعمار کے زیر سایہ اسلام کے عقیدہ ختم نبوت اور فرائض جہاد پر جو حملہ ہوا یہ سب سے زیادہ خوفناک حملہ تھا۔

نئے سامراج:..... انگریزی سامراج نے مشرق کا رخ کرتے ہی بھانپ لیا تھا کہ بحر الکاہل



سے بحر الکابل کے کناروں تک اس کے راستے میں اگر کوئی بڑی رکاوٹ ہے تو وہ اسلام اور مسلمانوں کا وجود ہے جو اپنے سیاسی انتشار کے باوجود اخوت اسلامی کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کا پیغمبر یعنی محمد رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں خدا کا آخری پیغمبر اور خاتم النبیین ہے جس کا لایا ہوا دین آخری دین ہے اور اس دین کا صحیفہ یعنی قرآن مجید خدا کی آخری کتاب ہے اور یہ کتاب ہر زمانہ اور ہر ملک کے لئے مکمل ہدایت نامہ ہے اور یہ کہ اسلام ہی وہ دین ہے جو زمانہ حاضرہ میں تمام انسانوں کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے جس کی اشاعت اور تبلیغ حکمت و موعظہ حسنہ سے فرض ہے لیکن اس کی حفاظت کے لئے اور دشمنوں کے زخموں سے اس کے قلعین اور دیگر مظلوم انسانوں کو بچانے کے لئے تیر و تفنگ اور ہر میسر ہتھیار سے کام لینا بھی فرض ہے جس کو جہاد فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔

بنابر آن مشرق پر سامراجی تسلط کو مستحکم کرنے اور اس کو دوام دینے کے لئے مغربی سامراج مسلمانوں کو اپنے اس راستے سے ہٹانا یا کم از کم ان کی روح مفادمت و قوت مقابلہ کو کچل ڈالنا ضروری سمجھتا تھا۔

سامراجی چال:..... انگریز یہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں میں سے ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جو پروپیگنڈا کریں کہ جس طرح دوسرے مذہبوں کے پیشوا اپنے اپنے وقت اور اپنی اپنی ہستی کے لوگوں کی اصلاح کو آئے تھے اور جب اس دنیا سے چلے گئے تو ان کے بعد ان ہی جیسے یا ان سے بھی بڑھ کر دوسرے آتے اور پہلوں کی جگہ لیتے رہے اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ بھی اپنے زمانے کے عربوں کی اصلاح کر کے چلے گئے ان کا دین اسی زمانہ کے لئے تھا اب نیا دین۔ لے کر کوئی اور آ سکتا ہے اور چونکہ مذہب ملکوتی چیز ہے اس کی حفاظت جہاد جیسے مسلح اور خون ریزی والے اقدام سے نہ ہونی چاہئے جس میں تیر و شمشیر کا دخل ہے جو وحشیانہ بات ہے، انگریز کا یہ خیال تھا کہ جب ختم نبوت کا عقیدہ نہ رہے گا تو مسلمانوں کی وحدت ملت اور وحدت انسانیت کے عقائد خود بخود ختم ہو جائیں گے اور جب جہاد کے فرض الی یوم القیامت کا عقیدہ نہ رہا تو ملت اسلامیہ کو غلام بنا لینے کا راستہ خود بخود صاف ہو جائے گا اور ایشیا و افریقہ میں انگریزی سامراج کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہ جائے گی۔

بہائیت اور قادیانیت کی پیدائش:..... ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے اور بھی ضرورت محسوس کی کہ مسلمانوں کے دل سے جذبہ جہاد اور عقیدہ ختم نبوت کو ختم کرنا مشرق میں اور خاص کر ہندوستان میں ان کے سامراج کی بقا و حیات کے لئے بہت ضروری ہے اور وہ اپنے

وسیع ذرائع اور گہری چالوں سے کام لیکر مختلف شکلوں میں جہاد کی فریضیت اور اسلام کی ہمہ گیری پر عمل کرتے اور کراتے رہے پہلے پہل یہ کام عیسائی مشنریوں کو سونپا گیا تھا لیکن ان کی ناکامی بہت جلد آشکار ہو گئی اس کے بعد بہت کچھ رد و کد کے بعد ایران میں علی محمد باب اور بہاؤ اللہ اور ہندوستان میں پنجاب کے مرزا غلام احمد قادیانی جنہوں نے انگریزی راج کی پناہ طاقت اور سرپرستی میں سامراج کی بدترین تمناؤں کو پورا کرنے کے لئے اسلام کے عظیم مقتدا محمد رسول اللہ کے خاتم النبیین ہونے اور جہاد کی تاقیامت فریضیت سے انکار کیا اور سامراج کی اغراض مضمومہ کو پورا کرنے کے لئے مسلمانوں میں وہ فتنے کھڑے کئے کہ الامان والحفیظ۔

بہائیت نے ایران میں شیعہ مسلمانوں کا شیرازہ بکھیرنے اور قادیانیت نے ہندوستان میں زیادہ تر اہل سنت میں اور ساتھ ہی اہل تشیع میں بھی تفریق و تشیت کی آگ بھڑکانے میں مغربی سامراج کے لئے وہی کام کیا جو دوسری عالمگیر جنگ میں ہٹلر کے لئے اس کا تیسرا دستہ (THIRD COLUMN) کرتا تھا اور بحیثیت مجموعی ان دونوں فتنوں نے اسلام کو ہر پہلو سے اپنی نیش زنی کا نشانہ بنائے رکھا۔

چونکہ ایران میں مسلم سلطنت موجود تھی جس نے علی محمد باب کو سزائے موت دے کر اور بہاؤ اللہ کو جلائے وطن کر کے اور ان کے متبعین کو غیر مسلم قرار دے کر فتنہ بابیت و بہائیت کی آگ جلد ہی بجادی۔ اور اس کے بعد بہائیت کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ خود بھی دین اسلام سے اپنی واقفیتی کا اعلان کر کے اسلام کے لئے اندرونی چھپے دشمن کا رول ترک کر دے۔

انگریز کا خود کاشتہ پودا:..... لیکن ہندوستان میں انگریزی راج کی موجودگی میں قادیانیت کے پھولے کو اہل اسلام کے جسم سے کاٹ کر الگ کرنے کا امکان نہ تھا اس لئے یہ فتنہ زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ مرزا غلام احمد اپنے آپ کو انگریزی سامراج کا خود کاشتہ پودا بھی کہتا رہا۔ انگریزی راج کے حق میں اسلامی ممالک (ترکی اور عربستان) میں پروپیگنڈا کرنے کا دعویٰ بھی کرتا رہا انگریزوں پر امان جتاتے ہوئے یہ بھی لکھتا رہا ہے کہ میں نے اس حکومت کی تائید میں جتنا لٹریچر شائع کیا ہے اس سے بچاس الماریاں پر ہو سکتی ہیں۔

پہلی جنگ عظیم میں جب بغداد پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو قادیان اور جہاں کہیں قادیانی تھے انہوں نے خوشی سے چراغاں کیا اور فتح کے جشن منائے اور مسلمانوں کے لئے جہاد کو حرام قرار دیتے رہے اور انگریز کی فوج میں بھرتی ہو کر مصر، عرب، عراق، ترکی اور ایران میں جا کر مسلمانوں پر گولیاں چلانے کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے رہے اور محمد رسول اللہ کی ختم نبوت سے انکار کر کے ایک جھوٹے مدعی

نبوت کو غبر بنا کر پیش کرتے رہے تاکہ مغربی سامراج کی تائید اور مسلمانوں کو اس کی تعادی
رضامند کرنے کے لئے وحی اور الہام جیسی پاکیزہ اصطلاحات کا استحصال (EXPLON
TATION) کیا جائے اور اس اسلام دشمنی پر بھی اپنے آپ کو مسلمان کہلانے پر مصر رہے۔

علمائے اسلام کا جہاد..... علماء امت نے دونوں جگہ اس فتنے کا مقابلہ کرنے میں کوئی کوتاہی
نہیں کی اور الحمد للہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے علمائے حق کی سعی کو قبولیت اور برکت سے
فرمائی اور اب یہ دونوں فرقے ہر محاذ پر پسپا ہو رہے ہیں اور ان کا پھیلا ہوا دجل و فریب کا جال پام
پارہ ہو چکا ہے اور اب کسی کو بھی پھنسانے کے قابل نہیں رہا۔ اور سامراج کے خاتمہ سے قوم
سرچشمہ ہی ختم ہو گیا جس پر ان کی آبیاری منحصر تھی۔

حضرت شاہ صاحب کا کارنامہ..... فتنہ قادیانیت کے خلاف جہاد کرنے والے علمائے
ربانی کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جن میں سے بعض نے اپنی تقریروں سے بعض نے تحریروں سے
اور بعض نے مناظروں اور مباحثوں سے اس فتنے کا مقابلہ کیا۔ شکر اللہ سعیم لیکن حضرت شاہ
صاحبؒ نے جن گہرے احساسات کے ساتھ اس فتنہ کے خطرات کا اندازہ لگایا اور پھر جس لگن کے
ساتھ وہ مدافعت عقائد اسلام کی جنگ لڑنے میں محو ہو گئے اس نے وہ فضا پیدا کر دی کہ قادیانیت
کے لئے کوئی پناہ لینے کی جگہ باقی نہ رہی۔ یہ شاہ صاحبؒ کی للہیت کا ثمرہ تھا کہ حضرت علامہ اقبالؒ
سے لے کر رئیس الاحرار مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تک اور مولانا ظفر علی خان سے لے کر مولانا
شام اللہ امرتسریؒ تک اور ایک عالم و فاضل سے لے کر ایک عامی مسلمان تک سب کے سب "ما
کان محمد ابدا احد من رجالکم ولكن رسول اللہ وخاتم النبیین" کا ورد کرنے لگے اور
الجهاد ماضی الی یوم القیمۃ کے غوامض و اسرار کی قدر و قیمت پر غور کرنے لگے۔

پنجاب کی طرف توجہ خاص..... چونکہ فتنہ قادیانیت کا مرکز اور اس کا مقام پیدائش پنجاب تھا
اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اپنی توجہ عالیہ کا مرکز پنجاب کو
قرار دیا انگریزی سامراج کے خلاف مجاہدین کی ایک سرفروش تنظیم مجلس احرار کو اپنی سرپرستی کا
شرف بخش کر اس کو قادیانیت کے خلاف بھی صف آرا کر دیا اور اس کے پیشواؤں میں سے سب
سے بڑے خطیب سید الاحرار مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امیر شریعت کا اعزاز بخش کر جلسہ عام
میں بذات خود ان کے ہاتھ پر قادیانیت کے خلاف بیعت جہاد کی اور اس طرح قادیانیت پر
بھرپور حملہ شروع کیا جو شاہ صاحبؒ کی وفات پر بھی ختم نہ ہوا۔

قادیانی ایک غیر مسلم فرقہ :..... الغرض قادیانیت کے خلاف حضرت شاہ صاحب کی چلائی ہوئی تحریک جہاد کا سلسلہ قریباً پچاس سال تک جاری رہا آخر کار مملکت پاکستان کی پارلیمنٹ نے قادیانیوں اور منکرین ختم نبوت اور منکرین فرضیت جہاد کو اسلام سے خارج ایک غیر مسلم اقلیت قرار دے کر جسم اسلام کو اس رستے ہوئے ناسور سے ہمیشہ کیلئے پاک کر ڈالا۔

آج سے برسوں پہلے حضرت مولینا ابو الوفا ثناء اللہ امرتسری حضرت مولینا انور شاہ کشمیری حضرت مولینا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ہندوستان کے دیگر علمائے کرام نے قادیانیوں کے ملت اسلامیہ سے خارج ایک ٹولی ہونے کا جو فیصلہ فتوؤں کی صورت میں صادر کیا تھا اور ترجمان ملت اسلامیہ علامہ اقبالؒ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے شبہات کا جواب دیتے ہوئے قادیانیت کو اسلام کی بغاوت ثابت کرتے ہوئے جو فیصلہ کن مضامین تحریر فرمائے تھے۔ ان کو قانون وقت بن جانے میں نصف صدی کا وقت لگا۔ سامراج کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی انگریز کا خود کاشت پودا زندہ رہ کر ماحول کو مسموم بنانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا مگر آخر کار اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔

الغرض تاریخ کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ علماء ربانی قرآن وحدیث اور اسلام کے بادیانہ اصولوں کی روشنی میں اس کینسر کو اسلام کے جسم سے کاٹ کر پھینک دینے کا جو فیصلہ صادر کر گئے تھے آج ان کے اس فیصلے کو ایک اسلامی ملک کی قانون ساز جماعت نے ایک دوامی آئین اور قانون بنا ڈالا۔ اور عرب و عجم کی تمام مسلم حکومتوں نے اس اقدام پر مہر تصدیق ثبت کر ڈالی۔

مقدمہ بہاولپور اور اس کی اہمیت :..... حضرت شاہ صاحبؒ نے فتنہ قادیانیت کے خلاف اپنی زندگی کے آخری دس بارہ سال کی مدت میں جو جہاد شروع کیا تھا ۲۵ اگست ۱۹۳۲ء کو بہاولپور کے مقدمہ میں عدالت کے سامنے پیش ہو کر بطور گواہ کے اسلام کی حقانیت اور قادیانیت کا ابطال ثابت کرنا اس طویل معرکے میں آپ کا ایک بڑا کارنامہ ہے بہاولپور سے واپس جا کر آپ تھوڑی سی مدت کے اندر اندر انتقال فرما گئے۔ اور مقدمہ کا فیصلہ جو قریباً سارے کا سارا آپ ہی کی شہادت پر مبنی ہے آپ کی وفات کے بعد صادر ہوا۔

مقدمہ بہاولپور کی نوعیت :..... مقدمہ کی نوعیت یہ تھی کہ ایک شخص کے ساتھ اس کے رشتے کے ایک شخص نے اپنی لڑکی کا نکاح پڑھا دیا ابھی شادی کی رسومات انجام نہ پائی تھیں کہ منگیتر نے قادیانیت اختیار کر لی۔ لڑکی اور اس کے باپ نے شادی سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ شخص مذکور مرتد ہو گیا ہے اسلئے مسلمان عورت اس کی زوجہ نہیں بن سکتی۔ قادیانیوں نے اپنے آپ کو مسلمان ثابت

کرنے کے لئے اپنے خلیفہ کا اثر و رسوخ اور اپنی تنظیم اور انگریزی حکومت کے قوانین کو داؤ پر لگا دیا۔ کوئی سات سال تک مقدمہ چلتا رہا۔ لڑکی نے خاوند کے قادیانیت کی وجہ سے مرتد اور خارج از اسلام ہونے کے ثبوت میں علماء اسلام کو بطور گواہ پیش کیا۔ حضرت شاہ صاحب کی تحریک سے مولانا ابوالوفا شاہ جہاں پوری لڑکی کی طرف سے بیروکار رہے اور مولانا مرتضیٰ حسن صاحب استاذ دیوبند مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دیوبند (سابق مفتی اعظم پاکستان)، مولانا نجم الدین صاحب پرنسپل اور نیشنل کالج لاہور، مولانا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ بہاولپور اور مولانا محمد حسین گوجرانوالہ کی شہادتوں کے بعد خود حضرت شاہ صاحب بطور گواہ پیش ہوئے اور پانچ دن تک اپنی شہادت قلم بند کراتے رہے۔ اور قادیانی و کلاء کے سوالات کے جوابات دیتے رہے بہاولپور کی عدالت کے فاضل جج صاحب جناب محمد اکبر خان صاحب نے حضرت شاہ صاحب کی شہادت پر اپنے فیصلے کا انحصار رکھا اور قادیانیت کو اسلام سے خارج شدہ ٹولہ قرار دیتے ہوئے ناسخ کو مرتد قرار دیا۔

بستر مرگ سے عدالت کے کٹہرے میں:..... یوں تو حضرت شاہ صاحب اس زمانہ میں کہیں بھی فتنہ قادیانیت کو سراٹھاتے دیکھتے تو اس کو پچھل ڈالنے کے لئے شہباز کی طرح چھپ کر پہنچ جاتے تھے لیکن بہاولپور میں جانے کے وقت آپ بستر مرگ سے اٹھ کر گئے تھے جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بہاولپور ایک ایسی ریاست تھی جو انگریزی راج کے ماتحت ہونے کے باوجود اسلامی ریاست کہلاتی تھی اور اس کی عدالتوں میں عائلی معاملات کی حد تک اسلامی قانون کے مطابق فیصلے صادر ہوتے تھے شاہ صاحب کی تمنا تھی کہ قادیانیت کے خارج از ملت اسلام ہونے کا فیصلہ کسی چھوٹی سی چھوٹی اسلامی حکومت کی عدالت سے ہی صادر ہو جائے تو حقیقت کو آشکارا کرنے اور فتنے کو اس کے کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے ایک مستحکم بنیاد بن جائے گی۔

بہاولپور کے عوام سے خطاب:..... جن دنوں (اگست ۱۹۳۲ء) بہاولپور کے تاریخی مقدمے میں حضرت شاہ صاحب کو شہادت دینے کے لئے جانا پڑا۔ اس وقت آپ سخت علالت کی وجہ سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) کے مدر سے کی صدارت کا چارج مولانا شبیر احمد عثمانی کو سونپ کر موافق آپ دہوا میں علاج کرانے کے لئے اپنے دولت خانہ پر دیوبند تشریف لے آئے تھے۔ دیوبند میں کچھ قلیل عرصہ ہی میں قیام فرمایا تھا کہ اسی دوران میں مقدمہ بہاولپور کا معرکہ الآراء واقعہ پیش آگیا۔ اس لئے حضرت کو وہاں جانا پڑا حالانکہ اب آپ چارو ناچار دوبارہ ڈابھیل جانے کا ارادہ کر چکے تھے چنانچہ پہلے ہی جمعہ کو جب بہاولپور کی جامع مسجد میں عامۃ المسلمین سے آپ نے خطاب فرمایا تو اس بات کا انکشاف ان الفاظ میں کیا:

”حضرات! میں نے ڈابھیل جانے کے لئے سامان سفر باندھ لیا تھا کہ یکا یک مولینا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ (بہاولپور) کا خط دیوبند موصول ہوا۔ کہ شہادت دینے کے لئے بہاولپور آئے۔ چنانچہ اس عاجز نے ڈابھیل کا سفر ملتوی کیا اور بہاولپور کا سفر کیا یہ خیال کیا کہ ہمارا نامہ اعمال تو سیاہ ہے ہی، شاید یہی بات میری نجات کا باعث بن جائے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا جانبدار ہو کر بہاولپور میں آیا تھا“

(حیات انور ۳۲۶، ۳۲۷)

مولینا محمد انوری لالکپوری کا بیان ہے کہ حضرت کے اس فرمانے پر تمام مسجد میں چیخ و چھاڑ پڑ گئی، لوگ دھاڑیں مار مار کر اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے کہ خود حضرت پر ایک عجیب کیفیت وجد طاری تھی۔ ایک مولینا صاحب نے اختتام وعظ پر فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب کی شان ایسی ہے اور آپ ایسے بزرگ ہیں وغیرہ۔ حضرت فوراً کھڑے ہو گئے فرمایا حضرت! ان صاحب نے غلط کہا ہے ہم ایسے نہیں ہیں بلکہ ہمیں تو یہ بات یقین کے درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ ہم سے گلی کا کتا ہی اچھا ہے، ہم اس سے بھی گئے گزر رہے ہیں۔ (حیات انور ۳۲۷)

لاہور کا آخری سفر اور مسجد میں کرسی کا مسئلہ:..... بہاولپور کے اس سفر میں حضرت شاہ صاحب لاہور بھی تشریف لے گئے۔ وہاں دو روز قیام فرمایا۔ اس سلسلے میں مرحوم مولینا محمد انوری لالکپوری کے الفاظ میں ہی ایک اور واقعہ کا اندراج غیر مناسب نہ ہوگا۔

(حضرت شاہ صاحب نے) آسٹریلیا بلڈنگ (لاہور) کی مسجد میں بعد نماز فجر وعظ فرمایا۔ علماء و فضلاء عوام و خواص بالخصوص ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور ان کے ساتھی اہتمام سے حاضر ہوئے تھے۔ بیان ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، مالک تعالیٰ سے علاقہ پیدا کرو غرض حضرت نے خطبہ شروع فرمایا۔ الحمد للہ الحمد للہ ونستعینہ الخ وعظ کرسی پر بیٹھ کر فرما رہے تھے۔ احقر کے دل میں دوسو سا گزرا کہ مسجد میں تو شاید کرسی بچھانا سوء ادب ہو۔ حضرت نے فوراً خطبہ بند کر دیا۔ فرمایا کہ مسجد میں کرسی بچھانا نبی کریم سے ثابت ہے۔ چنانچہ مسلم شریف میں روایت ہے کہ ایک ساکن کے جواب دینے کے لئے حضور کے لئے مدینہ کے بازار سے کرسی لائی گئی۔ راوی کہتا ہے کہ اس کرسی کے پائے سیاہ تھے۔ غالباً لوہے کے تھے۔ مصلے کے قریب رکھی گئی حضور نبی کریم نے اس پر بیٹھ کر جوابات دیئے۔ یہ فرمایا اور پھر خطبہ شروع فرما کر حضرت نے وعظ کیا۔ احقر ندامت سے پسینہ پسینہ ہو گیا۔ (حیات انور ۳۲۷، ۳۲۸)

مرض الوصال

ریاست بہاولپور اور شہر لاہور کے سفر کے بعد جب حضرت شاہ صاحبؒ دیوبند پہنچے تو آپ کے حالات میں مزید اضافہ ہو گیا اور سفر کی تھکان اور بے آرامی کی وجہ سے خونی بواسیر کے دیکھنے میں نے شدت اختیار کر لی۔ لیکن ڈابھیل میں تدریس کا جو کام ہو رہا تھا آپ اس کو حاصل حیات کا دے رہے تھے اس لئے آپ اپنی وصیت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے از سر نو کچھ عرصہ کے لئے ڈابھیل تشریف لے گئے اور درس حدیث کا محبوب شغل جاری رکھا آخر کار جب جسمانی ضعف و تھکوت نے انتہائی نازک صورت اختیار کر لی اور مسند درس کو رونق بخشنے کا امکان ہی باقی نہ رہا تو آپ نے رخصت ہو کر واپس دیوبند تشریف لے آئے اور گھر پہنچ کر صاحب فراش ہو گئے۔ مرض کا یہ آخری حملہ اس قدر شدید تھا کہ کوئی علاج کارگر نہ ہو سکا۔ آپ کے جسم کا خون اس قدر ضائع ہو چکا تھا کہ اس کا بدلہ مانتھل اب پیدا ہی نہ ہوتا تھا اور وہ دیرینہ مرض جس کو آپ اپنے علمی انہماک کی وجہ سے اہمیت نہ دیتے تھے اب مرض الوصال ثابت ہو رہا تھا اور ہوا۔

مگر آخری دم تک مطالعہ:..... اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں دین اسلام کی خدمت کا جذبہ بے پایاں ودیعت فرمایا تھا وہ آپ کو بستر مرگ پر بھی چین سے لیٹنے نہ دیتا تھا۔ آپ کو اپنے علاج کی طرف توجہ ہی نہ تھی۔ پرہیز وغیرہ سے بھی یک گونہ بے پروائی بلکہ بیزاری تھی۔ البتہ مطالعہ کتب کا سلسلہ اس حالت میں بھی حسب معمول جاری تھا۔ معالج اطباء نے باصرار تمام مطالعہ کی ممانعت کی اور عرض کیا کہ حضرت اس سے مرض بڑھ جائے گا فرمانے لگے کہ بھائی یہ کتب مبنی بذات خود میرا مستقل مرض ہے اور لا علاج ہے۔

پیشین گوئیاں:..... حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگرد مولانا محمد انوری لاکپوری تحریر فرماتے ہیں کہ (حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی (مدظلہ تعالیٰ) نے بیان فرمایا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے سفر آخرت اختیار فرمانے کے چند یوم قبل (میں) در دولت پر حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے کبھی پیشین گوئی نہیں کی، اب تو دو باتیں ذہن میں آگئی ہیں عرض کر ہی دیتا ہوں۔ ایک یہ کہ حضرت شیخ الہندؒ کے علوم کی خوب اشاعت ہوگی۔ دوم ہندوستان (اب) ضرور آزاد ہوگا اس لئے کہ منہ الم کی انتہا ہوگئی۔ (دارالعلوم دہلی ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۵ء)

اسی طرح حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا بیان ہے کہ مرض وفات میں ایک دفعہ

مولوی حامد الانصاری غازی کو مخاطب کر کے فرمانے لگے کہ بھائی ہمیں اب یقین ہو گیا کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائے گا۔ کیونکہ اس نے قدرتی اشیاء پر بھی ٹیکس عائد کر دیئے ہیں۔ ہوا پر ٹیکس، لٹا پر ٹیکس، پانی پر ٹیکس، نمک پر ٹیکس، جن چیزوں پر قدرت نے آزاد رکھا تھا ان پر پابندی عائد کرنا قدرت کا مقابلہ ہے۔ جس کے بعد زیادہ دیر تک بقا نہیں ہو سکتی اس لئے ہمیں یقین ہے کہ اب انگریز کے جانے کے دن قریب آ گئے ہیں۔ (حیات انور ۲۲۸، ۲۲۹)

مراجعت بطرف کشمیر کی تمنا:..... جہاںگیر بادشاہ کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے اپنی آخری تمنا کے بارے میں سوال کا یہ جواب دیا تھا کہ ”کشمیر و دیگر چچ“ حالانکہ کشمیر جہاںگیر کے لئے صرف سیرگاہ تھی اور بس حضرت شاہ صاحب کا خمیر ہی کشمیر کی خاک پاک سے تھا۔ یہ خطہ دلپذیر آپ کا وطن تھا اور آپ کے آباء و اجداد کا وطن تھا۔ آپ کو اپنی جنت ارضی کے ساتھ جو قلبی لگاؤ تھا اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ وفات سے متصل قبل کے ایام میں قلب مبارک میں مراجعت کشمیر کی تمنا جاگ اٹھی تھی آپ چاہتے تھے کہ لولاب پہنچ کر حضرت مولینا معظم شاہ صاحب کی قدم بوسی حاصل کریں۔ عزیز واقارب سے بھی ملیں اور موافق آب و ہوا میں علاج بھی جاری رکھیں اس پر مزید یہ کہ ان دنوں پنجاب کے مسلم پریس کا ایک حصہ یہ تاثر دے رہا تھا کہ قادیانی پارٹی نے کشمیر کے سیاح ہنگاموں کا ناجائز فائدہ اٹھا کر یہاں قادیانیت پھیلانے کا وھند شروع کر رکھا ہے۔ اس لئے حضرت شاہ صاحب یہ چاہتے تھے کہ کچھ وقت کے لئے کشمیر میں قیام کر کے علمائے کشمیر کا ایک محاذ منظم کریں اور وادی کشمیر کے عوام کو جھنجھوڑ کر فتنہ آخر زماں کے خطروں سے خبردار کریں اور قادیانیت کے زہر کا کچھ نہ کچھ تریاق اپنی وفات سے پہلے مہیا کر جائیں۔ مگر وقت معین قریب آپ پہنچا تھا اور اہل کشمیر بھی اتنے خوش نصیب نہ تھے کہ ان کو یہ دولت غیر مترقبہ ارزانی ہو جاتی اس لئے آپ کا یہ ارادہ عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔

مولینا مفتی محمد شفیع صاحب کا بیان:..... حضرت مولینا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ (سابق مفتی اعظم پاکستان) کے بیان کے مطابق مرض الوصال میں حضرت شاہ صاحب کا ارادہ تھا کہ ایک مرتبہ پھر کشمیر کا سفر کیا جائے اور وہاں اپنے اعزہ واقارب کی ملاقات کے علاوہ پیش نظر یہ تھا کہ کشمیر میں قادیانی فتنہ پھیلا ہوا ہے۔ اب تک وہاں پہنچ کر اس کے انسداد کے متعلق کوئی کام نہیں کیا گیا۔ اس سفر کا قصد کرنے کے ساتھ یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ کشمیر کے عوام اردو یا عربی کے رسائل تو پڑھ نہ سکیں گے۔ فارسی زبان میں مسئلہ ختم نبوت اور قادیانیت کے متعلق لکھ کر طبع کر کے وہاں ساتھ لے جائیں اور مفت تقسیم کریں۔ اس ارادہ کے ساتھ ہی خود ایک رسالہ کی تصنیف شروع فرمادی۔ ابھی یہ تصنیف تکمیل کو نہ پہنچی تھی کہ مرض کے اشیاء ادنے بالکل ہی قوی کو

معتدل کر دیا تو ایک طالب علم کے ذریعہ اس ناکارہ خالق کے پاس پیغام بھیجا کہ میں نے تمہیں ضرورت سے فارسی زبان میں مسئلہ ختم نبوت پر ایک رسالہ لکھنا شروع کیا تھا مگر اب میں اس کی تکمیل سے معذور ہوں تجھ سے ہو سکے تو اس کی تکمیل کر دے۔

کتاب خاتم النبیین:..... احقر ناکارہ نے تعمیل ارشاد کو سعادت سمجھ کر شروع کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ کی حالت بدلتا شروع ہوئی اور یہ علم و تقویٰ کا آفتاب عالم پر غروب کے کنارے آگیا یہاں تک کہ اس پیکر علم و تقویٰ مجسم دین و دیانت نے دین ہی کی غریب اپنی عمر کا آخری سانس پورا کر دیا۔

اب وہ کشمیر ۱ کا قصد اور وہاں رسالہ فارسی کی اشاعت بھی ایک خواب و خیال ہو گیا۔ مگر کے بعد آپ کے مسودات میں سے وہ منتشر اوراق فارسی جمع کر کے مجلس علمی جامعہ اسلامیہ دہلی سورت نے خاتم النبیین کے نام شائع کیا اور یہی اوراق آپ کا خاتمۃ التصانیف قرار پائے ۲۔ حضرت سرور و عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ختم نبوت پر قادیانی دجال نے جو حملے کئے تھے ان پر مدافعت کرتے کرتے حضرت شاہ صاحبؒ کی حیات سراپا کرامات کا بھی خاتمہ ہوا۔

یہ وہی خاتم النبیین نامی کتاب ہے جن کے متعلق مولینا قاری محمد طیب صاحبؒ کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے مرض وفات میں رو رو کر فرمایا کہ ہم نے عمر ضائع کی اور کوئی کام آخرت کے لئے نہ کیا۔ یہ رسالہ خاتم النبیین اس لعین قادیانی کے رد میں لکھا ہے۔ توقع ہے کہ شاید یہ رسالہ میری نجات کا ذریعہ ہو جائے۔ (حیات نور ۲۲۳)

وفات حسرت آیات

۲ صفر ۱۳۵۲ھ ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء

کل من علیہا فان و یبقی وجہ ربک ذو الجلال والا کرام (الرحمن)
روئے زمین پر موجود ہر کوئی فنا ہونے والا ہے آپ کے پروردگار کی ذات کو ہی دوائی بقا ہے جو عظمت اور احسان والی ہے

۱..... حضرت شاہ صاحبؒ اپنی وفات سے کوئی ایک سال قبل ۱۳۵۰ھ میں آخری بار کشمیر تشریف لائے تھے وہاں قیام سو پور بارہ مولہ اور لولاب وغیرہ مقامات پر اپنے مواعظ حسنہ سے عامۃ المسلمین کو مستفید فرمایا۔ ۲۳ صفر ۱۳۵۰ھ کو حضرت ممدوح نے جو خطبہ جامع مسجد سو پور میں ارشاد فرمایا اسے اسی وقت قلم بند کیا گیا ہے ایک رفیق کی وساطت سے الحمد للہ نے یہ تقریباً حاصل کی ہے کوئی۔ ۲..... ملاحظہ و مختصر احیات انور ۲۶۸، ۲۶۹

امیر المؤمنین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے اور بار بار "وَلَا تُبْزِلْنِي مُسْلِمًا وَالْحَقَنِي بِالصَّالِحِينَ" ۱۰

کہا رہے تھے۔ بستر مرگ کے پاس بیٹھی ہوئی آپ کی عظیم الشان دختر ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی زبان مہارک سے آپ کے جذبات قلب ان الفاظ میں ادا ہوئے جو واقعہ کے بہترین ترجمان ہیں۔

وَكُلُّ دُنْيَا غَيْبٍ يُسُوبُ

وَالْغَائِبُ الْمَوْتُ لَا يَسُوبُ

(ہر سانس بھی نہ کبھی گمراہی جاتا ہے۔ مگر موت کے سفر پر گیا ہوا کبھی واپس نہیں آتا۔)

فطرت اور جوان مرگی:..... علم و فضل کی دنیا میں ایسی بے شمار ہستیوں کا تذکرہ ملتا ہے جو موت کی طبعی اور عادی عمر کو پہنچنے سے پہلے انتقال کر گئے۔ اور ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے والے نے بھی حسرت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ کاش یہ کچھ اور مدت جیئے ہوتے تو نہ جانے اس جہان میں اپنے آثار کے کتنے خزانے چھوڑ جاتے۔

استاذ العلماء والمحدثین علامہ الدہر شیخ الحدیث حضرت مولانا نور شاہ کشمیری بھی عاقرہ اسلام کی اس جوان مرگ جماعت میں شامل ہیں۔ جو اسی یا نوے سال تو کجا عالم پیری کی پہلی منزل ساٹھ سال کی عمر کو بھی نہ پہنچنے پائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذہانت کی آگ کے تیز شعلے ذہین انسان کی جسمانی قوی کو اندر ہی اندر جلا کر بھسم کر دیتے ہیں۔

سحری گفت بلبل باغباں را

دریں گل جز نہال غم نگیرد

بہ پیری می رسد خار مغلل

ولی گل چوں جواں گردد بمیرد

الاجزاء الاجل:..... حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی دیرینہ علالت کو صبر ایوبی کے ساتھ طاقت کرنے کے بعد ۳ ماہ صفر المظفر ۱۳۵۲ھ (مطابق ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء) کو شہادت یافتہ النفس

۱۰ اس وقت جب اچھ کو چوری فرما کر وہابی کی حالت میں دنیا سے اٹھائے اور مجھ کو (خاص) نیک بندوں میں شامل کر لے۔

الْمُطْمَئِنَّةُ، اِرْجِعِي اِلَى رَبِّكَ رَاضِيَةً مُّرَضِيَةً ❶ کا پیغام ربانی سن کر لیک اللھم لیک کہتے ہوئے اور فساد خلی فی عبادی و ادخلی جنتی ❷ کے ارشاد کی تکمیل کرتے ہوئے حضرت جان آفرین (جل جلالہ) کو اپنی جان عزیز پر دکردی اور اپنے اعزہ و اقارت ملک بھر کے علماء و فضلاء اور اپنے مداحین و معتقدین کو اشک بار چھوڑ کر اپنے معبود و مقصود اور محبوب حقیقی الرحمن الاعلیٰ سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

وما کان قیس ہلک ہلک واحد
ولکنہ بنیان قوم تھدما
(قیس کی وفات ایک آدمی کی وفات نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی موت سے قعر ملت کے ستون گر گئے ہیں)

ہزاروں سال زگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت شاہ صاحبؒ کی رحلت کے وقت آپ کے گرد و پیش سے بقول مولینا مفتی محمد شفیع صاحبؒ (مفتی اعظم پاکستان) گویا بزبان حال یہ سنا جاتا تھا۔

اگرچہ خرمن عمرم غم تو داد بہار
بخاک پائے عزیزت کہ عہد نہ شکستم

حضرت شاہ صاحبؒ کے وصال کا واقعہ دیوبند میں آپ کے اپنے دولت خانے پر ہی پیش آیا اور سرزمین دیوبند ہی میں آپ کے جسد خاکی کی تدفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ آپ کے رفیق شفیق شیخ وقت مولینا میاں اصغر حسین صاحبؒ (متوفی ۱۳۶۴ھ) نے پڑھائی۔ واقعہ وصال پر اگرچہ دیوبند سے باہر اعلان و اطلاع کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا تھا پھر بھی خبر وفات ہر طرف بجلی کی طرح پھیل گئی اور دور دراز علاقوں سے آنے والوں کا جم غفیر شامل نماز جنازہ ہول گوجرانوالہ، لاہور، لدھیانہ، دہلی، امرتسر، سہارن پور، مظفرنگر، میرٹھ اور یوپی کے دیگر اطراف و اکناف سے مرحوم کے تلامذہ اور خیمین دیوبند پہنچ گئے۔

رنج و غم کی ہمہ گیر لہر:..... حضرت شاہ صاحبؒ نور اللہ مرقدہ اپنی رحلت سے نہ صرف اپنے جگر

❶..... اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار (کے جوار رحمت) کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔ ❷..... میں حاضر ہوں اے میرے اللہ میں حاضر ہوں۔ ❸..... تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

باروں ازہر، اکبر اور انظر کو بے سہارا چھوڑ گئے بلکہ اپنے تلامذہ اور وقت کے علماء و فضلاء کو یتیم کر گئے۔ جس روشن، نورانی اور پرکشش رخ انور کو دیکھ کر ایک غیر مسلم نے کہا تھا کہ اسلام کے حق ہونے کی ایک مستقل دلیل یہ چہرہ بھی ہے وہ آفتاب اپنے عشاق کی نظروں سے پوشیدہ ہو گیا۔

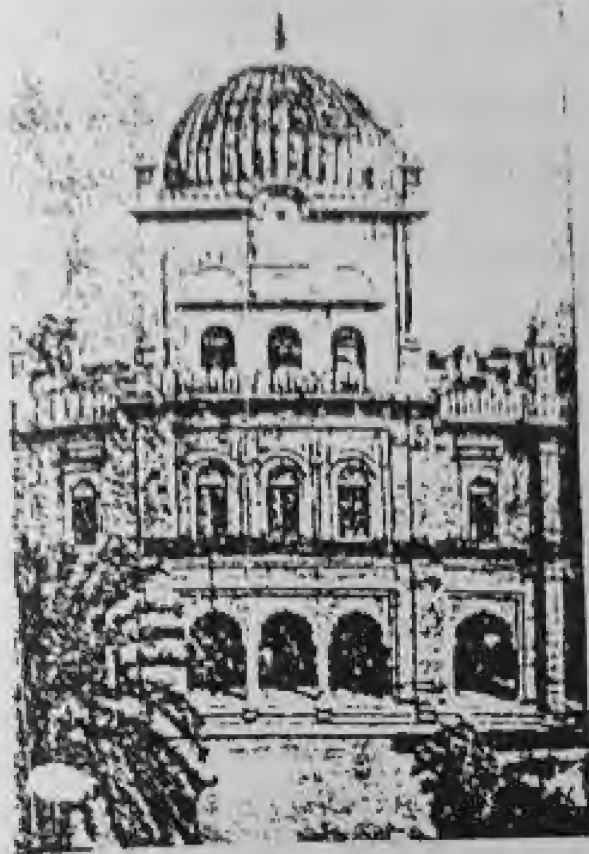
ہندوستان، بنگال و برما اور بلادِ اسلامیہ کے مشہور اہل عمل اور دینی اداروں نے حضرت مرحوم کی رحلت کے صدمہ کو محسوس کیا اور اپنے ملک کی حدود سے نکل کر غیر ملکی اخبار و جرائد میں دیر تک آپ کے حالات زندگی پر تذکرے شائع ہوتے رہے پورے غیر منقسم ہندوستان میں جنوب سے شمال اور مشرق سے مغرب تک آپ کی وفات کو قومی اور ملی نقصان کے طور پر محسوس کیا گیا اور تقریر و تحریر اور نشر و نظم میں اس نقصان عظیم پر اشکباری کی گئی۔

ما تم کدہ ڈا بھیل:..... چونکہ وفات کے وقت آپ کا بحیثیت صدر المدرسین جامعہ اسلامیہ ڈا بھیل سے تعلق تھا اس لئے اس ادارے کا سب سے زیادہ متاثر ہونا قدرتی امر تھا۔ جس دن حضرت شاہ صاحبؒ کے انتقال کی اطلاع ڈا بھیل پہنچی تو پورا خطہ ڈا بھیل ماتم کدہ بن گیا۔ حضرت مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی (متوفی ۱۳۶۹ھ) بے ساختہ چھینیں اور دھاڑے مار مار کر رورہے تھے اور فرما رہے تھے کہ آہ اب کس کے پاس جا کر اشکالات حل کرائیں گے؟ اس سلسلے میں مولینا سید احمد رضا صاحب بجنوری کا بیان ہے کہ:

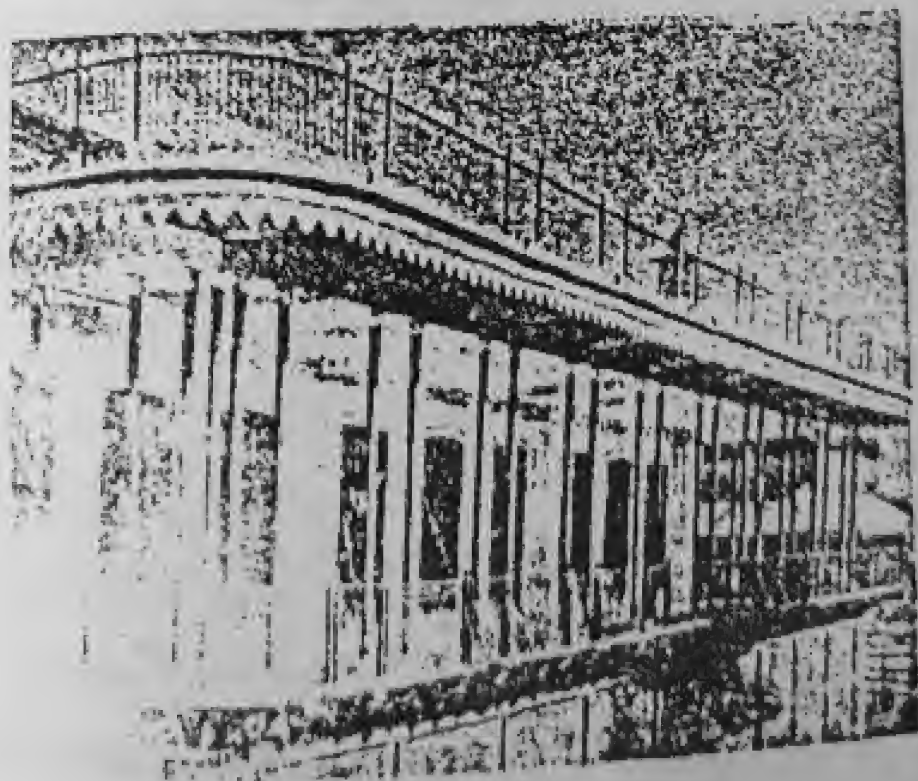
”جب جلسہ تعزیت (جامعہ اسلامیہ ڈا بھیل کے) دارالحدیث میں منعقد ہوا تو مجھے وہ منظر اب تک یاد ہے کہ طلبہ اساتذہ اور اہل قصبہ کا پورا مجمع حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات پر گریہ و بکاء میں مصروف تھا اور خود حضرت (مولینا) عثمانی نے جب تقریر شروع فرمائی تو وہ بھی تحمل نہ فرما سکے اور فرط گریہ سے کچھ دیر کیلئے رکے تقریر بند کرنی پڑی۔ پھر انہوں نے جلسہ کو خطاب فرمایا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات سے تم لوگ یتیم نہیں ہوئے بلکہ ہم جیسے پڑھانے والے یتیم ہو گئے ہیں۔ کیونکہ تمہارے لئے تو خدا کے فضل سے ہم بھی کافی ہیں مگر جس سے ہم پڑھانے والے پڑھتے تھے وہ شخصیت ہم سے جدا ہو گئی ہے۔ (نطق انور ۹)

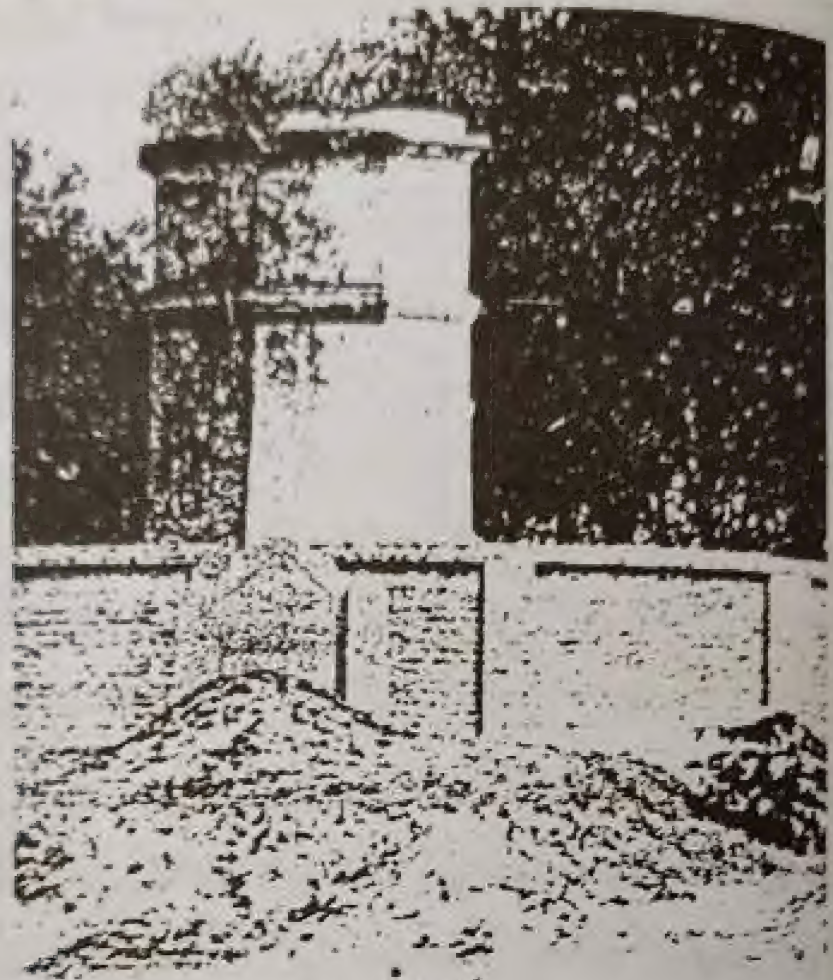
حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد حضرت مولینا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے ڈا بھیل میں علماء و طلباء کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے اپنے مشفق محترم حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق بیغ انداز میں فرمایا کہ بھائی! میں تو اتنا جانتا ہوں کہ صحابہؓ کا قافلہ جارہا تھا (اس میں سے) یہ پیچھے رہ گئے تھے۔



دارالشمیر: دارالعلوم دیوبند



دارالحدیث، دارالعلوم دیوبند



حضرت علامہ کشمیریؒ کی خواب گاہ
یہ خاک کی وہ ڈھیری ہے جس کے نیچے ایک گنج گراں مایہ پنہاں ہیں



حضرت شاہ صاحبؒ کے جدِ بزرگوار حضرت الشیخ بابا مسعود ندویؒ کی ٹر بہت
منظر میں سنگ مزار کے سرہانے چراغ داں پھولوں کے جھنڈ میں سے سر اٹھائے کھڑا ہے

وادئ کشمیر میں صف ماتم:..... حضرت شاہ صاحبؒ کے انتقال پر سارے ملک کے علمی اور فاضل حلقوں میں جو صف ماتم بچھ گئی تھی اس میں آپ کے اہل وطن پیش پیش تھے وادی کشمیر کے طول و عرض میں اس وقت ایسے بے شمار اہل علم موجود تھے۔ جو براہ راست یا بالواسطہ آپ کے علمی و روحانی فیوض سے بہرہ ور ہو چکے تھے اور آپ کی ذات کو اسلام کی دولت بے بہا یقین کرتے تھے سرینگر سو پور بارہ مولہ اور اسلام آباد کی مساجد و معاہد میں دعائیہ مجالس اور فاتحہ خوانی کے حلقے منعقد ہوئے۔ کشمیر کے علماء و فضلاء اور مشاہیر و مقتدر شعراء نے سرینگر میں ایک ماتمی اجتماع کیا جہاں حضرت شاہ صاحبؒ کے فضائل و مناقب بیان کئے گئے اور آپ کے علوم و کمالات پر تقریریں ہوئیں اور مشہور شعراء خولجہ عبد القادر صاحبؒ درویش، پیر عبد القادر صاحبؒ آثم (ملارئی)، خولجہ محمد امین صاحبؒ داراب، سید مبارک شاہ گیلانی فطرت اور خولجہ سعد الدین سعد صاحبؒ نقشبندی وغیرہم نے نہایت عالمانہ مرعے پڑھے (جن میں سے پیر عبد القادر صاحبؒ آثم کا مرثیہ اس کتاب کے اگلے صفحات میں شامل ہے)

باپ کے آنسو:..... خطہ کشمیر کے باشندے حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات حسرت آیات پر نالاں و گریبان تھے ہی آپ کے اخوان و اقرباء خصوصاً آپ کے پدر بزرگوار مولینا معظم شاہ صاحبؒ پر کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل امر نہیں۔ آپ تو ”انما اشکو بشی و حزنی الی اللہ“ کی تصویر بن کر رہ گئے ہونگے۔ حضرت معظم شاہ صاحبؒ پہلے بھی ایک جواں سال فاضل اور شاعر فرزند مولوی حسین شاہ کی وفات کا صدمہ برداشت کر چکے تھے اور اب علامہ انور شاہ جیسے ہمہ صفت موصوف اور علمی دنیا میں سورج کی طرح مشہور و معروف لخت جگر کی جدائی نے انہیں جیتے جی ہی مار ڈالا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی رحلت کے موقع پر آپ کو اطراف و اکناف سے بے شمار تعزیتی پیغامات موصول ہوئے۔ جامعہ اسلامیہ کے منتظمین نے بھی ایک تعزیت نامہ آپ کی خدمت میں ارسال کیا تھا جس کے جواب میں مولینا معظم شاہ صاحبؒ نے ادارہ کو شکریہ کا ایک خط تحریر فرمایا جس میں دیگر باتوں کے علاوہ لکھا تھا کہ:

”میں ہمیشہ سے اس آرزو میں تھا کہ حضرت مرحوم میرا جنازہ پڑھائیں اور وقتاً فوقتاً فاتحہ سے یاد فرماتے رہیں گے افسوس کہ خاکسار کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔“

دہلی ولاہور کے تعزیتی جلسے:..... حضرت شاہ صاحبؒ دوشنبہ کو انتقال فرما گئے آنے والے جمعہ کو جامع مسجد دہلی میں مفتی اعظم ہند حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہؒ (متوفی ۱۳۷۲ھ) کی صدارت میں ایک بہت بڑا تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں علماء و فضلاء کی ایک جماعت نے

تقدیر نور
۱۶۷
حضرت شاہ صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ حضرت مفتی صاحب نے شاہ صاحب کی رحلت کو
اہل ترین عالم ربانی کی وفات قرار دیا۔

دہلی کے اس جلسہ میں سحان الہند مولینا احمد سعید صاحب دہلوی (متوفی ۱۳۷۹ھ) نے شاہ
صاحب کی شان میں جو طویل اور بلیغ تقریر ارشاد فرمائی وہ اگلے صفحات میں من و عن مجموعہ ہذا کی
زینت ہے یہاں صرف اس تقریر کا حسب ذیل اقتباس درج کرنا کافی ہوگا۔

”معرز حاضرین! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ نے دو شنبہ کی شام کو دیوبند کی
خاک میں کسی انسان کو دفن نہیں کیا ہے بلکہ آپ نے ایک ایسے مکتبہ کو خاک میں ملا دیا
ہے جس میں ہر فن کی بے شمار کتابیں الماریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ آپ نے ایک
ایسے کتب خانہ کو زمین کی تہہ میں چھپا دیا ہے جس کی کتابیں احاطہ احصاء و شمار سے
خارج تھیں۔ ہائے مسلمانوں کی بد قسمتی، ہائے قوم کی حراماں نصیبی کیا چیز ان کے
ہاتھ سے تلف ہو گئی۔“ (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند جولائی ۱۹۶۶ء)

لاہور کے تعزیتی جلسے میں حضرت علامہ اقبالؒ (متوفی ۱۹۳۸ء) نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:
”اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے“
(مقدمہ انوار الباری حصہ دوم ۲۲۵)

ہر طرف سے خراج عقیدت:..... فاتح قادیان حضرت مولینا ثناء اللہ امرتسری نور اللہ مرقدہ
ان موقع پر اخبار المحدثات امرتسر میں حضرت شاہ صاحب کا تذکرہ فرماتے ہوئے تحریر فرما چکے
تھا۔ بے نظیر عالم دین رخصت ہو گیا۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ترجمان رسالہ معارف جون ۱۹۳۳ء کے شذرات میں اپنے درود
کا اظہار فرماتے ہوئے حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ یوں رقمطراز ہیں۔

”دین و دانش کا مہر انور ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء کی صبح کو دیوبند کی خاک میں ہمیشہ کے لئے
غروب ہو گیا..... مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے۔ ان کی مثال اس سمندر کی سی
ہے جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گران قدر خزانوں سے
معمور ہوتی ہے۔“

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے جلسہ تعزیت میں تقریر کرتے ہوئے حضرت شاہ
صاحب کی رحلت کو حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا انتقال قرار دیا۔

مزار پر انوار:

بر مزار ماغریبان نے چراغِ دے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

اس شعر میں شاعر نے مزار کی جس سادگی اور درسِ فتائیت کا نقشہ پیش کیا ہے وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے مزار پر انوار پر صادق آتا ہے کیونکہ دیوبند کے دیگر اکابر علماء و صلحاء کے مقابلے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی تربت شریف کو بھی شریعت اسلامیہ کی ہدایت کے مطابق رکھا گیا ہے تاکہ لا تجعلو قبری صنما کی عملی تعمیل کا زندہ نمونہ سبق آموز رہے۔

سرزمین کشمیر کا یہ مایہ ناز فرزند اور علم و عمل کا یہ پیکر عظیم سرزمین دیوبند کے عید گاہ سے متصل بہ استراحت ہے۔ آپ کی تربت محزنِ قربت بالکل کچی ہے۔ اس کا نہ کوئی پختہ چبوترہ ہے اور نہ اس کوئی قبہ اور گنبد ہے۔ اگر ایک طرف کو بعد کے زمانے میں نصب کئے کتبے سے رہنمائی نہ ملے تو پتہ بھی نہ چلے کہ شاہ صاحبؒ کہاں پر آرام فرمائیں۔ اللہ اللہ اس سادگی پر ہزار بناؤ قربان کیے جاسکتے ہیں۔ ظاہر بینوں کو وہاں کیا ملے گا البتہ اہل دل اور اصحابِ دانش و بینش کے لئے وہاں ہر وقت انوار و تجلیات کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ اور ارادتمند برابر فاتحہ کے پھول چڑھاتے رہتے ہیں۔ دیوبند میں وقتاً فوقتاً دنیاۓ اسلام کی برگزیدہ ہستیاں وارد ہوتی ہیں۔ ان میں سے اہل ذوق حضرت شاہ صاحبؒ اور دیوبند کے دیگر اکابر بزرگانِ ملت کے مقابر پر حاضری اور فاتحہ خوانی کے بغیر سیر دیوبند کو ادھورا تصور کرتے ہیں یہ صاحبِ قبر حضرت شاہ صاحبؒ کی بلند و بالا شخصیت کا کرشمہ ہے کہ ظاہری اور رسمی دھوم دھام نہ ہوتے ہوئے بھی آپ کی قبر شریف یزار و بیتوں کا نمونہ ہے۔

ایک حالیہ واقعہ:..... مجموعہ ہذا بھی زیر ترتیب ہی تھا کہ ۲۴ اپریل ۱۹۷۶ء کو صدر جمہوریہ ہند جناب فخر الدین علی احمد صاحبؒ دیوبند تشریف فرما ہوئے اخبارات میں چھپا کہ آپ پورے سرکاری لوازمات کے ساتھ اکابرین دیوبند حضرت مولینا محمد قاسم نانوتوی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ حضرت مولینا سید حسین احمد مدنی اور حضرت مولینا انور شاہ کشمیری (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) کے مقابر پر ایصالِ ثواب کے لئے تشریف لے گئے۔

مرقد انور پر فاتحہ خوانی کے موقع پر صدر جلیل القدر کے ہمراہ حضرت شاہ صاحبؒ کے فرزند ان کرام کے علاوہ مولینا اسعد مدنی (صدر جمعیۃ العلماء ہند) مولینا حامد الانصاری غازی (ممبر مجلس شوری دارالعلوم دیوبند) جناب محمد عثمان (چیرمین میونسپل بورڈ دیوبند) شری نرائن دت تیواری

(ذریعہ علمی یو پی) ڈاکٹر چنار یڈی (گورنریو پی) اور دیگر علمائین و زعماء بھی تھے۔

حضرت شاہ صاحب کا کنبہ

حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے اکابر و اقرباء میں مشائخ و علماء اور رجال مشہور کی اتنی کثرت ہے کہ ان سب کو سمیٹنے کے لئے ایک الگ جلد میں حضرت شاہ صاحبؒ کے جد امجد آپ کے خاندان اور کشمیر کے ہزاروں مسعودیوں کے جد امجد حضرت الشیخ بابا مسعود زوریؒ کا مختصر تذکرہ شامل کر دیں اور آپ کی اولاد کی مختلف شاخوں میں سے جو حضرات علمی اور عملی کمالات میں مشاہیر ہو کر رہے ہیں ان کے حالات کی تھوڑی سی جھلک اس ضمن میں شامل کتاب کر دیں حضرت شاہ صاحبؒ کے بزرگوار دادا صاحبؒ قاضی شاہ عبدالکریم کا تذکرہ بھی اسی تہہ میں ہی آئے گا۔ البتہ آپ کے والد ماجد مولینا محمد معظم شاہ صاحبؒ کا تذکرہ جو قدرے تفصیل کا متقاضی ہے شاہ صاحبؒ کے اقرباء و اولاد کے تذکرے کے ساتھ ساتھ کر دینا بر محل محسوس ہوتا ہے۔

والد ماجد..... کتاب ہذا کے مختلف ابواب و فصول میں شاہ صاحبؒ کے والد گرامی کا جو حال بیان ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولوی پیر محمد معظم شاہ صاحبؒ، قاضی شاہ عبدالکبیر صاحبؒ کے چھ فرزندوں میں سے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ آپ قریب ۱۲۵۰ھ میں یا اس سے بھی کچھ قبل وادی نلیم کے ایک گاؤں کوٹن میں پیدا ہوئے۔ ابھی دو سال کو بھی نہ پہنچے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا خاندانی روایات میں ہے کہ وفات کے وقت باپ نے اس ننھی سی جان کو اپنے سینے سے پٹا کر دیر تک آنکھیں بند رکھیں اور نہ جانے کیا کیا دعائیں دیتے رہے اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی طرح چھوٹے معظم کی پرورش بھی موضع لوات میں اپنے قریبی رشتہ داروں نے کی۔ ابتدائی تعلیم بھی لوات ہی میں حاصل کی اور اپنے قبیلہ کے دستور کے مطابق اونچی تعلیم کے لئے ضلع ہزارہ کے عربی مدارس میں جا کر داخل ہو گئے۔ وہاں کے نصاب کی تکمیل کے بعد واپس لوات آ گئے۔ موضع دودھوان (کپواڑہ) کے پیر سیف اللہ شاہ کی دختر سے شادی کی اور اہلیہ محترمہ کو بھی لوات لے گئے اور صاحبؒ اولاد ہو جانے کے بعد بھی مزید برسوں تک لوات میں مقیم رہے مگر چونکہ اپنا ازادی صلیبہ دونوں کے اجداد کا وطن لولاب تھا اس لئے صاحبؒ عیال ہو جانے کے بعد آپ نے وادی نلیم کو ترک کر کے وادی لولاب میں منتقل ہونے کا عزم کر لیا اور کچھ اپنی کوششوں سے اور کچھ اپنے سرال والوں کی مساعی جمیلہ سے قریب ۱۳۰۰ھ میں لولاب کے موضع ورنو میں وہ گھر بنالیا جو اب قریب ایک سو سال سے، پہلے آپ کا اور اب آپ کی ذریعات کا مسکن چلا آ رہا ہے۔ جب

آپ دادی سلیم میں تھے تب بھی اور لولاب سے چلے آنے پر بھی تبلیغ دین، وعظ و تذکیر، فتویٰ نویسی اور تعلیم و تدریس کے ساتھ پیری مریدی کے لوازمات کی انجام دہی آپ کا محبوب مشغلہ حیات رہا۔ اس زمانہ میں ڈوگرہ حکومت عوام کی بیداری کو اپنے وجود کے لئے خطرناک تصور کرتی تھی اور اس نے ہر قسم کی تقریر اور عوام سے خطاب کی ممانعت کر رکھی تھی بڑی مشکل سے صرف چند ایک ایسے علماء ہی دین کی تبلیغ کر سکتے تھے جن کے پاس حکومت کا تحریری اجازت نامہ ہوتا ہے اس لئے مولینا معظم صاحب نے بھی مہاراجہ رنبیر سنگھ سے اجازت وعظ خوانی حاصل کر رکھا تھا۔ اور پولیس کی مداخلت کے بغیر کھلے بندوں تبلیغ اسلام کا فرض انجام دیتے تھے۔ ان مشاغل سے بچے ہوئے اوقات کو آپ گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر ذکر الہی میں صرف کرتے تھے آپ کی عبادت و ریاضت اور تہجد کی پابندی ضرب المثل تھی۔ کشمیر کے اہل علم کے ہاں آپ کا شمار دانشمندان وقت میں ہوتا تھا آپ فارسی زبان کی نثر میں صاحب طرز محرر اور علم میں قادر الکلام شاعر تھے۔ طویل عمر کے ساتھ ساتھ آپ قابل رشک صحت کے مالک تھے۔ حضرت شاہ صاحب کی والدہ ماجدہ کی وفات کے بعد دروتجائی سے تنگ آ کر جب آپ نے دوسرا نکاح کیا تو اس وقت آپ کی عمر نوے سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اس عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ساتواں فرزند عطا کیا جو بحمد اللہ ابھی تک بقید حیات ہے۔ مولینا معظم صاحب کو دو قابل ترین فرزندوں مولوی حسین شاہ اور حضرت شاہ صاحب کی نقل از وقت وفات کے صدقات برداشت کرنے پڑے۔ حضرت شاہ صاحب کے انتقال کے بعد آپ مزید کوئی آٹھ نو سال زندہ رہ کر ایک سو دس سال کی عمر پا کر انتقال کر گئے اور اپنی مسجد کے مشرق کی طرف بلند ٹیلے پر مدفون ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ و برد مضجعہ۔

الاخوان:..... حضرت شاہ صاحب کے والد ماجد مولینا معظم صاحب کے سات صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں تھیں۔ صاحبزادوں کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مولینا یحییٰ شاہ، حضرت مولینا محمد انور شاہ، مولینا عبداللہ شاہ، مولینا سلیمان شاہ، پیر محمد نظام الدین شاہ، مولینا سیف اللہ شاہ اور پیر محمد شاہ

مولینا معظم صاحب کے ان سات فرزندوں میں سے پہلے چھ صاحب انتقال کر گئے ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم، والدین کی حسن تربیت، تعلیم اور دعاؤں کی برکت سے یہ بھائی چندے آفتاب و چندے مہتاب تھے اپنی صورت و سیرت اور سلیقہ ہر صفت میں ابنائے زمانہ سے ممتاز تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے علوم کی تکمیل حضرت شاہ صاحب کے سوا صرف مرحوم مولینا سیف اللہ شاہ نے کی تھی۔ مگر دیکھنے اور برتنے میں ان میں سے ہر ایک عالم دین ثابت ہوتا تھا۔

(۱) مولینا یسین شاہ: عمر میں سب سے بڑے تھے بڑے ذکی، فہیم، عالم اور شاعر تھے۔
 ۱۹۰۰ء میں جبکہ آپ صرف ۳۳ سال کے تھے۔ ان کا اچانک انتقال ہو گیا اور اپنے پیچھے
 ۱۳۲۰ھ کوئی اولاد بھی نہ چھوڑی۔ حضرت شاہ صاحبؒ ان دنوں مدرسہ امینیہ دہلی میں صدر مدرس تھے اس
 حادثہ جانکاہ کی وجہ سے کشمیر آ کر مدت تک غزوہ والدین کی تسکین قلب کے لئے ٹھہرے رہے۔
 (۲) خود صاحبؒ تذکرہ - حضرت شاہ صاحبؒ

(۳) مولینا عبداللہ شاہ: حضرت معظم صاحبؒ نے اپنی جدت پسندی کی وجہ سے آپ کا
 پیغام بسم اللہ شاہ رکھا تھا مگر جوان ہو کر حضرت شاہ صاحبؒ کے مشورے سے آپ عبداللہ شاہ کے
 ہاں سے موسوم ہوئے آپ بھی انتہائی ذہین تھے اور اپنے وقت کے ممتاز ترین طبیب حاذق تھے اللہ
 تعالیٰ نے آپ کو دست شفا ارزانی کر رکھا تھا۔ آپ صرف نبض سے (بلکہ اکثر و بیشتر نظر ہی سے)
 مرض کی جو تشخیص کرتے وہ ہو بہو ایکسرے (XRAY) کے مطابق ہوتی تھی ان کی غیر معمولی ذہانت
 اور تشخیص امراض آج بھی ضلع بارہ مولہ میں زبان زد خاص و عام ہے اور عجب تر آنکہ طب یونانی کی
 تعلیم و تربیت آپ نے باضابطہ کسی سے بھی نہیں لی تھی، جو کچھ بھی نہ تھا ذاتی اور تفریح مطالعہ پر مبنی
 تھا۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

آپ فارسی زبان کے شاعر بھی تھے بعض شرعی مسائل کو نظم کیا تھا۔ طبابت سے بچا ہوا وقت خدا
 تعالیٰ کی یاد اور گوشہ نشینی میں بسر کرتے تھے۔ آپ کے اکلوتے فرزند پیر محمد سعید شاہ صاحبؒ علم و عمل
 اور طباعت غرضیکہ ہر کام میں آپ کے مکمل جانشین ہیں۔ اور بقید حیات ہیں۔

(۶۳) مولینا سلیمان شاہ اور مولینا سیف اللہ شاہ: مولینا سلیمان شاہ کو عربی،
 فارسی اور اردو زبانوں پر خاص دسترس تھی آپ نے اور مولینا سیف اللہ شاہ نے تحریک آزادی کشمیر
 کے اولین دور میں عوام کو بیدار کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔ ۱۹۳۱ء میں سرینگر سے سیاسی تحریک کا جو
 نعرہ بلند ہوا اس سے دیہاتی علاقے ابتداء میں کم سے کم متاثر ہوئے لیکن کامرانج لولائ اور
 ہندوارہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے برادران مولینا سلیمان شاہ و مولینا سیف اللہ شاہ صاحبؒ
 جب میدان عمل میں نکل آئے تو تحریک نے بے پناہ ہنگامے کی صورت اختیار کر لی۔ اس کا سبب
 یہ تھا کہ ان علاقوں میں ان حضرات کا ذکر اور عقیدت پہلے سے موجود تھی اس لئے ان کی زبان سے
 نئی تحریک کو عوام نے پورے اعتماد اور جوش کے ساتھ یک دم قبول کر لیا۔ حکومت نے لوگوں پر سخت
 تشدد کیا۔ پولیس نے ہندوارہ میں نماز جماعہ پڑھکر نکلتے ہوئے ہجوم پر گولیاں چلائیں جس سے
 درجنوں شہید ہوئے اور زخمیوں کا شمار ہی نہیں مولینا سلیمان شاہ، مولینا سیف اللہ شاہ اور ان کے

رفیق حاجی عبدالغفار، مفتی محمد شاہ تار ت پوری ماسٹر غلام حسن مخدومی، خولجہ خستہ لون و ہندواری اور غلام قادر وغیرہ کو تو طویل قید و بند اور بڑے بڑے جرمانوں کی سزائیں دی گئیں۔

یہ ماہ جنوری اور فروری ۱۹۳۲ء کے واقعات ہیں کہ جب کشمیر کی ڈوگرہ حکومت نے علاقہ ہندوارہ میں فوج بھیج کر مولینا سیف اللہ شاہ اور سلیمان شاہ کو گرفتار کیا۔ اور الزام یہ لگایا کہ ان دونوں بھائیوں نے کامراج میں اپنی حکومت قائم کر کے مولینا سیف اللہ شاہ کو حاکم اعلیٰ اور سلیمان شاہ کو چیف جسٹس بنا رکھا ہے۔ فوج نے دہشت گردی کے بعد دونوں کو گرفتار کر کے پولیس کے ہاتھوں بہت سی تکالیف کا ہدف بنانے کے بعد کئی دنوں تک برف اور کیچڑ بھرے راستوں سے پیدل چل کر سنٹرل جیل سرینگر پہنچا کر بند کر دیا۔ یہ سزائیں دونوں بزرگوں نہایت محبت استغفار اور خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیں بزمانہ اسارت جیل کے سینکڑوں قیدیوں کو ان کے عملی اور روحانی فیوض حاصل ہوتے رہے۔ رہائی کے بعد بھی عوامی تحریک میں دونوں بھائیوں کا رول بہت نمایاں رہا۔ مسلم کانفرنس قائم کرنے میں بھی دونوں بھائی دوسرے سیاسی رہنماؤں کے دوش بدوش رہے۔ اپنے والد ماجد مولینا معظم صاحب کی وفات کے چند سال بعد مولینا سلیمان شاہ انتقال کر گئے۔ آپ کے چار فرزند ہیں (۱) مولینا عزیز الدین شاہ (۲) مولوی احمد سعید شاہ (۳) مولوی عبدالرشید شاہ اور (۴) مولوی عبدالمجید شاہ چاروں نے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی ہے خاص کر مولوی عبدالمجید شاہ نے کشمیر یونیورسٹی سے عربی زبان میں مولوی فاضل کی ڈگری حاصل کی ہے اور اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح کشمیر کے محکمہ تعلیم میں خدمات انجام دیتے ہیں۔

مولینا سیف اللہ شاہ کے سیاسی کارناموں کا تذکرہ اوپر آچکا آپ اپنے علم و عمل کے لئے بھی مرغی عام تھے آپ فاضل دیوبند، حضرت شاہ صاحب کے شاگرد اور دارالعلوم دیوبند میں میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ صاحب مرحوم کے ہمدرس تھے دنوں نے ایک ہی سال سندت حاصل کی تھیں لولات اور ماحقہ علاقوں میں آپ کے عقیدت مندوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ۱۲۷ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو آپ وفات پا گئے۔ آپ نے دو فرزند پیچھے چھوڑے ہیں۔ آپ کے بڑے فرزند پیر شریف الدین صاحب ہیں۔

(۷) پیر محمد شاہ: آپ حضرت شاہ صاحب کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں آپ نے درنو کو چھوڑ کر درگولہ (کپواڑہ) میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ اور تجارت کا شغل اختیار کر رکھا ہے۔

اولاد ناکبار ناس:..... حضرت شاہ صاحب کی اولاد ذکور و اناث کل پانچ تھے۔ تین صاحب زادے اور دو صاحب زادیاں۔ ان سب سے بڑی صاحب زادی عابدہ خاتون تھیں۔ یہ اور بچھے صاحب زادے محمد اکبر شاہ دونوں حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد جلد ہی انتقال

کر گئے۔ اور صرف دو صاحب زادے اور ایک صاحب زادی زندہ رہے۔ جو اب تک خدا سلامت رکھے زندہ ہیں۔

یہ ہیں: (۱) مولینا حافظ محمد ازہر شاہ قیصر (۲) مولینا محمد انظر شاہ (۳) محترمہ راشدہ خاتون۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات کے وقت یہ تینوں نو عمر اور نابالغ تھے، سوچھ بوجھ اور رشد کی عمر کو بھی کوئی نہ پہنچا تھا۔ اور نہ ہی کسی کی تعلیم آپ کے سامنے کسی قابل لحاظ درجے تک پہنچ پائی تھی۔

مولینا حافظ محمد ازہر شاہ قیصر:..... آپ حضرت شاہ صاحب کے بڑے فرزند ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات کے وقت آپ کم سن تھے۔ یتیمانہ حالات و مشکلات کو ہمت سے برداشت کرتے ہوئے آپ نے عربی اور فارسی کی تعلیم ذاتی مطالعہ سے حاصل کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہوائی کوائف کی وجہ سے آپ کسی قاعدے اور ڈھنگ سے تعلیم کی تکمیل تو نہیں کر سکتے تھے۔ بہم موروٹی ذہانت و فطانت اور اپنے مطالعہ اور محنت سے اتنی عمدہ قابلیت حاصل کر لی ہے کہ ایک سچ انظر عالم کی حیثیت میں علوم ضروریہ کی کتب زبان ہائے عربی اور فارسی وغیرہ سے پورا استفادہ کر سکتے ہیں اردو زبان جو آپ کو مادری دولت ہے اس کے نظم و نثر کے ساتھ اور اس کے اب اور صحافت کے ساتھ آپ کو غیر معمولی اور فطری لگاؤ ہے۔ گزشتہ چالیس سال سے آپ کا رجم قلم اس میدان میں جولانیاں دکھاتا رہا ہے ابتداء میں اخبار انور دیوبند اخبار استقلال دیوبند، رسالہ خالد دیوبند، اخبار صداقت سہارن پور، اخبار زمیندار لاہور اور اخبار شہباز لاہور کے صفحات آپ کے رشحات قلم کے لئے وقف رہا کرتے تھے۔ تقسیم ہند سے پہلے کے زمانے میں آپ کے جو بے شمار ادبی اور سیاسی مضامین برصغیر کے مشہور اخبارات اور اونچے معیار کے جرائد و رسائل میں چھپ رہے وہ اگر جمع کئے جائیں تو کئی ضخیم جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں

ادارت جریدہ دارالعلوم:..... تقسیم ملک کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند کے ترجمان خاص اہتمام دارالعلوم کی ادارت کی ذمہ داریاں انجام دے رہے ہیں۔ گزشتہ ایک ربع صدی سے رسالہ دارالعلوم کی ادارت کے گرانبار فرائض کامیابی سے سرانجام دیئے کے علاوہ آپ تصنیف و تالیف کے شغل سے بھی غافل نہیں ہیں۔ مزمن علیل اور عدیم الفرصت ہونے کے باوجود کچھ نہ کہہ کر تے ہی رہتے ہیں۔ کتاب حیات انور تو آپ کی بہت پرانی تالیفات میں سے ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حالات میں صدیق اکبر نام سے بھی آپ کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے اور آپ کی ایک تازہ تصنیف یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ تھوڑی مدت پہلے شائع ہوئی ہے جو اپنی نوعیت

کی خاص چیز ہے ان کتابوں کے علاوہ بھی اور بہت سی گر انقدر تخلیقات غیر مرتب و غیر مکمل ہیں۔
اپنی اشاعت کے لئے موافق حالات اور آپ کی فرصت کی منتظر ہیں۔

مولینا ازہر صاحب نے یکے بعد دیگرے دو نکاح کئے تھے دونوں سے آپ کو خدا نے بابرکت
اولاد عطا فرمائی ہے۔ آپ کے چار فرزند اور تین صاحب زادیاں ہیں۔ صاحب زادوں کے نام یہ
ہیں: محمد اطہر، محمد راحت، محمد نسیم اور محمد وجاہت۔

مولینا محمد انظر شاہ صاحب:..... آپ اس وقت دارالعلوم کے اساتذہ میں سے ایک اہم
مدرس اور اس کے ناظم تعلیم ہیں۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے ہی علوم کی تکمیل کی ہے اور دورِ تبحر
کی صبر آزما ابتلا و آزمائشوں سے گزر کر اپنی شخصیت کو نکھارا ہے۔ آپ آج کل دارالعلوم دیوبند میں
اپنی خداداد صلاحیتوں کے صدقے میں طبقہ اعلیٰ کے اساتذہ کی صف میں شمار ہوتے ہیں۔ فہم
حدیث اور تفسیر کے لائق مدرس اور کامیاب مقرر ہونے کے علاوہ آپ دارالعلوم کے موجودہ اساتذہ
میں ایک فاضل محقق و مصنف مانے جاتے ہیں آپ کی کئی کتابیں منصہ شہود پر آ کر مقبول ہو چکی
ہیں۔ جن میں تذکرہ الاعزاز اور شرح اسماء حسنی آپ کی ابتدائی مشق کی چیزیں تھیں۔ اب آپ کا
تفسیر ابن کثیر پر ایک بسیط حاشیہ بھی منظر عام پر آیا ہے جو آپ کا علمی کارنامہ ہے۔ آپ علم و عمل کی
ترقی کے راستہ پر جس رفتار سے گامزن ہیں اس کو دیکھ کر امید ہے کہ وقت آنے پر آپ اپنے نقیب
الظہیر والد کے قدم بقدم جادو پیدا دکھائی دیں گے اور اس مقولہ کے مصداق ثابت ہوں گے۔

اذا مات مناسید قام سید

فتو لهما قال الکرام فعول

مولینا انظر شاہ صاحب کی اولاد میں سے صاحبزادہ صرف ایک احمد میاں ہیں اور پانچ
صاحب زادیاں ہیں۔

خانوادہ مولینا سید احمد رضا بجنوری:..... حضرت شاہ صاحب کی سب سے چھوٹی
صاحب زادی محترمہ راشدہ خاتون جو حضرت شاہ صاحب کی وفات کے وقت بہت چھوٹی اور نو
عمر تھیں اور جن کو صحیح تعلیم اور بہترین پرورش عطا کرنے میں حضرت شاہ صاحب کی زوجہ محترمہ نے
کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ فرمایا۔ جب شادی کی عمر کو پہنچیں تو حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ میں
سے ایک فاضل ہستی مولینا سید احمد رضا صاحب بجنوری کے ساتھ آپ کا رشتہ طے ہوا۔ شاہ
صاحب کے رفیق اعظم علامہ شبیر احمد عثمانی نے خطبہ نکاح پڑھا۔

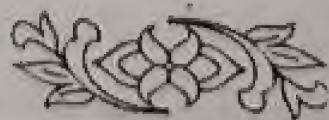
مولانا سید احمد رضا صاحب موصوف مشہور اہل قلم اور حضرات شاہ صاحب کے لائق و فائق
عالمہ میں سے ہیں اور آپ صحیح البخاری کی مفصل شرح انوار الباری کے مصنف ہیں جس کی ۱۳
جلدیں چھپ چکی ہیں۔

افتاد و بنابر..... مولانا سید احمد رضا صاحب سے علیا حضرت راشدہ خاتون صلیبہ کے ہاں پانچ
فرزند محمد ارشد رضا، محمد اسعد رضا، محمد امجد رضا، محمد امجد رضا، محمد امجد رضا اور چار بچیاں ہیں۔
صورت و سیرت اور ذہانت و فطانت میں یہ سب لوگ حضرت شاہ صاحب کی خصوصیات کے
وارث ہیں خاص کر بڑے فرزند مولوی محمد ارشد رضا جو فاضل دیوبند ہو جانے کے بعد حجاز چلے گئے
اور مدینہ طیبہ کی زمانہ حال میں قائم شدہ عدیم النظیر اسلامی یونیورسٹی جامعہ ازہر سے بھی تکمیل کی سند
مائل کی۔

دیوبند، مدینہ منورہ اور الازہر قاہرہ کے گلستان ہائے علوم کے رنگارنگ پھولوں سے اپنا دامن
بہر لینے کے بعد مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے علوم و فیوض کے چشمے اگر مولوی ارشد رضا کے دہان
سے بہنے لگ جائیں تو عین تقاضا فطرت ہو گا نہ کہ مقام حیرت یہی وجہ ہے کہ علمی حلقوں میں اب
آپ کی ذات سے بڑی امیدیں وابستہ ہو رہی ہیں۔

آپ کے باقی برادران بھی اپنی ذہانت کے لحاظ سے مستقبل کے چمکتے ہوئے ستارے دکھائی
دیتے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

”این خانہ ہمہ آفتابست“



مقالات ومضامین

نور الانور

استاذ الامام محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ ضریح
از حکیم الاسلام حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی مہتمم دارالعلوم

حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب حضرت مولینا حافظ محمد احمد صاحب کے فرزند ارجمند اور
بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولینا محمد قاسم نانوتوی کے پوتے ہیں۔ آپ کا سال ولادت ۱۲۵۵ھ
۱۲۲۲ھ میں آپ دارالعلوم کے ابتدائی درجات میں داخل ہوئے اور پندرہ سال میں دارالعلوم
میں پڑھائے جانے والے تمام علوم کی تکمیل کر کے ۱۳۳۳ھ میں سند فضیلت حاصل کر لی تحصیل تعلیم
کے بعد عملی زندگی کا آغاز دارالعلوم میں بحیثیت ایک مدرس کے کیا۔ ۱۳۴۳ھ میں اس عظیم ادارے کے
نائب مہتمم کے منصب پر فائز ہوئے اور اپنے بیشتر مہتمم مولینا حبیب الرحمن صاحب عثمانی کی
وفات کے بعد ۱۳۴۸ھ میں دارالعلوم کے اہتمام کی تمام ذمہ داریاں آپ کے کاندھوں پر آئیں جو
قریباً نصف صدی سے آپ کامیابی سے انجام دے رہے ہیں۔ یوں تو دارالعلوم دیوبند نے بڑے
بڑے ثقہ بزرگوں کو مہتمم کی مسند پر رونق افروز دیکھا ہے۔ حاجی سید محمد عابد صاحب، مولینا ربیع
الدین صاحب، حاجی سید فضل حق صاحب، مولینا محمد منیر صاحب، مولینا حافظ محمد احمد صاحب اور
مولینا حبیب الرحمن صاحب (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) سب کے سب اپنے اپنے وقت میں دارالعلوم
کے عظیم معماروں میں سے تھے لیکن جو ترقی دارالعلوم کو مولینا قاری محمد طیب صاحب کے زمانہ
اہتمام میں نصیب ہوئی ہے۔ اس سے پہلے دور میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ قطعی دور اہتمام میں
دارالعلوم نے ترقی کی جو منازل طے کی ہیں انکا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جب
حضرت قاری صاحب نے اہتمام کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لی تو دارالعلوم کا سالانہ میزانیہ مدخل
ومصارف پچاس ہزار روپے سے زیادہ نہ تھا مگر آج وہی سالانہ بجٹ ۲۷ لاکھ روپے سے متجاوز ہو چکا
ہے۔ دارالعلوم میں اساتذہ اور طلباء کی تعداد بھی آپ کے دور میں دو گنی سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اور
دارالعلوم کی بہت سی عالیشان تعمیرات بھی اس دور میں بن کر تیار ہوئی ہیں جن پر لاکھوں روپیہ کے
اخراجات آئے ہیں مدرسے کے نصاب تعلیم کتب خانہ اور دوسرے شعبوں میں بھی ترقی کی بہت سی

میں ملے ہوئی ہیں حالانکہ قاری صاحب کے اہتمام کا دور مشکلات سے بھرا ہوا دور تھا۔ اس میں سرسبز ہوا بہت سے وہ صوبے جو دارالعلوم کے لئے مالی امداد کا کھیت تھے جدا ہو گئے ہندوستان ملک تقسیم ہوا رہی ہے ملک کی تقسیم کا غصہ اس پر اتارا جاتا رہا اور ماحول میں امن و سلامتی کے میں جو مسلم آبادی بچ رہی ہے اس کی معاشی مشکلات بجائے خود ایک مسئلہ بن گئیں فرقہ وارانہ تعصبات کی طوفانی لہر ان کی وجہ سے اس کے اثر سے دارالعلوم کا گلشن بھی مرجھاتے مرجھاتے مشکل سے ہی پختا رہا لیکن اہم ہمایاں انھیں جن کے اثر سے دارالعلوم کا گلشن بھی مرجھاتے مرجھاتے مشکل سے ہی پختا رہا لیکن ہری محمد طیب صاحب کا پختہ عزم صبر و توکل مقصد عظیم کے لئے بے پناہ ایثار و قربانی اور اس پر مستراح حسن تدبیر اور بے پایاں خلوص ایک ایسا بادبان ثابت ہوا جس کے سہارے الحمد للہ دارالعلوم کا پختہ منزل بمنزل ساحل مراو کی طرف جا رہا ہے۔

سفینہ برگ گل بنالے گا قافلہ مور ناتواں کا

ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

آپ کی مساعی کا تازہ قدم یہ ہے کہ آپ ۱۹۷۷ء میں دارالعلوم کے قیام کی ایک صد و چہارہ سال تقریب منار ہے ہیں جو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس ادارہ کو نفاہری و باطنی ہر لحاظ سے بام عروج پر پہنچانے کا موجب ثابت ہوگی۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

حضرت قاری صاحب ادارہ دارالعلوم کی امداد و اعانت کے حصول اور اس سے بھی زیادہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور سر بلندی کے لئے لازمی آرام تک ترک کر کے اپنی صحت سے بے پروا ہو کر دور دراز ملکوں کے سفر پر جاتے ہیں یورپ عربستان، افریقہ، افغانستان اور پاکستان ہر جگہ پہنچتے ہیں۔ ہندوستان کے اندر تو آپ سال کا اکثر حصہ دورے پر ہی رہتے ہیں جنوب سے شمال تک اور مشرق سے مغرب تک آپ کی تنگ و دو پیہم رہتی ہے مسلمانوں کے پرسنل لا کے تحفظ کی مہم نے آپ کے لئے آرام و سکون اور بھی مشکل کر ڈالا ہے مگر یہ آپ کی قوت ایمانی اور اولوالعزمانہ محبت ہے جس کی وجہ سے ضعیف و پیروی اور بدنی نحافت پر آپ غلبہ حاصل کر کے چلے جا رہے ہیں۔

ہوا ہو گوشت و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

مولینا طیب صاحب قریباً ڈیڑھ سو کتابوں کے مصنف ہیں۔ چند ایک کے نام یہ ہیں۔

- (۱)۔ انتخاب فی الاسلام۔ (۲)۔ مشاہیر امت۔ (۳)۔ کلمات طیبات۔ (۴)۔ الطیب الثمر
- فی مسئلۃ القضاء القدر۔ (۵)۔ سائنس اور اسلام۔ (۶)۔ تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام۔ (۷)۔
- مسئلہ زبان اور ہندوستان۔ (۸)۔ دین و سیاست۔ (۹)۔ اسباب عروج و زوال اقوام۔ (۱۰)۔

اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام۔ (۱۱)۔ الاجتہاد و تقلید۔ (۱۲)۔ اصول و دعوت اسلام۔ (۱۳)۔
 اسلامی مساوات۔ (۱۴)۔ تفسیر سورہ فیل۔ (۱۵)۔ فطری حکومت۔
 اور اسی قسم کے دیگر موضوعات پر آپ کے قلم نے اپنی جولانیاں دکھائی ہیں اور دور حاضر کی
 تشکیکات و تلبیسات کے شافی اور کافی جوابات فراہم کر دیئے ہیں۔ آپ کا انداز امام غزالی پر
 ہے جس موضوع پر قلم اٹھاتے عقلی اور نقلی دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں۔
 مولینا طیب صاحب کو شعر و سخن سے بھی مناسبت ہے عرفان عاف کے نام سے آپ کا ایک
 مجموعہ کلام بھی منصفہ شہود پر آیا ہے، مگر آپ کی مصروفیات میں سخن وری کی فرصت کہاں اور یوں بھی
 آپ کا پایہ شعر و شاعری کی دنیا سے بہت بلند ہے اور آپ حضرات امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس
 ارشاد کے مصداق ہیں۔

ولولا الشعر بالعلماء يدري

لكنت اليوم اشعر من لبيد

(اگر شاعری علماء کی شان سے پست درجے کی چیز نہ ہوتی تو میں آج لبید سے بڑھکر شاعر ہوتا)

مولینا قاری طیب حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشد و اخس تلامذہ میں سے ہیں۔ آپ کو مولینا انور
 کشمیریؒ کے ساتھ وہی تعلق ہے جو خلاصہ ابن قیمؒ کو شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ حراثیؒ کے ساتھ تھا۔
 حضرت شاہ صاحبؒ کی صحبت میں مولینا طیب صاحبؒ نے طالب علمی اور اس کے بعد کے دور میں
 دوسرے تلامذہ کی نسبت رہنے کا زیادہ موقع پایا ہے اس لئے ان کے علوم و کمالات سے غیر معمولی
 استفادہ فرمایا ہے۔ علم سلوک میں حضرت قاری صاحبؒ کو حضرت شاہ صاحبؒ کے علاوہ حکیم الامت
 مولینا اشرف علی تھانویؒ سے بھی رابطہ تھا جن کے ہاتھ پر آپ نے ۳۵۰ احادیث میں بیعت کی تھی۔

الغرض مولینا طیب صاحبؒ مشہور و معروف شخصیت کے عالم دین میں آپ اپنے حسب و نسب
 کے لحاظ سے ممتاز علم و عمل کے لحاظ سے یکتا بیدار مغز فلسفی شرافت و علم کے مجسمہ استقلال و اخلاص
 کے نمونہ کامل اور ورع و تقویٰ کا چلتا پھرتا پیکر ہیں۔ اس لئے زمانہ حاضر میں مسلمانان ہند کے
 لئے آپ کا وجود مختنمات میں سے ہے۔

حضرت قاری صاحبؒ تحریکِ نعمت اور ادائے شکر کے طور پر ہمیشہ اپنے ہر کمال کو اپنے محبوب
 معلم و مرشد حضرت شاہ صاحبؒ کے فیض کی طرف منسوب فرماتے ہیں اور ہر مجلس میں حضرت شاہ
 صاحبؒ کے فضائل علمیہ کے بیان میں رطب اللسان رہتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا تذکرہ حیات انور جب تیار ہوا تھا تو کتاب کے مرتب مولینا حافظ محمد

از ہر شاہ صاحب قیصر کی استدعا پر حضرت مولینا محمد طیب صاحب نے بھی ایک مقالہ مجاہد لکھا تھا جو نور الانور کے عنوان سے زینت کتاب ہے اس مضمون میں آپ نے ساکر کوگاگر میں بند رہنے کی کامیاب کوشش فرمائی ہے اور اپنے ذاتی و نیاز مند اہل تعلقات اور تجربات کی روشنی میں نہایت فصیح و بلیغ انداز میں اتنا کچھ فرما گئے ہیں کہ جس کو اگر پھیلا یا جائے تو ایک کتاب کی صورت اختیار کرے۔ اہم نے گزشتہ اوراق میں اس مقالہ کے بعض اقتباسات ہدیہ ناظرین کئے ہیں لیکن مقالہ کے حسن و جامعیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو یہاں پر من و عن دہرایا جائے۔ گوئد

☆☆☆☆☆☆

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى

دارالعلوم دیوبند نے اپنی نوے سالہ زندگی ۱ میں علم و فضل کے ایسے ایسے رجال پیدا کئے کہ ان آخر کی صدیوں میں دور دور تک تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے عاجز نظر آتی ہے، ہر ایک اپنے فن، کردار سیرت اور بلند ذوق کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہی تھا۔ جو حضرات نصف صدی پیشتر گزر چکے ہیں ان سے شاید نئی دنیا واقف نہ ہو اور ممکن ہے کہ تعارف کرانے کے باوجود وہ ان سے تعارف نہ ہو سکے۔ لیکن ماضی قریب کے مشاہیر دیوبند کی ایک بڑی جماعت ہے جو اپنے شہرت عامہ کے لحاظ سے محتاج تعارف نہیں، اس کے علم و سیرت کی مثالیں بھی دور دور تک نہیں ملتیں۔

حضرت شیخ الہند مولینا محمود حسن قدس سرہ حضرت مولینا احمد حسن محدث امر وہی، حکیم الامت مولینا اشرف علی تھانوی، حضرت مولینا عبدالحق مفسر تفسیر حقانی، حضرت مولینا عبید اللہ سندھی، حضرت مولینا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولینا شبیر احمد عثمانی وغیرہ حضرات اپنے شہرہ آفاق علم و فضل اور کردار و سیرت کے لحاظ سے عزت و شہرت کی اونچی سطح پر پہنچے ہیں قلم و زبان انہیں عام طور پر جانتے پہنچاتے ہیں پھر ایسی تعداد کی تو کوئی شمار نہیں جو مشاہیر میں نہیں لیکن اپنی مضبوط علمی و اخلاقی سیرت کے ساتھ وہ زمینوں سے زیادہ آسمانوں میں مشہور ہیں اور وہاں القاب سے یاد کئے جاتے ہیں اور زمین کے کتنے ہی خطوں کے ایمانوں کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

بہر حال دارالعلوم دیوبند ایک شجرہ طیبہ ہے جس کے خوش ذائقہ اور خوشبودار پھل پھول سے انیسائے اسلام کا دل و دماغ معطر اور پر کیف بنا ہوا ہے اور اس آخری صدی میں اس کی جماعت مجموعی حیثیت سے انھی تو س نے مجددانہ اور اسلامی علم و عمل کو غیر اسلامی اثرات کی امیزشوں اور

۱ اس وقت تک اس میں لگ بھگ ۲۵ سال کا مزید اضافہ ہوا ہے کیونکہ زیر نظر مقالہ ۱۰ ذی قعدہ ۱۳۷۳ھ کو لکھا گیا ہے۔ گوئد و علی

شرک و بدعات کے لوٹ سے پاک کر کے نکھار دیا اور ستھرا کر کے دنیا کے آگے رکھ دیا۔

دیوبند کی ان آفتاب و ماہتاب ہستیوں میں نہایت تیز اور شفاف روشنی کا ایک جلیل القدر ستارہ حضرت الاستاذ علامہ دہر فرید عصر، حافظ الدین، محدث وقت مولینا محمد انور شاہ لکھنوی، مدرسین دارالعلوم دیوبند کی مبارک ہستی بھی ہے جو مجموعی حیثیت سے آیۃ من آیات اللہ اور اپنے غیر معمولی علم و فضل کے لحاظ سے دین کا ایک روشن منارہ تھے۔ اور آپ کی ذات بلامباہ نام جلیل، فاضل نبیل، تقی و تقی محدث مفسر و متکلم ادیب و شاعر صوفی صافی اور فانی فی السنۃ ذات تحریر۔

لیس علی اللہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی واحد

دارالعلوم میں آپ ۱۳۱ھ میں داخل ہوئے جبکہ منشی فضل حق دیوبند کا دور اہتمام تھا۔ ۱۳۱۲ھ میں تمام علوم و فنون کی تکمیل سے فارغ ہو کر جبکہ مولینا محمد احمد صاحب کا زمانہ اہتمام تھا۔ یہاں سے واپس ہوئے۔ چند سال مدرسہ امینیہ دہلی میں مسند درس پر متمکن رہے اور وہاں سے اپنے وطن کشمیر تشریف لے گئے وہاں سے بہ نیت ہجرت حجاز مقدس کے قصد سے روانہ ہوئے۔ دیوبند میں اپنے اساتذہ و شیوخ سے ملنے کے لئے اترے۔

آپ کے شیوخ و اساتذہ نے جو آپ کے جوہر و دل کو جانے اور پہچانے ہوئے تھے یہ دیکھتے ہوئے کہ دارالعلوم کی مسند درس کے شایان شان یہ ایک ہستی ہے جسے دارالعلوم نے گویا اپنے لئے پیدا کیا ہے آپ کو دیوبند روک لیا۔ اور آپ نے بھی غایت تواضع و انکسار نفس سے اپنے اساتذہ کی بات اپنی رکھتے ہوئے قیام دیوبند کا ارادہ فرمالیا۔

حضرت ممدوح کے ٹھہرانے سے ابتدائی منصوبہ اور مقصد یہ تھا کہ ترمذی اور بخاری کی شرح حضرت ممدوح سے لکھوائی جائے لیکن عملاً یہ معاملہ آگے نہیں بڑھا جس کی وجہ سے نامعلوم ہیں۔ شاید یہ ہوں کہ درس کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ واللہ اعلم

بہر حال آپ نے باقتبال اکابر دارالعلوم میں درس شروع فرما دیا البتہ غلبہ زہد و قناعت سے مشاہرہ لینے پر راضی نہ ہوئے اور لوجہ اللہ کام شروع کر دیا اس اصرار پر ان کے اکابر نے بھی سکون رضا سے کام لیا اور تنخواہ کا مسئلہ کلیۃً ان ہی کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

لیکن حضرت والد ماجد، حضرت مولینا حافظ محمد احمد صاحب نے اس کے بعد یہ گوارہ نہیں کیا کہ طعام و ضروریات طعام کے مصارف خود ان کے سر ڈالے جائیں اور فرمایا کہ اگر مدرسے سے حضرت ممدوح لینا نہیں چاہتے تو ان کے سر میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

تیسری متعین صورت یہ ہے کہ کھانا میرے ساتھ کھائیں۔ اسے حضرت ممدوح نے منظور فرمایا اور اس طرح تقریباً دس برس تک یہ صورت قائم رہی۔ حضرت والد ماجد علیہ الرحمۃ نے بھی اپنی معروف آبائی اور روایتی مہمان نوازی سے آپ کو مثل اپنے اہلیت کے سمجھا اور نہایت پورے سحران و انساٹ کے ساتھ یہ دور پورا ہوا۔

اس دور میں حضرت مولینا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی حضرت شیخ الہند اور حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے یاد فرمایا۔ اور قیام دیوبند پر مجبور فرمایا۔ ممدوح بھی یہاں رک گئے اور وہ بھی ان پوری مدت میں حضرت والد ماجد ہی کے مہمان رہے۔ یہ دسترخوان بظاہر کھانے کا دسترخوان تھا لیکن حقیقتاً اہل علم و فضل کی ایک پاکیزہ مجلس ہوتی تھی۔ جس میں حضرت والد ماجد قدس سرہ حضرت مولینا صیب الرحمن صاحب قدس سرہ حضرت مولینا انور شاہ صاحب قدس سرہ، حضرت مولینا عبید اللہ سندھی، اور اکثر و بیشتر حضرت مولینا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور متعدد دوسرے کبار اساتذہ و ارا العلوم شریک ہوتے تھے۔ علمی مسائل میں مکالمے ہوتے بحثیں ہوتیں معارف و تحقیق کھلتے اور خصوصیت سے حضرت شاہ صاحب اور مولینا سندھی مختلف علوم و فنون کے کافی دلچسپ مباحث چھیڑتے اور آخر کار بزرگان مجلس کی طرف سے کبھی مزاحی رنگ میں اور کبھی سنجیدہ رنگ میں فیصلے اور مکالمے سنائے جاتے حاضر الوقت خدام و طلبہ کو شاید درس تدریس کی بات سے برہنہ برس میں وہ تحقیقات ہاتھ نہ لگ سکتی تھی جو اس حلقہ طعام میں پکی پکائی ایک دم مل جاتی تھیں ان دونوں بزرگوں میں حاضر الوقت اکابر کے کمال ادب اور احترام کے ساتھ سلسلہ مسائل حق کوئی میں کبھی کوئی ادنیٰ ضحکالال یا تہاون پیدا نہ ہوتا تھا اور ہر ایک دوسرے کے خلاف نہ تھا اور بہت صاف ریمارک کرتا۔ اس طرح کھانے پینے کا یہ دسترخوان مائیدہ علم و فضل بن جاتا اور اس دسترخوان پر صرف بدنی غذا جمع نہ ہوتی تھی۔ بلکہ روحانی غذاؤں کے قسم قسم کے الوان جمع ہونے لگتے تھے۔ اور دسترخوان اس شعر کا مصداق بن جاتا۔

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارو

برنگ اصحاب صورت را بہ بوار باب معنی را

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں غذا کے بارے میں لطافت تھی مگر شوقینی نہ تھی غذاؤں کے نوع اور کھانوں کے الوان کی طرف طبیعت جھکی ہوئی نہ تھی جو مل گیا کھالیا جو آگیا شکر و رضاء ستائے قبول کر لیا میری جدہ محترمہ رحمۃ اللہ علیہا (جن کی مہمان نوازی اپنے دور میں مشہور تھی) اور خود حضرت نانوتوی قدس سرہ نے بھی اس بارہ میں یہ کہہ کر شہادت دی تھی کہ ہماری مہمان

نوازی تو احمد کی والدہ کی بدولت ہے۔

کبھی کبھی حضرت شاہ صاحب سے میری معرفت یہ کہلا کر بھیجتیں کہ حضرت کبھی تو اپنے کسی مرغوب کھانے کی فرمائش کر دیا کیجئے تو مٹاثران لب دلچہ سے جواب دیتے کہ میری طرف سے تمام گزارش کیجئے اور یہ عرض کر دیجئے کہ دسترخوان پر ہمہ نعمت موجود ہوتے ہوئے میں کابے کی فرمائش کروں مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں میری جنت کی نعمتیں یہیں تو نہیں تمام کی جا رہی ہیں۔

قیام دیوبند کی یہ صورت قائم ہو جانے پر حضرت شاہ صاحب نے باشارہ اکابر مدرس و مدرسین مستقل سلسلہ تو جاری فرمایا لیکن ہجرت کی پاک نیت سے دستبردار نہ ہوئے اور برابر حاضری کی بیوی و حرم الہی کا جذبہ آپ کو دیوبند چھوڑنے کی طرف مائل کرتا رہتا تھا۔ جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا اور یہ اکابر باطنی تعبیر اسے نلاتے جاتے لیکن خطرہ انہیں بھی رہتا تھا کہ نہ معلوم کس وقت یہ غلبہ غالب ہو جائے اور دارالعلوم کو ایسی جامع اور مستقبل کی بڑی بڑی امیدوں کی محور ہستی سے دستبردار ہونا پڑ جائے اس لئے یہ خطرات بھی انہیں مستقل جمادینے کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔

آخر کار انہیں پابند بنانے کے لئے ان بزرگوں نے ان کے پیروں میں بیڑی ڈالنے کی تدبیر سوچ لی۔ اور ارادہ کیا کہ حضرت ممدوح کا نکاح کر دیا جائے گو اس سے حضرت ممدوح کو انکار تھا مگر باطنی تدبیر انہیں راضی کر کے گنگوہ کے سادات کے ایک خاندان میں نکاح کر دیا گیا۔ میری دادی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا اور حضرت والد ماجد قدس سرہ نے اس کی کفالت کی اور نکاح کی اس تقریب کو اس طرح انجام دیا۔ جس طرح وہ اپنی اولاد کی کوئی بھاری تقریب کر سکتے تھے۔ بھوپال بارات گئی علماء کی ایک جماعت ساتھ تھی۔ بڑی پر مسرت فضا میں نکاح ہوا۔ دلہن آئی تو حضرت جدہ مرحومہ نے اسی طرح گھر میں اتارا جیسے اپنے گھر کی دلہن اتاری جاسکتی تھی۔ ولیمہ کی لمبی چوڑی دعوت کی اور احقر کے زمانہ مکان کے بالا خانہ پر حضرت شاہ صاحب مع اہلیہ محترمہ فروکش ہوئے۔

اس پر تقریباً ایک دو سال ہی گزرے تھے کہ اولاد کی امید ہوئی ہمارے گھر میں اس کی وہی خوشی تھی جو اپنے گھر میں اہلیت کے اولاد ہونے کی ہوتی ہے۔ اس وقت تک میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ گھر میں عرصہ مدید گزر چکا تھا، کوئی بچہ نہیں تھا جس کی سب کو تمنا تھی اس امید سے کہ حضرت ممدوح کے یہاں بچہ ہونے والا ہے سب گھر والوں کو بالخصوص میری دادی صاحبہ کو بے حد خوشی تھی اور جیسا کہ عورتوں کو قاعدہ ہوتا ہے انہوں نے عقیقہ کی تقریب کا سامان بھی شروع کر دیا تھا کہ اچانک حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کو مشورہ دیا گیا اور ممکن ہے کہ خود ان کے قلب میں ہی یہ داعیہ از خود پیدا ہوا ہو۔ انہوں نے حضرت جدہ مرحومہ سے عرض کیا کہ دس سال تک تو میں تنہا تھا

اب دو سال سے متاثر ہوں اور آپ ہی کے یہاں مقیم ہوں اب اولاد کی امید ہے تو اب میں ایک دورہ کے ساتھ ایک عائلہ کا بار ڈالنے اور ڈالتے رہنے پر شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اجازت دی جائے کہ الگ مکان لیکر رہوں۔ حضرت ممدوحہ اور والد ماجد اس پر راضی نہیں ہوئے تھے لیکن دوسرے اصرار بڑھا تو انہوں نے بادل ناخواستہ اسے قبول فرمایا اور حضرت شاہ صاحب محلہ راجان کے ایک مکان میں فروکش ہو گئے۔

اس صورت واقعہ کے بعد ذمہ داران مدرسہ کے لئے موقع آ گیا کہ وہ تنخواہ لینے کے لئے حضرت ممدوحہ پر اصرار کریں۔ چنانچہ کیا اور تاہل کی زندگی اور اس کے وسیع ہوتے رہنے کی صورت حال کے ماتحت طوعاً و کرہاً ممدوحہ کو بھی یہ اصرار قبول کر کے تنخواہ لینے پر راضی ہو جانا پڑا اور اب ایک گریہ کی طرح ان کی عائلی زندگی کا دور شروع ہو گیا۔

اس مکان کی رہائش کے بعد عزیزم مولوی ازہر شاہ سلمہ کی بہن عابدہ مرحومہ پیدا ہوئی اور پھر میرا ازہر شاہ سلمہ معرض وجود میں آئے تجدد سے تاہل ہوا تھا اور اب تاہل سے عائلی اور خانمانی زندگی کی داغ بیل پڑ گئی۔ اور زندگی کے علاقے ایک ایک کر کے بڑھتے رہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ وہی نکلا جو ایک تدبیر کے اختیار کرنے والے بزرگوں نے سوچا تھا کہ حضرت شاہ صاحب مقید ہو گئے اور ہجرت کے جانے کا وہ جذبہ سست پڑ گیا۔ بالآخر ترک کر دینا پڑا۔ اور باطمینان خاطر دارالعلوم میں مسند نشین درس ہو کر علمی افادات میں مشغول ہو گئے۔ اسی دوران میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے حجاز مقدس جانے کا قصد فرمایا اور شہرت ہوئی کہ حضرت بہ نیت ہجرت تشریف لے جاتے ہیں۔ یہ شہرت تو غلط ثابت ہوئی لیکن تشریف بڑی محقق تھی مگر شیخ زمانہ اور دارالعلوم کے شیخ الحدیث کا دارالعلوم سے جانے کا ارادہ کرنا کوئی معمولی حادثہ نہ تھا زمانہ بھی پر آشوب ہو گیا تھا حضرت کی نسبت برطانوی حکومت کو شکوک و شبہات پیدا ہو چکے تھے اور حضرت شیخ اور دارالعلوم کے انی خاہوں کو ایک تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں گورنمنٹ آپ کو تھام نہ لے اور سب سے بڑا خطرہ دارالعلوم کی کسی فرد فرید شخصیت نمونہ اکابر و اسلام اور یگانہ روز بستی سے محروم ہو جانے کا تھا جو کچھ کم حادثہ نہ تھا لیکن دارالعلوم کے ذمہ دار مبصرین نے حضرت شیخ صاحب کو دارالعلوم میں روک کر پہلے ہی آنے والے خطرات کی روک تھام کر لی اور حضرت شاہ صاحب جیسی یکتائے زمانہ بستی کو دارالعلوم میں لایا رکھا دیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت شیخ کی دارالعلوم سے اس عارضی جدائی اور مخصوص روحانی نکالت سے برائے چندے محرومی کا اثر تو ضرور ہوا لیکن علمی حلقہ کے خلا کا خطرہ رو براہ نہ آ سکا منہ محرومی ہجرتی کو یا موجود تھی اگر شیخ الہند برائے چند سامنے نہ رہے تو شیخ کے مثل سامنے تھے۔

چنانچہ حضرت کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے قائم مقام صدر مدرس کی حیثیت سے درس ترمذی و بخاری کو سنبھال لیا اور علمی پیاسوں کو یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ علم کے بحرِ خار سے محروم ہو گئے ہیں بلکہ انہیں یہ محسوس ہوا کہ اگر سمندر سامنے نہ رہا تو اس سمندر سے کیا ہوا ایک عظیم الشان دریا ان کے سامنے ہے جو اپنی بعض امتیازی خصوصیات کے ساتھ بدل نہیں بلکہ صحیح ہے جس سے بلا تامل علوم کے پیاسے سیراب ہونے لگے اور آبِ حیات سے قدیم و جدید سیرابی میں انہیں کوئی زیادہ فرق محسوس نہ ہوا۔

بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے درس حدیث میں کچھ ایسی امتیازی خصوصیات نمایاں ہوئیں جو عام طور سے درس میں نہیں تھیں اور حضرت شاہ صاحبؒ کا انداز درس درحقیقت دنیائے دین و تدریس میں ایک انقلاب کا باعث ثابت ہوا..... اولاً آپ کے درس حدیث میں رنگ تہذیب غالب تھا فقہ حنفی کی خدمت، تائید و ترجیح بلاشبہ ان کی زندگی تھی لیکن رنگ محدثانہ تھا فقہی مسائل میں کافی سیر حاصل بحث فرماتے لیکن اندازِ بیاں سے یہ کبھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ آپ حدیث کو فقہی مسائل کے تابع کر رہے ہیں اور کھینچ تان کر حدیث کو فقہ حنفی کی تائید میں لانا چاہتے ہیں۔ بھلا اس کا قصد و ارادہ تو کیا ہوتا؟ بلکہ واضح یہ ہوتا تھا کہ آپ فقہ کو بحکم حدیث قبول کر رہے ہیں حدیث فقہ کی طرف نہیں لی جاتی جا رہی ہے۔ بلکہ فقہ حدیث کی طرف لایا جا رہا ہے وہ آ رہا ہے اور کلیہ حدیث کے موافق پڑتا جا رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر گویا حدیث کا سارا ذخیرہ فقہ حنفی کو اپنے اندر سے نکال نکال کر پیش کر رہا ہے اور اسے پیدا کرنے کے لئے نمودار ہوا ہے۔

۱۳۳۰ھ میں علامہ سید رشید رضا مدیر المنار مصر جب بسلسلہ صدارت اجلاس ندوۃ العلماء لکھنؤ ہندوستان آئے اور دیوبند کی دعوت پر درالعلوم میں بھی تشریف لائے حضرت شیخ الہند کی موجودگی میں خیر مقدم کا عظیم الشان جلسہ نو درہ ہال میں منعقد ہوا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی برجستہ عربی تقریر میں ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے دارالعلوم کے علمی مسلک پر روشنی ڈالی جس کا اہم جزو یہ تھا کہ ہم تمام مختلف فیہ مسائل میں فقہ حنفی کے مسائل کو ترجیح دیتے ہیں اور تمام متعارض روایات کی تطبیق و ترجیح کے سلسلہ میں فقہ حنفی کی تائید حاصل کرتے ہیں تو علامہ رشید رضا نے حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر کے دوران ہی میں تعجب آمیز لہجہ سے کہا کہ کیا سارا ذخیرہ روایات حدیث صرف فقہ حنفی ہی کی حمایت کے لئے ہے۔

اس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے تقریر کے رخ کو پھیرتے ہوئے اس صحیحانہ استفسار کے جواب کی طرف رخ کر کے فرمایا کہ ہمیں تو ہر حدیث میں وہی نظر آتا ہے جو ابو حنیفہؒ نے سمجھا اور کہا ہے۔

اور اس پر بطور دلیل حنیفہ شافعیہ کے مشہور مختلف فیہ مسائل کی مثالیں دیتے ہوئے تطبیق روایات اور ترجیح راجح کے اپنے اصول بیان فرمائے اور واضح کیا کہ ان اصول کے تحت ہمیں ذخیرہ حدیث سے کس طرح فقہ حنفی نکلتا ہوا نظر آتا ہے؟

فقہ حنفی کی عظمت شان کو نمایاں کرتے ہوئے دکھایا کہ ہم محض قیاسی طور پر نہیں بلکہ نصوص حدیث کے سارے ہی ذخیرہ میں عیاں اودہ بنیادیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں جن پر فقہ حنفی کی تعمیر کھڑی ہوتی ہے۔

بہر حال درس حدیث میں آپ کے یہاں محدثانہ رنگ غالب تھا اور حدیث کو فقہ حنفی کے موید کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کے منشاء کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا اور ہاتھ در ہاتھ اس کے دلائل و شواہد سے اس دعویٰ کو مضبوط بنایا جاتا تھا۔

متون حدیث کی معتد کتابوں کا ڈھیر آپ کے سامنے ہوتا تھا اور تفسیر الحدیث بالحدیث کے اصول پر کسی حدیث کے بارہ میں جو دعویٰ کرتے اسے دوسری احادیث سے موید اور مضبوط کرنے کے لئے درس ہی میں کتب پر کتب کھول کھال کر دکھائے جاتے تھے اور جب ایک حدیث کا دوسری احادیث کی واضح تفسیر سے مفہوم متعین ہو جاتا تھا تو نتیجہ وہی فقہ حنفی کا مسئلہ نکلتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ حدیث فقہ حنفی کو پیدا کر رہی ہے یہ ہرگز مفہوم نہیں ہوتا تھا کہ فقہ حنفی کی تائید میں خواہ خواہ توڑ مروڑ کر حدیثوں کو پیش کیا جا رہا ہے یعنی گویا اصل تو مذہب حنفی ہے محض مویدات کے طور پر روایات حدیث سے اسے مضبوط بنانے کے لئے یہ ساری جدوجہد کی جا رہی ہے نہیں بلکہ یہ کہ حدیث اصل ہے لیکن جب بھی اس کے مفہوم کو اس کے فحوی اور سیاق و سباق نیز دوسری احادیث باب کی تائید و مدد سے اسے مشخص کر دیا جائے تو اس میں سے فقہ حنفی نکلتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے اس لئے طلبہ حدیث حضرت مدوح کے درس سے یہ ذوق لیکر اٹھتے تھے کہ ہم فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے حقیقتاً حدیث پر عمل کر رہے ہیں اور حدیث کا جو مفہوم ابو حنیفہؒ نے سمجھا ہے وہی در حقیقت شارع علیہ السلام کا منشاء ہے جس کو روایت حدیث ادا کر رہی ہے بلکہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ روایت حدیث سے امام ابو حنیفہؒ اپنا کوئی مفہوم پیش نہیں کرتے بلکہ صرف پیغمبر علیہ السلام کا مفہوم پیش کر رہے ہیں اور خود اس حدیث میں محض ایک جو یا اور ناقل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غرض حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث کی ایک خصوصیت تو یہ تھی کہ تحدیث و اخبار کے سلسلہ میں فقہ حنفی کی تائید ہوتی نظر نہیں آتی تھی بلکہ فقہ حنفی حدیث سے نکلتا ہوا نظر آتا تھا جس سے حدیث موید فقہ نہیں بلکہ منشاء فقہ ثابت ہوتی تھی۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آیا جو اس مقام کے مناسب حال ہے اور وہ یہ کہ حضرت شاہ صاحب نے ایک بار ایک مناظرہ میں جو حضرت ممدوح اور ایک عالم اہل حدیث کے مابین ہوا۔ الحمد للہ ہم نے پوچھا کیا آپ ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں؟ فرمایا نہیں میں خود مجتہد ہوں اور اپنی تحقیق پر عمل کرتا ہوں۔ اس نے کہا کہ آپ تو ہر مسئلہ میں فقہ حنفی ہی کی تائید کر رہے ہیں پھر مجتہد کیسے؟ فرمایا یہ کسی اتفاق ہے کہ میرا ہر اجتہاد کلیۃً ابو حنیفہؒ کے اجتہاد کے مطابق پڑتا ہے اس طرح جواب سے سمجھا یہی منظور تھا کہ ہم فقہ حنفی کو خواہ مخواہ بنانے کے لئے حدیث کو استعمال نہیں کرتے بلکہ حدیث میں سے فقہ حنفی کو نکلتا ہوا دیکھ کر اس کا استخراج سمجھا دیتے ہیں اور طریق استخراج پر مطلع کر دیتے ہیں۔ بہر حال اکابر دیوبند کے مذاق کے مطابق حضرت شاہ صاحبؒ مقلد بھی تھے مگر اس تقلید میں محقق بھی تھے، وہ مسائل میں پابند فقہ حنفی بھی تھے مگر اس پابندی کو مبصرانہ تحقیق سے اختیار کے ہوئے تھے جیسے مسئلہ تقدیر میں اہل سنت کا مذہب بندے کے جبر و اختیار کو جمع کر کے یہ کہنا ہے کہ وہ مختار ضرور ہے مگر مجبور فی الاختیار ہے۔ اسی طرح مسائل فقہیہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا رنگ یہ تھا کہ وہ مقلد ضرور ہیں مگر محقق فی التقليد ہیں، اور تمام اجتہادی مسائل میں جہاں تقلید کرتے ہیں وہاں مسائل کی تمام حدیثی اور قرآنی بنیادوں کی تحقیق بھی ذہن میں رکھتے ہیں۔

ایک امر کی مصنف نے اپنی معروف کتاب "MODERN INDIA" میں ذرا عنوان دیوبندیوں کا اسلام اہل دیوبند کا یہی جامع اضداد طریقہ اپنے مختصر عنوان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ:

حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ لوگ (اہل دیوبند) اپنے کو مقلد کہتے ہیں، مگر ساتھ ہی ہر مسئلہ پورے محققانہ انداز سے کہتے ہیں اور مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے ایسی ہیج و تحقیق کرتے ہیں کہ اس دعوائے تقلید کے ساتھ بے ساختہ مجتہد بھی نظر آنے لگتے ہیں (المنتهی بمعناہ)

حاصل اس کا بھی وہی ہے کہ یہ حضرات مجتہد فی التقليد اور محقق فی الاتباع ہیں کورانہ تقلید یا جہد اتباع کے جال میں پھنسے ہوئے نہیں ہیں اور لم یخروا علیہا صما و عمیانہ کے سچے مصداق ہیں۔ بحر حال یہ عنوان حضرت شاہ صاحبؒ کے درس میں اس لئے کافی بکھرا ہوا نظر آتا تھا کہ ان کا غالب رنگ محدثانہ تھا اور ہر مسئلہ میں حدیثی مسئلہ کی تائید حدیث ہی سے کرتے جاتے تھے لیکن نتیجہ میں پہنچ کر وہ مسئلہ حنفی فقہ کا مسئلہ بن جاتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس مسئلہ کا غشافلان حدیث ہے جسے امام ابو حنیفہؒ نے اتباع حدیث سے نکال کر پیش کر دیا۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ حضرت ممدوح کے علمی تجر اور علم کے بحر و خار ہونے کی وجہ سے درس

بہر حال حضرت شاہ صاحب کا درس حدیث محض حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ فقہ تاریخی اور کلام فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی اور سائنس وغیرہ تمام علوم جدیدہ و قدیمہ پر مشتمل ہوتا تھا اور اس لئے اس جامع درس کا طالب علم اس درس سے ہر علم و فن کا مذاق لیکر اٹھتا تھا اور اس میں بیاستھویں پیدا ہو جاتی تھی کہ وہ بضمن کلام خدا و رسول ہر فن میں محققانہ انداز سے کلام کر جائے۔ یہ درحقیقت درس کی لائن کا ایک انقلاب تھا جو زمانہ کی رفتار کو دیکھ کر الاستاد الامام الشیرازیؒ نے اختیار فرمایا چنانچہ کبھی کبھی تحدیث بالعممہ کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! اس زمانہ کے علمی فتنوں کے مقابلہ میں جس قدر ہو سکا ہم نے سامان جمع کر دیا ہے بالخصوص فقہ حنفی کے ماخذ و مناشی کے سلسلہ میں حدیثی ذخیرہ کافی ہی نہیں کافی سے زیادہ جمع فرمادیا۔

پھر بھی قیام ڈا بھیل کے زمانہ میں آخری سال جس کے بعد درس دینے کی نوبت نہیں آتی اور وصال ہو گیا درس حدیث میں فقہی و حدیثی تحقیقات کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا اور ترجیح مذہب حنفی اور تطبیق روایات میں عمر بھر کے علم کا نچوڑ پیش فرمایا جس کو املا کرنے والوں نے املا کیا۔ تاہم مذہب حنفی کے اس غیر معمولی اہتمام کی توجیہ کرتے ہوئے گاہ گاہ فرماتے کہ عمر بھر ابو حنیفہ کی نمک حرامی کی ہے اب مرتے وقت جی نہیں چاہتا کہ اس پر قائم رہوں چنانچہ کھل کر پھر ترجیح مذہب کے سلسلہ میں اچھوتے اور نار روزگار علوم و معارف اور زکات و لطائف ارشاد فرمائے جس سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ من جانب اللہ آپ پر مذہب حنفی کی بنیادیں منکشف ہو گئی تھیں اور ان میں شرح صدر کی کیفیات پیدا ہو چکی تھیں جس کے اظہار پر گویا آپ مامور یا مجبور تھے۔ ان علوم و معارف کے ذخیرے کو حضرت ممدوح کے دور شید شاگردوں مولینا محمد یوسف بنوری، اور مولینا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی نے الواح اوراق میں جمع کر کے اہل علم پر ایک ناقابل مکافات احسان فرمایا ہے حق تعالیٰ ان دونوں محقق قاضیوں کو جزائے خیر عطا فرمائے اور حضرت شاہ صاحب کی روحانیت سے ان کی نسبت کو اور زیادہ قوی فرمائے آمین۔

حضرت ممدوح کا یہ جملہ کہ عمر بھر ابو حنیفہ کی نمک حرامی کی شاید اس طرف مشیر ہے کہ حضرت ممدوح جہاں روایات حدیث میں تطبیق و توثیق روایات کا اصول اختیار فرمائے ہوئے تھے وہیں روایات فقہیہ میں بھی آپ کا اصول تقریباً تطبیق و توثیق ہی کا تھا یعنی مذاہب فقہاء کے اختلاف کی صورت میں حنفیہ کا وہ قول نقل فرماتے جس سے خروج عن الخلاف ہو جائے۔ اور دونوں فقہ باہم جڑ جائیں اگرچہ یہ قول مفتی بہ بھی نہ ہو اور مسلک معروف کے مطابق بھی نہ ہو نظر صرف اس پر تھی کہ وہ فقہی مذاہبوں میں اختلاف جتنا کم سے کم رہ جائے وہی بہتر ہے ظاہر ہے کہ اس میں بعض مواقع پر

خود امام کا قول بھی چھوٹ جاتا اور صاحبین کا قول زیر اختیار آ جاتا تھا۔ یعنی فقہ حنفی کے دائرے سے تو بھی باہر نہیں جاتے تھے مگر امام ابو حنیفہؒ کے بلا واسطہ قول سے کبھی کبھی باہر نکل جاتے تھے۔ خواہ وہ واسطہ صاحبین ابو حنیفہ ہی کا قول ہو۔ شاید اس کو حضرت ممدوح نے ابو حنیفہؒ کی نمک حرامی سے تعبیر فرمایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر عمر میں اس توسع سے رجوع کر کے کھلے طور پر مذہب کے سرحد و مفتی پہ حصے بلکہ اقوال ابی حنیفہؒ کے اختیار و ترجیح کی طرف طبیعت آچکی تھی اور یہ بلاشبہ اس کی دلیل ہے کہ ابو حنیفہؒ کی خصوصیات کے بارہ میں حق تعالیٰ نے انہیں شرح صدر عطا فرمادیا تھا اور وہ ان اثرات خالصہ لکیر ہی پر جم کر چلنے لگے تھے جس پر ان کے شیوخ سرگرم رفتار رہ چکے تھے۔

میں نے حضرت شیخ الہندؒ کا مقولہ سنا ہے فرماتے تھے کہ جس مسئلہ میں امام ابو حنیفہؒ منفرد ہوتے ہیں اور ائمہ ثلاثہ میں سے کوئی ان کی موافقت نہیں کرتا۔ اس میں ضرور بالضرور پوری قوت سے ابو حنیفہؒ کا اتباع کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ میں ضرور کوئی ایسا واقعہ ہے جس تک امام کی نظر پہنچ سکی ہے اور پھر حق تعالیٰ اس دقیقہ کو منکشف بھی فرمادیتا ہے۔

یہ مقولہ امام ابو حنیفہؒ کے اس مسلک کے ذیل میں فرمایا کہ قضاء قاضی ظاہر و باطن نافذ ہو جاتی ہے۔ فرمایا کہ اس مسئلہ میں میں بالضرور امام ابو حنیفہؒ ہی کی پیروی کروں گا۔ کیونکہ اس میں صرف امام ہی متفر ہیں۔ اور یہ تفرو اس کی دلیل ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی ایسی دقیق بنیاد ان پر منکشف ہوئی ہے جہاں تک دوسروں کی نگاہیں پہنچ نہیں سکی ہیں۔

اس قسم کے مضمون حضرت نانوتویؒ قدس سرہ کے بارے میں میں نے حاجی امیر شاہ خان صاحب مرحوم سے سنا کہ حضرت والا نے مولینا محمد حسین صاحب بٹالوی سے گفتگو فرماتے ہوئے کہا تھا کہ ابو حنیفہؒ کا مقلد ہوں، صاحب ہدایہ اور درمختار کا مقلد نہیں ہوں اس لئے میرے مقابلے میں بطور معاوضہ جو قول بھی آپ پیش کریں وہ ابو حنیفہؒ کا ہونا چاہئے دوسروں کے اقوال کا میں جواب دہ نہ ہوں گا۔ اس سے بھی یہی نکتہ نکلتا ہے کہ فقہ حنفی میں اصل بنیادی قول ان حضرات کے نزدیک خود امام کا ہوتا تھا اور وہی درحقیقت فقہ حنفی کی اساس ہونے کا حق بھی رکھتا تھا۔

یہی ممکن ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ پر آخری عمر میں یہی نکتہ منکشف ہوا ہو جو ان کے شیوخ پر منکشف ہوا تھا۔ اور اس کے خلاف توسع کو وہ ابو حنیفہؒ سے نمک حرامی کرنے کی تعبیر سے اس مقصد کو ظاہر فرما رہے ہوں۔

ان کے ساتھ درس حدیث کے سلسلہ میں مذاہب اربعہ کے اختلاف بیان کرتے ہوئے کبھی کبھی مناظرانہ صورت حال بھی پیدا ہو جاتی تھی، ان مناظرانہ مباحث اور فرعیاتی اختلافات سے کتاب

وسنت کے ہزار ہا مکتون علوم واشکاف ہوتے تھے جو اس اختلاف کے بغیر حاصل کرنا ممکن نہ تھے۔ پھر ان فرعیات کا تراجم اور تراجم کے بعد قول فیصل حضرت ممدوح کے قلب لسان سے ظاہر ہوتا۔ حضرت کی خصوصیات لگ جانے سے عجیب و غریب اور نئے نئے علوم پیدا ہوتے پھر ان تراجم سے محاکمہ اور ترجیح کے سلسلہ سے جو تحقیقات بیان ہوئیں وہ خود مستقل علوم و مصارف کا ذخیرہ ہوتی تھیں۔ فرض ایجابی اور سلبی دونوں قسم کے علوم کی نیرنگیاں حلقہ درس کو ایک رنگین گلدستہ بناتے ہوئے تھیں۔ جن میں رنگ رنگ کے علمی پھول چنے ہوئے ہوتے تھے تفتن علوم کی رنگینوں کے ہر آپ کے درس میں ایک خاص شوکت بھی ہوتی تھی کلام میں تمکین اور قوت الفاظ میں شوکت و حشمت اور کلام کے وقت حضرت ممدوح کی ہیئت کدائی کچھ ایسے انداز کی ہو جاتی تھی جیسے کہ بادشاہ اپنا حاکمانہ فرمان صادر ہے۔ بالخصوص ائمہ مجتہدین کے متبعین علماء کے کلام پر بحث و تہجد چھڑ جاتی تو اس وقت محارضانہ اور ناقذانہ کلام کی شوکت اور بھی زیادہ ابھری ہوتی دکھائی دیتی تھی، نگاہیں تیز ہو جاتیں، آواز قدرے بلند ہو جاتی اور گردن اٹھا کر بولتے تو ایک عجیب پر شکرت اور رعب افزاء کلام معلوم ہوتا تھا۔

بعض مواقع پر مثلاً حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کے تفردات کا ذکر آتا تو پہلے ان کے علم و فضل و تقہ و تبحر کو سراہتے ان کی عظمت و شان بیان فرماتے، اور پھر ان کے کلام بحث و نظر سے تہجد فرما۔ جس میں عجیب متضاد کیفیات جمع ہوتی تھیں۔ ایک طرف ادب و عظمت اور دوسری طرف رو وقہ یعنی بے ادبی اور جسارت کے ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ سے بھی بچتے اور رنج اور صواب میں کتمان صواب سے بھی دور رہتے کبھی کبھی علمی جوش میں آ کر برنگ مزاح بھی رو وقہ فرماتے تھے جو بجائے خود ہی ایک مستقل علمی لطیفہ ہوتا تھا۔

ایک بار غالباً استوی علی العرش کے مسئلہ پر کلام فرماتے ہوئے حافظ ابن تیمیہ اور ان کے مسک اور دلائل کا تذکرہ آیا تو پہلے اسے شرح و وسط سے بیان فرمایا پھر ان کے علم کی عظمت و شان کو کافی دہرایا اور عقیدت بھرے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ حافظ ابن تیمیہ جہاں علوم میں ہیں۔ ان کی رفعت شان و جلالت قدر کا یہ عالم ہے کہ اگر میں ان کی عظمت کو سراٹھا کر دیکھنے لگوں تو ٹوپی پیچھے کی طرف گر جائے گی اور پھر بھی نہ دیکھ سکوں گا لیکن بایں ہمہ مسئلہ استواء علی العرش میں اگر دو یہاں آنے کا ارادہ کریں گے تو درس گاہ میں نہ گھسنے دوں گا یا کبھی ان اکابر متقدمین کے کسی موسم یا شرح طلب کلام کی توجہ بہ کرتے ہوئے فرماتے کہ ہر شخص اپنی ہی جلالت شان کے مطابق کلام کرتا ہے۔ اسے کیا خبر ہوتی ہے کہ بعد میں ہم جیسے گھس گھسے بھی آنے والے ہیں جو اس کلام کی عظمت

میں سلطان و چچاں ہو کر رہ جائیں گے؟
بہر حال درس کا اندازہ ایک عجیب نیرنگی کا رنگ لئے ہوئے تھا جو بالکل انوکھی تھی۔ جس میں
علوم و فنون بھی ہوتے تھے تائید و تنقید بھی ہوتی تھی علوم و معارف کے ساتھ علمی مزاج اور لطائف
و لطافت بھی ہوتے تھے جس سے ہر استعداد کا طالب علم لطف اندوز ہوتا تھا حتیٰ کہ کبھی کبھی خود طلبہ
کے ساتھ بھی علمی رنگ کا مزاج فرما لیتے تھے۔

عصر مغرب کے درمیان ایک دن بخاری کا درس زور و شور سے ہو رہا تھا احقر بھی اس سال
بخاری میں تھا اور شریک درس بھی تھا کہ اچانک کتاب بند کر دی اور فرمانے لگے کہ جب بھائی شمس
بخاری میں تھا تو اب درس کا کیا لطف رہا جاؤ تم بھی گھر کا راستہ لو۔

الہ دین ہی رخصت ہوئے تو اب درس کا کیا لطف رہا جاؤ تم بھی گھر کا راستہ لو۔
ہم سب حیران ہوئے کہ کون بھائی شمس الدین اور وہ آئے کب تھے؟ اور رخصت کب ہو گئے؟
ہماری حیرانی کو دیکھ کر سورج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو غروب ہو رہا تھا فرمایا کہ جاہلین دیکھتے
تھے وہ بھائی شمس الدین جا رہے ہیں اب کیا اندھیرے میں سبق پڑھو گے کیا وہ لطف کا سبق ہوگا؟
تیس دن بھائی شمس الدین جا رہے تھے کسی طالب علم نے سوال کیا مگر مہمل انداز سے، فرمایا کہ مہمان تجھے
ایک بار پچھلی صف میں سے کسی طالب علم نے سوال کیا مگر مہمل انداز سے، فرمایا کہ مہمان تجھے
معلوم نہیں کہ میں اسناد متصل کرنا بھی جانتا ہوں جانتا ہے کس طرح اسناد متصل ہوگی؟ میں اس
اپنے پاس والے کو تھپڑ ماروں گا، وہ اپنے پاس والے کو مارے گا۔ وہ اپنے پاس والے کو تھپڑ رسید
کرے گا یہاں تک کہ تھپڑ کا یہ فعلی سلسلہ سند تجھے تک پہنچ جائے گا۔

یہ تہدید بھی تھی اور حکیمانہ رنگ سے فنی اصطلاحات میں ایک مزاح بھی تھا جس سے طلبہ کی
مخاطبہ (نشاط میں لانا) مقصود تھا۔

ایک دفعہ مسائل فقہیہ کے ذیل میں نابالغ کی امامت کا ذکر آ گیا کہ اس کے پیچھے نماز نہیں
ہوتی۔ فرمانے لگے کہ مسئلہ تو یہی ہے۔ مگر بعض نابالغوں کے پیچھے ہو بھی جاتی ہے (اس زمانہ میں
حضرت مدوح ہی مسجد دارالعلوم میں امامت کرتے تھے) فرمانے لگے کہ تم نے کبھی پیر نابالغ بھی
دیکھا ہے؟ جو ساٹھ برس کا بھی ہوا اور نابالغ بھی؟ جاہلین! وہ ساٹھ برس کا نابالغ میں ہوں (اس
وقت تک حضرت مدوح کی شادی نہیں ہوتی تھی) اشارہ اسی طرف تھا ❶

ایک دفعہ ملا علاؤ الدین میرٹھی جو اس زمانہ میں قلعی کا برف بیجا کرتے تھے اور آجکل دودھ
منٹائی کی دکانداری کرتے ہیں۔ نہایت دیندار اور وضعدار آدمی ہیں۔ قلعی برف کا مڑکا لے کر

❶ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت کی عمر اس وقت ۶۰ برس کی تھی۔ انہوں نے یہ محاورہ فرمایا حقیقت میں ان کا
عمر ۴۲ سال کی عمر میں ہوا ہے ۱۲۰ کوئدہ

دارالافتاء میں پہنچ گئے۔ جہاں حضرت والد ماجد کے پاس اس وقت حضرت شاہ صاحب درجہ اکابر مدین شریف فرماتے تھے، حضرت بہتم صاحب رحمۃ اللہ نے ملا جی کو روک کر برف کی تھوڑی کھولنے کے لئے فرمایا یہ سب حضرات کھلیاں تناول فرماتے رہے۔ کھانے کے دوران میں حضرت شاہ صاحب نے ملا جی سے پوچھا کہ آپ اس برس کی تجارت میں ماہانہ کتنا پیدا کر لیتے ہیں! کہا کہ یہی کوئی ساٹھ روپے ماہوار اس زمانہ میں حضرت شاہ صاحب کی تنخواہ بھی ۶۰ روپے ہی ماہوار تھی مسکرا کر فرمانے لگے تو پھر تمہیں دارالعلوم کی صدر مدرس کی ضرورت نہیں۔

بہر حال حضرت شاہ صاحب کا حلقہ درس اور ساتھ ہی دوسری مجالس علم و کمال کے ساتھ غریبوں سے بھی معمور ہوتی تھیں جو ان کی زندہ دلی اور فقہ نفس کی دلیل تھی اور اس ذیل میں کتنے ہی مہر و معارف بے ساختہ نکلے ہوئے اور باب مجلس کے ہاتھ پلے پڑ جاتے تھے مگر اس کے باوجود مجلس شرعی آداب سے بھرپور ہوتی تھی۔ جس میں غیر متعلق یا فضول اور لالچی باتوں کا کوئی وجود نہ ہوتا تھا۔ اگر کسی شخص نے کسی کی برائی یا فضول بات شروع کی تو معاف فرماتے کہ بھائی ہمیں اس کی فرصت نہیں ہے کوئی مسئلہ پوچھنا ہو تو پوچھو ورنہ جاؤ ہمارا وقت ایسی باتوں کے لئے قاصر نہیں۔ وقت کی بہت زیادہ قدر اور حفاظت فرماتے تھے۔

اوقات کا بڑا حصہ مطالعہ کتب میں گزرتا تھا ذوق مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ طبعی اور شرعی ضروریات کے علاوہ کوئی وقت کتب بینی یا افادہ سے خالی نہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ فرمایا کہ فتح الباری کا (چونچ) جلدوں کی کتاب ہے (تیرہ ویں مرتبہ مطالعہ کر رہا ہوں۔ اور یہ بھی فرمایا کہ میں درس کے لئے کسی مطالعہ نہیں کرتا ہوں مطالعہ کا مستقل سلسلہ ہے اور درس کا مستقل اس لئے ہر سال درس میں نئی نئی تحقیقات آتی رہتی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس درس کے لئے مطالعہ کی ضرورت ہی کیا تھی جب وقت کے تمام گوشے مطالعہ سے ہر لمحے گویا مطالعہ الامداد تھا تو محدود مطالعہ کی ضرورت بھی کیا تھی؟ کتب درسیہ اور باہر کے کتب حدیث کے فنی مباحث طبعیت کا یہ بن چکے تھے اور ہر وقت کے مطالعہ سے ان میں روز بروز ضبط و انضباط کی کیفیات پیدا ہوتی چلی جا رہی تھیں اور مباحث درس گھسنے یا قائم رہنے کے بجائے غور ہی ہو مایہ مایہ رہتے رہتے تھے تو انہیں جزوی مطالعہ سے بڑھانے کے کوئی معنی بھی نہ تھے بلکہ شاید یہ مقررہ جزوی مطالعہ علوم کے بڑھتے ہوئے وسط میں کچھ نہ کچھ خارج اور حد بندی ہی کا سبب بن جاتا۔ پھر یہ مطالعہ محض کتب درسیہ یا شروح و حواشی اور منہیات درس تک ہی محدود نہ تھا بلکہ تمام فنون کی ہر میسر آمدہ کتاب تک پھیلا ہوا تھا جن میں کسی فن کی تخصیص نہ تھی۔ ذہن کسی ایک فن کے

ساتھ مقید نہ تھا بلکہ مطلقاً علم کے بارے میں ہل من مزید کا ذوق رکھتا تھا اور حدیث منہو مان
لا بلکہ ان کا صحیح مصداق تھا۔

مصر تشریف لے گئے تو اوقات کا بڑا حصہ کتب خانہ حذیبیہ کی کتب کے مطالعہ میں صرف ہوا
تھانہ حاضر ہوئے تو حرمین کے کتب خانے کنگال ڈالے اور فرائض و تلوحات کے بعد گویا آپ کی
میراث یہ تھی اور کتب بنی تھی۔ مرض وفات میں اطباء نے مطالعہ کی ممانعت کر دی۔ لیکن جب بھی
موقع ملا اسی وقت کتب بنی شروع کر دی۔ اطباء نے کہا کہ حضرت اس سے مرض بڑھ جائے گا۔
فرمانے لگے کہ بھائی کتب بنی خود ہی میرا مستقل مرض ہے اور لا علاج ہے۔

مطالعہ کے سلسلہ میں فنون عصریہ، فلسفہ جدید، ہیئت جدید حتیٰ کی فن ریل اور جغری کتابوں کو بھی
مطالعہ سے نہ چھوڑا۔

جب بھوپال شاہی کے سلسلہ میں تشریف لے گئے تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک جماعت نے
عصری فنون کی کچھ بخشیں چھیڑ دیں آپ نے ان ہی فنون کی اصطلاحات میں بحوالہ کتب جوہیات دیئے۔
فرمایا کہ یہ نہ سمجھنا کہ ہم لوگ ان فنون سے نااہل ہیں ہم ان عصری فنون کی کتابوں کا مطالعہ بھی کافی کئے
ہوئے ہیں اور ان فنون کی بنیادوں کو بھی جانتے ہیں یہی صورت مسائل حاضرہ کے مطالعہ کی بھی تھی۔

سفر پنجاب کے سلسلہ میں جب لاہور پہنچے تو یہ زمانہ سود کی تحریک کا تھا مسلمانوں کی ایک جماعت
اقتصادی وجوہ پر سودی بینکوں کا قیام مسلمانوں کے لئے ضروری سمجھ رہی تھی۔ مولوی طفیل احمد صاحب
لکھنوی رسالہ سود مند نکال رہے تھے اور جواز سود کا پرچار شد و مد سے کیا جا رہا تھا لاہور پہنچنے پر حضرت
کی تمام گاہ پر لوگ ملتے کے لئے آنے لگے مجمع ہو گیا۔ مولینا ظفر علی خان بھی آگئے اور جواز سود کے
بارہ میں اقتصادی دلائل سے بھری سے ہوئی ایک تقریر کی جس میں ضرورت سود پر کلام کیا گیا تھا۔

مقتصد یہ تھا کہ حضرت ممدوح بھی اس کی تائید میں کچھ فرمادیں حضرت شاہ صاحب نے ساری
تقریر سن کر جواب میں فرمایا کہ بھائی جسے جہنم میں جانا ہو وہ خود جائے ہماری گردن کو پٹن نہ
ٹھائے کہ اس سے گزر کر پہنچے اور اس کے بعد سودی کاروبار کے مضرات اور اس تحریک کے غلط
ہونے پر سیر حاصل علمی بحث فرمائی جس سے لوگوں کے خیالات کی کافی حد تک اصلاح ہوئی۔

علامہ اقبال مرحوم کے خیالات کی بہت حد تک اصلاح حضرت ممدوح کے ارشادات سے
ہوئی۔ ان کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات و شبہات سے پر آتے تھے اور حضرت ان کے
جوابات لکھتے جس سے ان کے قلب کی راہ ہنسی چلی گئی۔

غرض کثرت مطالعہ صرف درسی علوم کی کتب تک محدود نہ تھا، عصری علوم و فنون کا مطالعہ جاری

رہتا تھا جس سے نو تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ بھی مرعوب اور مستفید تھا۔

جب میں نے اپنے ایک عربی قصیدے **نونية الاحقاد** کے طبع کرانے کا ارادہ کیا تو قصیدے میں امت کے مشاہیر علم و فن کی مختصر سوانح نظم و نثر میں جمع کی گئی ہیں جسے اس زمانہ میں طبع کرایا گیا تھا اور اب چھوٹی خوبصورت ^{تفلیح} طبع پر برشور دار مولوی حافظ قاری محمد سالم سلمہ نے اسے دوبارہ تاج المعارف کی طرف سے دوبارہ طبع کرایا ہے اس قصیدہ میں ابوالحسن کذاب کا ذکر بھی مشاہیر کے سلسلہ میں آیا ہے کہ یہ صفت کذب اور دروغ گوئی میں مشہور اور یکتا کے روزگار تھے مجھے ان کی تاریخ نہ ملی جو اس قصیدے میں درج کرتا۔ اس صورت میں ہم لوگوں کی آخری دعا یہ ہوتی تھی کہ حضرت شاہ صاحب تک پہنچ جاتے تھے اور اس سلسلہ میں بلا محنت و مشقت علم کا ناما یہ اور وسیع ذخیرہ لیکر گھر آ جاتے تھے جو برس ہا برس کے ذاتی مطالعہ سے بھی حاصل ہونا دشوار تھا۔

میں اپنے اسی معمول بہ دستور کے مطابق حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں ان کے دولت خانہ حاضر ہوا۔ مرض اوقات اپنی آخری حد پر پہنچ چکا تھا اور دو تین ہفتہ بعد ہی وصال ہونے والا تھا۔ کمر و بے حد ہو چکے تھے۔ لیٹنے اور بیٹھنے میں بے حد تکلیف ہوتی تھی اطلاع کرنے پر مجھے حسب معمول گھر میں بلا لیا اور عادت تھی کہ جب بھی میں پہنچتا تو کسی نہ کسی چیز سے تواضع فرماتے فوراً چائے بنانے کا حکم دیتے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت ممدوح کا دارالعلوم سے کوئی تعلق نہیں تھا اور میں اس زمانہ میں مہتمم دارالعلوم پر تھا لیکن حضرت ممدوح کے اس تعلق کے انقطاع بلکہ اس سے بھی پہلے ^{مستحق} کے زمانہ میں میرا تعلق ان سے وہی رہا جو پہلے سے تھا حتیٰ کہ آمد و رفت بھی منقطع نہیں ہوئی اسے حضرت شاہ صاحب بھی محسوس فرماتے اور قد رکی نگاہ سے دیکھتے پھر یہ تعلق کوئی رسمی یا دنیوی نہ تھا جو قطع ہو جاتا بلکہ روحانی تھا اور قدیم تھا جو ناممکن الانقطاع تھا گو درمیانی مدت میں قضاء و قدر سے وہ دستور اور مغلوب سا ہو گیا تھا اور ٹکونی طور پر **أَنْ نَزَعَ الشَّيْطَانُ بَيْتِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي** منظر کا ظہور ضرور ہوا تاہم یہ سب ^{سطحی} سطحی بات تھی قلبی طور پر محبت و عقیدت کا علاقہ بدستور قائم تھا اور اس میں جتنا کچھ رخت چڑ گیا تھا مرد و ایم سے اس میں بھی اضمحلال آچکا تھا اس لئے از اول تا آخر میرے لئے حضرت ممدوح کے قلب مبارک میں کافی گنجائش تھی جس کا ظہور میری نگاہ بگاہ حاضر کی پر ہوتا رہتا تھا اس موقع پر بھی حسب معمول اس بزرگانہ شفقت سے پیش آئے چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد متوجہ ہوئے فرمایا مولوی صاحب کیسے تشریف لائے۔

میں نے عرض کیا حضرت ابوالحسن کذاب کا ترجمہ نہیں ملتا اس کے بارہ میں نشان معلوم کرنے حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا ادب و تاریخ کی کتابوں میں فلاں فلاں مواقع کا مطالعہ کر لیجئے تقریباً آٹھ دس کتابوں

کے نام لے دیئے اور ان کے مظان و مواقع کی نشاندہی فرمادی میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے اس فن کی پوری تاریخ معلوم کرنی نہیں صرف اس کی صفت کذات و دروغ گوئی کے حالات معلوم کرنے ہیں مگر ان کا کوئی عنوان کسی کتاب میں نہیں ملتا کہ اس کے نیچے ان خاص واقعات کا مطالعہ کروں۔

فرمایا مولوی صاحب! آپ نے بھی کمال کیا صفت کذب کو کسی صفت مدح ہے کہ لوگ اس پر عزائم قائم کر کے اس کے واقعات دکھلائیں ایسی مذموم صفات و افعال کا تذکرہ تو ضمناً اور عوارضات قائم کر کے عوارضات ہمیشہ کمالات پر قائم کئے جاتے ہیں نہ کہ نقائص و عیوب پر، ان کتب سے لیا جاتا ہے لیجئے ضمناً اس کی صفت کذاب کا بھی تذکرہ کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گا۔

میں فلاں فلاں مقام دیکھ لیجئے ضمناً اس کی صفت کذاب کا بھی تذکرہ کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گا۔
میں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے تو کتابوں کے اتنے اسماء بھی یاد نہیں رہیں گے۔ چہ جائیکہ ان کے مظان اور مواقع محفوظ رہیں نیز انتظامی مہمات کے بکھیروں میں اتنی فرصت بھی نہیں کہ چند جزوی باتوں کے لئے اتنا طویل و عریض مطالعہ کروں بس آپ ہی اس شخص کے کذبات اور دروغ گوئی سے حلقہ واقعات کے دو چار مثالیں بیان فرمادیں میں ان ہی کو آپ کے حوالہ سے جزو کتاب بنادوں گا۔
نہ پر مسکرا کر ابوالحسن کذاب کی تاریخ اس کے سن ولادت سے سن وفات تک بیان فرمائی شروع کر دی جس میں اس کے جھوٹ کے عجیب و غریب واقعات بیان فرماتے رہے، آخر میں سن وفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شخص مرتے مرتے بھی جھوٹ بول گیا پھر اس جھوٹ کی تفصیل بیان فرمائی۔

خیرانی یہ تھی کہ یہ بیان ایسے طرز سے ہو رہا تھا کہ گویا حضرت مدوح نے آج کی شب میں مستقام اسی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے جو اس بسط سے سن واد واقعات بیان فرما رہے ہیں۔

میں نے تعجب آمیز لہجہ میں عرض کیا کہ حضرت شاید کسی قریبی ہی زمانہ میں اس کی تاریخ دیکھنے کی نوبت آئی ہوگی؟ سادگی سے فرمایا جی نہیں آج سے تقریباً تیس سال کا عرصہ ہوتا ہے جب میں مصر گیا ہوا تھا خدیوی کتب خانہ میں مطالعہ کے لئے پہنچا تو اتفاقاً اسی ابوالحسن کذاب کا ترجمہ ماننے آگیا اور اس کا مطالعہ دیر تک جاری رہا بس اسی وقت جو باتیں کتاب میں دیکھیں حافظہ میں محفوظ ہو گئیں اور آج آپ کے سوال پر مختصر ہو گئیں جن کا میں نے اس وقت تذکرہ کیا۔

اللہ اکبر! یہ واقعات حدیث و تفسیر اور فقہ و اصول کے ان مباحث سے تعلق نہ رکھتے تھے جو ان کے متداول فنون اور روزمرہ کے مشاغل میں سے تھے بلکہ ایک غیر متعلق بات اور وہ بھی تیس سالہ موت کی ذہن میں آئی ہوئی اور اوپر سے وہ بھی کسی اہتمام سے نہیں محض اتفاقی طور پر اور سرسری الفاظ سے ذہن میں آئی ہوئی چیز تھی اس کا اتنا استخراج عام معاد حافظہ سے بالاتر، کرامتی حافظہ سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ جس علم و فن میں بھی گفتگو فرماتے تھے و اختصار کی یہی نوعیت ہوتی تھی کہ کوئی اس مسئلہ کو ابھی دیکھ کر اور ذہن میں سمیٹ کر آرہے ہیں۔

مولانا سعید احمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ صدر جمعیت علماء دہلی کا حضرت ممدوح کو چلتا پھرتا کتب خانہ کہنا حقیقتاً اظہار حقیقت پر مبنی ہے اور حضرت ممدوح اس لقب کے جائز طور پر نہیں بلکہ انہی طور پر مستحق ہیں۔

وفور مطالعہ اور اس کے ساتھ قوت حافظہ ایسا ہی ہے جیسے سرمایہ دار سرمایہ کے ساتھ نئی دل بھی ہو۔ بخیل سرمایہ دار ہو تو بے فیض اور بے نتیجہ ہے جیسے بعض کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے مگر قوت حافظہ نہ ہونے کے سبب ان کا وقتی شوق مطالعہ تو پورا ہو جاتا ہے مگر خود ان کو یاد دوسروں کو اس مطالعہ کی کاوشوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا لیکن حضرت شاہ صاحب کا جس درجہ مطالعہ وسیع تھا اسی درجہ حافظہ بھی قوی تھا۔ گویا ذہن و حافظہ ہر وقت تیار رہتے تھے کہ آنکھیں یا کان کچھ لائیں تو وہ فوراً اسے جمع کر لیں۔ بلاشبہ حضرت ممدوح کے اس غیر معمولی حافظہ سے حفاظ سلف کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ انہیں غیر متداول بلکہ غیر معروف کتب کی عبارتیں بھی اس درجہ مستحضر رہتی تھیں کہ وقت پڑنے پر بے تکلف پیش کر دیا کرتے تھے اور علماء حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے تھے۔

تحریک خلافت کے دور میں جب امارت شرعیہ کا مسئلہ چھڑا تو مولوی سبحان اللہ خان صاحب گورکھپوری نے اس مسئلہ میں اپنے بعض نقاط نظر کی تائید میں بعض سلف کی عبارت پیش کی جو ان کے نقطہ نظر کی تو موید تھی مگر مسلک جمہور کے خلاف تھی۔ یہ عبارت وہ خود لیکر دیوبند تشریف لائے اور مجمع علماء میں اسے پیش کیا تمام اکابر دارالعلوم حضرت شاہ صاحب کے کمرہ میں جمع تھے۔ حیرانی یہ تھی کہ نہ اس عبارت کو رد ہی کر سکتے تھے کیونکہ وہ سلف میں سے ایک بڑی شخصیت کی عبارت تھی اور نہ اسے قبول ہی کر سکتے تھے کہ مسلک جمہور کے صراحتہ خلاف تھی۔ یہ عبارت اتنی واضح اور صاف تھی کہ اسے کسی تاویل و توجیہ سے بھی مسلک جمہور کے مطابق نہیں کیا جاسکتا تھا۔

حضرت شاہ صاحب استنجا کے لئے تشریف لے گئے ہوئے تھے وضو کر کے واپس ہوئے تو اکابر نے عبارت اور مسلک کے تعارض کا تذکرہ کیا اور یہ کہ ان دونوں باتوں میں تطبیق و توفیق بھی نہیں بن پڑتی۔

حضرت ممدوح حسب عادت حبسنا اللہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے اور عبارت کو ذرا غور سے دیکھ کر فرمایا "کہ اس عبارت میں جعل اور تصرف کیا گیا ہے اور دو سطروں کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے۔ درمیان کی ایک سطر چھوڑ دی گئی ہے۔"

اس وقت کتب خانہ سے کتاب منگائی گئی دیکھا گیا تو واقعی اصل عبارت میں سے پوری ایک

طرور میان میں سے حذف ہوئی تھی۔ جوں ہی اس ساقط کردہ سطر کو عبارت میں شامل کیا گیا، عبارت کا مطلب مسلک جمہور کے موافق ہو گیا۔ اور سب کا قیام برقرار ہو گیا۔

بہر حال حافظ اور انقال دینی کے لحاظ سے حضرت ممدوح آیت من آیات اللہ تھے جن کی الہی ترقی زمانوں میں نہیں ملتی۔

حضرت ممدوح کی اس تبحر پسندی اور ذوق زیادہ علم کا نتیجہ تھا کہ طلبہ میں بھی وہی ذوق پیدا ہونے لگا۔ ہر طالب علم کوشش کرتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تحقیق کے ساتھ مسئلہ کی تہ تک پہنچے۔ اس دور میں برصغور بڑے کا یہ ذہن بن گیا تھا اور اس کے آثار زمانہ طالب علمی ہی میں نمایاں ہونے لگے۔

چنانچہ اس زمانہ کے متعدد طلباء دور حدیث نے اچھے اچھے قابل قدر رسالے اور مضامین سے اپنے علمی تبحر کا ثبوت دیا میں نے ادب و تاریخ کے سلسلہ میں رسالہ مشاہیر امت لکھا۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم (سابق مفتی اعظم) پاکستان نے شتم البدوۃ فی القرآن اور شتم البدوۃ فی الحدیث کا رسالہ دو جلدوں میں مرتب کیا مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی نے کلمۃ السرفی جہودۃ روح السر لکھا مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی نے بھی کئی رسالے لکھے اور تقریباً دو تین سال کے عرصہ میں احاطہ دارالعلوم سے اشعار، انیس رسالے شائع ہوئے۔

یہ درحقیقت وہی ذوق تھا جو حضرت ممدوح کے درس حدیث سے طلبہ لیکر اٹھتے تھے اور علمی طور پر اپنے اندر زمانہ طالب علمی ہی میں ایک ایسی قوت محسوس کرنے لگتے تھے کہ گویا وہ تمام علوم و فنون پر حاوی ہیں اور علم ان کے اندر سے خود بخود ابھر رہا ہے۔ وہ کتب بینی محض عنوان بیان تلاش کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔

حضرت ممدوح کے یہاں علم کے اس غیر معمولی شغف و اشتہاک اور ہمہ وقت کے شغل کے باوجود عمل اور اتباع سلف کے اہتمام میں ذرہ برابر کمی اور کوتاہی نہ ہوتی تھی۔

ہم بہت ہی سنتیں ان کے عمل دیکھ کر معلوم کر لیا کرتے تھے۔ اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ کھانے میں ہمیشہ تین انگلیاں استعمال کرتے تھے اور دونوں ہاتھ مشغول رکھتے تھے بائیں ہاتھ سے روٹی اور داہنے ہاتھ سے اسے توڑ توڑ کر استعمال کرتے تھے۔ لقمے ہمیشہ چھوٹے چھوٹے استعمال کرتے تھے۔

ایک صورت لباس کی تھی پاجامہ نیم ساق سے کبھی نیچا نہ ہوتا تھا، عمامہ کا استعمال زیادہ ہوتا تھا، بریڈوں میں اکثر و بیشتر سبز یا سیاہ رنگ کا عمامہ استعمال فرماتے تھے زہد و تقویٰ حضرت ممدوح کے کلمے اور روشن چہرے پر برستا تھا ایک غیر مسلم شخص نے کسی موقع پر حضرت ممدوح کا سرخ و سفید

رنگ کشادہ پیشانی اور ہنس مکھ چہرہ نیز چہرہ کی مجموعی وجاہت و عظمت دیکھ کر کہا اسلام کے ہونے کی ایک مستقل دلیل یہ چہرہ بھی ہے۔

جمعہ کیلئے جاتے تو فاسعو الی ذکر اللہ کا منظر سب کو نظر آتا سعی اور روز کی شان آتا رفتاری اور لمبے لمبے قدم ڈالنے کی چال سے نمایاں ہوتی۔ حسب اللہ تکلیف کلام تھا۔ افسوس کہ اکثر و بیشتر حسب اللہ فرماتے تھے اور ایسے ہی موقع بموقع اللہ اجل فرماتے رہتے تھے۔ میں بعض اوقات غایت خشیت سے آنکھوں میں نمی آ جاتی جسے صبط کرنے کی کوشش کرتے تھے انشاء و قصاید اور وعظ میں خوف و خشیت کے اشعار اکثر تر آنکھوں کے ساتھ پڑھتے جس سے تمام مظہر خشیت الہی نظر آتا تھا اور سامعین کی آنکھیں تر ہو جاتی تھیں۔ ٹھیک طریقہ نبوی ﷺ کے مطابق کن آنکھوں سے دیکھتے اور جدھر متوجہ ہوتے، پورے پورے متوجہ ہوتے تھے۔ ادب عالم یہ عالم تھا کہ خود ہی فرمایا کہ میں مطالعہ میں کتاب کو اپنا تابع کبھی نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ خود کتاب کے تابع ہو کر مطالعہ کرتا ہوں چنانچہ سفر و حضر میں ہم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ لیٹ کر مطالعہ کر رہے ہوں یا کتاب پر کہنی ٹیک کر مطالعہ میں مشغول ہوں بلکہ کتاب کو سامنے رکھ کر مودب انداز سے بیٹھتے گویا کسی شیخ کے آگے بیٹھے ہوئے استفادہ کر رہے ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک دینیات کی کسی کتاب کا مطالعہ بے وضو نہیں کیا۔

سبحان اللہ! کہنے کو تو یہ بات بہت چھوٹی سی نظر آتی ہے لیکن اس پر استقامت اور دوام ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہی کر سکتا ہے جسے حق تعالیٰ نے ایسے کاموں کے لئے موفق اور ميسر کر دیا ہے اور وہ گویا بنا ہی اس لئے گیا ہے کہ اس سے دینی آداب کے عملی نمونے پیش کرائے جائیں۔

كُلُّ مُبْسِرٍ لِّمَا خُلِقَ لَهُ۔

ہر کسے ما بہر کارے ساختہ ☆ بامیل اور اردو لٹریچر اندا صمد ادب شیوخ و اکابر کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے کبھی آنکھ اٹھا کر یا آنکھ ملا کر گفتگو نہ فرماتے۔ فتنہ ۱۳۴۴ھ میں جب معاملہ حدود سے بڑھنے لگا اور حضرت ممدوحؒ نے مدرسہ میں آنا اور درس دینا چھوڑ دیا جس سے طلبہ میں انتشار پھیل گیا اور اسٹرائٹک کی صورت پیدا ہوئی۔ تو حضرت والد ماجدؒ نے بلا واسطہ اس مسئلہ کو سنبھالنے کی سعی فرمائی اور ایک دن اچانک صبح کے وقت حضرت ممدوحؒ کے مکان پر تنہا پہنچ گئے۔ اور اطلاع ہونے پر ایک دم گھبرا کر حضرت ممدوحؒ باہر تشریف لائے اور اسی سابقہ نیاز مندوں کے ساتھ بہت ہی مودبانہ انداز سے پردہ کرا کر گھر میں لے گئے گردن جھکا کر عرض کیا کہ حضرت اس وقت اچانک کیسے تکلیف فرمائی۔

حضرت والد ماجدؒ نے فرمایا کہ حضرت مجھے یہ عرض کرتا ہے کہ میرا بھی آپ پر کوئی حق ہے؟
فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہنیں تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔
والد ماجدؒ نے فرمایا کہ بسم اللہ بس تو میری گزارش یہ ہے کہ آپ ان قصوں کو چھوڑ دیں اور مدرسہ چلیں اور میرے ساتھ چلیں۔

فرمایا بہت اچھا! حضرت نے چند معاملات پیش فرمائے کہ حضرت انہیں یوں کر دیا جائے،
والد ماجدؒ نے فرمایا کہ آپ کا منصب مطالبہ کرنے کا نہیں، مطالبے پورے کرنے کا ہے آپ اپنے
قلم سے جو مناسب سمجھیں چل کر خود کریں اس پر ساتھ ہوئے اور مدرسہ میں پہنچ گئے سب کو حیرت
سب اپنا مسرت ہوئی کہ سارا فتنہ ختم ہو گیا۔

والد ماجدؒ نے فرمایا کہ ”یہ سب مطالبے آپ خود جاری کر دیں اور درس شروع کر دیں“ فرمایا کہ
حضرت اتنی اجازت دیں کہ ظہر کے بعد حاضر ہو کر درس شروع کروں فرمایا مضا نقہ نہیں حضرت ممدوح
شریف لے گئے مگر پھر ظہر کے بعد تشریف نہیں لائے اور معلوم ہوا کہ لوگوں نے مجبور کر کے روک دیا۔
مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ زمانہ اختلاف میں ادب و توقیر اور تسلیم و رضا کا بذات خود یہ عالم تھا کہ
جس واقعہ میں آپ نے دیکھا۔

تقریری افادہ کے ساتھ تحریری افادہ یعنی تصنیف کا بھی آپ میں کافی ذوق تھا۔ حدیث میں
مضامین اور نادرہ روزگار رسالے تالیف فرمائے اور علمی ترکہ میں چھوڑے جیسے:

نیل المرقدين في مسألة رفع اليدين، فضل الخطاب في مسألة ام
الكتاب، كشف الستار عن مسألة الوتر، اكفار الملحدين في
ضروريات الدين (عربی) اور خاتم النبیین (فارسی)

مرض وفات میں رو کر فرمایا کہ ہم نے عمر ضائع کی اور کوئی کام آخرت کے لئے نہ کیا یہ رسالہ خاتم
النبیین کا دیانی کے رد میں لکھا ہے توقع ہے کہ شاید یہ رسالہ میری نجات کا ذریعہ ہو جائے۔
دارالعلوم کے سنن قیام میں تقریباً اواخر سنین میں کلامی مسائل کی طرف توجہ دی ابتدائی ایام میں
کلامی مسائل میں زیادہ ذوق سے کام نہیں فرماتے تھے۔ نقل و روایت کا غلبہ تھا۔ آخر عمر میں ذوق ابھرا
فوائد اوقات میں دوپہر کے ابتدائی حصہ میں کتاب شروع کرائی۔ احقر بھی اس میں شریک تھا۔
اس میں بالخصوص حضرت نالوتوی قدس سرہ کی کتب کے حوالہ سے کلامی مسائل میں ان کے علوم کو
بیان فرماتے اور ان کی شرح فرماتے اور آخر کار ان علوم کے عنوانات منضبط کرنے کے لئے عربی کا
ایک بلغ قصیدہ خود ہی موزون فرمایا جو ”ضرب الخاتم علی حدود العالم“ کے نام سے

مچھ چکا ہے اس کے ایک ایک شعر میں بہت سے مسائل کھپا دیئے ہیں ساتھ ہی ان کی شرح و تفسیر کے لئے مآخذوں کے حوالے دیئے گئے ہیں جن میں تمام کتب معقول و مباحثہ فلسفہ کے حوالوں کے ساتھ علوم قاسمیہ کی کتب مثلاً تقریر دلیہ و انتصار الاسلام، مباحث شاہ جہاں پور وغیرہ کے حوالے بکثرت ملتے ہیں خط نہایت پاکیزہ تھے، حروف موتیوں کی طرح کاغذ پر جڑے ہوئے نظر آتے تھے اور بہت خوب صورت ہوتے تھے ہر ایک قلم سے لکھتے تھے اور مختصر نویسی کے ساتھ لکھنے کی عادت تھی اکثر تحریریں اشارات ہوتے تھے جن کو صاحب ذوق ہی سمجھ سکتا تھا۔

فن ادب اور شاعری کا ذوق بہت بلند پایہ تھا دارالعلوم میں عام اجتماعات یا کسی بڑی شخصیت کے قدم یا کسی اہم حادثہ کے وقوع پر قصائد قلم بند فرماتے اور انہیں مجمع میں سناتے، پڑھتے، ہلڑتے نہایت دلکش تھا ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے جس سے سامعین پر گہرا اثر پڑتا تھا عربی اور فارسی کی بلاغت اعلیٰ مقام تک پہنچی ہوئی تھی۔

فرماتے کہ مقامات حریری جیسی عبارت ایک گھنٹہ میں چار ورق برجستہ لکھ سکتا ہوں لیکن ہر ایک جیسی عبارت چار مہینوں میں بھی چار سطر نہیں لکھ سکتا اردو سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا لیکن کام بہر حال بلیغ ہوتا تھا مگر عربیت آمیز، اس اردو اجنبیت کی وجہ سے ہم میں اردو کی ایک گونہ تحقیر قائم ہو گئی تھی اردو کی کتابوں کو دیکھنا عیب سا معلوم ہوتا تھا حتیٰ کہ خود اپنے اسلام صالحین کی علوم معارف سے بھرئی ہوئی اردو تصنیفیں دیکھنے میں بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ خواہ اسے محسوس کر کے یا از خود ادبیر قلب سے ایک دن تفسیر بیان القرآن اردو از حضرت تھانوی قدس سرہ کے بارے میں فرمایا کہ اردو میں اتنی چست تفسیر آج تک نظر سے نہیں گزری اس تفسیر نے بہت سی پرانی تفاسیر سے مستغنی کر دیا ہے۔ اس کے بعد ہم لوگ اردو کی کتابیں دیکھنا گویا جائز سمجھنے لگے تھے اور یہ کہ اردو زبان بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے علم کا تعلق ہو سکتا ہے۔

اشاء سال تعلیمی میں گاہ بگاہ سفر بھی فرماتے تھے اور سال بھر میں سفروں کی تعداد خاصی ہو جاتی تھی اس میں بعض سفر لمبے لمبے بھی ہوتے تھے جیسے پنجاب و سرحد وغیرہ کے اسفار سے رو قادیانی کے سلسلے میں پنجاب کے مستقل دورے بھی فرمائے خاص قادیان کا سفر بھی ہوا جس میں ایک بڑی جماعت ساتھ تھی اور ہم لوگ بھی ہر کات تھے اور سفروں میں بھی احقر ساتھ رہا۔

تقریر علمی ہوتی تھی جس سے علماء ہی استفادہ کر سکتے تھے لیکن عوام بصد عقیدت سن کر برکت حاصل کرتے تھے۔

گھوڑہ ضلع راولپنڈی کے سفر میں احقر اور مولانا محمد ادریس صاحب کاندہلوی حال شیخ الحدیث

جامعہ اشرفیہ لاہور اور دوسرے بعض اور مستفیدین بھی ساتھ تھے۔ حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ بھی ہمراہ تھے راویلنڈی پہنچنے پر بڑے بڑے اجتماعات ہوئے اور بڑی بڑی مجلسیں منعقد ہوئیں جو خوش مذاقی اور ظرافت کے سلسلہ میں ایک واقعہ بھی پیش آیا کہ حضرت مولانا مرتضیٰ حسن مرحوم وظیفہ پڑھ رہے تھے جو ناشتہ آگیا حضرت ممدوح نے زور سے فرمایا شیخ بلند کا مقصد آپ کا ہے دسترخوان پر آجائیے!

کبوتہ کے اسی سفر میں حضرت ممدوح نے مجھے فقیر صاحب کا خطاب عطا فرمایا صورت واقعہ یہ ہوئی کہ بارش بہت زیادہ ہوگئی جلسہ گاہ شہر سے میل بھر کے فاصلہ پر تھی راستہ میں بھی بارش آگئی اور سارے دور تک پانی میں مع کپڑوں کے نچڑ گیا جلسہ گاہ کے قریب ایک مسجد میں پہنچ کر بھیجے گئے کپڑے اتارے ایک صاحب نے اپنی چادر لنگی کے طور پر دی اور ایک صاحب نے اوڑھنے کے لئے دوسری چادر دیدی میں لنگی باندھ کر اور چادر اوڑھ کر ننگے سر ننگے پاؤں حضرت شاہ صاحب کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچا حکم فرمایا کہ:

”اس وقت جلسہ میں تقریر بھی کرنا ہوگی“

چنانچہ مجھے اسٹیج پر کھڑا کر کے خود ہی میرے تعارف کی تقریر کی اور فرمایا کہ یہ فقیر صاحب جو آپ کے سامنے حد میں ننگے سر ننگے پاؤں کھڑے ہیں فلاں ہیں فلاں کے بیٹے اور فلاں کے بھائی ہیں علمی سواذ خاص رکھتے ہیں مجمع میں بولنے کا ڈھنگ انہیں آگیا ہے یہ جیسے باہر سے فقیر نظر آتے ہیں ویسے ہی اندر سے بھی فقیر صاحب ہی ہیں آپ ان کی تقریر سے فائدہ اٹھائیں گے۔

مکان میں بھی شیخ زکریا بہاؤ الدین ملتائی کی درگاہ کے احاطہ میں جلسہ ہوا میں ساتھ تھا تو مجھے اس تقریر کرنے کا حکم دیا اور جب میں تقریر ختم کر چکا تو اس تقریر کی تائید میں بار بار میرا ذکر فرما فرما کر خود بھی تقریر فرمائی اور کافی حوصلہ بڑھایا، صاغر کی حوصلہ افزائی کی آپ کو خاص عادت تھی جس سے چھوٹے اپنے حوصلہ سے زیادہ کام کر جاتے تھے اور ان میں ترقی کی امنگ پیدا ہو جاتی تھی۔

دس و تدریس کے ساتھ ارشاد و تلقین کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا بیعت بھی فرمالتے تھے اپنے اہل سنت سنا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کی طرف سے مجاز بیعت بھی تھے۔ دیوبند کے بھی بعض اہل بیعت تھے الہ دین دیوبندی جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ کے دیکھنے والوں میں تھے حضرت مولانا ہی سے بیعت تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد میں نے اور جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ العظم پاکستان مقیم کراچی نے بھی ساتھ ہی ساتھ حضرت ممدوح کی طرف رجوع کیا۔ ہمیں

طریق چشتیہ کے مطابق اذکار تلقین فرمائے اور ہم اس میں کھلی تاثیر تصرف محسوس کرتے تھے۔
علم و اخلاق کے ان اونچے مقامات کے ساتھ سیاسیات سے بھی آپ کو لگاؤ تھا اور ملکی معاملات
میں شرعی اصول پر چچی کلی رائے ظاہر فرماتے تھے۔

جمعیتہ العلماء ہند کے سالانہ اجلاس پشاور کی صدارت فرمائی خطبہ صدارت ارشاد فرمایا۔ جس
میں وقت کے تمام مسائل پر بحث فرمائی انگریزوں سے کافی تنفر تھا ایک دفعہ مرض وفات میں ۱۹۴۳ء
کے انقلاب سے سولہ سترہ سال پہلے عزیزی مولوی حامد الانصاری غازی کو مخاطب کر کے فرماتے
لگے کہ بھائی ہمیں اب یقین ہو گیا ہے کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائے گا کیونکہ اس نے قدرتی
اشیاء پر بھی ٹیکس عائد کر دیئے ہیں ہوا پر ٹیکس، فضا پر ٹیکس، پانی پر ٹیکس، نمک پر ٹیکس، جن چیزوں پر
قدرت نے آزاد رکھا تھا ان پر پابندی عائد کرنا قدرت کا مقابلہ ہے جس کے بعد زیادہ دیر تک
نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہمیں یقین ہے کہ اب انگریز کے جانے کے دن قریب آ گئے ہیں۔

حضرت ممدوح کی ان گونا گوں علمی اور اخلاقی خصوصیات کے سبب خود ان کے اکابر ان کی
عزت کرتے تھے حضرت شیخ الہند استاد ہونے کے باوجود توقیر کے کلمات ان کے بارہ میں استعمال
فرماتے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے کہ جب مولوی انور شاہ میرے پاس آ کر بیٹھتے ہیں تو میرا
قلب ان کی علمی عظمت کا دباؤ محسوس کرتا ہے میرے والد ماجد باوجود استاد ہونے کے انکی انتہائی
توقیر فرماتے تھے اور غائبانہ بھی ان کے لئے کلمات تعظیم استعمال فرماتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس کی
عظمت اس کے بڑوں کے دل میں بھی ہو اس کی عظمت اس کے چھوٹوں کے دلوں میں کتنی ہوگی۔

ایک مقتدر ہستی ایک یگانہ روزگار ہستی کے فضائل و مناقب ان سطور میں کیا آ سکتے ہیں بڑی بڑی
نصحتیں بھی ایسے لوگوں کی سوانح کے لئے کافی نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے یہ مضمون تو کیا ان کی سہائی کر سکا
ہے لیکن اس کی نگارش بطور سوانح کے ہوئی ہی نہیں یہ سطور صرف بطور تذکرہ کا بلین اپنے دل کی تسلی
اپنے استاد زادہ عزیز مولوی محمد ازہر شاہ قیصر، مدیر ماہنامہ دارالعلوم کے ایاء کی تعمیل کے لئے لکھی گئی ہیں۔
ورنہ کجا سوانح خاتم المحمدین اور کجا یہاں جہل الجاہلین، بس جہل المقلد دموعہ کے طور پر یہ بضاعت
مزجاہ (جو آج ہمارے ۱۰ اذیقعدہ ۱۳۷۳ھ کو بعد نماز صبح پیٹھ کر لکھنی شروع کی اور مسلسل لکھتے لکھتے ٹھیک
گیارہ بجے دن کے ختم کردی) بطور ایک ہدیہ ناچیز عزیز محترم و ممدوح کی خدمت میں پیش ہے۔

”گر قبول افتد زہے عز و شرف“

الحمد للہ اولاً و آخراً

(منقول از حیات انور)

قادیانی فتنہ

اور

حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری

از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (سابق مفتی اعظم پاکستان)

حضرت مولانا محمد شفیع صاحب، حضرت شاہ صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے سالہا سال تک دارالعلوم دیوبند میں مفتی کے فرائض انجام دے چکے ہیں اور بعد ازاں پاکستان تشریف لے گئے اور وہاں دارالعلوم کراچی کے شیخ الحدیث اور مملکت پاکستان میں مفتی اعظم کے منصب جلیل پر فائز رہے۔ واسع الاطلاع کثیر المطالع کثیر الصنائف محقق اور فاضل تبحر تھے۔ ۱۱ اشوال المکرم ۱۳۹۶ھ کو آپ پاکستان میں انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کوندہ

امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی امتیازی فضیلت ہے کہ پوری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوتی اور امت میں تاقیامت ایک ایسی جماعت قائم رہنے کی بشارت رسول اللہ ﷺ نے صریح طور پر دی ہے جو دین حق کی اصلی ہیئت پر قائم رہ کر اس کے اندر پیدا ہونے والے رخنوں کی اصلاح کرتی رہے گی اس کو اللہ کی راہ میں نہ کسی کا خوف مانع ہوگا نہ طمع ایسے ہی لوگوں کے حق میں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

ان الله ليغرس لهذا الدين غرسا

(اللہ تعالیٰ اس دین کی خدمت کے لئے پودے لگا تارہے گا)

یہ ضروری نہیں کہ اس جماعت کے افراد سب کسی ایک ہی جگہ یا کسی ایک ہی بستی یا ایک ملک میں ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ اس جماعت کے افراد کو ہر زمانہ اور ہر خطہ میں پیدا فرماتے رہتے ہیں۔ ان کی خصوصی علامت یہ ہوتی ہے کہ دین کے فروغ اور اس میں پیدا شدہ رخنوں کی اصلاح عام مسلمانوں کی خیر خواہی اور ان کو دین کے صحیح راستہ پر چلانے کا داعیہ ان کے قلوب میں ایسا رچا ہوا ہوتا ہے کہ یہ جذبہ ان کے حوائج ضروریہ انسانیہ کا درجہ لے لیتا ہے۔ ان مقاصد میں کسی جانب سے عمل آتا ہے تو انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا گھر جل گیا ہم لٹ گئے۔

خجر چلے کسی پر تڑپتے ہیں ہم امیر

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

خدمت خلق اور اصلاح خلق ان کے لئے طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے اللہ تعالیٰ کا ہزار شکر ہے اس نے جن بزرگوں کی صحبت کا شرف عطا فرمایا ان میں کافی تعداد ایسے حضرات کی تھی جن کے چہرے دیکھ کر خدا یاد آئے جن کی زندگی کو دیکھنے والے بے تامل کہہ اٹھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے دین اور مسلمانوں کی خدمت ہی کے لئے چن لیا ہے۔ انا اخلصنا ہم بخالصہ ذکر الہی (ہم نے ان کو ایک خاص کام کے لئے مخصوص کر لیا ہے یعنی ذکر و فکر آخرت کے لئے)

ان ہی مقدس بزرگوں میں سے میرے استاذ محترم استاد الاساتذہ بحر العلوم والفنون دہلی زمانہ اور رازی وقت حضرت علامہ مولینا محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ کی ذات گرامی ایک اقدیری حیثیت رکھتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اس ناکارہ کو آپ کی خدمت و صحبت میں رہنے اور بجز ظرف استفادہ کرنے کے لئے تقریباً بیس سال کی طویل المدت عطا فرمائی آپ کے پورے فضائل و کمالات کو تو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو علم کا حظ وافر حاصل ہے۔ یہ ناکارہ اپنی کم بختی اور کم حوصلگی کی بناء پر اس درجہ سے محروم رہا۔

ما نداریم مشامے کہ توانست شنید
درد نہ ہر دم وز داز گلشن وصلت نغحات

مگر اس پر بھی جو کچھ آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا اس کو ضبط بیان میں لانا آسان نہیں خصوصاً اس وقت کہ ہجوم مشاغل و ذواہل نے دل و دماغ کو کسی کام کا نہیں چھوڑا۔

انکوں کرا دماغ کہ پرسدر باغباں

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

مولوی محمد ازہر شاہ صاحب قیصر سلمہ اللہ تعالیٰ نے احقر سے فرمائش کی کہ قادیانی فتنہ کے استیصال میں حضرت شاہ صاحب کی مساعی جمیلہ سے متعلق اپنی معلومات کو ضبط کر کے پیش کیا جائے اس لئے میں کچھ وقت نکال کر اپنی ناقص معلومات کا ایک حصہ آپ کی زندگی کے ایک مختصر گوشہ پر اپنی یادداشت کے مطابق پیش کرتا ہوں۔

فتنہ مرزائیت کی شدت اور اس کے بعض اسباب: تقریباً ۱۳۳۰ھ کا واقعہ ہے کہ فتنہ قادیانیت پورے ہندوستان کے اطراف و جواب میں خصوصاً پنجاب میں ایک طوفانی صورت سے اٹھا۔ اس کا سبب خواہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۹ء کی جنگ عظیم میں قادیانی مسیح کی امت نے

مسلمانوں کے مقابلہ میں عیسائیوں (انگریزوں) کو کافی تعداد بہم پہنچائی جس کا اعتراف خود
انگریزوں نے اپنے ایشیاءات میں کیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ بغداد سات سو سال کے بعد مسلمانوں
کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے تسلط میں داخل ہوا تو جہاں محمد مصطفیٰ کی پوری امت الہی کے رُج
الہ میں مقید تھی وہیں قادیانی مرزا کی امت قادیان میں چراغان کر رہی تھی۔ (افضل قادری)

اس جنگ عظیم میں ہندوینے اور مسلمانوں کے مقابلے میں انگریزوں کو کامیاب بنانے کے سلا
تحریروں کی حمایت (بقول مرزا صاحب) اپنے اس ٹھوکا شہ پودے کو زیادہ حاصل ہو گئی اور اس
پر مسلہ ہو گیا کہ وہ کھل کر مسلمانوں کے مقابلہ میں آجائے اور ممکن ہے کہ کچھ اور بھی اسباب ہوں۔
یہ زمانہ دارالعلوم دیوبند میں میرے درس و تدریس کا ابتدائی دور تھا اور میں اس بسم اللہ کے گنبد
نیاپانی کتاب اور سبق پڑھانے کے سوا کچھ نہ جانتا تھا کہ دیوبند میں کیا ہو رہا ہے۔

لیکن ہمارے بزرگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے فروغ اور اسلام کی خدمت ہی کے لئے
یہ فرمایا تھا، قادیانیت کے اس بڑھتے ہوئے طوفان سے سخت تشویش و اضطراب محسوس فرما رہے
تھے اور تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ اس کے مقابلہ کی فکر کر رہے تھے۔ بالخصوص حضرت شاہ صاحب
قدس سرہ پر اس فتنہ کا بہت اثر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے ان
کو بھی لیا ہے۔ جیسا ہر زمانہ میں عادت اللہ یہ رہی ہے کہ ہر فتنہ کے مقابلہ کے لئے اس وقت کے
مرد دین سے کسی کو منتخب کر لیا گیا اور اس کے قلب میں اس کی اہمیت ڈال دی گئی، فتنہ قادیانیت کے
تجمل میں حضرت ممدوح کی شبانہ روز جدوجہد اور فکر و عمل سے ہر دیکھنے والے کو یقین ہو جاتا تھا
کہ اللہ تعالیٰ نے اس خدمت کے لئے آپ کو چن لیا ہے۔

مصر و عراق وغیرہ ممالک اسلامیہ میں فتنہ قادیانیت کا انسداد..... میں حسب
وقت ایک روز استاد محترم حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کی دائمی
اعت کے خلاف دیکھا کہ ان کے سامنے کوئی کتاب زیر مطالعہ نہیں، خالی بیٹھے ہوئے ہیں اور
جس پر فکر کے آثار نمایاں ہیں میں نے عرض کیا کہ کیسا مزاج ہے؟ فرمایا کہ بھائی مزاج کو کیا
پہنچتے ہو قادیانیت کا ارتداد اور کفر کا سیلاب امنڈنا چلا آتا ہے صرف ہندوستان میں نہیں عراق
اور ایران میں ان کا فتنہ سخت ہوتا جاتا ہے اور ہمارے علماء عوام کو اس طرف توجہ نہیں ہم نے اس کے
مقابلہ کے لئے جمیع علماء ہند میں یہ جموین پاس کرائی تھی کہ دس رسالے مختلف موضوعات متعلقہ
قادیانیت پر عربی زبان میں لکھے جائیں اور ان کو طبع کرا کر ان بلاد اسلامیہ میں بھیجا جائے۔ مگر
اب کوئی کام کرنے والا نہیں ملتا۔ اس کام کی اہمیت لوگوں کے خیال میں نہیں میں نے عرض کیا کہ

اپنی استعداد پر تو بھروسہ نہیں لیکن حکم ہو تو کچھ لکھ کر پیش کروں، ملاحظہ کے بعد کچھ مفید معارف و شائع کیا جائے ورنہ بے کار ہونا تو ظاہر ہی ہے ارشاد ہوا کہ "مسئلہ ختم نبوت" پر لکھو، احقر نے اس محترم کی تعمیل ارشاد کو سرمایہ سعادت سمجھ کر چند روز میں تقریباً ایک سو صفحات کا ایک رسالہ عربی زبان میں لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت ممدوح رسالہ دیکھتے جاتے تھے اور بار بار دو عالمی کلمات زبان پر تھے مجھے کوئی تصور نہ تھا کہ اس ناچیز خدمت کی اتنی قدر افزائی کی جائے گی۔ پھر خود ہی حضرت ممدوح نے اس رسالہ کا نام "ہدایۃ المہدیین فی آیۃ خاتم النبیین" تجویز فرما کر اس کے آخر میں ایک صفحہ بطور تقریظ تحریر فرمایا اور اپنے اہتمام سے اس کو طبع کرایا۔ مصر، شام، عراق، مختلف مقامات پر اس کے نسخے روانہ کئے۔

خاص قادیان میں پہنچ کر اعلانِ حق اور ردِ مرزائیت:..... اسی زمانہ میں حضرت ممدوح کے ایماء پر امرتسر، پٹیالہ اور لدھیانہ کے چند علماء نے یہ تجویز کیا کہ اس فقہ کے استیصال کے لئے خاص قادیان میں ایک تبلیغی جلسہ سالانہ منعقد کیا جائے تاکہ قضیہ زمین بر سر زمین میں طے ہو سکے۔ یہ عوام کو فریب میں ڈالنے والے مناظرے اور مباہلے کے چیلنج جو اکثر اس فرقہ کی طرف سے چبے رہتے ہیں ان کی حقیقت لوگوں پر واضح ہو جائے۔ چنانچہ چند سال مسلسل یہ جلسے قادیان میں ہوتے تھے، اور حضرت ممدوح اکثر بذاتِ خود ایک جماعت علماء و یوبند کے ساتھ اس میں شرکت فرماتے تھے۔ احقر: کارہ بھی اکثر ان میں حاضر رہا ہے۔

قادیانی گروہ نے اپنے آقاؤں (انگریزوں) کے ذریعہ ہر طرح اس کی کوشش کی کہ یہ جلسے قادیان میں نہ ہو سکیں لیکن کوئی قانونی وجہ نہ تھی جس سے جلسے روک دیئے جاسکیں۔ کیونکہ ان جلسوں میں عالمانہ بیانات تہذیب و متانت کے ساتھ ہوتے اور کسی نقضِ امن کے خطرہ کو موقع نہ دیتے تھے۔ جب قادیانی گروہ اس میں کامیاب نہ ہوا تو خود تشدد پر اتر آیا۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ اور ان کے رفقاء کو قادیان جانے سے پہلے اکثر ایسے گمنام خطوط ملا کرتے تھے کہ اگر قادیان میں قدم رکھا تو زندہ واپس نہ جاسکو گے۔ اور یہ صرف دھمکی ہی نہ تھی بلکہ عملاً بھی اکثر اس قسم کی حرکتیں ہوتی تھیں کہ باہر سے جانے والے علماء و مسلمانوں پر حملہ کئے جاتے تھے ایک مرتبہ آگ بھی لگائی گئی۔ لیکن حق کا چراغ کبھی پھونکوں سے بجھایا نہیں گیا اس وقت بھی ان کے اخلاق سوز جلے مسلمانوں کو ان جلسوں سے نہ روک سکے۔

تردیدِ مرزائیت میں تصانیف کا سلسلہ:..... ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہم چند خدام جانے قادیان میں حضرت ممدوح کے ساتھ حاضر تھے صبح کی نماز کے بعد حضرت شاہ صاحب قدس سرہ

نے اپنے مخصوص علامہ حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ زمانہ کو الحاد کے فتنوں نے گھیر لیا اور قادیانی و جال کا فتنہ ان سب میں زیادہ شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اب ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی عمر و توانائی کا بڑا حصہ اور درس حدیث کا اہم موضوع حقیقت و شافیت کو بٹائے رکھا۔ طہرین زمانہ کے و سادس کی طرف توجہ نہ دی۔ حالانکہ ان کا فتنہ مسئلہ حقیقت و شافیت سے کہیں زیادہ اہم تھا۔ اب قادیانی فتنہ کی شدت نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا تو میں نے اس کے متعلق مسائل کا کچھ مواد جمع کیا ہے۔ اگر اس کو میں خود تصنیف کی صورت میں مدون کروں تو میرا طرز ایک خاص علمی اصطلاحی رنگ کا ہے اور زمانہ قلعہ الرجال کا ہے اس قسم کی تحریر کو نہ صرف یہ کہ پسند نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس کا فائدہ بھی بہت محدود رہ جاتا ہے۔ میں نے مسئلہ قراۃ فاتحہ خلف الامام پر ایک جامع رسالہ فصل الخطاب بزبان عربی تحریر کیا۔ اہل علم اور طلباء میں عموماً تقسیم کیا لیکن اکثر لوگوں کو یہی شکایت کرتے سنا کہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لئے اگر آپ لوگ کچھ ہمت کریں تو یہ مواد آپ کو دیدوں۔ اس وقت حاضرین میں چار آدمی تھے۔ احقر کا کارہ، حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن رحمۃ اللہ علیہ، سابق ناظم شعبہ تعلیم و تبلیغ دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا بدر عالم صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند (حال مہاجر مدینہ) اور حضرت مولانا محمد اور لیس صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند و شیخ الجامعہ بہاولپور (حال شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور) اداہم اللہ تعالیٰ فیضہم۔ ہم چاروں نے عرض کیا کہ جو حکم ہو ہم امتثال امر کو سعادت کبریٰ سمجھتے ہیں۔ اس وقت فرمایا کہ اس فتنہ کے استیصال کے لئے علمی طور پر تین کام کرنے ہیں۔ اول مسئلہ ختم نبوت پر ایک محققانہ مکمل تصنیف جس میں مرزائیوں کے شکوک و شبہات و ابہام کا ازالہ بھی ہو۔

دوسرے حیات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مسئلہ کی مکمل تحقیق قرآن و حدیث اور آثار و سلف

سے مع ازالہ شبہات ملحدین۔

تیسرے خود مرزا کی زندگی۔ اس کے گرے ہوئے اخلاق اور متعارض و متباہت اقوال اور انبیاء و اولیاء و علماء کی شان میں اس کی گستاخیاں اور گندی گالیاں۔ اس کا دعویٰ نبوت و وحی اور متضاد قسم کے دعوے۔ ان سب چیزوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ اس کی کتابوں سے مع حوالہ جمع کرنا جس سے مسلمان کو اس فرقہ کی حقیقت معلوم ہو اور اصل یہ ہے کہ اس فتنہ کی مداخلت کے لئے وہی چیز اہم اور کافی ہے۔ مگر چونکہ مرزائیوں نے مسلمانوں کو فریب میں ڈالنے کے لئے خواہ مخواہ کچھ علمی مسائل میں عوام کو الجھا دیا ہے اس لئے ان سے بھی (غماض) نہیں کیا جاسکتا پھر فرمایا کہ مسئلہ ختم نبوت کے متعلق تو یہ صاحب (احقر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) ایک جامع رسالہ عربی زبان میں لکھ چکے ہیں اور اردو میں لکھ رہے ہیں اور آخر الذکر معاملہ کے متعلق مواد فراہم کر کے

مدون کرنے کا سب سے بہتر کام حضرت مولانا سید مرتضیٰ جس صاحب کر سکیں گے کہ اس معاملہ میں ان کی معلومات بھی کافی ہیں اور مرزائی کتابوں کا پورا ذخیرہ بھی ان کے پاس ہے اور اس کا ہر اپنے ذمہ لے کر جلد سے جلد پورا کریں۔

اب مسئلہ رفع و حیات عیسیٰ علیہ السلام رہ جاتا ہے اس کے متعلق میرے پاس کافی مواد جمع ہے آپ تینوں صاحب دیوبند پہنچ کر مجھ سے لے لیں اور اپنے اپنے طرز پر لکھیں۔ یہ مجلس ختم ہوگئی مگر حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے قلبی تاثرات اپنا ایک گہرا نقش ہمارے دلوں پر چھوڑ گئے۔ دیوبند واپس آتے ہی ہم تینوں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسئلہ حیات عیسیٰ سے متعلق مواد مل گیا۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب دامت برکاتہم نے آیت النبی متوفیک وذافعک الی کی ترجمہ سے متعلق مواد لے کر اس پر ایک مستقل رسالہ اردو میں الجواب الفصیح لمنکر حیات المسیح تحریر فرمایا جو علمی رنگ میں لا جواب سمجھا گیا اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے پسند فرما کر اس کی تقریباً تحریر فرمائی یہ رسالہ ۱۳۳۲ھ میں شعبہ تبلیغ دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوا۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب دامت فیوضہم نے اپنے مخصوص انداز میں اس مسئلہ پر اردو زبان میں ایک جامع اور محققانہ رسالہ بنام کلمۃ السرفی حیوة روح السرف تصنیف فرما کر حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی خدمت میں پیش کیا حضرت ممدوح نے بے حد پسند فرما کر تقریباً تحریر فرمائی۔ اور ۱۳۳۲ھ میں دارالعلوم دیوبند سے شائع ہو کر مقبول و مفید خلاقی ہوا۔

احقر کا رو کے لئے یہ کام رکھا گیا کہ جتنی مستند معتبر روایات حدیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات یا نزول فی آخر الزمان کے متعلق وارد ہوئی ہیں ان سب کو ایک رسالہ میں جمع کر دے۔ مگر نے قلیل علم کے لئے رسالہ النصریح بما تواتر فی نزول المسیح بزبان عربی لکھا۔ حضرت ممدوح کی بے حد پسندیدگی کے بعد اسی سال شائع ہوا۔

اس کے بعد حسب ارشاد ممدوح مسئلہ ثبوت پر ایک مستقل کتاب اردو زبان میں تین حصوں میں لکھی۔

پہلا حصہ ختم النہ فی القرآن جس میں ایک سو آیات قرآنی سے اس مسئلہ کا مکمل ثبوت اور محدوں کے شبہات کا جواب لکھا گیا ہے۔

دوسرا ختم النہ فی الحدیث جس میں دوسو دس احادیث معتبرہ سے اس مضمون کا ثبوت اور منکرین کا جواب پیش کیا گیا ہے۔

خیر اہم البدیۃ فی الآثار جس میں سینکڑوں اقوال صحابہ و تابعین اور ائمہ دین سے اس کے ثبوت اور منکرین اور ان کی تاویلات باطلہ پر رد کے متعلق نہایت صاف و صریح نقل کئے گئے ہیں۔ یہیں رسالے پہلی مرتبہ ۱۳۴۲ھ سے ۱۳۴۳ھ تک شائع ہوئے۔ اس کے ساتھ مختصر رسالہ دہادی مرزا اور مسیح موعود کی پہچان اردو زبان میں احقر نے لکھ کر پیش کئے ان رسائل کا جو کچھ نفع مسلمانوں کی اصلاح و ہدایت اور ملحدین و منکرین پر اتمام حجت کے سلسلہ میں ہوا یا ہوگا اس کا علم واللہ ہی کو ہے مجھے تو اپنی محنت کا نقد صلہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی مسرت و خوشنودی اور بے شمار دعاؤں سے اسی وقت مل گیا اور جوں جوں ان رسائل کی اشاعت سے مسلمانوں کی ہدایت بہت سے قادیانی خاندانوں کی توجہ و رجوع الی الاسلام کے متعلق حضرت کو معلوم ہوئے اسی طرح اظہار مسرت اور دعاء کے انعامات ملتے رہے۔

مجدد و منا حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو عمر اور طبقہ کے اعتبار سے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ سے مقدم تھے لیکن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے محیر العقول ہم کے بے حد معقد اور آپ کے ساتھ معاملہ بزرگوں کا سا کرتے تھے جو خدمت اس سلسلہ کی ان کے سپرد فرمائی تھی اس کو آپ نے بڑی سعی بلیغ کے ساتھ انجام دینا شروع کیا اور مرزا قادیانی کی پوری زندگی اس کے اخلاق و اعمال اور عقائد و خیالات دعویٰ نبوت و رسالت اور تکفیر عام اہل اسلام گستاخی در شان انبیاء و اولیاء کو مرزا کی اپنی کتابوں سے بحوالہ صفحہ سطر نہایت انصاف اور اقیانوس کے ساتھ نقل کر کے بہت سے رسائل تصنیف فرمائے اور حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہ کے سامنے پیش فرما کر ان کی مراد پوری فرمائی۔ ان رسائل میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں۔

قادیان میں قیامت خیز بھونچال، اشد العذاب علی مسیمة انجباب، فتح قادیان، مرزائیوں کی تمام برائیوں کو چیلنج مرزائیت کا خاتمہ، مرزائیت کا جنازہ بے گور و کفن، ہندوستان کے تمام مرزائیوں کو چیلنج، مرزا اور مرزائیوں کو دربار نبوت سے چیلنج۔ یہ سب رسائل ۱۳۴۲ھ سے ۱۳۴۳ھ تک شائع ہوئے۔

فیروز پور پنجاب میں تاریخی مناظرہ:..... اسی زمانہ میں چھاؤنی فیروز پور پنجاب میں قادیانیوں کا ایک خاصا اجتماع ہو گیا تھا یہ لوگ وہاں کے مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے اور اپنے دستور کے موافق عوام مسلمانوں کو مناظرہ و مباحثہ کا چیلنج کیا کرتے تھے اور جب کسی عالم سے مقابلہ کی نوبت آئی تو راہ گریز و اختیار کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں ضلع سہانپور کے رہنے والے کچھ مسلمان جو فیروز پور میں بسلسلہ ملازمت مقیم تھے ان لوگوں نے روز روز کی جھک جھک کو فہم کرنے کے لئے خود قادیانیوں کو دعوت مناظرہ دے دی۔

قادیانیوں نے سادہ لوح عوام سے معاملہ دیکھ کر بڑی دلیری اور چالاکی کے ساتھ دعوتِ مناظرہ قبول کر کے بجائے اس کے کہ مناظرہ کرنے والے علماء سے شرائطِ مناظرہ طے کرتے انہیں عوام سے ایسی شرائطِ مناظرہ پر دستخط لئے جن کی رو سے فتح بہر حال قادیانی گروہ کی ہو اور اہل اسلام کو مقررہ شرائط کی پابندی کی وجہ سے ہر قدم پر مشکلات درپیش ہوں۔ ان عوامِ مسلمین نے مناظرہ اور شرائطِ مناظرہ طے کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند سے چند علماء کو دعوت دی جو قادیانیوں سے مناظرہ کریں۔ مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اور حضرت شاہ صاحب مولانا بدر عالم صاحب، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب اور احقر تجویز ہوئے اور قادیانیوں نے یہ دیکھ کر کہ ہم نے اپنی من مانی شرائط میں مسلم مناظرین کو جکڑ لیا ہے اپنی قوت محسوس کی اور قادیان کی پوری طاقت فیروز پور میں لا ڈالی ان کے سب سے بڑے عالم اس وقت سردر شاہ کشمیری اور سب سے بڑے مناظر حافظ روشن علی اور عبدالرحمن مصری وغیرہ تھے یہ سب اس مناظرہ کے لئے فیروز پور پہنچ گئے۔ ہم چار افراد حسبِ الحکم دیوبند سے فیروز پور پہونچے تو یہاں پہنچ کر چھپا ہوا پروگرامِ مناظرہ اور شرائطِ مناظرہ کا نظر سے گزارا شرائطِ مناظرہ پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ ان میں ہر حیثیت سے قادیانی گروہ کے لئے آسانیاں اور اہل اسلام کے لئے ہر طرح کی بے حد پابندیاں ہیں جو کہ عوام نے اپنی نادانیت کی بنا پر تسلیم کی ہیں۔

اب ہمارے لئے دو ہی راستے تھے کہ یا ان مسلمہ فریقین شرائطِ مناظرہ کے ماتحت مناظرہ کریں جو ہر حیثیت سے ہمارے لئے مضرت تھیں یا پھر مناظرہ سے انکار کر دیں کہ ہم ان شرائط کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے جو بغیر ہماری شرکت کے طے کر لی گئی ہیں۔ لیکن دوسری شق پر مقامی مسلمانوں کی بڑی خفت اور سبکی تھی اور قادیانیوں کو اس پروپیگنڈے کا موقع ملتا کہ علماء نے مناظرہ سے فرار کیا اس لئے ہم سب نے مشورہ کر کے مناظرہ کرنے کا تو فیصلہ کر لیا اور بذریعہ تار صورت حال کی اطلاع حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کو دے دی۔

اگلے روز مقررہ وقت پر مناظرہ شروع ہو گیا ابھی شروع ہی تھا عین مجلسِ مناظرہ میں نظر پڑی کہ حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مع چند دیگر علماء کے تشریف لارہے ہیں۔ ان کی آمد پر ہم نے کچھ دیر کے لئے مجلسِ مناظرہ ملتوی کی اور ان حضرات کو صورت حال بتائی۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ جائیے ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ تم نے جتنی شرطیں اپنی پسند کے موافق عوام سے طے کرائی ہیں اتنی ہی اور لگا لو ہمارے طرف سے کوئی شرط نہیں۔ تم چوروں کی طرح عام نادانوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے عادی ہو کسی شرط اور کسی طریق

پاکستان کے سامنے آ کر اپنے دلائل بیان کر دے اور ہمارا جواب سنو پھر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو۔
حضرت کے ارشاد کے موافق اسی کا اعلان کر دیا گیا اور مناظرہ جاری ہوا ان اکابر کو مناظرہ کے لئے
دینی کتب ہماری غیرت کے خلاف تھا۔ اس لئے پہلے دن مناظرہ مسئلہ ختم نبوت پر احقر نے کیا۔ دوسرے
بیس دن حضرت مولانا بدر عالم اور مولینا محمد ادریس صاحب نے دوسرے مسائل پر مناظرہ کیا۔
یوں تو مناظرہ کے بعد ہر فریق اپنی اپنی کہا ہی کرتا ہے لیکن اس مناظرہ میں چونکہ عموماً تعلیم یافتہ
جہد شریک تھا اس لئے کسی فریق کو دھاندلی کا موقع نہ تھا۔ پھر اس مناظرہ کا کیا اثر ہوا۔ اس کا جواب
فیروز پور کے ہر گلی کوچہ سے دریافت کیا جاسکتا تھا۔ کہ قادیانی گروہ کو کس قدر رسوا ہو کر وہاں سے
بھاگ کر چلا۔ خود اس گروہ کے تعلیم یافتہ و سنجیدہ طبقہ نے اس کا اقرار کیا کہ قادیانی گروہ اپنے کسی دعوے
کو ثابت نہیں کر سکا اور اس کے خلاف دوسرے فریق نے جو بات کہی قوی دلیل کے ساتھ کہی۔

مناظرہ کے بعد شہر میں ایک جلسہ عام ہوا جس میں حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولینا شبیر
احمد عثمانی کی تقریریں قادیانی مسئلہ کے متعلق ہوئیں۔ یہ تقریریں فیروز پور کی تاریخ میں ایک یادگار
نام کی نوعیت رکھتی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ جو قادیانی دجل کے شکار ہو چکے تھے اس مناظرہ اور
تقرروں کے بعد اسلام پر لوٹ آئے۔

حضرت شاہ صاحب کا دورہ پنجاب: ۱۳۳۳ھ میں جب کہ حضرت شاہ صاحب
قدس سرہ کی کوشش سے بذریعہ تصنیف و تحریر قادیانی دجل و فریب کا پردہ پوری طرح چاک کر دیا
گیا۔ اور قادیانیت سے متعلق ہر مسئلہ اور مختلف طرز و انداز کے بیسوں رسائل شائع ہو چکے تو آپ
نے اس کی بھی ضرورت محسوس فرمائی کہ ناخواندہ عوام کا طبقہ جو زیادہ کتابیں نہیں پڑھتا اور قادیانی
مبطلین چل پھر کر ان میں اپنا دجل پھیلاتے ہیں اور مناظرہ و مہابلہ کے جھوٹے بیج ان کو دکھاتے
پھرتے ہیں ان لوگوں کی حفاظت کے لئے پنجاب کے مختلف شہروں کا ایک تبلیغی دورہ کیا جائے۔

پنجاب دوسرے دورہ کا پروگرام بنا علماء دیوبند کی ایک جماعت ہمرکاب ہوئی اس جماعت میں
حضرت شاہ صاحب کے ساتھ اکابرین میں سے حضرت شیخ الاسلام مولینا شبیر احمد عثمانی اور حضرت
مولینا سید مرتضیٰ حسن صاحب شریک تھے اس کے علاوہ حضرت مولینا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم
دیوبند حضرت مولینا بدر عالم صاحب حضرت مولینا محمد ادریس صاحب، مولینا محمد نعیم صاحب
لدھیانوی اور احقر ناکارہ شامل تھے یہ علم کے پہاڑ اور تقویٰ کے پیکر پنجاب کے ہر بڑے شہر میں پہنچے
اور مرزائیت کے متعلق اعلان حق کیا۔ مکرین کو رفع شبہات کی دعوت دی۔ لدھیانہ امرتسر لاہور،
گجرات، راولپنڈی، ایبٹ آباد مانسہرہ ہزارہ، کھوش وغیرہ میں ان حضرت کی بصیرت افروز

اور عالمانہ تقریریں ہوئیں، مرزائی دجال جو آئے دن مناظرہ و مہلبہ کے چیلنج عوام کو دکھانے کے لئے پھرا کرتے تھے ان میں سے ایک سامنے نہ آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس جہاں میں نہیں ہیں۔ اس پر رے سفر میں عام مسلمانوں نے جہاں الحق و ذہق الباطل کا مناظرہ کو یا آنکھوں سے دیکھ لیا۔

بہاولپور کا معرکہ آلا راء تاریخی مقدمہ:..... حضرت شاہ صاحب اور دیگر اکابر ہمارے بیانات اور مرزائیوں کے مرتد ہونے کا فیصلہ۔

۱۹۲۶ء میں احمد پور شرقیہ ریاست بہاولپور کی ایک مسلمان عورت کا دعویٰ اپنے شوہر کے مرزائی ہو جانے کی وجہ سے نکاح منسوخ ہونے کے متعلق بہاولپور کی عدالت میں دائر ہوا۔ اور سات سال تک یہ مقدمہ بہاولپور کی ادنیٰ و اعلیٰ عدالتوں میں دائر رہتے ہوئے آخر میں دربار معلیٰ بہاولپور میں پہنچا۔ ۱۹۳۳ء میں دربار معلیٰ نے پھر عدالت میں یہ لکھ کر واپس کر دیا کہ ہمارے خیال میں اس مسئلہ کی پوری تحقیق و تصحیح کرنا ضروری ہے دونوں فریق کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے علماء کی شہادتیں پیش کریں اور دونوں طرف کے مکمل بیانات سننے کے بعد اس مسئلہ کا کوئی فیصلہ کیا جائے۔

اب مدعی علیہ مرزائی نے اپنی حمایت کے لئے قادیان کی طرف رجوع کیا قادیان کا بیت المال اور اس کے رجال کا مقدمہ کی پیروی کے لئے وقف ہو گئے ادھر مدعیہ بیچاری ایک غریب گھرانے کی لڑکی شہادت کس پیرسی میں وقت گزار رہی تھی اس کی قدرت سے قطعاً خارج تھا کہ ملک کے مشاہیر علماء کو جمع کر کے اپنی شہادت میں پیش کر سکے یا اس مقدمہ کی پیروی کر سکے۔ مگر الحمد بہا بہاولپور کے غیر مسلموں کی انجمن موید الاسلام نے زیر پرستی حضرت مولانا محمد حسین صاحب شیخ الحداد بہاولپور اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مقدمہ کی پیروی کا انتظام کیا اور ملک کے مشاہیر علماء کو خطوط لکھ کر اس مقدمہ کی پیروی اور شہادت کے لئے طلب کیا حضرت شاہ صاحب اس وقت جامعہ اسلامیہ ذابھیل میں صدر مدرس کے فرائض انجام دے رہے تھے اور کچھ عرصہ علالت کے سبب رخصت ہو چکے تھے لیکن بلائے ہوئے تھے۔ طویل علالت سے شکایت ہے حد ہو چکی تھی۔

لیکن جس وقت یہ حاملہ آپ کے سامنے آیا تو مسئلہ کی نزاکت اور بیت کے قوی احساس نے آپ کو اس کے لئے مجبور کر دیا کہ اپنی صحت اور دوسری ضرورتوں کا خیال کئے بغیر وہ بہاولپور کا سفر کریں۔ آپ نے نہ صرف اپنے آپ کو شہادت کے لئے پیش فرمایا بلکہ ملک کے دوسرے علماء کو بھی ترغیب دے کر شہادت کے لئے جمع فرمایا۔

یہ واقعہ تقریباً ۱۳۵۱ھ کا ہے جب احقر ناکارہ بحیثیت مفتی دارالعلوم دیوبند فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دے رہا تھا۔

انجمن موبہ الاسلام بہاولپور کی دعوت کے علاوہ استاد محترم حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کا ایماء پر میری حاضری کے متعلق معلوم ہوا۔ احقر نے حاضری کا قصد کر لیا لیکن حضرت استاد شاہ صاحب قدس سرہ کو جو خدا و اشغف دینی ضرورتوں کے ساتھ تھا اور آپ کو بے چین کئے رکھتا تھا اس وجہ سے آپ نے تاریخ مقدمہ سے کافی روز پہلے بہاولپور پہنچ کر اس کام کو پوری توجہ کے ساتھ بروئے کار فیصلہ فرما کر سب بیانات کے اختتام تک تقریباً بیس پچیس روز بہاولپور میں قیام فرمایا۔ حضرت شاہ صاحب کا پر شوکت عالمانہ بیان جو کمرہ عدالت میں ہوا اس کی اصل کیفیت تو صرف ان ہی لوگوں کے دل سے پوچھے جنہوں نے یہ منظر دیکھا ہے اسکو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ تقریباً کہ اس وقت کمرہ عدالت دارالعلوم دیوبند کا دارالحدیث نظر آتا تھا عدالت اور حاضرین پر ایک سک کا عالم تھا۔ علوم ربانی کے حقائق و معارف کا دریا تھا جو اٹھ اچلا جاتا تھا۔

پانچ روز مسلسل بیان ہوا تقریباً ساٹھ صفحات پر قلم بند ہوا یہ بیان اور دوسرے حضرات کے بیانات جو ایک مستقل جلد میں طبع ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف رد مرزائیت کے لئے بلکہ اسلام و ایمان اور کفر و ارتداد کی پوری حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک نادر مجموعہ ہیں۔

اس مقدمہ میں کیا ہوا؟ اس کی پوری تفصیل تو اس مفصل فیصلہ سے معلوم ہو سکتی ہے جو عدالت کی طرف سے ۷ فروری ۱۹۳۵ء مطابق ۳ ذی قعدہ ۱۳۵۳ھ کو دیا گیا اور جو اسی وقت بزبان اردو ایک سو باون صفحات پر شائع ہو چکا تھا۔ اسکی اشاعت کا اہتمام حضرت مولانا محمد صادق صاحب رحمہ اللہ جامعہ عباسیہ بہاولپور حال ناظم امور مذہبیہ بہاولپور کے دست مبارک سے ہوا۔ اس مقدمہ کی شہادت علماء کے اجتماع ان کی ضروریات کا انتظام بھی مولانا موصوف ہی کے ہاتھوں انجام پایا تھا۔ مولانا سے میرا پہلا تعلق اس سلسلہ میں پیدا ہوا۔ آپ نے اس فیصلہ کے شروع میں ایک مختصر تبصرہ لکھی ہے اس کے چند جملے نقل کر دینے سے کسی قدر حقیقت پر روشنی پڑ سکتی ہے وہ یہ ہیں۔

مدیر کی طرف سے شہادت کے لئے حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد انور شاہ صاحب حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری، حضرت مولانا محمد نجم الدین صاحب پروفیسر اور نیکل کالج دیوبند اور مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند پیش ہوئے حضرت شاہ صاحب کی تشریف آوری نے تمام ہندوستان کی توجہ کے لئے جذب مقناطیسی کا کام کیا۔ اسلامی ہند میں اس مقدمہ کو

غیر فانی شہرت حاصل ہوگئی۔ حضرات علمائے کرام نے اپنی اپنی شہادتوں میں علم و عرفان کے دریا بہا دیئے اور فرقہ ضالہ مرزا سید کا کفر و ارتداد و زور و روشن کی طرح ظاہر کر دیا اور فریق مخالف کی جرح کے نہایت مسکت جواب دیئے خصوصاً حضرت شاہ صاحبؒ نے ایمان کفر، زندہ و ارتداد و ختم نبوت اجماع قوا و متواترات کے اقسام و حجب کشف الہام کی تعریفات اور ایسے اصول و قواعد بیان فرمائے جن کے مطالعہ سے ہر ایک انسان علیٰ وجہ البصیرت بظان مرزائیت کا یقین کامل حاصل کر سکتا ہے۔ پھر فریق ثانی کی شہادت شروع ہوئی، مقدمہ کی پیروی کاری اور شہادت پر جرح کرنے اور قادیانی دجل و دروہ کو آشکارا کرنے کے لئے شہرہ آفاق مناظر، حضرت مولینا ابوالفداء صاحب نعمانی شاہ جہاں پوری تشریف لائے۔ مولینا موصوف مختار مدعیہ ہو کر تقریباً ڈیڑھ سال مقدمہ کی پیروی کاری فرماتے رہے فریق ثانی کی شہادت پر ایسی باطل شکن جرح فرمائی جس نے مرزائیت کی بنیادوں کو کھوکھلا اور مرزائی دجل و فریب کے تمام پردوں کو پارہ پارہ کر کے فرقہ مرزا بیہض الہ کا ارتداد آشکارا عالم کر دیا۔ فریقین کی شہادت ختم ہونے کے بعد مولینا موصوف نے مقدمہ پر بحث پیش کی اور فریق ثانی کی تحریری بحث کا تحریری جواب الجواب نہایت مفصل اور جامع پیش کیا کامل دو سال کی تحقیق و تنقیح کے بعد عالی جناب ڈسٹرکٹ جج صاحب بہادر نے اس تاریخی مقدمہ کا بصیرت افروز فیصلہ ۱۹۳۵ء فروری ۱۵ء بحق مدعیہ سنایا۔ یہ فیصلہ اپنی جامعیت اور قوت استدلال کے لحاظ سے یقیناً بے نظیر و بے عدیل ہے مسلمانان ہند کی بہرہ اندوزی کی خاطر اس فیصلہ کو اپنی کتابی صورت میں شائع کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ مواد مقدمہ کی تیسری جلد ہے اس سے پہلے دو جلدیں اور ہوں گی۔

جلد اول میں حضرت علمائے کرام کی مکمل شہادتیں اور جلد ثانی میں حضرت مولینا ابوالفداء صاحب شاہ جہاں پوری کی بحث اور جوال الجواب شائع کیا جائے گا۔ باقی رہا یہ سوال کہ دونوں جلدیں کب شائع ہوں گی۔ اس کا جوال مسلمانان ہند کی ہمت افزائی پر موقوف ہے۔ یہ تیسری جلد جتنی جلد فروخت ہوگی اسی انداز سے پہلی دو جلدوں کی اشاعت میں آسانی ہوگی۔ حضرات علمائے کرام کے بیانات اور بحث اور جواب الجواب تردید مرزائیت کا بے نظیر ذخیرہ ہے اگر خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ تینوں جلدیں شائع ہو گئیں تو تردید مرزائیت میں کسی دوسری تصنیف کی قطعاً حاجت نہ رہے گی۔

اس مقدمہ میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے حکم کی بناء پر پہلا بیان اس احقر کا ہوا، تین روز بیان اور ایک دو روز جرح ہو کر تقریباً ساٹھ صفحات پر بیان مرتب ہوا۔ یہ پہلا بیان تھا ابھی لوگوں نے اکابر کے بیان سنے نہ تھے۔ سب نے بے حد پسند کیا مجھے یاد ہے کہ دوران بیان میں بھی اور مکان پر آنے کے بعد بھی حضرت شاہ صاحب قدس سرہ دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کے

ساتھ اپنی سرست کا اظہار فرماتے تھے اور اس ناکارہ و آوارہ کے پاس دین و دنیا کا صرف یہی سرمایہ ہے کہ اللہ والوں کی رضا رضائے حق کی علامت ہے۔

واللہ تعالیٰ ان شاء ان یلحقنی بالصالحین

فقہ مرزا بیٹ پر حضرت شاہ صاحبؒ کی اپنی تصانیف:..... مرزا بیٹ کے حقائق ضروری مسائل پر کافی سے زائد رسائل و کتب حضرت شاہ صاحبؒ قدس سرہ کے ارشاد و ایمان کی بنا پر لکھے جا چکے تھے۔ لیکن ایک مسئلہ بنو زیدؒ باقی تھا کہ مرزائیوں کے نماز ہر روزہ و عبادت قرآن اور کلمہ اسلام پڑھنے سے عام مسلمانوں اور خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ کو سخت اشتباہ تھا کہ ان چیزوں کے جوتے ہوئے ان کو اسلام سے خارج کیسے کہا جاسکتا ہے۔ بلکہ اس معاملہ میں بعض اہل علم کو بھی یہ انکار تھا کہ اہل قبلہ اور کلمہ گو کی تکفیر جو شخص کسی تاویل کی بنا پر خلاف شرع عقیدے کا قائل ہو اس کی تکفیر میں علمائے اہل حق نے بہت کلام کیا ہے۔ اس لئے اس مسئلہ پر حضرت الاستاد شاہ صاحبؒ قدس سرہ نے خود قلم اٹھایا اور ایک رسالہ بنام اکفار الصلحہ الدین و المتاولین فی شئی من ضروریات الدین تحریر فرمایا جس میں اس مسئلہ کو قرآن و حدیث اور تصریحات سلف کی روشنی میں آفتاب نصف النہار کی طرح واضح فرمادیا بلکہ کفر و ایمان مکمل حقیقت اہل قبلہ اور کلمہ گو کی شرعی تعریف پر ایک جامع کتاب تصنیف فرمادی جن میں اس بات کو بھی واضح کر دیا گیا کہ اگر کسی عقیدہ کفریہ میں مطلقاً تاویل کو مانع کفر قرار دیا جائے تو دنیا میں کوئی کافر کا فر نہیں رہ سکتا کیونکہ ہر کافر کچھ نہ کچھ تاویل اپنے عقیدہ فاسدہ کی کرتا ہے بلکہ فیصلہ یہ ہے کہ اسلام کے وہ احکام جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں (جن کو اصطلاح فقہ و کلام میں ضروریات دین کہا جاتا ہے) جیسے ان کا انکار صریح کفر و ارتداد ہے اسی طرح تاویل کر کے جمہور امت کے خلاف ان کے لئے معنی دینا بھی کفر و ارتداد ہے (یہ کتاب عربی زبان میں ہے)

ایک دوسری مستقل کتاب مسئلہ حیات نزول عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی اپنے قلم سے بزبان عربی تصنیف فرمائی جس کا نام عقیدہ الاسلام فی نزول عیسیٰ علیہ السلام رکھا۔

یہ کتاب کہنے کو تو اسی ایک مسئلہ کی بہترین و جامع تحقیق ہے لیکن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر و تحریر کو جائزے والے جانتے ہیں کہ ایک مسئلہ کے ضمن میں کتنے علوم و معارف کے ابواب آجاتے ہیں یہ کتاب بھی اپنے موضوع کی عجیب و غریب تصنیف ہے۔

مقدمہ بہاد پور سے واپسی کے بعد مرض روز بروز شدت پکڑتا گیا لیکن اسی حالت میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے درس حدیث کو جاری رکھتا آئندہ قوی نے بالکل جواب دے دیا اور آپ

دیوبند تشریف لا کر گویا صاحب فراش ہو گئے اور یہی مرض مرض الموت ثابت ہوا۔

لیکن قدرت نے جو دینی خدمت کا جذبہ بے پایاں آپ کے قلب مبارک میں ودیعت فرمایا تھا وہ بستر مرگ پر بھی چین سے نہ لیٹنے دیتا تھا۔ افادات علمیہ اور کتب دینی کا سلسلہ اس حالت میں بھی اسی طرح جاری تھا۔

تا آنکہ یہ ارادہ ہوا کہ ایک مرتبہ پھر کشمیر کا سفر کیا جائے وہاں اپنے اعزہ و اقارب کی ملاقات کے علاوہ پیش نظر یہ تھا کہ کشمیر میں قادیانی فتنہ پھیلا ہوا ہے۔ اب تک وہاں پہنچ کر اس کے انداز کے متعلق کوئی کام نہیں کیا گیا۔ اس سفر کا قصد کرنے کے ساتھ یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ کشمیر کے عوام اردو یا عربی کے رسائل تو پڑھ نہ سکیں گے فارسی زبان میں مسئلہ ختم نبوت اور قادیانیت کے ساتھ ہی خود ایک رسالہ کی تصنیف شروع فرمادی ابھی یہ تصنیف تکمیل کو نہ پہنچی تھی کہ مرض کے اشد اد نے بالکل ہی قوی کو معطل کر دیا تو ایک طالب علم کے ذریعے اس ناکارہ خلاق کے پاس پیغام بھیجا کہ میں نے کشمیر کی ضرورت سے فارسی زبان میں مسئلہ ختم نبوت پر ایک رسالہ لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر اب میں اس کی تکمیل سے معذور ہوں تجھ سے ہو سکے تو اس کی تکمیل کر دے۔

احقر ناکارہ نے تعمیل ارشاد کو سعادت عظمیٰ سمجھ کر شروع کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ حضرت امجد کی حالت بدلنا شروع ہوئی اور یہ علم و تقویٰ کا آفتاب عالم تاب غروب کے کنارے آگاہیہاں تک کہ ۲ ماہ صفر ۱۳۵۲ھ شب ووشنبہ اس پیکر علم و تقویٰ مجسم دین و دیانت نے دین ہی کی فکر میں اپنی عمر کا آخری سانس پورا کر دیا آپ کے گرد و پیش سے گویا بزبال حال یہ سنا جاتا تھا۔

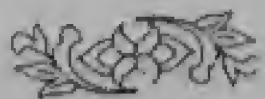
اگرچہ خرمن عمر م غم تو داد بباد

بخاک پائے عزیزت کہ عہد نہ شکستم

اب وہ کشمیر کا قصد اور وہاں رسالہ فارسی کی اشاعت بھی ایک خواب و خیال ہو گیا عرصہ کے بعد آپ کے مسودات میں سے وہ منتشر اوراق فارسی جمع کر کے مجلس علمی ڈابھیل ضلع سورت نے بنام خاتم النبیین شائع کیا۔ اور یہی اوراق آپ کا خاتمہ تصانیف قرار پائے۔

فجزاه عنا وعن جميع المسلمين خير الجزاء ووفقنا لاتباع سنته
فی خدمة الدين المتين وهو الموفق والمعين.

(منقول از حیات انور)



حضرت مولینا محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ

از حضرت مولینا محمد منظور صاحب نعمانی دامت فیائہم (مدیر الفرقان کھنڈ)

علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں مولینا نعمانی قبلہ مدظلہ العالی کا مرتبہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ آپ سال ہا سال تک ندوۃ العلماء لکھنؤ میں شیخ الحدیث رہے ہیں۔ اس وقت سر زمین ہند میں ملت اسلام کی دینی اور علمی خدمات انجام دینے کے لئے "الفرقان" نامی رسالہ کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ نہایت بیدار مغز صاحب علم و فضل اور ممتاز عالم دین مبین ہیں۔ جن کی بلند پایہ تصانیف صاحب بصیرت کے لئے نہایت قابل قدر ہیں، ان کی کئی کتابوں کا ترجمہ انگریزی زبان میں بھی ہوا ہے جن میں "ISLAMIC WHAT FOITH AND PRACTICE" اور "ISLAMIS" مغربی ممالک کے طالبان حق اور مفکرین میں بھی کافی مقبولیت پا چکی ہیں۔ خدمت حدیث میں معارف الحدیث، ان کا محدثانہ رکارنامہ ہے۔ (کوندو)

خدا داد نورانیت و محبوبیت:..... حضرت استاد قدس اللہ سرہ کے کمالات میں یقیناً علم و عمل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر اور مخلوق کی نگاہ میں بھی زیادہ قدر و قیمت علم و عمل ہی کی ہے۔ اس لحاظ سے مجھے پہلے حضرت ممدوح کے وہی واقعات و ارشادات اور اپنے وہی تاثرات ذکر کرنے چاہئیں جن کا تعلق علم و عمل جیسے اعلیٰ کمالات سے ہے لیکن یہ عاجز چونکہ سب سے پہلے حضرت کی ظاہری نورانیت و محبوبیت ہی سے واقف اور متاثر ہوا اس لئے سلسلہ سخن اسی سے شروع کرتا ہوں۔

آج سے تقریباً تیس سال پہلے کی بات ہے، میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور اگلے سال دارالعلوم دیوبند جانے کا ارادہ تھا۔ مراد آباد میں جمعیتہ العلماء ہند کا اجلاس ہوا۔ یہ عاجز بھی گیا حضرت شاہ صاحب کا ذکر اپنے اساتذہ سے سنا کرتا تھا لیکن ابھی تک آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ غالباً صبح کا وقت تھا دیکھا کہ چند حضرات ایک طرف تشریف لارہے ہیں۔ ان میں ایک بزرگ جو گہرے ہنرنگ کا عبا پہنے ہوئے تھے۔ اور غالباً ہلکے زرد رنگ کا عمامہ زیب سر تھا بڑے حسین و جمیل اور بڑے نورانی نظر پڑے، آپ سے آپ دل میں آیا کہ شاید یہی دیوبند کے حضرت شاہ صاحب ہیں کسی سے پوچھا، یہ جوات ملا کہ ہاں شاہ صاحب یہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے

صرف اس دیدہ سے دل میں ایک خاص محبت و عقیدت ڈال دی۔

اجلاس کے سلسلہ میں تین دن میں مراد آباد رہا۔ اب تک یاد ہے کہ اس تاک میں رہا کرتا اور گھوم پھر کر اس کی کوشش کیا کرتا تھا کہ حضرت کو کہیں دیکھوں غالباً دیکھنا تو بار بار نصیب ہوا لیکن تقریر یا بات سننا کیا معنی؟ ان دنوں میں آواز سننا بھی یاد نہیں۔

چند مہینے کے بعد دیوبند پہنچ گیا۔ اس سال چونکہ میں نے دورہ حدیث نہیں کیا تھا اس لئے حضرت کے یہاں میرا کوئی سبق تو نہیں تھا لیکن پھر بھی روزانہ کئی کئی بار آنکھوں کو دید کا موقع ملتا تھا۔ مگر خوب یاد ہے کہ جی بھرتا نہیں تھا اور ہر دفعہ دیکھنے میں لذت ملتی تھی اگلے سال میں نے وہ لیا اور حسب معمول بخاری شریف اور ترمذی شریف پوری پوری حضرت کے یہاں ہوئیں اور ان سے دونوں سبقوں کے سلسلہ میں روزانہ قریباً ۳، ۴ گھنٹے خدمت میں حضوری کی سعادت نصیب ہوتی تھی لیکن اپنی گذشتگی کے ذکر اور اس کی یاد میں آج بھی لذت محسوس کرتا ہوں کہ حسب توقع علمی استفادہ کے علاوہ یہ عاجز آنکھوں کے ذریعہ بھی لذت و سرور حاصل کرتا تھا اور میرا خیال ہے کہ میں اس حال میں منفرد نہ تھا بلکہ بہت سے شرکاء درس غالباً میرے شریک حال تھے۔

سیرت و باطن کے کمال کے ساتھ ساتھ اگر اللہ اپنے کسی بندہ کو صورت و ظاہر کی نورانیت و زیبائی اور اس میں جذب و کشش بھی نصیب فرمائے تو بلاشبہ بڑا انعام ہے اور میرا خیال ہے کہ افادہ و استفادہ میں اس سے بڑی جان پر جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر غیر کو ظاہر پر صورت کی زیبائی بھی عطا فرمائی جاتی ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے۔

ما بعث اللہ نبیا الا حسن الوجه حسن الصوت وصاحبکم احسنہم

وجہا و احسنہم صوتا ①

کمال علمی اور علوم میں جامعیت:..... یوں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کو گونا گوں ظاہری و باطنی کمالات سے نوازا تھا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ آپ کا علمی کمال دوسرے تمام کمالات پر غالب تھا۔ اتنا غالب کہ دوسرے سب کمالات گویا بالکل اس کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ آپ کے متعلق صرف یہی سمجھتے ہیں کہ آپ اپنے وقت کے ایک بہت بڑے علامہ تھے اور بعض حضرات جن کی واقفیت اور زیادہ ناقص ہے وہ علوم میں بھی صرف علم حدیث

①..... یہ حدیث شریف امام قاضی عیاض نے اپنی کتاب الشفا میں نقل کی ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے پیغمبر بھی آئے وہ سب خوب و اور خوش آواز تھے اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ دونوں چیزیں بھی دہر دہر سے زیادہ عطا فرمائی گئی تھیں اور آپ ان پہلو میں بھی سب سے فائق تھے۔

میں آپ کے امتیاز اور علو مقام کے قائل ہیں اور آپ کو اس دور کے صرف ایک ممتاز محدث کی حیثیت سے جانتے ہیں کہ حضرت ممدوح کا خاص امتیاز علوم کی جامعیت تھی اور وہ تھی ایسی جامعیت کہ اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس علم میں حضرت کی مہارت اور مناسبت نسبتاً زیادہ تھی۔

وسعت علم کے ساتھ وقت نظر:..... اس موقع پر بعض حضرات کی ایک اور غلط فہمی کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے کے ایک نامور عالم جنہیں حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خصوصیت سے بلا واسطہ واقف ہونے کا غالباً کبھی موقع نہیں ملا۔ ان کے متعلق میں نے سنا کہ کسی موقع پر انہوں نے حضرت کی تعریف کرتے ہوئے اپنے اسی خیال کا اظہار فرمایا کہ ان کا معاملہ بہت وسیع تھا اور چونکہ حافظہ بہت قوی تھا اسلئے آپ بذات خود ایک وسیع کتب خانہ تھے۔ لیکن نظر میں گہرائی نہیں تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ وسیع النظر اور کثیر المعلومات تو تھے لیکن دقیق النظر اور عمیق العلم نہیں تھے۔

یہ عاجز پورے وثوق اور بحمد اللہ پوری بصیرت کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ جن اہل علم و نظر کو حضرت کی علمی خصوصیات سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے انہیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت کے یہاں وقت نظر کا پلہ کسی طرح بھی وسعت نظر کے مقابلہ میں ہلکا نہیں تھا البتہ علم کی سطح ہمارے اس زمانہ کی عام سطح سے اتنی بلند تھی کہ نہ سمجھ سکے والے بھی معذور سمجھے جانے کے قابل ہیں ایک دفعہ خود فرمایا۔

”بعض اوقات بہت نیچے اتر کا بات کرتا ہوں لیکن پھر بھی لوگ نہیں سمجھتے“

یہ ایک بڑا علمی سانحہ ہے کہ حضرت ممدوح نے اپنے علم کی نشانی میں کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی لیکن اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہوئی کہ حضرت کو اہل زمانہ کی طرف سے مایوسی تھی تاہم بعض خاص خاص مسائل اور موضوعات پر جو چند رسالے خود آپ کے لکھے ہوئے ہیں ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی سطح زمانہ کی عام سطح سے کس قدر بلند ہے اور آپ کی نظر کتنی دقیق اور علم کتنا عمیق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانے کے بہت سے اہل علم اپنے کو ان رسالوں کے سمجھنے سے عاجز و قاصر پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ تعبیر و ادا میں کوئی اغلاق و تعقید ہے۔ بلکہ یہ صرف علمی سطح کے غیر معمولی تفاوت کا نتیجہ ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ آج کل کے بہت سے اہل علم حضرت امام محمد اور امام شافعیؒ کی کتابوں سے اتنی آسانی سے استفادہ نہیں کر سکتے جتنی آسانی سے متاخرین کی کتابوں سے وہ استفادہ کر لیتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت کا طرز فکر اور طرز استدلال بہ نسبت متاخرین کے متقدمین سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔

قرآن مجید میں تدبر و تفکر: علم کی گہرائی اور وقت نظر کا کچھ اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ حضرت نے اپنا یہ حال خود ایک دفعہ بیان فرمایا کہ:

”میں رمضان مبارک میں قرآن مجید شروع کرتا ہوں اور تدبر و تفکر کے ساتھ اس کو پورا کرتا چاہتا ہوں لیکن کبھی پورا نہیں ہوتا جب دیکھتا ہوں کہ آج رمضان المبارک ختم ہونے والا ہے تو پھر اپنے خاص طرز کو چھوڑ کر جو کچھ باقی ہوتا ہے اس دن ختم کر کے دور پورا کر لیتا ہوں۔“

یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ رمضان مبارک میں کبھی حضرت کے قریب رہنے کا اتفاق تو نہیں ہوا لیکن یہ معلوم ہے کہ آپ ”انزل فیہ القرآن“ والے اس مبارک مہینہ میں زیادہ وقت قرآن مجید ہی کی تلاوت اور تدبر و تفکر پر صرف فرماتے تھے۔ اس کے باوجود قرآن مجید ختم نہیں کر پاتے تھے۔ حدیث میں غور و تدبر: خود حضرت نے ایک دن بیان فرمایا:

”کہ میں نے غور و فکر کے ساتھ صحیح بخاری کے صرف متن کا تیرہ دفعہ بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ شرح یا حواشی کے ساتھ جو مطالعہ کیا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔“

قرآن مجید میں تدبر و تفکر کی مثالیں تو بہت سی سنی ہیں اور کتابوں میں بھی پڑھی ہیں۔ لیکن حدیث میں تفکر کی ایسی مثال نہ سنی نہ کتابوں میں کہیں نظر سے گزری۔

اور جن لوگوں کو حضرت کے درس حدیث سے کچھ مستفید ہونے کا موقع ملا ہے غالباً وہ سب اس کی شہادتیں دیں گے کہ آپ کے درس کا رنگ بھی یہی تھا کہ اس میں اسنادی و روایتی بحث و تنقید کے مقابلہ میں معنوی اور روایتی مباحث کم نہیں۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوتے تھے اور اس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ آپ نے صرف ایک صاحب روایت محدث کی حیثیت سے حدیث کے متون و اسانید ہی سے واقفیت حاصل نہیں کی ہے۔ اور اسی طرح یہ کہ آپ کے علم کا ماخذ و سرچشمہ حواشی و شروح ہی نہیں ہیں بلکہ ایک صاحب فکر و روایت اور دقیق النظر فقیہ کی طرح آپ نے احادیث کے معانی و مقاصد پر خود بھی بڑا گہرا غور کیا ہے اور چند خاص خاص مسکون پر حضرت کے جو بعض رسائل ہیں وہ بھی حضرت کی اس خصوصیت و جامعیت پر شاہد ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی قابل ذکر ہے جو شاید بہت سے اہل علم کے لئے ایک نیا انکشاف ہوا چھا ہے اس بہانہ سے وہ بھی قرطاس کی امانت بن جائے۔

علامہ نیمویؒ کی آثار السنن اور حضرت استاذؒ: حضرت مولانا ظہیر احسن شوق نیویؒ

اور ان کی معرکہ الآراء ناقص " آثار السنن " سے اور اس کی غیر معمولی اہمیت سے کم از کم حضرات اہل علم ضرور واقف ہوں گے۔ ہمارے زمانہ طالب علمی میں تو علمی اور درسی حلقوں میں اس کتاب کی دھوم مچی ہوئی تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محدثانہ طرز پر حقیقت کی تائید میں یہ کتاب ہمارے اس زمانے کا شاہکار ہے، افسوس یہ پوری نہیں ہو سکی اور اس کے پہلے دو حصے تالیف فرما کر علامہ مدوح اس عالم سے رحلت فرما گئے۔

حضرت استاد رحمۃ اللہ نے ایک دن درس میں اس کتاب کے متعلق یہ پورا واقعہ فرمایا کہ: "جس زمانہ میں مولینا ظہیر احسن صاحب نیوی رحمۃ اللہ علیہ "آثار السنن" تالیف فرما رہے تھے انہوں نے اس کے کچھ اجزاء حضرت استاد (یعنی حضرت شیخ الہند) کی خدمت میں اس غرض سے بھیجے کہ ملاحظہ فرما کر مشورے دے دیں اور جو اضافے فرمائے جاسکیں وہ اضافے فرمادیں۔ حضرت استاذؒ نے ملاحظہ فرما کر وہ اجزاء واپس فرمادیے اور ان کو میرا پتہ لکھ دیا کہ آپ اس مقصد کے لئے اس پتہ پر خط و کتابت فرمائیں میں اس زمانے میں اپنے وطن (کشمیر) میں رہتا تھا۔

مولینا ظہیر احسن صاحب نے حضرت استاذؒ کے حوالے سے مجھے خط لکھا اور اس طرح میری ان کی خط و کتابت شروع ہو گئی۔ اور پھر انہوں نے اپنی کتاب بھیجی شروع فرمائی۔ جتنی لکھ لیتے تھے وہ مجھے بھیج دیتے تھے اور میں ان کے حکم کی تعمیل میں اضافے کرتا تھا۔ میں نے جو اضافے کئے وہ مقدار میں ان کی اصل کتاب سے زیادہ تھے۔ لیکن میرے یہ اضافے زیادہ تر معنوی بحثوں سے متعلق تھے کیونکہ مولینا موصوف نے علل و اسانید کی بحثوں کے اضافہ کی گنجائش کسی کے لئے بہت کم چھوڑی تھی مگر چونکہ میری وہ معنوی بحثیں مولینا کے ذوق کی چیز نہیں تھی اور وہ اپنی کتاب میں خالص محدثین کے طرز پر علل و اسانید ہی سے بحث کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے میرے اس باب کے (یعنی علل و اسانید کے متعلق) اضافے تو قبول فرمائے اور کتاب میں لے لئے لیکن معنوی مباحث تمام تر حذف کر دیے۔

اس عاجز نے حضرت استاذؒ سے یہ پوری بات درس میں خود سنی ہے اور حضرت ہی کے ذریعہ یہ معلوم ہے کہ علامہ شوق نیوی جب تک رہے حضرت سے علمی مراسلت اور مشاورت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ حضرت استاذؒ ہی سے سنے ہوئے بعض جزئیات اس عاجز کو یاد بھی ہیں لیکن وہ خالص علمی باتیں ہیں اس مقالہ میں ان کا ذکر مناسب نہ ہوگا۔

علامہ نیویؒ حضرت استاذؒ کی نظر میں جب علامہ شوق نیویؒ کا ذکر آ گیا ہے تو اس واقعہ کا

اظہار بھی میرے لئے ضروری ہے کہ حضرت استاذ فن حدیث میں علامہ ممدوح کا مقام بہت بلند ثابت
تھے اور معرفت علمی و اسانید میں ہندوستان کے کسی دوسرے عالم کو ان کا عدیل و مثیل نہیں قرار دیا جاتا
تھے۔ اس عاجز کو خوب یاد ہے یہاں تک فرماتے تھے کہ مولینا ظہیر احسن صاحب حضرت مولانا ممدوح
صاحب (لکھنوی فرنگی محلی) کے شاگرد ہیں لیکن صناعت حدیث میں ان سے بہت فائق ہیں۔
اس سے یہ اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانے کے اکثر علمی حلقوں میں جو یہ بیماری آگئی
ہے کہ اپنے خاص حلقہ اور اپنی خاص جماعت سے باہر ان کو کوئی صاحب کمال نظری نہیں آتا اور
میدان میں وہ اپنے ہی حلقہ اور سلسلہ والوں کا جھنڈا اونچا رکھنا چاہتے ہیں۔ حضرت استاذ رحمہ اللہ
علیہ کو الحمد للہ یہ بیماری بالکل نہیں لگی تھی۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھیں یہ بڑی ہی خراب بیماری ہے۔
خیر، یہ باتیں تو اسطر ادا کر میں آگئیں، ورنہ میں حضرت استاذ کی علمی خصوصیات کا ذکر کر
رہا تھا۔ اب پھر وہیں آجائیے۔

یادداشت کے متعلق اپنے بعض تجربے:..... دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے کئی سال
بعد تک درس و تدریس اس عاجز کا مشغلہ رہا اور اس زمانہ میں کتابوں کے مطالعہ سے بھی کچھ زیادہ
شغف تھا۔ کبھی زیر درس کتابوں میں اور کبھی خارجی مطالعہ میں ایسے اشکالات بھی پیش آجاتے
تھے جن سے اعلیٰ کرنے سے اپنا غور و فکر عاجز رہتا تھا میں ایسے تمام اشکالات کو اپنی نوٹ بک میں
نوٹ کرتا رہتا تھا اور جب حضرت استاذ کی خدمت میں حاضری میسر ہوتی تو وہ نوٹ بک جبر
سے نکال کر اکثر پہلی ہی ملاقات کی مجلس میں حضرت کے سامنے اپنے وہ اشکالات عرض کرتا۔
حضرت میرے ہر سوال کا جواب اس طرح دیتے گویا اس سوال کے تمام اطراف پر آپ نے
خاص طور پر حال ہی میں غور فرمایا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس تجربہ کی شہادت ہر وہ شخص دے گا
جس نے کوئی علمی اشکال کبھی حضرت کے سامنے پیش کر کے جواب چاہا ہو۔

بہر حال مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ جب تک حضرت اس دنیا میں رہے میرا برابر یہ دستور رہا کہ
اپنے مطالعہ کے اشکالات کے علاوہ بعض دوسرے اہل علم و اصحاب درس کے اشکالات و سوالات
بھی ان سے دریافت کر کے میں اپنی نوٹ بک میں لکھ کر لے جاتا تھا۔ اگر یہ عرض کروں تو بے جا
نہ ہوگا کہ حضرت کی خدمت میں حاضری کے ہر موقع پر میری نوٹ بک کے یہ سوالات ہی حضرت
کے لئے میرا خاص ہدیہ ہوتا تھا جس کا میں بڑا اہتمام کرتا تھا اور حضرت کا معاملہ بھی یہ تھا کہ اگر کبھی
میں حاضر ہوا اور کسی وجہ سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور کچھ دیر خاموش بیٹھا تو حضرت خود فرماتے
تھے۔ مولوی صاحب کچھ پوچھنا ہے؟ اور اس کے بعد میں پوچھتا۔

خیر یہ تو تھی تمہید اب یادداشت اور قوت حافظہ کا واقعہ سنئے جس کے لئے مجھے یہ لمبی تمہید لکھنی پڑی۔ ایک دفعہ کی حاضری میں ترمذی شریف کی ایک عبارت کا میں نے حوالہ دیا اور عرض کیا کہ اس عبارت میں یہ اشکال ہے بہت غور کیا لیکن حل نہیں ہو سکا۔

فرمایا مولوی صاحب آپ کو یاد نہیں رہا مجھے خوب یاد ہے جس سال آپ دورہ میں تھے اس موقع پر میں نے بتایا تھا کہ یہاں ترمذی کے اکثر نسخوں میں ایک غلطی واقع ہو گئی ہے لیکن لوگ سرری طور پر گزر جاتے ہیں اور انہیں پتہ نہیں چلتا ورنہ جو اشکال آپ کو پیش آیا سب کو پیش آنا چاہئے۔ پھر فرمایا صحیح عبارت اس طرح ہے۔

بس سارا اشکال جس نے چکر میں ڈال رکھا تھا ایک منٹ میں رفع ہو گیا اللہ اکبر، یہ بات بھی یاد رہتی تھی کہ فلاں سال اس موقع پر سبق میں یہ بات بتلائی تھی۔

ایک واقعہ اور سنئے۔ سورہ النساء کے سولہویں اور سترہویں رکوع کی آیتیں چوری اور دھوکہ بازی کے ایک خاص واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں۔ اس واقعہ کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے مجھے غالب علی ہی کے زمانہ میں ایک خاص مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں معلوم کرنے کی ضرورت پڑی کہ کسی سن میں یہ واقعہ پیش آیا اور یہ آیتیں نازل ہوئیں؟ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں جو تفسیریں مجھے ملیں جن میں آیات سے متعلق روایات کو جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ میں نے ان سب کو دیکھ لیا مگر واقعہ کا زمانہ اور سن مجھے کہیں سے معلوم نہ ہو سکا۔ عاجز آ کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے فلاں واقعہ کے سن وقوع کی تلاش ہے کتابوں میں دیکھا مگر مجھے نہیں ملا۔

فرمایا کون کون سی کتابیں آپ نے دیکھیں؟ میں نے تفسیر ابن جریر وابن کثیر معالم وغیرہ چند تفسیروں کے نام لئے۔ فرمایا درمنثور میں نہیں دیکھا۔ میں نے عرض کیا کہ درمنثور کا نسخہ اس وقت کتب خانہ میں موجود نہیں تھا کہیں عاریت میں گیا ہوا ہے، اس لئے اس کو تو نہیں دیکھ سکا۔ فرمایا: جاؤ اس کو دیکھ لو، اس میں مذکور ہے۔

چنانچہ تلاش کر کے درمنثور کو دیکھا تو ابن سعد کی ایک روایت میں یہ صریح الفاظ اس میں موجود تھے۔

وَمَا ذَلِكَ فِي شَهْرِ رَجَبِ سَنَةِ اَرْبَعٍ كَمَا فِي وَاقِعَةِ مَاہِ رَجَبِ ۴ھ میں پیش آیا۔

گویا جو چیز بھی کسی کتاب میں حضرت نے دیکھی تھی وہ حافظہ کے خزانہ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی تھی۔

حدیث کے درس کے وقت صحاح ستہ اور ان کے علاوہ چند احادیث کی کتابیں حضرت کے سامنے رکھی رہتی تھیں اور جب کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آپ کو کسی حدیث کا حوالہ دینا ہوتا تھا تو

صرف رہانی حوالہ پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ تقریر جاری رکھتے ہوئے بے تکلف اسی کتاب پر ہاتھ جاتا تھا کہ بعض اوقات تو وہی صفحہ کھلتا تھا جس پر وہ حدیث ہوتی تھی ورنہ بس دو چار ورق ادھر سے یا ادھر سے الٹنے کے بعد وہ حدیث سامنے ہوتی تھی۔ جن حضرات نے یہ منظر نہیں دیکھا انہیں آج یہ سن کر غالباً حیرت ہوگی اور شاید بہت سوں کو باور کرنا بھی مشکل ہوگا۔ لیکن جن لوگوں کو حضرت کے درس میں چند روز بھی بیٹھنے کا موقع ملا ہوگا انہوں نے قریباً روزانہ سبق میں یہ عجوبہ دیکھا ہوگا۔

علمی اطمینان اور اتفاق:..... حضرت استاذ کے علمی امتیازات اور خصوصیات میں ایک نہایت اہم اور قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ جس مسئلہ میں آپ سے رجوع کیا جاتا آپ جواب اس طرح دیتے کہ گویا اس کے سارے پہلوؤں اور تمام مالہ و ماعلیہ پر آپ نے ماضی قریب ہی میں غور فرمایا ہے اور آپ بالکل مطمئن ہیں۔ شاید یوں ہو یا شاید یوں ہو والی بات آپ کے یہاں بالکل نہ تھی۔ فقہ حنفی کے بارہ میں اطمینان:..... جس سال یہ عاجز دورہ حدیث کا طالب علم تھا (اور وہی سال دارالعلوم دیوبند میں حضرت کے درس کا آخری سال تھا۔ شعبان کے مہینہ میں جیسا کہ طلبہ امتحان سے فارغ ہو کر اپنے وطن جانے والے تھے آپ نے ایک دن بعد نماز عصر تمام طلبہ سے بالعموم اور دورہ حدیث سے فارغ ہونے والے اپنے تلامذہ سے بالخصوص خطاب فرمایا اس میں من جملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بھی فرمائی۔

ہم نے اپنی زندگی کے پورے تیس سال اس مقصد کے لئے صرف کئے کہ فقہ حنفی کے موافق حدیث ہونے کے بارہ میں اطمینان حاصل کیا جائے۔ سو الحمد للہ اپنی اس تیس سالہ محنت اور تحقیق کے بعد میں اس بارہ میں مطمئن ہوں کہ فقہ حنفی حدیث کے مخالف نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جس مسئلہ میں مخالفین احناف جس درجہ کی حدیث سے استناد کرتے ہیں کم از کم اسی درجہ کی حدیث اس مسئلہ کے متعلق حنفی مسلک کی تائید میں ضرور موجود ہے اور جس مسئلہ میں حنفیہ کے پاس حدیث نہیں ہے اور اس لئے وہ اجتہاد پر اس کی بنیاد رکھتے ہیں وہاں دوسروں کے پاس بھی حدیث نہیں ہے۔

یہاں مجھے فقہ حنفی کے بارہ میں تو حضرت کا صرف اتنا ہی ارشاد نقل کرنا تھا جو دراصل حضرت نے ایک دوسری بات کے لئے بطور تمہید کے فرمایا تھا لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں وہ اصل بات بھی ذکر کر دی جائے جس کی یہ تمہید تھی۔

حضرت نے فقہ حنفی کے مسئلہ میں اپنی تیس سالہ محنت و تحقیق اور اس کے نتیجہ میں اپنے اس اطمینان کا ذکر فرمانے کے بعد خدام سے فرمایا سننے والے گوش دل سے سنیں کیا فرمایا۔ فرمایا

لیکن اب مجھے افسوس ہے کاش میرا یہ وقت دین کے اس سے زیادہ اہم اور زیادہ ضروری کام میں صرف ہوا ہوتا تو آخرت میں اس کے کام آنے کی زیادہ امید کر سکتا تھا۔
پھر اسی تقریر میں آپ نے فرمایا:

”میں نے اپنے فارسی اور عربی ذوق کو محفوظ رکھنے کے لئے ہمیشہ اردو لکھنے پڑھنے سے استراذ کیا یہاں تک کہ عام طور سے اپنی خط و کتابت کی زبان بھی میں نے عربی اور فارسی ہی رکھی لیکن اب مجھے اس پر بھی افسوس ہے کہ ہندوستان میں اب دین کی خدمت اور دین سے دفاع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اردو میں مہارت پیدا کی جائے اور باہر کی دنیا میں دین کا کام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انگریزی زبان کو ذریعہ بنایا جائے۔ میں اس بارہ میں آپ صاحبوں کو خاص طور پر وصیت کرتا ہوں۔“

آگے کسی موقع پر ان شاء اللہ میں اس کا مستقل ذکر کروں گا کہ حضرت استاذ کو اس زمانہ میں دو فتنوں کی طرف سے بڑی سخت فکر تھی۔ اندرونی فتنوں میں قادیانیت کا فتنہ اور خارجی فتنوں میں الحاد و مادہ پرستی کا فتنہ، اپنی زندگی کے اس دور میں حضرت کی دل کی خاص لگن بس یہی تھی کہ امت محمدیہ کو ان فتنوں کے طوفان سے محفوظ رکھنے کے لئے اہل عمل پوری تیاری اور طاقت سے میدان میں آئیں۔ اور حضرت سمجھتے تھے کہ یہ کام اس زمانہ میں اردو اور انگریزی ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے اس لئے ان دونوں زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کے لئے خاص طور سے فرمایا کرتے تھے۔ اسی سے ناظرین یہ بھی اندازہ فرما سکتے ہیں کہ خالص کتاب بین عالم ہونے کے باوجود آپ کے ذہن و فکر میں کتنی وسعت تھی اور آپ کی نظر میں وقت کے تقاضوں کی کتنی اہمیت تھی۔
خیر یہ تو گویا ایک جملہ معترضہ تھا ورنہ میں فقہ کے سلسلہ میں حضرت کی بعض علمی خصوصیات کا تذکرہ کر رہا تھا اب آگے اسی سلسلہ میں سنئے۔

فقہ میں آپ کا ایک خاص اصول:..... ایک موقع پر آپ نے فرمایا اکثر مسائل میں فقہ حنفی میں کئی کئی اقوال ہیں اور مرتجعین اور اصحاب فتویٰ مختلف وجوہ اسباب کی بناء پر ان میں سے کسی ایک قول کو اختیار کرتے اور ترجیح دیتے ہیں۔ میں اس قول کو زیادہ وزنی اور قابل ترجیح سمجھتا ہوں جو از روئے دلائل زیادہ قوی ہو یا جس کے اختیار کرنے میں دوسرے ائمہ مجتہدین کا اتفاق زیادہ حاصل ہو جاتا ہو۔ اسی سلسلہ میں فرمایا میرا اپنا اصول تو یہی ہے لیکن دوسرے اہل فتویٰ اپنے اصول پر جو فتویٰ لکھتے ہیں میں ان کی بھی تصدیق کر دیتا ہوں اور میری اس تصدیق کا مطلب یہ

ہوتا ہے کہ از روئے فقہ حنفی یہ جواب بھی صحیح ہے۔

بعض مسائل میں آپ کی خاص تحقیق وسعتِ علم و نظر اور خاص فقیہانہ فکر کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ بعض مسائل میں آپ کی تحقیق ہمارے زمانہ کے عام علماء احناف سے الگ تھی بلکہ شاید واقعہ کی زیادہ صحیح تعبیر یہ ہوگی کہ عام علماء و اہل فتویٰ کے لئے فقہ حنفی میں وہ ایک نئی علمی دریافت ہوتی تھی۔ اس کی کئی ایک مثالیں اس عاجز کو یاد ہیں لیکن ان میں سے ایک ایسی ہے جس کا ذکر اردو کے اس مقالہ میں بھی نامناسب نہ ہوگا۔

فقہ حنفی کا یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اگر دنیا کے کسی بھی گوشہ میں چاند دیکھا جائے تو دوسرے تمام مقامات پر اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ مثلاً اقصائے مغرب میں رمضان کا چاند ایک دن دیکھا گیا تو اگر شرعاً قابل اعتبار و رعبہ سے اس کی اطلاع اقصائے مشرق میں رہنے والوں کو پہنچ جائے تو ان کو بھی اسی حساب سے روزہ رکھنا ہوگا۔ خاص علمی اور فقہی تعبیر اس مسئلہ کی یہ کی جاتی ہے کہ حنفیہ کے یہاں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں اور دوسرے ائمہ کے یہاں اس کا اعتبار ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا عام طور سے علمی اور فقہی حلقوں میں حنفیہ کا یہی مذہب معلوم و مشہور ہے اور عموماً اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے حنفی فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں کچھ ایسا ہی لکھا ہوا بھی ہے حالانکہ ہیئت کے حساب سے یہ بالکل ناقابل فہم ہے۔

حضرت استاذ قدس سرہ کی تحقیق اس مسئلہ میں یہ تھی کہ عام مصنفین سے اس کی تعبیر میں لغزش ہوگئی اور اصل مسئلہ حنفیہ کا یہ ہے کہ ایک اقلیم میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں فرماتے تھے کہ مشرق و مغرب کے درمیان اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کرنا بدعت غلط ہے اور حضرت استاد اپنی اس تحقیق کے سلسلہ میں جہاں تک اب یاد پڑتا ہے ابن رشد کی بدایہ المجتہد اور فقہ حنفی کی کتابوں میں سے ہدایہ کا حوالہ بھی دیتے تھے۔

واضح رہے کہ پہلے تو یہ صرف ایک قابل غور علمی مسئلہ تھا جو محض معقولیت پسندوں کے لئے اشکال اور غلجان کا باعث ہوتا تھا لیکن اب یہ واقعی مسئلہ ہو گیا ہے کیونکہ اکثر ممالک عربیہ میں ہندوستان سے ایک دن پہلے چاند نظر آتا ہے اور ہیئت کے اصول پر ایسا ہی ہونا بھی چاہئے اور ہوائی جہاز جدہ سے پرواز کر کے ۸، ۹ گھنٹے میں بمبئی آ جاتا ہے اور ۱۲ گھنٹے سے کم میں دہلی آ سکتا ہے۔ پس یہ ہو سکتا ہے کہ مثلاً ۲۹ رمضان کی شام کو کچھ لوگوں نے جدہ میں عید کا چاند دیکھا اور اسی شب کو وہ ہوائی جہاز سے روانہ ہو کر صبح کو بمبئی پہنچے تو اگر اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کیا جائے تو ان لوگوں کی شہادت پر ہندوستان والوں کے لئے اس دن روزہ ختم کر کے عید منانے کا حکم دیا جائے گا۔ حالانکہ یہاں اس روز انیسواں ۲۹ بلکہ کبھی تو اٹھائیسواں ۲۸ ہی روزہ ہوگا اپنے زمانے کے

اکابر علماء و اہل فتویٰ کے متعلق سنا ہے کہ جب ان کے سامنے یہ واقعاتی اشکال اس مسئلہ کے متعلق پیش کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آجائے پھر اس کے سوا چاہہ نہیں کہ دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا جیسا کہ اس قسم کی ناگزیر صورتوں میں کیا جاتا ہے یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ اگر ان بزرگوں کو اس مسئلہ کے متعلق حضرت استاذ کی مندرجہ صدر تحقیق و تشخیص پہنچی ہوتی تو اس مسئلہ میں فقہ حنفی کو چھوڑ کر دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دینے کو وہ ناگزیر نہ سمجھتے۔

عم اسرار و حقائق:..... حضرت استاذ علم اسرار و حقائق میں بلاشبہ اس دور کے شیخ اکبر تھے شیخ مدوح کے علوم سے خاص مناسبت بھی تھی اور شیخ کے بہت سے نہایت اعلیٰ اور قیمتی افادات زیادہ تر ان کی مشہور کتاب ”فتوحات مکیہ“ کے حوالہ سے درس میں بیان بھی فرمایا کرتے تھے۔ اور بلاشبہ بعض مشکل و غنی حقیقتوں کے بارہ میں ان سے بڑا انشراح اور اطمینان حاصل ہوتا تھا۔

حضرت استاذ کے شاگرد رشید مولینا بدر عالم صاحب میرٹھی (مقیم حال مدینہ طیبہ) کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے پہلے انہوں نے فیض الباری میں بھی حضرت کے اس سلسلہ کے افادات کا خاصا حصہ لے لیا تھا اور اب حدیث کی جو ایک نئی جامع کتاب وہ خود مرتب فرما رہے ہیں جو ان ہی کے اردو ترجمہ اور مفصل تشریحی نوٹوں کے ساتھ ندوۃ المصنفین دہلی سے ترجمان السنۃ کے نام سے شائع ہو رہی ہے اور پہلی دو جلدیں شائع بھی ہو چکی ہیں۔ اس میں بھی انہوں نے حضرت استاذ کے خاص الخاص علی شعبہ کے نہایت گراں قدر افادات کو اردو میں منتقل کرنے کی اور غیر عالم اردو خوانوں کو بھی سمجھا دینے کی بڑی مبارک اور کامیاب کوشش کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ اکبر کے مضامین کو صحیح و سالم اور محتاط طریقہ پر اردو جیسی کسی زبان میں منتقل کر دینا یقیناً بڑا مشکل کام ہے مگر ترجمان السنۃ کے ابتدائی ابواب ہی کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولینا بدر عالم صاحب کے لئے اس کو کس حد تک آسان فرمادیا ہے۔

جدید مغربی علوم پر بھی نظر:..... مصر والوں نے جدید مغربی علوم پر عربی میں جو کتابیں شائع کی ہیں اور مختلف مغربی زبانوں سے جو تراجم کئے ہیں حضرت استاذ ان کے ذریعہ ان نئے علوم اور نئی تحقیقات سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے خاص طور سے طبعیات میں یورپ نے جو علمی ترقی کی ہے اس کے معترف اور اس کے افادی پہلو کے قدردان تھے اور اسی وجہ سے مشہور مصری فاضل طنطاوی جوہری کی تفسیر جواہر القرآن کے مطالعہ اور اس سے علمی استفادہ کا مشورہ دوسرے اہل علم کو بھی دیتے تھے حالانکہ اس میں بہت سی پیریں ایسی بھی ہیں جو سخت ناپسندیدہ ہیں۔

سلسلہ درس کی بعض قابل ذکر چیزیں:..... جو طلبہ صرف ونحو کی خامی اور عربی استعداد کی کمزوری کی وجہ سے حدیث صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے اور اعراب میں غلطیاں کرتے تھے حضرت استاذ ان کے لئے حدیث پڑھنا جائز نہیں سمجھتے تھے اسی طرح اگر طالب علم سے سبق کی قرأت میں کسی ایسے راوی کے نام میں غلطی ہوتی جو سلسلہ سند میں بار بار اور کثرت سے آتا تو اس سے بھی آپ کو بڑی سخت لذت ہوتی تھی اور گویا یہ تکلیف آپ کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ ایک دن ترمذی شریف کا سبق ہو رہا تھا۔ ایک طالب علم نے عبارت پڑھنی شروع کی شاید پہلی یا دوسری حدیث تھی۔ سلسلہ سند میں آیا عن الشعمی اس بے چارہ نے بجائے شعمی کے شعمی پڑھا۔ حضرت استاذ نے تصحیح فرماتے ہوئے فرمایا عن الشعمی لیکن اس بندہ خدا کی زبان سے پھر وہی نکلا عن الشعمی۔ حضرت نے اس وقت سبق سے انٹھا دیا اور فرمایا کہ جو لوگ اتنے ناقص الاستعداد اور کم فہم ہوں کہ روزانہ سند میں آنے والے راویوں کے صحیح ناموں سے بھی واقف نہ ہوں اور بار بار بتلانے سے بھی نہ سمجھ سکیں ان کو دورہ حدیث میں شریک نہیں ہونا چاہئے۔ صحیح قسم کے طالب علمانہ سوالات سے حضرت بہت خوش ہوتے تھے اور بڑی بشاشت کے ساتھ جواب مرحمت فرماتے تھے لیکن مہمل قسم کے اور لایعنی یا غیر متعلق سوالات کی بالکل گنجائش اور اجازت نہ تھی۔ جس سال یہ عاجز دور حدیث میں تھا اس سال دورہ میں تقریباً سوطا بعلم تھے ان میں سے ۵۴ کو حضرت نے خود متعین فرمایا تھا کہ صرف یہی سوال کیا کریں اور ان کے علاوہ جس کو سبق کے سلسلہ میں کچھ پوچھنا ہو وہ پہلے ان کو بتا دے اگر یہ اس کو پیش کرنے کے قابل سمجھیں تو پیش کریں حضرت کے اس طرز عمل کی وجہ سے کسی فضول اور لایعنی بات میں بالکل وقت ضائع نہیں ہوتا تھا میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرت کا یہ ہمیشہ کا رویہ تھا یا اس سال یہ طرز عمل اختیار فرمایا تھا حضرت استاذ قدس اللہ سرہ کے متعلق اس مقالہ میں ذکر کرنے کے لائق اور درس سلسلہ کی جو باتیں اس وقت یاد آئیں وہ یہی تھیں جو حوالہ قلم ہو چکیں اب زندگی کے بعض دوسرے شعبوں کے متعلق اسی طرح کی بعض جستہ جستہ چیزیں جو حافظہ میں ہیں وہ بھی ہدیہ ناظرین کرام ہیں۔

دو فتنوں کا شدید احساس:..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور آپ کی امت کے بارہ میں آپ کو دو فتنوں کی طرف سے بڑی گہری فکر تھی۔ خارجی فتنوں میں الحاد و مادہ پرستی کا مغربی فتنہ جو اقوام مغرب کے سیاسی غلبہ اور علوم و فنون میں ان کی بالاتری کی وجہ سے تمام عالم میں چھایا جا رہا ہے اور داخلی و اندرونی فتنوں میں مسیلہ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا فتنہ ان دونوں فتنوں کی شدت احساس سے آپ بے چین رہتے تھے اور ان کے مقابلہ اور امت کی ان سے حفاظت کرنے کے واسطے تباہی کرنے کے لئے آپ طلبہ کو بڑے درد کے ساتھ

زنجبیل دیتے تھے اور اس کے لئے درس کے علاوہ آپ مستقل تقریریں بھی کرتے تھے بلکہ اس زمانہ میں حضرت کی تقریروں کا موضوع عموماً یہی ہوتا تھا۔

قادیانی فتنہ سے آپ کی غیر معمولی بے چینی:..... خاص طور سے مؤخر الذکر قادیانی فتنہ کے بارے میں آپ کی فکر اور بے چینی کا جو حال تھا جن لوگوں نے دیکھا نہیں وہ اس کا انداز نہیں کر سکتے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے مختلف علاقوں میں مختلف شکلوں میں ارتداد کی جو وبا پھیلی تھی اور خاص کر مسلمانہ کذاب کی جھوٹی نبوت پر ایمان لانے کا فتنہ جو اس وقت ایک دم زور پکڑ گیا تھا اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی بے چینی اور حرارت ایمانی کا ذکر جو روایات میں آتا ہے حضرت استاذ قدس سرہ کے احوال میں بالکل اس کی جھلک نظر آتی تھی اور اس زمانہ میں حضرت اپنی اکثر تقریروں میں اس فتنہ ارتداد کے زمانہ کے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وہ ایمان افروز جملہ جو آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس وقت فرمایا تھا جب مرتدین کے خلاف جنگ کے بارہ میں مصلحت اندیشی سے کام لینے کا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو انہوں نے مشورہ دیا تھا۔ وہ جملہ کتب حدیث و سیر ہیں آج تک محفوظ ہے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقام صدیقیت کی شہادت دے رہا ہے اس کے الفاظ جو حضرت استاذ اس زمانہ میں اکثر دہرایا کرتے تھے یہ ہیں۔

”اجار فی الجاہلیۃ و خوار فی الاسلام اند قد انقطع الوحی و تم

الدین ینقص و انا حی“ ❶

بہر حال قادیانی فتنہ کی فکر سے حضرت استاذ کی سب سے بڑی فکر تھی اور اس معاملہ میں آپ کا وہ حال تھا جو ان بندگان خدا کا ہوتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ اپنا خاص کوئی کام لینا چاہتا ہے اور پھر اس کی فکر اور اس کے لئے بے چینی ان پر طاری کر دیتا ہے۔

ایک دفعہ حضرت استاذ نے قادیانیت سے متعلق اپنے تین خواب سنائے تھے جو آپ نے دس دس سال کے فاصلے سے دیکھے تھے۔ اپنی اس نالائقی پر آج سخت رنج و افسوس ہے کہ نہ کہیں اس کو نوٹ کیا اور نہ یاد رکھا اجمالاً صرف اتنا یاد ہے کہ پہلا خواب آپ نے قیام دہلی کے زمانہ میں دیکھا تھا دوسرا اس سے ٹھیک دس سال بعد اور تیسرا اس کے ٹھیک دس سال بعد دیکھا تھا۔

ان تینوں خوابوں میں آپ کو پنجاب کے اس متکبر کذاب کے فتنہ سے امت محمدیہ کے ایمان کی

❶ مطلب یہ ہے کہ تم جاہلیت میں تو بڑے سخت اور زور آور تھے اور آج اسلام کی حالت میں ایسی کمزوری اور نامردی کی باتیں کرتے ہو نبوت ختم ہو چکی ہے وحی کی آمد کا سلسلہ ختم ہو چکا اور دین ہر طرح مکمل ہو گیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں دنیا میں زندہ رہوں اور دین میں قطع و برید ہو۔

حفاظت کے لئے جدوجہد کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور اس راستہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد کی بدولت
تھی مجھے اجمالا اتنا ہی یاد رہ گیا ہے۔ حضرت نے ایک موقع پر پوری تفصیل سے یہ تینوں خواب
سنائے تھے شاید حضرت کے خدام اور تلامذہ میں سے کسی اور کو یاد ہوں۔

اس فقہ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو کام حضرت استاذ سے لیے ان کا ذکر اچھی خاصی تفصیل
کے ساتھ جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اپنے ایک مستقل مضمون میں کر چکے ہیں تاہم اس
سلسلہ میں دو تین باتیں ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

قادیانی فقہ کے ظہور نے جن مسائل اور مباحث پر گفت شنید کا سلسلہ پیدا کر دیا ہے ان میں
مسئلے مختلف وجوہ و اسباب سے عملی طور پر کچھ مشکل ہیں یعنی ان میں لوگوں کے لئے مغالطہ کھانے
کی گنجائش بہ نسبت دوسرے مسئلوں کے کچھ زیادہ ہے ایک مسئلہ حیات مسیح علیہ السلام۔ اور دوسرا
ایمان و کفر کے حدود کا مسئلہ۔

یہ دوسرا مسئلہ اگرچہ فی نفسہ مشکل نہیں ہے بلکہ سیدھی سادی بات ہے لیکن کچھ تو مسئلہ کے بعض
پہلوؤں کی بعض مبہم اور غیر واضح تعبیروں نے اور کچھ تکفیر جیسے سنگین معاملہ میں بعض لوگوں کی بے
احتیاطیوں نے مسئلہ کو اچھا خاصا مشکل بنا دیا ہے اور اس میں ایسی الجھنیں پیدا کر دیں کہ بہت سے لوگ
خواہ مخواہ اس میں الجھ جاتے ہیں حضرت استاذ نے ان دونوں مسئلوں کی طرف خود توجہ مبذول فرمائی۔

مسئلہ حیات مسیح پر پہلے ایک رسالہ عقیدۃ الاسلام فی حیۃ عیسیٰ علیہ السلام لکھا اس کے بعد
بطور اس کے حواشی یا ضمیمہ کے دوسرا رسالہ تحیۃ الاسلام تالیف فرمایا یہ دونوں عربی زبان میں ہیں اور
جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ حضرت کا طرز فکر اور طرز بیان واستدلالات متاخرین کا
نہیں ہے جس کا سمجھنا ہم جیسوں کے لئے زیادہ آسان ہوتا ہے بلکہ ائمہ متقدمین کا سا ہے اس لئے
افسوس ہے کہ ہر عربی دان کیلئے بھی ان دونوں رسالوں کو پوری طرح سمجھ لینا آسان نہیں ہے لیکن
اس میں شبہ نہیں کہ جو سلیم القلب ان دونوں رسالوں کو سمجھ کر پڑھ لے اس کو ان شاء اللہ اس میں ذرا
برابر شبہ نہیں رہیگا کہ قرآن مجید کی قطعی شہادت قادیانیوں کے دعوے مہمت مسیح کے خلاف ہے اور
قادیانیوں کی طرف سے جو سینکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات اس مسئلہ پر لکھے گئے ہیں۔ ان کی بنیاد لکھنے
والوں کی جہالت پر ہے یا علمی خیانت اور دھوکہ بازی پر۔

جس سال یہ عاجز دارالعلوم دیوبند میں دورہ حدیث کا طالب علم تھا اسی سال ممالک عربیہ میں غالباً
مصر کے ایک بڑے وسیع انظر عالم اور ممتاز فاضل جو مغربی علوم میں بھی خاص دستگاہ رکھتے تھے اور
جرمنی میں ایک عرصہ تک ان کا قیام بھی رہا تھا دیوبند تشریف لائے تھے اور دارالعلوم میں چند روز قیام

فرمایا تھا ان کی تحریف آوری کا باعث جیسا کہ اس قوت سنا تھا صرف یہ ہوا تھا کہ حضرت استاذ کے رسالہ ”عقیدۃ الاسلام“ کا نسخہ کہیں ان کی نظر سے گزرا اس کو دیکھنے کے بعد انہوں نے ضروری سمجھا کہ اس علم کا آوری اگر دنیا میں کہیں زندہ موجود ہے تو مجھے اس سے ضرور ملنا چاہئے۔

دوسرے مسئلہ کفر و اسلام کے حدود پر حضرت استاذ نے رسالہ ”اکفار الملحدين فی شیعہ و دریات الدین“ تالیف فرمایا یہ بھی عربی میں ہے اور ہر عربی دان کے لئے یہ بھی سہل الفہم میں نہیں ہے لیکن کفر و اسلام کے حدود کی ایسی تنقیح غالباً اس سے پہلے نہیں ہوئی اس کو سمجھ کر پڑھنے کے بعد اس میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کر کے اور اس کی امت نے اس کو نبی مان کے اپنے کو اسلام کے وسیع دائرہ سے اس طرح نکال لیا ہے کہ جو شخص محمد رسول اللہ کے لائے ہوئے دین پر ایمان نہیں رکھتا ہو وہ اب کسی طرح ان لوگوں کو مسلمان میں شمار نہیں کر سکتا اور اگر وہ قادیانیت اور قادیانیوں سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود ایسا کرے گا تو اس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے بعض اہم حصوں کی تکذیب یا آپ کی بعض واضح تعلیمات میں تحریف کرنی پڑے گی۔ اگرچہ وہ اپنی کج فہمی یا نادانی کی وجہ سے اپنی اس پوزیشن کو سمجھتا نہ ہو۔

”اکفار الملحدين“ کا تعلق چونکہ کفر و اسلام کے مسئلہ سے تھا اور اس میں مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی امت پر کفر کا حکم لگایا گیا تھا اور بلاشبہ یہ بہت اہم معاملہ تھا اس لئے حضرت نے یہ مناسب سمجھا کہ اس زمانے کے دوسرے اکابر اور شاہیر اہل علم کی آراء بھی اس کے بارہ میں حاصل کی جائیں۔ چنانچہ کچھ اکابر اہل علم مثلاً حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری وغیرہ کی آراء تو پہلے ہی ایڈیشن میں شامل کر دی گئی تھیں اور اس عاجز کے پاس اسی ایڈیشن کا نسخہ ہے لیکن دوسرے حلقوں کے بعض علماء و افاضل کی رائیں اور تصدیقیں بعد میں حاصل ہوئی تھیں۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمن ایڈیشن کی اشاعت کے کافی عرصہ بعد موصوف کی تصدیق موصول ہوئی تھی مگر مجھے معلوم نہیں کہ بعد کے ایڈیشنوں میں بعد والی وہ تصدیقات شامل ہوئیں یا نہیں اگر نہیں شامل ہوئی ہیں اور کہیں محفوظ ہیں تو ان کو شامل ہونا چاہئے۔

الغرض قادیانی فتنہ کی غارت گری سے محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کے ایمان کی حفاظت کے سلسلہ میں ایک کام تو آپ نے یہ کیا کہ ان دو مسئلوں کو خود صاف کیا۔ لیکن چونکہ اردو میں لکھنے کی حضرت کو عادت نہ تھی اس لئے مجبوراً یہ دونوں رسالے عربی میں لکھے اور اس امید پر لکھے کہ خود علماء کے ذہن جب ان دو مشکل مسئلوں کے بارہ میں ان رسالوں سے صاف مطمئن ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ جن کو توفیق

دیگا وہ ان کے مضامین کو حسب ضرورت اردو وغیرہ کی زبانوں میں بھی منتقل کر دیں گے۔

ایک رسالہ آپ نے مسئلہ ختم نبوت پر خاتم النبیین کے نام سے فارسی زبان میں بھی تحریر فرمایا اور آپ نے خصوصیت سے اپنے وطن کشمیر کی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھا کیونکہ وہاں کے جس طبقہ کو آپ سمجھانا چاہتے تھے اس کے لئے آپ کے نزدیک فارسی زبان ہی اچھا ذریعہ بن سکتی تھی۔ ان رسالوں کے علاوہ آپ کی فکر اور بے چینی نے آپ کے تلامذہ کی ایک اچھی خاصی تعداد کو اس طرف متوجہ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان سے اس فتنہ کی انسداد میں مختلف شکلوں میں بہت کچھ کام لیا جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے جس مضمون کا ابھی اوپر میں نے تذکرہ کیا ہے اس سے ناظرین کو اس کی کچھ تفصیل معلوم ہوگی۔

سلوک و تصوف:..... میں عرض کر چکا ہوں کہ علمی شغف و انہماک اور علمی کمال کا آپ پر اتنا غلبہ تھا کہ دوسرے تمام کمالات اور زندگی کے دوسرے پہلو اس کے نیچے بالکل دبے ہوئے تھے چنانچہ آپ کی زندگی کا وہ بلند ترین پہلو بھی جس کو سلوک و تصوف سے تعبیر کرنا چاہیے اس علمی کمال اور شغف علمی سے دبا ہوا تھا اسی وجہ سے بہت سے لوگ آپ کی زندگی کے اس رخ سے بالکل ناواقف ہیں یہ عاجز بھی کچھ زیادہ واقف نہیں ہے لیکن اجمالاً اتنا ضرور جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دولت سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور یقیناً آپ آراستہ باطن اصحاب احسان میں سے تھے۔ حضرت گنگوہی مرقدہ سے مجاز بھی تھے لیکن اس لائن کی باتیں کرنے کی عادت نہ تھی۔ البتہ ایک دفعہ ایک واقعہ سنایا اور اس سلسلہ میں جو کچھ جوش آگیا تو ایک آدھ بات ہم لوگوں کو ایسی بھی سنیں میرا آگلی جس سے کچھ سمجھا جا سکے کہ اس فضا میں بھی حضرت استاذ کی پرواز کتنی بلند ہے۔ جو واقعہ حضرت نے سنایا وہ یہ تھا۔

فرمایا کہ ایک دفعہ میں کشمیر سے یہاں کے لئے چلا۔ راستہ کی کافی مسافت گھوڑے پر سوار ہو کر طے کرنی پڑتی تھی۔ راستہ میں ایک صاحب کا ساتھ ہو گیا، یہ پنجاب کے ایک مشہور پیر صاحب کے مرید تھے اور ان ہی کے پاس جا رہے تھے یہ مجھ سے اپنے اس پیر صاحب کا اور ان کے کمالات اور کرامات کا تذکرہ راستہ بھر کرتے رہے۔ ان کی خواہش اور ترغیب یہ تھی کہ میں بھی ان پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں اور اتفاق سے وہ مقام میرے راستے میں بھی پڑتا تھا میں نے بھی ارادہ کر لیا جب ہم دونوں پیر صاحب کی خانقاہ پر پہنچے تو ان صاحب نے مجھ سے کہا کہ نئے آدمیوں کو اندر حاضر ہونے کے لئے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے میں پہلے اندر جا کر آپ کے لئے اجازت لے لوں چنانچہ وہ اندر تشریف لے گئے۔ ان بزرگ نے اطلاع پا کر

خود اپنے صاحبزادے کو مجھے لینے کے لئے بھیجا اور اکرام سے پیش آئے خود ایک تخت پر بیٹھے ہوئے تھے باقی سب مریدین و طالبین نیچے فرش پر تھے مگر مجھے اصرار سے اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا کچھ باتیں ہوئیں اس کے بعد اپنے مریدین کی طرف متوجہ ہو گئے اور اپنے طریقہ پر ان پر توجہ دانی شروع کی اور اس کے اثر سے وہ بے ہوش ہو ہو کر لوٹے اور تڑپنے لگے۔ میں یہ سب دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ مجھ پر بھی یہ حالت طاری ہو سکے تو مجھ پر بھی آپ توجہ فرمائیں انہوں نے توجہ دینی شروع کی اور میں اللہ تعالیٰ کے اسم پاک کا مراقبہ کر کے بیٹھ گیا بے چاروں نے بہت زور لگایا اور بہت محنت کی لیکن مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا کچھ دیر کے بعد انہوں نے خود ہی فرمایا کہ آپ پر اثر نہیں پڑ سکتا۔

حضرت استاذ نے یہ واقعہ اتنا ہی نقل فرمایا اور اس کے بعد ایک غیر معمولی جوش کے ساتھ فرمایا۔ کچھ نہیں ہے لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے ایک کرشمہ ہے اور کچھ مشکل بھی نہیں، معمولی مشق سے ہر ایک کو حاصل ہو سکتا ہے ان باتوں کا خدا رسیدگی سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر اسی سلسلہ میں اور اسی جوش کی حالت میں فرمایا:

”اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو انشاء اللہ تین دن میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز سنائی دینے لگے۔ لیکن یہ بھی کچھ نہیں اصل چیز تو بس احساس کیفیت اور شریعت و سنت پر استقامت ہے۔“

اس ایک موقع کے سوا حضرت سے کبھی کوئی ایسی بات سننا اس عاجز کو یاد نہیں جس سے حضرت کے اس باطنی کمال کا کچھ سراغ ہم کو ملا ہو۔

اپنے بعض اکابر سے خصوصی تاثر:..... جیسا کہ میں عرض بھی کر چکا ہوں سلوک و تصوف کے سلسلہ کی باتیں کرنے کی حضرت استاذ کی عادت نہیں تھی۔ کم از کم اس عاجز کا علم تجربہ تو یہی ہے اس لئے اس سلسلہ کے اپنے اکابر کے خاص احوال و واقعات یا ان کی زندگی کے خاص اس شعبہ کے متعلق اپنے تاثرات حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ سے سننے کا اہم نیاز مندوں کو کبھی شاذ و نادر ہی اتفاق ہوتا تھا ایک ہی دفعہ کی یاد ہے درس ہی میں کسی سلسلہ میں فرمایا۔

ہم یہاں آئے یعنی کشمیر سے ہندوستان تو دین حضرت گنگوہیؒ کے یہاں دیکھا۔ اس کے بعد حضرت استاذ (یعنی حضرت شیخ الہندؒ) اور حضرت رائے پوری (یعنی شاہ عبدالرحیم صاحبؒ) کے یہاں دیکھا اور اب جو دیکھنا چاہے وہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب کے یہاں جا کر دیکھے۔

اپنے سلسلہ کے ان اکابر کے علاوہ ہم عصر مشائخ میں سے دو اور بزرگوں کے بارہ میں بھی حضرت استاذ کے بہت بلند کلمات اس عاجز کو یاد ہیں۔ ایک حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب مجددی نقشبندی اور دوسرے حضرت مولانا احمد خان صاحب مجددی نقشبندی۔ ان دونوں بزرگوں کے متعلق حضرت فرماتے تھے کہ اس عصر میں یہ نقشبندی سلوک کے امام ہیں۔

یہ دونوں بزرگ ضلع میانوالی کے تھے دونوں کے وصال کو کچھ عرصہ ہو چکا ہے دونوں ایک ہی شیخ کے تربیت یافتہ اور مجاز تھے لیکن بعض مسائل میں نقطہ نظر کے فرق کی وجہ سے درمیان میں کچھ بعد پیدا ہو گیا تھا لیکن حضرت استاذ دونوں کو سلوک کا امام مانتے تھے یہ عاجز بھی ان دونوں بزرگوں کی زیارت سے مشرف ہوا ہے واللہ الحمد والحمد۔

بعض شائل نبوی کی جھلک..... اگرچہ شائل و اخلاق میری اس تحریر کا موضوع نہیں ہے غالباً ان چیزوں پر کوئی اور صاحب مستقلاً لکھیں گے لیکن یہاں پہنچ کر حضرت استاذ کی دو تین عادتیں ذکر کرنے کو بھی بے اختیار جی چاہتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے جو اخلاق و شائل کتب حدیث میں روایت کئے گئے ہیں ان میں ایک یہ عادت مبارکہ بھی نقل کی گئی ہے کہ آپ بہت زیادہ خاموش رہتے تھے (گویا بلا ضرورت بولتے ہی نہ تھے) حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

”كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَوِيلَ الصَّمْتِ“

یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ اس مبارک عادت کا جیسا کامل نمونہ حضرت استاذ کو دیکھا ایسا کوئی اور دیکھنا یا نہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کو صرف علمی و دینی افادہ و استفادہ کے لئے اور ناگزیر ضروری باتوں ہی کے لئے زبان دی گئی ہے۔

اور اس خاموشی میں تنفس کی منضبط کیفیت اور ایک خاص نوعیت محسوس کرنے والے صاف محسوس کر لیتے تھے کہ پاس اکٹھا ۱ کے شغل میں برابر مشغول اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات مبارکہ می صحابہ کرامؓ ذکر فرماتے ہیں کہ

مسکراتے کی تو بہت زیادہ عادت تھی لیکن کھل کھلا کر ہنستے کبھی نہیں دیکھا بالکل یہی حال حضرت استاذ کا تھا۔

۱۔ سو فیہ کے اشغال میں سے صرف پاس انھاس کے متعلق آپ کا خیال تھا کہ انکی اصل حدیث و سنت سے کچھ معلوم ہوتی ہے اس لئے خود اپنا شغل بھی تھا اور رجوع کرنے والے نیاز مندوں کو تلقین بھی فرماتے تھے۔

اس زمانہ میں غیبت کی بیماری کس قدر عام اور متعدی ہو گئی ہے اور اس سے اور اس کے اڑتے ہوئے جراثیم سے محفوظ رہنا کتنا مشکل ہو گیا ہے اس کا اندازہ بہت سے حضرات کو شاید نہ ہو لیکن اس عاجز کو خوب ہے اور اسلئے میرا یقین ہے کہ اللہ کا جو بندہ اس دور میں غیبت سے محفوظ ہو وہ اللہ کی خاص حفاظت میں ہے اور یہ اس کی بڑی کرامت ہے۔

مگر حضرت استاذ قدس سرہ کو الحمد للہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے غیبت سے زبان کو ایسا محفوظ کیا تھا کہ سبھی اشارۃً یا کنایۃً بھی غیبت کی قسم کی کوئی بات سننا یا نہ سنیں بلکہ یہ یاد ہے کہ حضرت کے سامنے کسی نے غیبت کی قسم کی کوئی بات شروع کی اور حضرت نے فوراً روک دیا۔

حضرت استاذ کے متعلق بس یہی کچھ منتشر باتیں اسی وقت اس مقالہ میں ذکر کے قابل یاد آئیں جو حوالہ قلم و قریط اس کردی گئیں

(منقول از حیات انور)



حضرت امام العصر شاہ صاحب

اور

ان کی تصانیف

از حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ

(سابق شیخ الحدیث و ناظم اعلیٰ جامعہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی پاکستان)

مولانا بنوری رحمۃ اللہ حضرت شاہ صاحب کے مایہ ناز شاگرد اور آپ کے علوم و معارف کے بہترین وارث تھے۔ پہلے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں شیخ الحدیث اور مجلس عملی ڈابھیل کے رکن اعلیٰ رہے اور پھر جامعہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی میں شیخ الحدیث اور ناظم اعلیٰ کے فرائض انجام دے رہے تھے علم و عمل اور مکارم اخلاق میں فائق الاقران تھے، برصغیر کے ممتاز ادیب و مصنف اور وسیع المعلومات عالم دین تھے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے سعادت مند تلامذہ میں سے جس اقبالہ کو سب سے پہلے اپنے استاد جمیل کے سوانح حیات مرتب کرنے کا شرف حاصل ہوا وہ ان ہی کی ذات گرامی تھی۔ انہوں نے ۱۳۵۵ھ میں فقہ العصر من حدی الشیخ الانور کے نام سے عربی زبان میں حضرت شاہ صاحب کی سوانح حیات تالیفات فرما کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔ اس کے علاوہ ان کی متعدد گرانقدر تالیفات شائع ہو چکی ہیں جن میں مبسوط مقدمہ مشکلات القرآن۔ بغیۃ الاریب فی مسائل القبلة و المحارب اور شرح ترمذی شریف قابل ذکر ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے قابل فخر شاگرد اور علم و فضل کے اس بحر ذخار کے متعلق یہاں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ حضرت مرحوم جب فیض الباری کی اشاعت کی غرض سے مصر تشریف لے گئے تو ایک ملاقات میں شیخ طنطاوی جوہری کی تفسیر جواہر القرآن پر صاحب تفسیر کے رد و تنقید کی، بے پناہ علم و فضل کے باوجود شیخ طنطاوی اس تنقید سے اتنے متاثر اور مرعوب ہوئے کہ بار بار اپنی زبان سے فرمایا: انت ملک نزلت من السماء لاصلاحی ”آپ تو فرشتہ ہیں جو آسمان سے میری اصلاح کی غرض سے نازل ہوئے ہیں“

۱۱ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو علوم و معارف کا یہ آفتاب بھی غروب ہو گیا رحمۃ اللہ رحمۃ واسعہ کونہ

علمی دنیا کی تاریخ میں ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی شخص کے ذاتی کمالات و علوم کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دنیا ان کے کمالات سے واقف بھی ہو جائے اللہ تعالیٰ کی اس عظیم مخلوق میں اس کی وسیع سر زمین میں کتنی ایسی ہستیاں گزری ہوں گی جن کا صحیح علم اور ان کی علمی گہرائیوں کا صحیح اندازہ کسی کو نہ ہوا ہو۔

اور یہ بھی ایک مسلمہ امر ہے کہ کوئی شخص تصانیف کے محض عددی کمیت و اکثریت کی بنا پر علامہ عصر بن جائے ایسا نہیں ہو سکتا علماء اسلام کے علمی سمندر میں کثرت سے ایسے بیش بہا موتی موجود ہیں جو کبھی کسی تاج مرصع کی زینت نہیں بنے۔

قدرت کے معدنی کائنات میں ایسے بے بہا جواہرات موجود ہیں کہ کوہ نور نامی ہیرے اور اس کی چمک و تابانی کے سامنے ماند پڑ جائیں۔

وان من شینی الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم (الحجرات)

حافظ حدیث امام تقی الدین ابن دقیق العید رحمہ اللہ جیسے محقق عصر جن کے متعلق حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی فرماتے ہیں کہ امت محمدیہ میں ایسا دقیق النظر محدث نہیں گزرا۔ اگر ان کی کتاب احکام الاحکام یا کتاب الامام شرح الامام کی ناقص نقول کتابوں میں نقل نہ ہوتیں تو شاید موجودہ نسل کو ان کے کمالات کا کچھ علم بھی نہ ہوتا کیا کوئی یہ گمان کر سکتا ہے کہ شیخ جلال الدین سیوطی مصری اپنی کثرت مصنفات کی وجہ سے ابن دقیق العید جیسے محقق روزگار سے سبقت لے جائیں گے۔

بسا اوقات دفتر تاریخ کی ورق گردانی سے بھی اس کا پورا پورا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے، معاصرین فیض یافتہ اور چشم دید کمالات کے مشاہدہ کرنے والوں کو جن علمی حقائق کا انکشافات ہوتا ہے ان کے مؤلفات کے صفحات پڑھنے والوں کو پورا احساس بے حد مشکل ہے۔ پھر قدرت کا عجیب نظام ہے کہ علماء امت اور ارباب ولایت کے مزاج بھی اتنے مختلف ہیں کہ عقل نارسا حیران رہتی ہے کوئی دینی خدمت، تعلیم و ارشاد افادہ و افادہ کے پیش نظر تالیف و تصنیف میں مشغول نظر آتا ہے۔ کوئی اصلاح و تربیت کے حرص کی خاطر حلقہ صحبت و استفادہ کو وسیع کرنے کی فکر میں مصروف ہے کوئی اللہ تعالیٰ کا بندہ خمول پسندی تواضع اور شہرت سے نفرت کی بناء پر گم نامی کو اپنا شیوہ اختیار بنائے ہوئے ہے۔ یہ نظام قدرت کے عجائبات کے انتہاء ہے نہ کائنات کی نیرنگیوں کا شمار

رتب نقصر الامانی حسری دونہا ماورائہن وراء

امام العصر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایک طرف علمی تبحر و تحریک الافکار جامعیت، حیرت افزا وقت نظر فوق العادت حافظہ، کتب بینی اور مطالعہ کا مجسم شوق و ذوق عطا فرمایا

دوسری طرف غول پسندی و جاہت و شہرت سے نفرت اور تواضع و فروتنی کے کمالات سے سرفراز فرمایا۔ حضرت امام العصر کی پوری زندگی مطالعہ کتب میں گزری اور ساری زندگی میں کچھ نہ کچھ جو ہم ریز سے قلم سے نکلتے رہے۔ مشکلات و حقائق پر یادداشتیں لکھتے رہے اور علمی افکار و نظریات بھی قلم بند کرتے رہے لیکن کبھی مستقل تالیف و تصنیف کا شوق دامنگیر نہ ہوا۔

کاش اگر حضرت کو اپنے علوم و معارف کے پیش نظر تصنیف و تالیف کا سوال حصہ بھی شوق ہی ہوتا تو آج علمی دنیا کا دامن ان کے علوم و تحقیقات سے پر ہوتا اور ان کے علمی جواہرات سے اہل علم ہمال مال ہوتے اور آئندہ کی نسلیں صحیح معنی میں انکی معرفت و قدر دانی میں کوتاہی نہ کرتیں۔

لیکن تاہم الحمد للہ قرآن کریم احادیث اور فقہ اسلامی کے بعض مشکلات علم کلام کے مشکل ترین مسائل خلافت امت کے معرکہ الآراء مسائل اور عقائد محمدیہ کے امہات و اصول پر چوتھے ایسے رسائل یادگار چھوڑ گئے جن کی نظیر علمی ذخائر میں مشکل سے ملے گی۔ جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا کیا مجال کہ بعید سے بعید نقل و نقل سے دقیق و دقیق عقلی و نقلی کوئی پہلو تشنہ رہ جائے دنیا نے اسلام کے وسیع انظر محقق عالم شیخ محمد زاہد کوثری مرحوم نے قاہرہ میں ایک دفعہ دوران ملاقات میں فرمایا کہ احادیث سے دقیق مسائل کے استنباط میں شیخ ابن ہمام صاحب فتح القدیر کے بعد ایسا محدث و عالم امت، میں نہیں گزرا اور پھر فرمایا کہ یہ کوئی کم زمانہ نہیں غالباً موصوف کے الفاظ یہ تھے:

لم يأت في الأمة بعد الشيخ ابن الهمام مثله في استشارة الأبحاث
النادره من الأحاديث وليست هذه المدة بقصيرة

اور حیرت یہ ہوتی تھی کہ کسی موضوع پر جب کچھ تحریر فرمایا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید ساری زندگی اس ایک موضوع کی نذر ہوئی ہے۔

ایک دفعہ ۱۳۴۲ھ میں مولینا حبیب الرحمن خان صاحب شیروانی مرحوم حیدر آباد سے دیوبند تشریف لائے تھے۔ اس وقت مرحوم امور مذہبی کے صدور الصور کے عہدے پر فائز تھے۔ حضرت کی زیارت کے لئے قیام گاہ پر تشریف لائے حضرت شیخ رحمۃ اللہ نے مشکلات القرآن کا کچھ حصہ تذکرہ فرمایا اور بطور مثال سورۃ منزل کی پہلی آیتوں میں علماء کو جو علمی اشکال تھا اس کا ذکر فرما کر اپنی طرف سے ایک ایسی تفسیر بیان کر کے ایسی تحقیق کی کہ وہ مشکل حل ہو گئے۔ شیروانی صاحب نے حیران ہو کر بے ساختہ فرمایا کہ حضرت بات بالکل صاف ہوئی۔ ۱۳۴۸ھ کا واقعہ ہے کشمیر سے واپسی پر حضرت لاہور ایک دو روز کے لئے اترے، آسٹریلیا بلڈنگ میں قیام تھا۔ میزبان نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کو بھی دعوت دی۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے حضرت شاہ صاحب

نے بہت سے علمی جواہرات بیان فرمائے ان میں ایک موضوع یہ تھا کہ دنیا میں سائنس و طبیعیات میں جو حیرت انگیز ترقیاں ہوئی ہیں انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں ان کی نظیریں موجود ہیں اور انبیاء کرام کے معجزات میں یہ چیزیں قدرت نے اس لئے ظاہر کرائیں کہ یہ آئندہ امت کی ترقیات کے لئے تمہید ہوں اور فرمایا کہ ضرب الخاتم میں بھی اسی کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے راقم الحروف نے حضرت کے ایماء پر یاد سے وہ شعر سنائے جن میں ایک شعر یہ تھا۔

وقد قبل ان المعجزات نقدم بما يوتقى فيه الخليفة في صدى

میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم بے حد مظلوم ہوتے رہے۔

بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ کسی مصنف نے بقصد تقریظ لکھوانے کوئی کتاب حضرت کے سامنے پیش کی اور ظاہر ہے کسی اہم موضوع پر کوئی محقق شجیدہ اہل قلم یا معیاری مصنف علمی کتب خانوں کی اس فراوانی میں کیا کسر باقی رکھے گا۔ لیکن دیکھا یہ گیا کہ حضرت سرسری نظر میں اہم ترین اصلاحات فرما کر بیش قیمت اضافہ بھی فرمادیا کرتے تھے جس سے مصنف حیرت میں پڑ جاتا تھا۔ افسوس کہ میں اس مختصر مقالے میں اس کے نظائر پیش نہیں کر سکتا راقم الحروف کی کتاب فحیہ العنبر میں اس کی کچھ مثالیں ملیں گی جو امام العصر کی حیات کے چند صفحات سے اٹھائیں برس قبل راقم کے قلم سے بطور نقش اول نکل چکے ہیں اس حیرت انگیز کمال پر یہ کمال کہ جب تک کوئی شخص خود مسئلہ یہ دریافت کرے اپنی طرف سے کبھی سبقت نہ فرماتے تھے۔ درحقیقت اس حیرت ناک علمی تبحر کے ساتھ یہ وقار و سکون اور علم کے اس متلاطم سمندر کے ساتھ یہ خاموشی امام العصر کی مستقل کرامت ہے۔

مخدوم و محترم سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم کا ایک بلیغ جملہ اس حقیقت کے چہرے سے پوری نقاب کشائی کرتا ہے فرماتے ہیں۔

مرحوم کی مثال ایک ایسے سمندر کی ہے جس کی اوپر کی سطح ساکن ہو اور اندر کی گہرائیاں گراں قدر موتیوں سے معمور ہوں (معارف غالباً جون ۱۹۳۳ء) غرضیکہ حضرت امام العصر رحمۃ اللہ نے باوجود اس مجاہد العقول جامعیت، تبحر کثرت معلومات و وسعت مطالعہ حیرت ناک استحضار اور قوت حفظ کے شوق سے کبھی تالیف و تصنیف کا ارادہ نہیں فرمایا اور امت کے دل میں یہ تڑپ رہی کہ کاش کسی اہم کتاب حدیث پر کوئی خدمت یادگار چھوڑ جاتے۔

حضرت مولینا صاحب بدر عالم نے ایک دفعہ عرض کیا کہ اگر جامع ترمذی وغیرہ پر کوئی شرح تالیف فرمادیتے تو پس ماندگان کے لئے سرمایہ ہوتا غصہ میں آکر فرمانے لگے کہ زندگی میں نبی کریم ﷺ کی احادیث کو پڑھا کر پیٹ پالا کیا آپ چاہتے ہیں کہ مرنے کے بعد میری حدیث کی

خدمت بکرتی رہے۔ ہاں دینی اور کچھ علمی شدید تقاضوں کی وجہ سے چند رسائل یادگار چھوڑ گئے اس طرح اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ علمی دنیا کچھ نہ کچھ ان کی علمی تحقیقات و خصوصیات سے مستفید رہے نیز ان کے تلامذہ و اصحاب کی وساطت سے بھی اچھا خاصا ان کے علمی کمالات کا ذخیرہ امت کے ہاتھ آیا۔ اس طرح یہ محقق یگانہ عصر حاضر کا جامع الکمالات امام دنیا میں علم کا آفتاب و مآب تاب بن کر چکا میرے ناقص علم میں غیر منقسم ہندوستان کی سر زمین میں جامعیت و تبحر کے اعتبار سے ایک حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور ان کے بعد حضرت علامہ امام العصر کشمیریؒ کی نظر نہیں ملے گی۔ ہندوستان کے غیر مقلد حضرات کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر بھی چند رسائل کی تالیف کی نوبت آئی جن میں فاتحہ حلف الامام رفع یدین اور مسئلہ و ترزیر بحث آئے ہیں ضمناً اور بہت سے مسائل آگئے ہیں، نیز فتنہ قادیانیت کی تردید کے سلسلہ میں چند رسائل تالیف فرما چکے ہیں جن میں امت محمدیہ کے قطعی عقیدہ ختم نبوت کی تحقیق بھی آگئی ہے جو دین اسلام کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس طرح کفر و ایمان کا مدار جن امور پر ہے اس کی تحقیق واضح طور سے ہو گئی حیات مسیح علیہ السلام کے عقیدہ کی تفصیلات بھی آگئی ہیں اس طرح علم کلام کے چند مشکل ترین مسائل کا فیصلہ بھی فرما چکے ہیں۔

حضرت امام العصر کی تالیفی خصوصیات:..... ”فیض الباری“ کے مقدمہ ۲۱ پر رقم نے لکھا تھا ۵ منجملہ حضرت شیخ کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ زیادہ تر اہتمام مشکلات کے حل کرنے کا فرماتے تھے بحثوں کو پھیلانے اور الفاظ بار بار استعمال کرنے پر زیادہ توجہ نہیں فرماتے تھے نیز یہ کوشش فرماتے تھے کہ موضوع کے متعلق مواد زیادہ پیش کیا جائے اسکی توضیح و تشریح کے زیادہ در پے نہیں ہوتے تھے۔ لفظوں میں اختصار اور معانی میں کثرت ان کی طبیعت و عادت بن گئی تھی۔ خواہ تدریس میں ہو یا تصنیف و تالیف میں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے جب کسی مبلغ کو دیکھا تو یہ دیکھا کہ الفاظ کے اختصار کے ساتھ معانی میں تفصیل کرتا ہے۔

ابن ندیم کتاب الفہرست میں لکھتے ہیں:

”طبیعتیں نتائج کی منتظر رہتی ہیں نہ کہ مقدمات کی اور مقاصد سے خوش ہوتی ہیں نہ کہ صرف عبارت کی طوالت ہے۔“

مجھے پہنچا ہے کہ حضرت حکیم لامت مولینا تھانویؒ فرمایا کرتے کہ بسا اوقات حضرت

شاہ صاحب رحمۃ اللہ کے ایک جملہ کی تشریح میں ایک رسالہ کی ضرورت پڑتی ہے۔
 حیمۃ البیان مقدمہ مشکلات القرآن ۸۳ میں اور فقہ العنبر ۱۰۵ پر رقم الحروف نے حضرت امام
 العصر کی تالیفی خصوصیات کو وضاحت و تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے۔

”جامعیت وقت نظر سرعت انتقال و ذہنی اور کثرت آمد کی بنا پر طبیعت اختصار کی عادی
 بن گئی تھی۔ معلومات کی فراوانی کی وجہ سے ضمنی مضامین کثرت سے ذکر فرمایا کرتے
 تھے حدیث کے لطائف میں جب علم عربیت و بلاغت کے نکات کا بیان شروع
 ہو جاتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ علوم عربیت کی تحقیقات ہی شاید کتاب کے اصلی
 موضوع ہیں اور بعید ترین و عمدہ ترین مآخذ سے وہ نقول پیش فرمایا کرتے تھے جن
 سے محققانہ شروع حدیث کا دامن بھی خالی ہوتا تھا۔ افسوس کہ اختصار کی وجہ سے میں
 اس کی مثالیں پیش نہیں کر سکتا اس لئے عام نگاہیں ان کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتی
 تھیں اور بہ مشکل عام طبیعتیں لذت اندوز ہوتی تھیں حضرت کے مختصر سے مختصر
 رسالے کے لئے بھی سارے علوم سے نہ صرف مناسبت بلکہ مہارت ان میں
 ضروری ہے ان تصانیف کی صحیح قدر دانی وہی عالم کر سکتا ہے جسے کسی موضوع میں
 مشکلات پیش آتی ہوں اور پورے متعلقات کی چھان بین کر چکا ہو اور تشفی نہ ہوتی نہ
 ہو۔ پھر حضرت امام العصر کی تالیف کا غور سے مطالعہ کی توفیق ہو اس وقت قدر شناسی
 و قدر دانی کی نوبت آئے گی اور حقائق مطلوبہ کے چہرے سے پردے ہٹتے چلے
 جائیں گے خالی ذہن غیر مبتلا شخص جسکو کبھی کسی مشکل کی خلش ہی پیش نہ آئی سچی
 مضامین و شگفتہ عبارت سے مانوس ہو وہ کبھی قدر نہیں کر سکتا۔“

حضرت استاذ محترم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کی
 کتاب کشف السر عن صلوة الوتر کی قدر اس وقت ہوئی کہ اس مسئلے پر جتنا ذخیرہ حدیث کا مل سکا
 سب کا مطالعہ کیا پھر رسالہ مذکور کو اول سے آخر تک بار بار پڑھا اس وقت اس کی صحیح قدر ہوئی۔
 اب میں اس مختصر سے تمہیدی مضمون کو امام مسروق بن الاعدع التوفی ۱۳۷ھ کے ایک تاریخی کلام
 پر ختم کرتا ہوں جس کو امام تاریخ ابن سعد نے اپنی کتاب الطبقات میں ذکر کیا ہے (طبقات ابن
 سعد جلد ۲ صفحہ ۱۱۵) باسناد صحیح مسروق سے روایت ہے مسروق (کوفہ کے کہار تابعین میں سے ہیں،
 قسرم ہیں یعنی عہد نبوت کو پا چکے ہیں) فرماتے ہیں:

(ترجمہ) ”نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم) کے صحابہ کرام کی مثال تالابوں

اور حوضوں جیسی ہے یعنی چھوٹا اور بڑا کوئی تالاب ایک آدمی کی سیرابی کے لئے کافی ہوتا ہے کوئی دو کے لئے کوئی دس کے لئے کوئی سو کے لئے اور بعض ایسے تالاب ہیں اگر روئے زمین والے سب پینے کے لئے آئیں تو سب سیراب ہو کر جائیں حضرت عبداللہ بن مقصور رضی اللہ عنہ کی مثال اسی تالاب کی ہے“

راقم الحروف کہتا ہے کہ علماء امت کی مثال بھی یہی ہے اور حضرت امام العصر شاہ صاحب کی مثال عبداللہ بن مسعود کی ہے ان کا وجود پوری امت کی سیرابی کے لئے کافی تھا اب ان تصانیف کی فہرست پیش کرتا ہوں جو حضرت اپنے قلم حقیقت رقم سے تالیف فرما چکے ہیں۔
امام العصر کی تصانیف:

(۱)..... عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام:

یہ کتاب ۲۲۰ صفحات پر مشتمل ہے عقیدہ حیات مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم کی کیا ہدایت ہیں، اس کی تفصیل ہے اس میں احادیث کا استقصاء واستیفاء نہیں کیا گیا ہے بقدر ضرورت ضمناً احادیث کا ذکر ہے اس لئے اس کا دوسرا نام ہے ”حیوۃ المسیح بمقتن القرآن والحديث الصحيح“ ضمنی مسائل کی تحقیقات کئی جگہ آگئی ہیں۔

عقیدہ حدوث عالم عقیدہ ختم نبوت کنایہ حقیقت ہے یا مجاز؟ ذوالقرنین دیا جوج وما جوج کی تحقیق سند ذی القرنین کی تعیین وغیرہ وغیرہ۔

حضرت شیخ عثمانی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ یہ کتاب حضرت شاہ صاحب کی سب کتابوں میں واضح مفصل اور شگفتہ ہے۔

(۲)..... ”تحیۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام“

یہ کتاب ۱۵۰ صفحات کی ہے۔ عقیدہ الاسلام کی تعلیقات اور اس پر اضافات ہیں ادب و بلاغت کی عجیب و غریب ضمن تحقیقات آگئی ہیں۔

(۳)..... ”التصريح بما تواتر فی نزول المسيح“

نزول مسیح علیہ السلام کے متعلق احادیث و آثار صحابہ کو اس میں بہت تفتیش و دیزہ ریزی سے لیا گیا ہے جن کی تعداد تقریباً سو تک پہنچ جاتی ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا اس پر ایک نثریں مقدمہ بھی ہے۔

(۴)..... ”اکفار الملحدين فی ذمہ وریات الدین“

۱۲۸ صفحات کا ایک عجیب و غریب رسالہ ہے جس میں کفر و ایمان کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالی گئی اور اصولی طور پر بحث کی گئی ہے کہ مدارِ ایمان کیا کیا امور ہیں اور کن عقائد و اعمال کے انکار سے کفر لازم آتا ہے اور کس قسم کے عقائد میں تاویل کرنا بھی موجب کفر ہے۔

اس موضوع پر سب سے پہلے امام غزالیؒ نے قلم اٹھایا تھا "فیصل الشفرقة بین الاسلام والزندقة" ان کا رسالہ مصر و ہندوستان میں عرصہ ہوا کہ شائع ہو چکا ہے اس رسالے کی عمدہ تحقیقات حضرت شیخ نے چند سطروں میں نقل فرمائی ہیں عصر حاضر میں یہ ایک اہم ترین دینی خدمت تھی وہ حضرت نے پوری فرمادی اس پر سارے علماء دیوبند کی رائیں اس لئے لکھوا دی ہیں تاکہ اہل حق جماعت میں اس اہم ترین مسئلہ میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

(۵)..... "خاتم النبیین"

یہ عقیدہ ختم نبوت میں عجیب رسالہ ہے جو ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے فارسی زبان میں لیکن دقیق حضرت کا خاص اسلوب علمی کمالات اور وہی کمالات کے نمونے پورے طور پر جلوہ آراء ہیں۔ حضرت مولینا سید سلیمان ندوی مرحوم نے بھی ایک دفعہ ایک مکتوب میں تحریر فرمایا تھا کہ بہت دقیق ہے عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔

(۶)..... "فصل الخطاب فی مسئلة ام الكتاب"

مسئلہ فاتحہ خلف الامام جو عہد صحابہؓ سے لیکر آج تک معرکہ الآراء موضوع رہا ہے اس پر ۱۰۹ صفحات کا محققانہ رسالہ ہے۔ حدیث عبادہ بروایت محمد ابن اسحاق کی عجیب و غریب تحقیق کی گئی بڑی مدقّق کے ساتھ اس اہم موضوع کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ لفظ "فصاعدا" کی تحقیق میں ۱۲، ۱۳ صفحات پر مشتمل دقیق ترین مضمون آگیا ہے۔ یہ مضمون چونکہ عام دسترس سے بالکل باہر تھا راقم الحروف نے اپنی کتاب معارف السنن شرح ترمذی (مخطوط) میں اس کی جدید اسلوب عصری سے اس کی تحلیل و تشریح کی ہے اور شگفتہ عربی میں اس کی تسہیل کی کوشش کی ہے۔

حضرت مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم کو ڈابھیل میں جب یہ مضمون سنایا تو نہایت مخطوط ہوئے اور بے ساختہ فرمایا کہ حق تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ اس مشکل ترین دقیق و غامض مضمون کی ایسی افصاح کی کہ شاید مقدور میں اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے،

(۷)..... "خاتمة الخطاب فی فاتحة الكتاب"

مسئلہ فاتحہ خلف الامام پر فارسی زبان میں لطیف رسالہ ہے۔ بلا مراجعت کتاب دوروز میں

محرم ۱۳۲۰ھ میں یہ تالیف فرما چکے ہیں مسئلہ پر جدید انداز میں استدلال ہے۔
حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ کی اس تقریظ بھی ہے حضرت شیخ نے وقت نظر کی خوب داد دی ہے۔

(۸)..... "نیل الفرقدين في مسئلة رفع اليدين"

۱۴۵ صفحات پر مشتمل ہے مسئلہ خلافہ نماز میں رکوع سے پہلے اور بعد میں ہاتھوں کو اٹھانے کے موضوع پر نہایت عجیب انداز میں تحقیق فرمائی ہے اور نہایت انصاف سے محققانہ انداز میں یہ ثابت فرمایا ہے کہ مسئلہ میں اختلاف عہد صحابہ سے ہے اور اس میں اگر اختلاف ہے وہی ہے کہ آیا رفع یدین کرنا بہتر ہے یا نہ کرنا بہتر ہے جائز و ناجائز کا اختلاف نہیں ضمنی طور پر بہت نفیس مباحث آگئے ہیں۔

(۹)..... "بسط اليدين لنيل الفرقدين"

سابق الذکر موضوع پر ۶۴ صفحہ کا رسالہ ہے یہ رسالہ سابق نیل الفرقین کا مکملہ ہے اس موضوع پر قدما و محدثین سے لیکر متاخرین اور عصر حاضر تک بہت کچھ خامہ فرسائی ہو چکی ہے۔ اس پامال موضوع پر ایسے محققانہ اسلوب میں جدید استدلال اور دقیق استنباطات پیش کرنا یہ حضرت شاہ صاحب ہی کا حصہ ہے۔ الشیخ الامام محمد زاہد الکوثری اپنی کتاب تآییب الخطیب فیما ساقہ فی ترجمۃ ابی حنیفہ من الاکاذیب (۸۴) میں رقمطراز ہیں۔

رفع الیدین کے موضوع پر جانہین سے مخصوص کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس موضوع پر بہترین کتابیں علامہ بروجر مولانا محمد نور شاہ صاحب کشمیری کی دو کتابیں ہیں نیل الفرقین و بسط الیدین جن میں سارا لب لباب آگیا ہے اور یہ ثانی و کافی ہیں (ترجمہ) در حقیقت صحیح قدر دانی ایسے محققین ہی کر سکتے ہیں۔

(۱۰)..... "كشف السر عن صلوة الوتر"

مسئلہ وتر کے بارے میں امت میں جو اختلاف چلے آئے ہیں۔ کل خلافت سولہ سترہ تک پہنچ جاتے ہیں ان میں جو مشکل ترین وجوہ ہیں ان کی ایسی تحقیق و فیصلہ کن تدقیق فرمائی ہے کہ کسی مصنف مزاج کو مجال انکار باقی نہیں رہتا۔ رسالہ ۹۸ صفحوں میں تمام ہوا ہے، دوسرے ایڈیشن میں بمقدار ایک ثلاث تعلیقات کا اضافہ فرمایا ہے۔ مسئلہ آمین بالجبر وضع الیدین علی الصدور وغیرہ مسائل کی تشفی کن تحقیق فرمائی گئی ہے شروع میں خطبہ کے بعد ایک فصیح و بلیغ عربی کا قصیدہ ہے جو نہایت ہی مؤثر اور رقت انگیز ہے ہر حیثیت سے قابل دید ہے۔

(۱۱)..... "ضرب الخاتم علی حدوث العالم"

حدوث عالم کا نام و فلسفہ کا معرکتہ الآراء موضوع ہے اس پر مشککین و فلاسفہ اسلام نے ہر

حاصل بحثیں کی ہیں۔ مستقل رسائل کا موضوع بحث رہا ہے شیخ جلال الدین دوانی نے بھی اس پر ایک رسالہ الزوراء کے نام سے تصنیف کیا ہے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ نے اس سنگلاخ وادی میں قدم رکھا ہے اور الہیات و طبیعیات اور قدیم و جدید فلسفہ کی رو سے اتنی کثرت سے دلائل و براہین قائم کئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے اور حدوث عالم کا مسئلہ نہ صرف یقینی بلکہ بدیہی بن جاتا ہے لیکن افسوس کہ حضرت نے ان براہین دلائل اور شواہد کو چار سو شعر میں منظم پیش کیا ہے ظاہر ہے کہ شعر کا دامن تفصیلات سے خالی رہتا ہے لیکن اس کے ایضاح و حل کے لئے ہزاروں حوالے کتب متعلقہ کے دیدئے گئے جن میں صدر شیرازی کی اسفار اربعہ فریدہ جدی و بستان فی کے دائرہ المعارف خصوصیت رکھتی ہیں۔ راقم الحروف نے حضرت کے حکم سے متعلقہ حوالہ جات تقریباً ایک سو صفحات میں بڑی عرق ریزی سے جمع کئے تھے جس سے حضرت بے حد مسرور تھے اور میری اس ناچیز خدمت کو ایک دفعہ مولینا حبیب الرحمن خان شیروانی کے سامنے بہت سراہا تھا فرماتے تھے کہ اصل موضوع اثبات باری تھا لیکن عنوان میں ایک قسم کی شائبہ تھی اس لئے حدوث عالم کا عنوان تجویز کیا اور آخر میں دونوں کا مفاد ایک نکلتا ہے۔

(۱۲)..... "مرقات الطارم لحدوث العالم"

سابق الذکر موضوع پر ۶۲ صفحات میں رسالہ ہے۔ رسالہ کیا ہے دریا کو گوزرے میں بند کر دیا ہے۔ اس رسالہ میں ادلہ و براہین کے استقصاء کا ارادہ نہیں فرمایا بلکہ یہ "ضرب القاتم" کے لئے مقدمات تشریح اور تفسیر کا کام دیتا ہے۔ نظائر اور شواہد اس موضوع پر اتنے پیش کئے ہیں کہ عقل و برہان سے پہلے ذوق و وجدان فیصلہ کر لیتا ہے۔ ترکی کے سابق شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری جو قاہری میں جلا وطنی کے بعد مقیم تھے اور رد مادیتین و دہریتین میں نہایت ہی متخصص جلیل القدر عالم تھے۔ ترکی و عربی میں اس موضوع پر متعدد کتابیں تالیف فرما چکے ہیں۔

۱۳۵۵ھ بمطابق ۱۹۳۸ء میں یہ رسالہ ان کو راقم الحروف نے دیا تھا مطالعہ فرمانے کے بعد اتنے متاثر ہوئے اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ فلسفہ و کلام کے دقائق کا اس انداز سے سمجھنے والا اب بھی کوئی دنیا میں زندہ ہے اور پھر فرمایا۔

جتنا کچھ آج تک اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے اس رسالہ کو اس سب پر ترجیح دیتا ہوں اور اس اسفار اربعہ (ان کے سامنے اس وقت تھی) پر اس رسالہ کو ترجیح دیتا ہوں۔

پھر اس وقت "القول فیصل" کے نام سے رد دہریتین میں ایک مبسوط کتاب تالیف فرما رہے تھے اس میں اس رسالہ سے بہت نقول لئے اور اس کتاب میں اس رسالہ کی بڑی تعریف کی۔

ایک حصہ اس کا طبع ہو چکا ہے نہ معلوم یہ عبارت اس حصہ میں آگئی ہے یا نہیں ضمناً اس رسالہ میں کلام و تصوف الہیات و طبیعیات کے بہت سے حقائق کا فیصلہ فرمایا گیا ہے۔

(۱۳)..... ”ازالة الیرین فی الدب عن قرة العینین“

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مشہور کتاب قرة العین فی تفصیل الشیخین کا حیدر آباد دکن میں کسی شیعہ مزاج عالم نے رد لکھا تھا حضرت امام العصر نے شاہ دہلوی کی تائید میں اس کی تردید لکھی۔ نہایت عمدہ کتاب ہے ۱۹۶ صفحات میں پھیل گئی ہے۔ اس میں قال المولی المولف کہہ کر شاہ دہلوی کی عبارت نقل فرماتے ہیں ❶

اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے کشمیر میں ملا تھا۔ ابتداء سے ۸ صفحے غائب ہیں اس لئے نام مجھے نہ معلوم ہو سکا اور سوء اتفاق سے حضرت شیخ سے پوچھنے کی نوبت نہ آئی ازالۃ الیرین میرا تجویز شدہ نام برائے نام ہے۔

(۱۴)..... ”سہم الغیب فی کبد اہل الیریب“

تاریخی نام: قسی سہم الغیب

ہندوستان کی سرزمین میں جہاں بد قسمتی سے بہت سے بدعات اور عقائد شرکیہ بغض سادہ لوح مسلمانوں میں رائج ہو گئے ہیں۔

وہاں ایک ان میں سے علم غیب کا عقیدہ ہے اور سید احمد رضا خان صاحب بریلوی اور ان کے اتباع نے اس کو عملی رنگ میں پیش کیا اور ایک عرصہ تک ہندوستان میں یہ موضوع بحث رہا۔ ایک بریلوی شخص نے اس میں ایک رسالہ لکھا اور اہل حق کے مسلک کے خلاف اپنے نامہ عمل اور نامہ قرطاس کو سیاہ کیا۔ اور اپنا نام عبدالحمید دہلوی ظاہر کیا۔ حضرت شیخ کا قیام اس زمانہ میں دہلی میں تھا آپ نے جواب ترکی بہ ترکی عبدالحمید بریلوی کے نام منسوب کر کے اس کا جواب شائع فرمایا رسالہ کے آخر میں حضرت مولینا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولینا شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب میں عربی میں ایک قصیدہ ہے رسالہ کی زبان حضرت شیخ کے عام تصنیفی مذاق کے خلاف اردو ہے۔

یہ چودہ تصانیف تو امام العصر شاہ صاحب کی وہ ہیں کہ اپنے قلم سے تالیف فرما چکے ہیں۔

امام العصر حضرت شاہ صاحب کی دوسری قسم کی تصنیفات:..... دوسری قسم کی وہ تصنیفات ہیں کہ آپ کی یادداشتوں سے مرتب کی گئی ہیں ان کتابوں کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔

❶..... قال المعترض سے تردید کر نیوالے کی عبارت اور اقوال سے اس کی تردید فرماتے ہیں۔ من

(۱)..... "مشکلات القرآن"

قرآن کریم کی جن آیات کریمہ کو مشکل خیال فرمایا تھا خواہ وہ اشکال تاریخی اعتبار سے ہو یا کلامی حیثیت سے، سائنس کی رو سے ہو یا کسی عقلی پہلو سے یا علم عربیت و بلاغت کی جہت سے ہو ان پر یادداشت مرتب فرمائی تھی۔ اگر کہیں اس پر عمدہ بحث کی گئی ہے۔ اس کو نقل فرمایا حوالہ دیا اور نہیں تو خود غور و فکر کے بعد جو حل سامع ہوا تحریر میں لایا گیا۔ یہ یادداشت بہ شکل مسودات مختلف اوراق میں موجود تھی مجلس ڈابھیل نے مرتب کر کے اسے شائع کیا اور راقم الحروف نے مجلس عالمی کی خواہش پر "تیمم البیان" کے نام سے ۸۴ صفحہ کا اس کا مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ اصل کتاب ۲۸۷ صفحات پر ختم ہوئی۔ قرآنی علوم اور قرآنی معارف کا نہایت پیش قیمت گنجینہ ہے۔ اگر جدید اسلوب سے اس کو پھیلا یا گیا تو ایک ہزار صفحات میں کہیں جا کر کتاب ختم ہوگی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے متعلق کچھ اور مسودات بھی نکل آئے تھے جن کی زیور طبع سے آراستہ ہونے کی نوبت ابھی نہیں آئی۔

(۲)..... "خزینۃ الاسوار"

یہ ایک رسالہ ہے جس میں کچھ اور ادوادیہ کچھ مجربات و اذکار وغیرہ جمع کئے گئے ہیں یہ سب علامہ میری کی کتاب "حیوة الحیوان" کے اقتباسات ہیں۔ کہیں کہیں حضرت شاہ صاحب کی طرف سے اضافات بھی ہیں یہ رسالہ حضرت کے ذیلی مسودات جو کشمیر میں تھے۔ ان میں دستیاب ہوا تھا۔ مجلس علمی ڈابھیل نے اس نام سے شائع کیا۔

(۳)..... "فیض الباری بشرح صحیح البخاری"

یہ حضرت شاہ صاحب کے درس صحیح بخاری کی المائی شرح ہے جس کو حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدینہ نے کئی سال کی محنت و عرق ریزی کے بعد فصیح و بلیغ عربی زبان میں مرتب کیا ہے۔ یہ حضرت امام العصر کے علوم و کمالات کی سچی تصویر پیش کرتی ہے جہاں حافظ شیخ الاسلام بدرالدین عینی اور قاضی القضاہ حافظ ابن حجر عسقلانی جیسے بلند پایہ محقق و شارحین عاجز آ گئے ہیں وہاں شیخ کے خصائص و کمالات جلوہ آراء نظر آئیں گے۔ زیادہ تر اعتناء ان ہی معارف حدیث کا کیا گیا جہاں شارحین ساکت نظر آتے ہیں حضرت شیخ کے آخری عمر کے محرب علوم و اذواق خصوصی احساسات و علمی خصوصیات، دقت نظر و تحقیقی معیار کے نمونے اہل علم و یارانِ نکتہ دان کے لئے ملائے عام دے رہے ہیں۔ یہ چار ضخیم جلد کا بحر بیکراں مصر میں آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔

قرآن و حدیث فلسفہ و کلام اور معانی و بلاغت وغیرہ کے نہایت پیش بہا ابحاث سے مالا مال ہے۔

اس پر راقم الحروف اور حضرت جامع و مرتب کے قلم سے دو مبسوط مقدمے ہیں۔ ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے (عام عبادت نہایت شگفتہ و سلیس ہے بعض بعض مقامات میں خاص ادبی لطافت ہے۔

(۴)..... "العرف الشذی بشرح جامع الترمذی"

یہ حضرت شاہ صاحب کی درس جامع ترمذی کی املائی شرح ہے جس کو جناب مولینا محمد چراغ صاحب ساکن ضلع گجرات نے بوقت درس قلم بند کیا ہے اور زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ اور اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے۔ جامع ترمذی کے مشکلات احادیث احکام پر محققانہ کلام پر موضوع پر عمدہ ترین کبار امت کے نقول اور حضرت کی خصوصی تحقیقات کا ذخیرہ ہے طلبہ حدیث اور اساتذہ حدیث پر عموماً اور جامع ترمذی کے پڑھانے والوں پر خصوصاً اس کتاب کا بڑا احسان ہے۔

(۵)..... "انوار المحمود فی شرح سنن ابی داؤد"

یہ سنن ابی داؤد کے درس کی املائی تقریر و شرح ہے جس کو مولینا محمد صدیق صاحب نجیب آبادی مرحوم نے جمع کر کے شائع کیا ہے۔ کل دو جلدوں میں ہے، مرتب و جامع نے بہت سی کتابوں کی اصل نقول کو مراجعت کر کے لفظ بلفظ درج کر دیا ہے۔ کتاب کے تسمیہ میں حضرت شاہ صاحبؒ اور ان کے شیخ حضرت شیخ الہند کے نام کی تلمیح کی گئی ہے۔

(۶)..... "صحیح مسلم کی املانی شرح"

سنا ہے کہ ہمارے محترم دوست فاضل گرامی جناب مولینا مناظر احسن صاحب گیلانی نے صحیح مسلم کے درس کی تقریر قلم بند فرمائی تھی یہ اب تک نہ طبع ہوئی نہ راقم الحروف کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

(۷)..... "حاشیہ سنن ابی ماجہ"

جناب محترم مولینا سید محمد ادریس صاحب سکروڑوی سے سنا تھا کہ آپ نے سنن ابن ماجہ پر کتاب کے حواشی و ہوامش پر تعلیقات اپنے قلم سے لکھی تھیں۔ راقم الحروف کو اس کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یوں تو حضرت نے جن کتابوں پر تعلیقات لکھی ہیں اگر استقصاء کیا جائے تو متعدد کتابیں نکل آئیں گی۔

الاشباہ والنظائر جو ابن نجیم کی فقہ میں مشہور کتاب ہے اس پر تعلیقات حضرت کے قلم سے خود میں نے کشمیر میں دیکھے ہیں۔ یہ کل اکیس کتابیں ہوئیں جن سے حضرت امام العصر کے کمالات کے کچھ پہلو نمایاں ہو سکتے ہیں۔ کتاب کی پوری حقیقت اس وقت منکشف ہوتی کہ کتاب کے مضامین یا خصوصیات کا واضح تعارف کراتا اور جن مشکل ابھاث میں حضرت کے کمالات نظر آرہے ہیں ان کی تفصیلات سامنے آئیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ کسی مقالے کیلئے موزون نہیں تفصیلی

تبصرہ اور علوم و معارف کے نمونے پیش کرنے کے لئے ایک مستقل تالیف کی ضرورت ہے۔
راقم الحروف کی کتاب نحمدہ العنبر جو حضرت کی حیات طیبہ کے چند صفحے ہیں اس میں کچھ تفصیلات ناظرین کو ہاتھ آئیں گے۔ تالیفات کے متعلق جو کچھ وہاں لکھا ہے اگر اس کی تشریح ہی کی جائے تو اس مقالہ سے کہیں زیادہ ہوگا۔ اس وقت بہت غلات و ارتجال میں چند سطریں لکھنے کی توفیق ہوئی۔ حضرت امام العصر کے کمالات کا کوئی گوشہ بھی لیا جائے تو تفصیل کے لئے داستان کی ضرورت ہے اور جی چاہتا ہے کہ قلم اپنی جولانیاں دکھلاتا رہے۔

مدحتك جهدي بالذی انت اہلہ

فقصر عما صالح فبك من جهدي

میں نے چاہا کہ جس تعریف کے آپ مستحق ہیں اتنی تعریف کر سکوں لیکن میری کوشش ناکام رہی۔

فماكل مافيه من الخير قلتہ

ولاكل مافيه بقول الذی بعدی

جو کمالات ان میں ہیں نہ میں کہہ سکا اور نہ میرے بعد آنے والا کہہ سکے گا۔ (حیات انور)

XXXX

تشریح : مندرجہ ذیل تصنیفات کے علاوہ بھی چند مزید کتابیں ہیں جن کا مختصر تذکرہ ذیل ہے۔

۱۔ ”معارف السنن“

کے نام سے سنن ترمذی کے کئی جز مجلس علمی کراچی سے شائع ہوئے ہیں۔ اس کتاب کے فاضل مولف مرتب حضرت شاہ صاحب کے شاگرد رشید مولینا محمد یوسف بنوری ہیں۔

۲۔ ”انوار الباری شرح اردو صحیح بخاری“

از مولینا احمد رضا صاحب، بنجوری تلمیذ حضرت شاہ صاحبؒ یہ اردو میں بخاری شریف کی مشہور شرح ہے جو مجموعی طور شاہ صاحب کے علوم کی آئینہ دار ہے۔

۳۔ ”لتحاف لمذهب الاحناف“

مرتبہ مولینا محمد بن موسیٰ میاں سملکی تلمیذ (حضرت شاہ صاحبؒ) ۲۶۸ صفحات پر مشتمل اس نسخہ کو مولانا موصوف نے ۱۹۵۹ء میں لندن میں آفسٹ پر شائع کیا ہے۔

۴۔ "النور الضائع علی نظم الفرائض"

فارسی زبان میں ۱۱۹۲ اشعار پر مشتمل ایک نظم حضرت شاہ صاحبؒ نے مولانا فخر الدین احمد کوہلو یادگار عنایت فرمائی تھی جسے موصوف نے کچھ اضافوں کے ساتھ طبع کرا دیا۔ یہ نظم علم میراث پر ہے۔

۵۔ "خلاصہ تقریر"

یہ رسالہ اردو زبان میں ہے لاہور سے شائع ہوا ہے یہ حضرت شاہ صاحب کے ان خطبات کا خلاصہ ہے جو آپ نے وفات سے کئی سال پہلے سرینگر میں ارشاد فرمائے ہیں۔

۶۔ "دعوت حفظ ایمان"

دو، تریڈیقا دیانیت میں، یہ چند ورتی ٹریکٹ اردو زبان میں ہیں (کوندو)



اے کہ تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم

از حضرت مولینا پروفیسر سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدظلہ العالی
(ایم اے فاضل دیوبند)

سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ و صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگزہ

مولینا سعید احمد صاحب اکبر آبادی دامت فیوضہم برصغیر ہندوپاک کے ممتاز و مقتدر علماء میں سے ہیں آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے قابل فخر شاگرد ہیں اور اکثر فرماتے ہیں کہ مجھے ہر قدم پر یہ محسوس ہوا ہے کہ میرا وجود معنوی حضرت الاستاذ کی ہی غیر معمولی شفقت اور حسن تربیت کا مہیون کرم ہے حضرت موصوف پہلے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں استاد اور پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں کئی سال تک پرنسپل رہے۔ ۱۹۵۹ء میں مسلم یونیورسٹی علیگزہ میں شعبہ دینیات کے سربراہ (DEAN FACULTY OF THEOLOGY) مقرر ہوئے۔ اپنے شفیق استاد اور مربی حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات گرامی کے ساتھ انہیں کتنی عقیدت ہے اس کا اندازہ راقم الحروف کے نام ان کے مندرجہ ذیل مکتوب گرامی سے لگایا جاسکتا ہے۔

نئی دہلی

۲۲ اگست ۱۹۷۵ء

محبت محترم و مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا محبت نامہ آیا تھا مگر میں کلکتہ چلا گیا تھا اس لئے افسوس ہے جواب میں تاخیر ہوئی معذرت خواہ ہوں آپ اندازہ نہیں کر سکتے ہیں کہ مجھ کو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کس درجہ گہرا تعلق تھا اور اس طرح حضرت مجھ پر کس درجہ شفیق اور مہربان تھے۔ میں جو کچھ بھی ہوں اور میں نے جو کچھ پایا ہے وہ سب حضرت کے فیض و صحبت کا عطیہ ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے مجھے کشمیر، کشمیر کے لوگ اور ہر وہ چیز جس کا حضرت شاہ صاحبؒ سے تعلق ہے دل سے عزیز ہے۔ اس بنا پر میں آپ کو بھی عزیز رکھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم اور تندرست رکھے

آمین۔ برادر مکرّم مولینا مسعودی صاحب کو میرا بہت بہت سلام عرض کیجئے اور

مزان چری بھی۔

مخلص: سعید احمد اکبر آبادی

مولینا اکبر آبادی صاحب کثیر الصانف ہیں ان کی چند مشہور اور معرکہ الآراء کتابوں

کے نام یہ ہیں۔

فہم القرآن، وحی الہی، مولینا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد، مسلمانوں کا عروج

وزوال اور سیرت ابو بکر صدیق۔

مولینا موصوف آج کل ندوۃ المصنفین دہلی کے مشہور علمی اور تحقیقی ماہنامہ رسالہ برہان

کے ایڈیٹر اور انسٹیٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ (نئی دہلی)

سے وابستہ ہیں

کوہد عفی اللہ عنہ

اللہ تعالیٰ انہیں تادیر سلامت رکھے (آمین)

حضرت الاستاذ اپنی ذات سے چند درجہ علمی کمالات و فضائل کے باعث ایک انجمن اور صحیح معنی

میں اس شعر کے مصداق تھے

ان یجمع العالم فی واحد

لیس علی اللہ بمستکبر

خود میرا اپنا حال یہ تھا کہ علماء سلف کے شوق علم و وسعت مطالعہ قوت حفظ و ذہانت غیر معمولی

وسعت علم و عمیق نظر و غیرہ اور ان کے علمی و ذی کمالات سے متعلق ایک دو نہیں سینکڑوں حیرت انگیز

واقعات پڑھے تھے۔ میں انکو پڑھتا تھا اور دل میں خیال کرتا تھا کہ مورخین نے اپنی عام عادت کے

مطابق رائی کو پہاڑ بنا کر پیش کر دیا ہے۔ ورنہ ایک انسان میں بیک وقت اتنے کمالات کیونکر جمع

ہو سکتے ہیں مدتوں دماغ پر یہی خیال مسلط رہا لیکن جب حضرت شاہ صاحب کو بہت قریب سے

دیکھا اور حضرت موصوف کی صحبت میں بیٹھ کر سمندر سے کچھ قطرے حاصل کرنے کی سعادت

نصیب ہوئی تو اب معاوہ پہلا خیال بدلا اور یقین ہو گیا کہ جب عالم اسلامی کے انتہائی دور زوال

میں بھی دیوبند نامی ایک قصبہ کے افق سے ایک ایسی شخصیت بلند ہو سکتی ہے جو حفظ حدیث میں

حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ عینی و قسطلانی۔ کتب قدیمہ کے علم و تبحر میں حافظ ابن تیمیہ اور حافظ

ابن قیم علم معانی و بیان میں سعد الدین تفتازانی اور فخر خوارزم جارا اللہ زنجیری منطق اور فلسفہ میں ما

محبت اللہ بہاری اور صدر الدین شیرازی، عربی میں جاحظ اور بعید الزمان ہمدانی کا اور فارسی شعر و سخن

میں خاقانی و انوری کا ہم پایہ اور حریف و ہمسرہ ہو تو پھر یہ کیونکر مشتبہ اور عقلاً محال ہو سکتا ہے کہ اسلام کے اور مسلمانوں کے دور شباب و ترقی میں ایسے علماء اعلام پیدا ہوئے ہوں جن کی نظیر ماورائیت کے بطن سے آج تک پیدا نہیں ہوئی۔ گویا حضرت شاہ صاحبؒ کو دیکھ کر اپنے علماء سلف کی عظمت کا صحیح احساس پیدا ہوا اور پہلی مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ اتنے ائمہ سلف کی نسبت جو واقعات تاریخ کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں وہ مبالغہ پر داری نہیں بلکہ واقعات کا اصل اور بے کم و کاست بیان ہے۔

جب تک نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم

میں معتقد فتنہ محشر نہ ہوا تھا

اس بناء پر حضرت شاہ صاحب کا حق کسی درجہ میں اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب کہ تن تنہا کوئی ایک شخص نہیں بلکہ ایک مجلس کی شکل میں مختلف علوم و فنون کے ماہر چند علماء ایک جگہ یکسو ہو کر بیٹھ جائیں اور وہ اپنے اپنے ذوق و استعداد کے مطابق حضرت شاہ صاحب کی تصنیفات و تالیفات اور رسائل و مقالات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے یہ معلوم کریں کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا کس علم و فن میں صحیح مرتبہ و مقام کیا ہے اور علم و فن کے دوسرے ائمہ کے بالمقابل حضرت مرحوم کے امتیازات و مختصات کیا ہیں؟ حضرت شاہ صاحب کا اصل میں جوان کے لئے بقائے دوام اور حیات جاوید کا ضامن ہے وہ ہر علم و فن میں ان کا یہی امتیاز و اختصاص ہے اس بناء پر حضرت مرحوم کی کوئی سوانح عمری اس وقت تک مکمل ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں انہیں علمی امتیازات و مختصات پر کما حقہ روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔

حضرت الاستاد کا یہی علمی جاہ و جلال تھا جس کے باعث بڑے بڑے فضلاء عصر جو مسلک و مشرب کے لحاظ سے حضرت الاستاذ سے کھلا ہوا اختلاف رکھتے تھے حضرت سے جب کبھی دو چار ہوتے تھے تو ان کے لئے علم و فضل کے اس مسند نشین یگانہ کے سامنے سراطاعت و حلقہ بگوشی خم کرنے کے سوا چارہ نہ رہتا تھا۔ علامہ سید رشید المصری قاہری کے نامی گرامی علمی و دینی ماہنامہ المنار کے ایڈیٹر تفسیر المنار اور بیسیوں بلند پایہ علمی کتابوں کے نامور مصنف مفتی محمد عبدہ اور سید جمال الدین افغانی کے مخصوص صحبت یافتہ و جانشین، خود عرب اور عربی کے بلند پایہ ادیب و انشاء پرداز اور خطیب و مقرر تھے۔ ان تمام اوصاف و کمالات کے باوجود عالم اسلام کی جب اس نامور شخصیت نے دارالعلوم دیوبند کی مسجد میں حضرت الاستاد کی تقریر عربی زبان میں سنی جو مسلسل ایک گھنٹہ جاری رہی تھی اور جس کا اصل موضوع حدیث اور علمائے دیوبند تھا۔ تو یہ مصری عالم سر تاپا حیرت بنا ہوا تھا اور آخر اسے اعتراف کرنا پڑا کہ اگر ہندوستان کے سفر میں اسے مولینا محمد انور شاہ

کی زیارت و ملاقات کا اور موصوف کی یہ تقریر سننے کا موقع نہ ملتا تو وہ سمجھتا کہ وہ ہندوستان کے سفر سے تہی داماں آیا ہے۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کو کون نہیں جانتا ایک نامور فلسفی شاعر ہونے کے علاوہ فلسفہ کے دقتیں انظر عالم تھے۔ نیز فلسفہ یونانی اور اسلامی کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کا فلسفہ مغرب بھی جانتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا اسلامیات کا مطالعہ بھی وسیع تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے بر ملا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اپنی انگریزی زبانوں کے چھ لیکچروں ❶ کی تیاری میں حضرت الاستاذ سے کافی مدد لی ہے۔ یہاں شاید اس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حضرت الاستاذ کا ایک منظوم رسالہ حدوث عالم کی بحث پر ہے۔ یہ رسالہ تو حجم میں بہت مختصر ہی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اس مسئلہ (حدوث عالم) پر سارے قدیم و جدید فلسفہ کا عطر اور اس پر تنقید ہے اور اس بناء پر جب تک کوئی شخص فلسفہ اچھا اور مبصر عالم نہ ہو وہ اس رسالہ سے پورے طور پر نفع حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ رسالہ چھپ کر آیا تو اس کا ایک نسخہ حضرت الاستاذ نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پاس بھی تحفہ ارسال فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب جس ذوق اور جس استعداد کے بزرگ تھے اس کے اعتبار سے ان کے لئے کوئی تحفہ اس چند ورق رسالہ سے زیادہ قیمتی ہو نہیں سکتا تھا۔ بڑے خوش ہوئے اور پورا رسالہ بڑی توجہ اور غور و فکر کے ساتھ پڑھا۔ میں اس زمانہ میں بسلسلہ طالب علمی لاہور میں مقیم تھا اور گاہے گاہے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی علمی و ادبی مجلس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم تھا کہ مجھ کو حضرت شاہ صاحبؒ کے ادنیٰ درجہ کے تلامذہ میں سے ہی ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے بلکہ اس یادگار علم و فضل میں شخصی تقرب و اختصاص کا مرتبہ بھی میسر ہے اس بناء پر میرے ساتھ کرم و شفقت بزرگانہ کا معاملہ کرتے تھے اور جب کبھی حاضر ہوتا گھنٹوں بڑی بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ مختلف اسلامی مسائل پر گفتگو فرماتے تھے، اسی قسم کی ایک صحبت میں ایک مرتبہ فرمایا کہ میں تو مولینا انور شاہ کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ اور قال الرسول سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی ان کو اس درجہ درک و بصیرت اور اس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدوث عالم پر اس رسالہ میں انہوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وہ رسالہ میرے حوالہ کیا اور فرمایا۔ اس میں چار شعرا ایسے ہیں جن کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا میں

نے ان پر نشان لگا دیا ہے آپ دیوبند جائیں تو یہ نسخہ ساتھ لے جائیں اور شاہ صاحب سے ان اشعار کا مطلب دریافت کر کے آئیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کی تعمیل کی۔ دیوبند آکر وہ رسالہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر کے ڈاکٹر صاحب کا پیغام پہنچایا لیکن حضرت الاستاذ نے مجھ کو ان اشعار کا مطلب سمجھانے کے بجائے یہی مناسب خیال فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کو غازی میں ایک طویل خط لکھیں اور اسی میں ان اشعار کا مطلب بھی تحریر فرمادیں، یہ خط میں ہی دتی لے کر لاہور آیا اور ڈاکٹر صاحب کو پہنچایا۔

یہ حکیم الامت جس نے خود اپنے متعلق کہا تھا

اس کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں

کبھی سوز و ساز رومی کبھی بیچ و تاب رازی

اس کے دل میں حضرت الاستاذ کی کس درجہ عظمت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اختلاف کے باعث جب حضرت الاستاذ نے اپنے عہدہ صدرالاساتذہ سے استعفیٰ دیا اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چند روز بعد میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمانے لگے کہ ”آپ کا یا دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو میں بہر حال شاہ صاحب کے استعفیٰ کی خبر سن کر بہت خوش ہوا ہوں۔“ میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا۔ کیا آپ کو دارالعلوم دیوبند کے نقصانات کا کچھ ملال نہیں ہے۔ فرمایا کیوں نہیں؟ مگر دارالعلوم کو تو صدر المدرسین اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی لیکن اسلام کے لئے اب جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتی ہوں اس کو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد انہوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کو میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اس وقت عالم اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا ہے جو اس عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہو سکے پھر فرمایا: یہ مسائل کیا ہیں اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے؟ میں ایک عرصہ سے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ سب مسائل میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کروں گا اور ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے؟ یہ شاہ صاحب بتائیں گے اس طرح ہم دونوں کے اشتراک و تعاون سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آجائے گی۔ چنانچہ باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ اسی جذبہ کے تحت ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بڑی

کوشش کی کہ کسی طرح شاہ صاحب دیوبند کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور تشریف لے آئیں اور وہیں مقیم ہو جائیں لیکن افسوس کہ حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ ایسا نہ ہو سکا اور حضرت شاہ صاحب لاہور کے بجائے ڈابھیل تشریف لے گئے جس کا ڈاکٹر صاحب کو بڑا اظلال اور صدمہ ہوا۔

باخبر حضرات جانتے ہیں کہ پنجاب کے خصوصاً اور ہندوستان کے عموماً انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں قادیانی فتنہ کی شرانگیزی و اسلامی کشی کا جو احساس پایا جاتا ہے اس میں بڑا دخل ڈاکٹر اقبال مرحوم کے اس لیکچر کا ہے جو ختم نبوت پر ہے اور ساتھ ہی اس مقالہ کا ہے جو انگریزی میں قادیانی تحریک کے خلاف شائع ہوا تھا لیکن یہ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ ان دونوں تحریروں کا اصل باعث حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ ہی تھے۔

ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب انجمن خدام الدین کے کسی سالانہ اجتماع میں شرکت کی غرض سے لاہور تشریف لے گئے تو ڈاکٹر صاحب ملاقات کے لئے حضرت موصوف کی قیام گاہ پر آئے اور پھر ایک دن اپنے ہاں رات کے کھانے پر مدعو کیا دعوت کا صرف ایک بہانہ تھا ورنہ اصل مقصد علمی استفادہ تھا چنانچہ کھانے سے فراغت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ختم نبوت اور قتل مرتد کا مسئلہ چھیڑ دیا جس پر کامل دوڑھائی گھنٹہ تک گفتگو رہی ڈاکٹر صاحب کی عادت یہ تھی کہ جب وہ کسی اسلامی مسئلہ پر کسی بڑے عالم سے گفتگو کرتے تھے تو بالکل ایک طالب علمانہ انداز سے کرتے تھے مسئلہ کے ایک ایک پہلو کو سامنے لاتے اور اس پر اپنے شکوک و شبہات بے تکلفانہ بیان کرتے تھے چنانچہ اب اس وقت بھی انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ شکوک و شبہات اور ایرادات و اعتراضات کو بڑے صبر و سکون کے ساتھ سنا اور اس کے بعد ایک ایسی جامع اور مدلل تقریر کی کہ ڈاکٹر صاحب کو ان دو مسئلوں پر اطمینان کلی ہو گیا اور جو کچھ خلش ان کے دل میں تھی وہ جاتی رہی اور اس کے بعد ہی انہوں نے ختم نبوت پر وہ لیکچر تیار کیا کہ جو ان کے چھ لیکچروں کے مجموعہ میں شامل ہے اور قادیان تحریک پر وہ ہنگامہ آفرین مقالہ سپرد قلم فرمایا جس نے انگریزی اخبارات میں شائع ہو کر پنجاب کی فضا میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔

بہر حال یہ دو تین واقعات صرف اس غرض سے لکھے گئے ہیں کہ جن لوگوں کو براہ راست یا تصنیفات و تالیفات کے ذریعہ حضرت الاستاذ کے بحرناپیداکنار علم سے جرعہ نوشی کا موقع نہیں ملا وہ ایک جوہر گر نمایاں کی قدر و قیمت کا اندازہ تو اس سے کر سکیں کہ دنیا کے جوہریوں کی رائے اس کے متعلق کیا تھی؟

شکل و صورت :..... قدرت نے حضرت الاستاذ کو جس طرح اقلیم علم کی تاجداری عطا فرمائی تھی اس طرح جسمانی ہیئت و میل و ذول، قد و قامت اور شکل و صورت میں بھی ایک خاص امتیاز عطا

فرمایا تھا۔ مجھ کو ہندوستان، مصر و حجاز اور دوسرے ممالک عربیہ کے بڑے بڑے علماء و مشائخ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے لیکن جو وجاہت، جو وقار و متانت، جو دل کشی، اور جو جاذبیت میں نے حضرت الاستاذ میں پائی وہ کہیں کسی اور جگہ نظر نہیں آئی۔ ہزار علماء میں بھی بیٹھتے تو سب سے ہی الگ اور سب سے ہی نمایاں رہتے۔ دیکھنے والوں کی نگاہ ادھر ادھر گھومنے کی بعد وہیں پر جا کر ٹھہرتی اور پھر جہتی تو اس طرح کہ وہاں سے پلٹنے کا نام نہ لیتی۔ کشمیری الاصل تھے اس لئے خوب کھلا ہوا سپید رنگ کشیدہ دراز اقامت، چوڑا چکلا سینہ، دوہرا اور گز ار جسم، بڑی بڑی مگر رسیلی اور شرجیلی آنکھیں کشادہ و فراخ پیشانی، طویل مگر سوتواں بینی، بڑے بڑے کان پر گوشت اور فرہ چہرہ ابریشم اور حریر کی مانند نرم و سبک جلد، چلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ علم کا ایک گوہ گراں سبک گامی کر رہا ہے۔ بیٹھتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ علم و فضل کا ایک آفتاب نظام شمس سے دایستہ ستاروں کو اپنے ارد گرد لے کر بیٹھ گیا ہے وہ سر پر کبھی سفید اور کبھی بہر تمامہ اور قامت بالا پر سبز قبا استعمال کرتے تھے۔ دیکھنے والے ڈر ڈر کے دیکھتے تھے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے کیونکہ فرمان نبوی ہے ”العبین حق“

غرض کوئی ایک ادا ہو تو اس کا ذکر کیجئے، کوئی ایک خوبی ہو تو اس کو بیان کیا جائے جہاں عالم یہ ہو کہ
ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کر شمر دامن دل میکشد کرجا اینجاست
وہاں خاموشی کو ہی ترجمانی دل کا منصب تفویض کر دینے کے سوا اور کیا چارہ ہے۔

لطافت طبع:..... اسی حسن و جمال ظاہری و باطنی کے باعث طبیعت میں لطافت بھی بہت زیادہ تھی۔ بہت صاف اور ابلے کپڑے پہنتے تھے۔ غذا میں بھی روٹی گوشت وغیرہ جیسی چیزیں رغبت سے نہیں کھاتے تھے۔ البتہ تازہ پھلوں اور طیور کے عاشق تھے ایک مرتبہ فرمایا کہ بیس سال میری زندگی میں ایسے گزرے ہیں کہ میں نے پرندوں کے علاوہ کوئی اور دوسرا گوشت کھایا ہی نہیں۔

۱۹۲۸ء میں حضرت الاستاذ اپنی جماعت کے ساتھ جس میں حضرت الاستاذ مولینا شبیر احمد عثمانی، مولینا سید سراج احمد صاحب رشیدی، مولینا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی، مولینا بدر عالم، مولینا عتیق الرحمن عثمانی اور مولینا محمد ادریس صاحب سکروڈوی شامل تھے۔ راقم الحروف کی شادی میں شرکت فرمانے کے لئے آگرہ تشریف لائے (چانچہ اس خاکسار کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ نکاح حضرت الاستاذ ہی نے پڑھا ہے) تو اگرچہ قبلہ والد صاحب مرحوم نے اس جماعت مقدسہ کی ضیافت کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کے باورچی کا الگ انتظام کر دیا تھا جو دونوں وقت عمدہ قسم کے کھانے تیار کرتا تھا۔ لیکن آگرہ کے نواح میں ایک مقام ہے مکو یہاں کے خربوزے مشہور ہیں، اتفاق سے یہ موسم انہیں خربوزوں کی فصل کا تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے پہلی مرتبہ ایک خربوزہ کھایا تو بے حد پسند آیا اور

والد صاحب سے فرمایا بس ڈاکٹر صاحب! اگر آپ میری خاطر تواضع کرنا چاہتے ہیں تو سن لیجئے۔ مجھ کو آپ کی بریائی، تورمہ اور کوفتوں وغیرہ سے غرض نہیں۔ آپ میرے لئے تو یہ انتظام کیجئے کہ منہ کے خربوزوں کا ایک ٹوکرا ہر وقت بھرا ہوا میرے پاس رکھا رہے اور ساتھ ہی ایک چھری، دو پلیٹیں اور ایک طشت اور ایک بالٹی یہ چیزیں بھی رکھ دیں تاکہ میں جس وقت جس قدر بھی کھانا چاہوں کھا سکوں! قبلہ والد صاحب نے ارشاد کی تعمیل کی اور پھر تو حضرت الاستاذ کا حال یہ تھا کہ کھانا برائے نام کھاتے تھے اور شکم سیری خربوزوں سے کرتے تھے بھنے ہوئے مرغ کے بھی بڑے قدر داں تھے۔

اخلاق:..... علم و فضل میں جو سر بلند اور سرفرازی اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی تھی اسی تناسب سے اخلاق بھی نہایت بلند اور پاکیزہ تھے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی سائل حضرت الاستاذ کے پاس آیا ہو اور وہ نامراد گیا ہو۔ جیب میں اس وقت جو کچھ ہوتا روپیہ ہو یا انٹنی سائل کے حوالہ کر دیتے۔ ایسی بات کہنے سے احتراز فرماتے تھے جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ ایک مرتبہ امرتسر تشریف لے گئے وہاں کے ایک نامی گرامی بیرسٹر صاحب بھی بر بنائے عقیدت خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ بیرسٹر صاحب ڈاڑھی مونچھ صاف رکھتے تھے اس لئے حضرت الاستاذ کے سامنے بیٹھتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ اور بچنے بچنے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت الاستاذ نے ان کی یہ دلی کیفیت بھانپ لی اور فرمایا۔ بیرسٹر صاحب آپ کیوں خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ ہم دونوں کا فعل اگرچہ مختلف ہے لیکن غرض و غایت دونوں کی ایک ہی ہے یعنی دنیا کمنا میں اگر مولوی ہو کر ڈاڑھی نہ رکھوں تو مجھے کوئی روٹی نہ دے۔ اسی طرح اگر آپ بیرسٹر ہو کر ڈاڑھی صاف نہ کرائیں تو ہر شخص کہے گا کہ ان کو بیرسٹر کبھی نہ بنایا ہے؟ یہ تو ملا جی ہیں تو پھر آپ کو بھی بیرسٹری کے نام کی روٹی نہ ملے۔ بس جب ہم دونوں کی غرض ایک ہی ہے تو محض اختلاف فعل پر آپ کیوں شرمندہ ہوں۔

مزاج:..... مزاج لطافت طبع کی نشانی ہوتی ہے حضرت شاہ صاحب بھی گاہے گاہے بہت لطیف قسم کے مزاج فرماتے تھے۔

ایک واقعہ لکھتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت الاستاذ کو مزاج کے ساتھ ساتھ چھوٹوں کی دلجوئی اور ان کی دل دہی کا کس قدر خیال رہتا تھا۔ اوپر گزر چکا ہے کہ حضرت الاستاذ میری شادی میں شریک ہوئے اور حضرت نے ہی میرا نکاح پڑھا تھا۔ یہ مہینہ مئی کا تھا جو آگرہ کے لئے بہت ہی شدید اور انتہائی سخت موسم ہے۔ بارات کو اعتماد پور جو آگرہ سے تین چار اسٹیشنوں کے فاصلہ پر ہے وہاں جانا تھا۔ ریل کے اوقات کی مجبوری کی وجہ سے دوپہر کو تقریباً دو ڈھائی بجے کے قریب ہم لوگ آگرہ سے روانہ ہوئے اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اعتماد پور کے اسٹیشن پر پہنچ گئے گو منزل ابھی دو میل

دور تھی اسٹیشن سے قیام گاہ تک جانے کے لئے اس نواح کی مخصوص اور سخت تکلیف دہ سواری یعنی یکہ میں بیٹھنا تھا پھر اس پر ستم یہ کہ راستہ نہایت ناہموار جگہ جگہ گڑھے اور نشیب و فراز وہ کہ الامان! گرمی اپنے شباب پر نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قافلہ یکوں پر سوار ہو کر اسٹیشن سے شہر کی جانب روانہ ہوا تو راستہ کی ناہمواری اور گڑبڑوں کی فراوانی کے باعث برا حال ہو گیا۔ حضرت شاہ صاحب ٹھہرے اس نہایت ہی لطیف اور نازک مزاج بزرگ نے تھوڑی دیر چلنے کے بعد ہی یکہ رکوا دیا اور با پیادہ ہو گئے چلچلاتی دھوپ پڑ رہی اور لو چل رہی ہے، چاروں طرف سے مٹی کے تودے ہیں کہ فضاء میں گشت لگاتے پھر رہے ہیں اور اسی عالم میں حضرت شاہ صاحب نے منہ اور کانوں کو رمال لپیٹے ہوئے حسب اللہ ونعم الوکیل پڑھتے ہوئے قدم بڑھائے۔ اعتماد پور کی آبادی کی طرف چلے جا رہے ہیں آخر خدا خدا کر کے مقام آیا۔ ایک بڑے مکان میں انتظام تھا وہاں ہم لوگوں کو پہنچا دیا گیا۔ یہاں لوگ پہلے سے موجود تھے کوئی پنکھا لے کر دوڑا اور کوئی پانی سے بھر لونا لے کر آیا کہ سخت گرمی میں چل کر آئے ہیں ذرا منہ ہاتھ دھو کر ٹھنڈے ہو لیجئے۔ حضرت شاہ صاحب کو صدر مجلس میں ایک قالین پر بٹھا دیا گیا اور دو تین آدمی بڑے بڑے پنکھے لے کر جھلنے کھڑے ہو گئے جب پسینہ خشک ہو گیا اور دم میں دم آ گیا تو دودھ کے شربت کا ایک بھرا ہوا گلاس میں خود لے کر حضرت الاستاذ کی خدمت میں حاضر ہوا میں آنے کو تو آ گیا ورنہ حق یہ ہے کہ شرم کے مارے نگاہ نہیں اٹھتی تھی کہ میری وجہ سے مولینا شبیر احمد صاحب اور دوسرے حضرات کو عموماً اور حضرت الاستاذ کو خصوصاً کس قدر شدید تکلیف پہنچی ہے۔ اس قسم کے خیالات اور احساس ندامت و شرمندگی تھا۔ جن سے میں اس وقت دو چار ہو رہا تھی۔ اسی عالم میں دودھ کے شربت کا گلاس حضرت الاستاذ کی طرف بڑھایا۔ حضرت میرے چہرے بشرے سے سمجھ گئے۔ گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا اور خوش مزاجی کے ساتھ فرمایا۔

الایا ایہا الساقی ادر کاساؤ ناولہا

پھر ایک دگھونٹ لینے کے بعد میری طرف دیکھ کر ذرا تبسم سے فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

اور مولوی صاحب کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکبہا

اللہ اکبر! کیا اخلاق تھے، ایک عبد حقیر و بے مایہ کی کیسی دلجوئی و ولد ہی تھی؟ ایک بندہ گنہگار ہجر و پر کیسی بزرگانہ شفقت کہ مسکراتے ہوئے متوجہ کر کے ایک خاص انداز سے حضرت حافظ شیرازی کا یہ مصرعہ دوم پڑھنا تھا کہ میری ساری ندامت و شرمندگی اسی وقت کا فور ہو گئی اور پھر حضرت شاہ صاحب نے اپنی کسی بات سے یہ قطعاً محسوس نہیں ہونے دیا کہ سفر کی شدید صعوبتوں کی وجہ سے حضرت کے دل پر ناگواری کا کوئی بھی اثر ہے۔

خودداری:..... عام اخلاق و فضائل کے ساتھ حضرت میں خودداری بھی انتہا درجہ کی تھی برار کے قضیہ کے سلسلہ میں نظام حیدر آباد دہلی میں آئے ہوئے تھے کہ نظام کی خواہش پر حضرت شاہ صاحب بھی دیوبند سے دہلی تشریف لائے اور ایک وقت مقررہ پر نظام کی قیام گاہ پر پہنچے خبر ہوتے ہی نظام نے اندر بلا لیا لیکن حضرت شاہ صاحب پہنچے تو عام آداب و شرائط کا لحاظ اور نہ کسی شاہی دستور و آئین کی پابندی رو برو ہوتے ہی شاہ صاحب نے پیش قدمی کی اور خالص اسلامی طریقہ پر السلام علیکم کہا۔ نظام پیشوا کی کے لئے آگے بڑھے اور دیکھ کر سلام کہہ کر شاہ صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ایک کرسی پر لے جا کر بٹھا دیا۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ زیادہ تر دائرۃ المعارف کے کام سے ہی متعلق تھی۔ حضرت شاہ صاحب نے حدیث کی چند اہم کتابوں اور ان کے قلمی نسخوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ اگر آپ ان کو بھی حاصل کر کے دائرۃ المعارف کی طرف سے شائع کر دیں تو بے شہر علم حدیث کی اور اس کے واسطے سے اسلام کی یہ بڑی عظیم الشان خدمت ہوگی۔ اس زمانہ میں دیوبند سے ایک ہفتہ وار اخبار مہاجر نکلتا تھا جو دارالعلوم دیوبند کی اصلاح طلب جماعت کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر نے اس ملاقات کی خبر چھاپنے کا ارادہ کیا تو ایڈیٹر نے بارگاہ خسروی میں حضرت کشمیری کی باریابی یا اسی مفہوم کی کوئی اور عبارت بطور عنوان خبر لکھی۔ اتفاق سے اخبار ابھی چھپا نہیں تھا کہ حضرت شاہ صاحب کو اس عنوان کی اطلاع ہو گئی تو حد درجہ برہم اور خفا ہوئے اور فرمایا کہ میں ہر چند ایک مرد بے مایہ و بے بضاعت ہوں لیکن اتنا منکسر المزاج بھی نہیں کہ یہ عنوان گوارہ کر لوں۔ کیسی بارگاہ خسروی اور کیسی اس میں باریابی صاف لکھتے تھے نظام اور انور شاہ کی ملاقات۔

ایک مرتبہ حیدر آباد کے مولوی نواب فیض الدین صاحب ایڈوکیٹ نے حضرت شاہ صاحب کو اپنی لڑکی کی شادی میں بلایا۔ چونکہ نواب صاحب اور ان کے خاندان کو علماء دیوبند کے ساتھ قدیم رابطہ اور قلبی علاقہ تھا اس لئے شاہ صاحب حیدر آباد تشریف لے گئے۔ دوران قیام میں بعض لوگوں نے چاہا کہ حضرت شاہ صاحب اور نظام کی ملاقات ہو جائے۔ حضرت کو اس کی اطلاع ہو گئی تو فرمایا۔ مجھے کو ملنے میں عذر نہیں ہے لیکن اس سفر میں میں نہیں ملوں گا۔ کیونکہ اس سفر کا مقصد نواب صاحب کی بچی کی تقریب میں شرکت تھا اور بس میں اس مقصد کو خالص رکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ ہر چند لوگوں نے کوشش کی اور ادھر نظام کا بھی ایما تھا مگر شاہ صاحب کسی طرح رضامند نہیں ہوئے۔

اسی قیام حیدر آباد کے زمانہ کا واقعہ ہے جو مجھ کو میرے ماموں قاضی ظہور الحسن صاحب ہاشم سیوہاروی نے سنایا تھا موصوف اس زمانہ میں مستقلاً نواب فیض الدین صاحب کے مکان میں ہی رہتے تھے۔ ماموں کہتے تھے کہ شاہ صاحب کے قیام کے دنوں میں ایک روز سرائے حیدری کا

ٹیلیفون آیا کہ میں مولانا انور شاہ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب کو یہ پیغام پہنچایا گیا تو فرمایا میں تو یہیں ہوں ابھی کہیں جانا نہیں۔ حیدری صاحب آنا چاہتے ہیں تو آجائیں۔ حیدری صاحب کو یہ پیغام پہنچا تو انہوں نے پھر ٹیلیفون پر کہا کہ بہت اچھا میں حاضر ہوتا ہوں لیکن ایک شرط ہے وہ یہ کہ میرے پہنچنے پر شاہ صاحب کے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوں تو ان کو اٹھا دیا جائے میں جہاں میں شاہ صاحب سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت الاستاذ کو حیدری صاحب کا یہ پیغام پہنچایا گیا تو فوراً ارشاد فرمایا کہ یہ ناممکن ہے کہ میں حیدری صاحب سے باتیں کرنے کے لئے حاضرین مجلس کو چھوڑ کر الگ جا بیٹھوں یا ان لوگوں سے میں کہوں کہ چلے جائیں۔

اسلامی غیرت و حمیت حضرت شاہ صاحب طبعاً بڑے حلیم اور بردبار تھے لیکن اسلامی اور دینی معاملات میں وہ کس طرح تہاؤں تساہل یا غفلت شعاری کو گوارہ نہیں کر سکتے تھے۔ ایک مرتبہ ذابھیل سے دیوبند تشریف لے جا رہے تھے میں اس زمانہ میں مدرسہ فتحپوری دہلی میں مدرس تھا حضرت کو دہلی اسٹیشن پر دیوبند کے لئے گاڑی بدلنی پڑتی تھی اور کئی گھنٹہ وہاں قیام کرنا پڑتا تھا اس فرصت کو غنیمت جان کر میں چند احباب کے ساتھ اسٹیشن پہنچ گیا اور جب تک دیوبند والی گاڑی چھوٹ نہیں گئی اسٹیشن پر حضرت الاستاذ کے ساتھ ہی رہا۔ اس موقع پر دوران گفتگو میں حضرت الاستاذ کو معلوم ہوا کہ ابھی حال ہی میں دہلی میں قادیانیوں کا ایک جلسہ تین دن تک ہوتا رہا جس میں ہر قسم کی تقریریں کی گئیں۔ لیکن علماء اسلام میں سے کسی شخص نے قادیانیوں کے جلسہ میں پہنچ کر اس کو مناظرہ کی دعوت نہیں دی۔ قادیانی فتنہ کا استیصال حضرت شاہ صاحب کے دل کو لگا ہوا تھا یہ سن کر انہیں بے حد صدمہ ہوا اور خصوصاً اس بنا پر کہ دہلی میں دیوبند کے پڑھے ہوئے بیسیوں علماء موجود ہیں لیکن اس کے باوجود قادیانی تین دن تک اطمینان سے اپنا جلسہ کر گئے اور کسی عالم دین کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ تقریر یا تحریر مسلمانوں کو اس فتنہ کی ہلاکت انگیزی سے باخبر کر دیتا، اس مجمع میں غالباً میں ہی ایسا شخص تھا جو حضرت الاستاذ کی توجہات عالیہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمانے لگے۔ مولوی صاحب کسی شریف آدمی کی تو بین گالی سننے سے ہی نہیں ہوتی بلکہ اگر وہ کوئی اپنے مرتبہ سے گرا ہوا کام کرے تو اس سے بھی اس کی توہین ایسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ گالی وغیرہ سے۔

اس پر ایک واقعہ سنایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں ایک متول اور باعزت شخص نے زبرقان نامی ایک شاعر کے خلاف شکایت کی کہ اس نے ایک شعر میں اس کی بڑی شدید جھوکی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شاعر سے جواب طلب کیا تو اس نے کہا امیر المومنین میں نے تو اس کی مدح کی ہے نہ کہ مذمت چنانچہ دیکھئے میں کہتا ہوں۔

دع المکارم لا ترحل لبغيتها
ترجمہ: تو چھوڑ بزرگیوں اور بڑی طاقتوں کو مت سفر کر ان کی طلب میں تو بیٹھا بھی رہ
(اپنے گھر کے اندر) کیونکہ تو کھانے والا بھی ہے اور پہننے والا بھی ماشاء اللہ خوب کھاتا پیتا
آدی ہے۔

حضرت عمرؓ نے یہ شعر سنا تو فرمایا استغاثہ بالکل صحیح ہے درحقیقت ایک شریف انسان کی توہین
اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ حصول مکارم کو غریبوں کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے۔
بہر حال یہ چند سطریں صرف اس مجلس میں شرکت کی غرض سے لکھی ہیں ورنہ میں خود اپنی
طرح جانتا ہوں کہ ان سے حضرت الاستاذ کا حق کیا ادا ہو سکتا ہے۔

اللہ اکبر کیسے مبارک تھے وہ لمحات زندگی جو اس علم و عمل کے ایک زندہ پیکر کی معیت اور محبت
میں بسر ہوئے اور کیسی لطف آفرین اور روح پرور ساعتیں تھیں وہ جو اس شجرہ فلاح و تقویٰ کے در
سایہ گزریں۔ فرحمة اللہ رحمۃ واسعة و نور برہانہ۔

(منقول از حیات انور)



حضرت الاستاذ علامہ کشمیری کے تجدیدی کارنامے

از حضرت مولینا سید احمد رضا صاحب بجنوری مدظلہ العالی
مؤلف: انوار الباری شرح صحیح البخاری

مولینا سید احمد رضا صاحب بجنوری دامت فیوضہم حضرت شاہ صاحب نور اللہ ضریح کے نہ صرف باصلاحیت شاگرد ہیں بلکہ انہیں حضرت شاہ صاحبؒ کے خویش ہونے کا فخر بھی حاصل ہے حضرت شاہ صاحب کی چھوٹی صاحبزادی کا عقد نکاح ۱۹۴۷ء میں ان کے ساتھ ہوا۔ نکاح حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے پڑھایا۔

مولینا سید احمد صاحب کئی سال تک دارالعلوم دیوبند میں حضرت شاہ صاحبؒ کے درس سے مستفید ہوئے اور جب حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی خدمات جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کیلئے وقف کیں تو مولینا رضا صاحب بھی وہاں حضرت کے درس میں شامل ہو گئے۔ اس طرح سے انہیں حضرت شاہ صاحب کے آخری دو سال کے درس بخاری شریف میں شرکت و استفادہ کی نعمت غیر مترقبہ مل گئی۔

مولینا بجنوری مدظلہ کئی سال تک روزنامہ الجمعۃ دہلی میں کام کر چکے ہیں بعد ازاں دارالعلوم دیوبند میں شعبہ نشر و اشاعت سے متعلق رہے۔ آج کل بجنوریوپی میں مکتبہ ناشر العلوم سے وابستہ ہیں۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مولینا موصوف بزمانہ قیام ڈابھیل حضرت شاہ صاحب کی تقاریر درس بخاری شریف قلم بند کر چکے تھے۔ اور اب کئی سال سے انوار الباری شرح اردو صحیح بخاری کے نام سے بخاری شریف کی شرح تحریر فرما کر بالاقساط شائع کر رہے ہیں، ان کے بیان کے مطابق شرح بخاری شریف کا یہ مجموعہ تقریباً چالیس حصوں پر مشتمل ہوگا۔ اس وقت اس کی چودہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے ملفوظات گرامی پر مشتمل ایک کتاب نطق انور بھی شائع کی ہے۔

بہر کیف علوم انوری کو دوسروں تک پہنچانے میں قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔
جزاہ اللہ خیراً (کوندہ)

حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کے حالات و علمی کمالات مختصراً انوار الباری حصہ دوم اور نطق انور جلد اول میں بیان کر چکا ہوں اور مجھ سے زیادہ بہتر و مفصل حالات رفیق محترم علامہ بنوری دام

لہذا ہم نے فقہ العصر میں لکھے ہیں۔ یہاں ان کے صرف چند اہم کارناموں کا تذکرہ کریں گا والتوفیق من اللہ۔

(۱)..... حضرت کے زمانے میں قادیانی منتہی کا فتنہ سب سے زیادہ اہتمام عوام و خواص کا سبب بنا تھا جو برطانوی اقتدار کی سرپرستی میں پلا بڑھا تھا۔ اور اس جھوٹے دعوے کے ثبوت میں بھاری دلائل و براہین بھی اتنے مضبوط و مستحکم قائم کئے گئے تھے کہ اچھے علماء وقت بھی ان کے مقابلے سے کتراتے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ ہی کی وہ واحد ذات تھی جو سارے علمی و عملی کمالات کے بحر بیکراں تھی اور آپ نے میدان مقابلہ میں اتر کر تمام علماء حق کو جوابات و دلائل سے مسلح کر کے اس فتنہ کی سرکوبی کرائی۔ حضرت نے اس سلسلہ میں متعدد تالیفات بھی کیں، جن میں علوم نبوت، ختم نبوت اور حیات و نزول مسیح علیہ السلام پر سیر حاصل ابھارت پر دقلم فرمائیں۔ یہ تالیفات حضرت کے علمی تعارف کا بہت بڑا ذخیرہ بھی ہیں جن سے علماء ہند مستفید ہوتے رہیں گے۔

نطق انور میں حضرت کے اس تجدیدی کارنامہ کا تذکرہ و تعارف زیادہ تفصیل سے آچکا ہے اس لئے اس مختصر تحریر میں صرف اشارہ پراکتفا کرتا ہوں۔

(۲)..... تاریخ اسلام میں ہے کہ قاہرہ میں جس شان کے ساتھ بخاری شریف کا درس ہوتا تھا، اسی شان سے علما ی عینی نے امام طحاویؒ کی کتاب معانی الآثار کا درس دیا تھا، جس میں فقہ حنفی کی برتری محدثانہ طور سے پیش کرتے تھے اور آپ نے اس کتاب کی دو ضخیم شرح بھی لکھی تھیں۔ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی بڑی تمنا تھی کہ یہ کتاب دارالعلوم دیوبند وغیرہ میں بھی اس شان کے ساتھ پڑھائی جائے، مگر ایسا نہ ہو سکا، تاہم آپ کا درس بخاری شریف و ترمذی شریف ایسی محدثانہ و محققانہ شان کے ساتھ ہوتا تھا یہ تمنا بڑی حد تک پوری ہو جاتی تھی۔

۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ایک عظیم الشان اجلاس علامہ رشید رضا مصری کی صدارت میں ہوا تھا تو اس وقت علامہ موصوف دارالعلوم دیوبند بھی پہنچے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ شیخ الحدیث تھے اور دارالعلوم کی طرف سے علامہ کی ترحیب قدوم کے لئے جلسہ منعقد ہوا تھا۔ علامہ نے جلسہ سے کچھ قبل کسی استاذ دارالعلوم سے سوال کیا کہ یہاں درس حدیث کس نوعیت کا ہوتا ہے؟ جواب ملا کہ حدیث کی شرح و تحقیق کے بعد فقہی بحث میں حنفی فقہ کی برتری واضح کی جاتی ہے علامہ نے بے ساختہ فرمایا، کیا حدیث حنفی ہو گئی ہے؟ اس گفتگو کا ہم حضرت شاہ صاحبؒ کو ہو گیا تو آپ نے اپنی نہایت فصیح و بلیغ عربی تقریر میں درس حدیث دارالعلوم دیوبند کی نوعیت ہی واضح فرمائی اور ان سب

وجہ و دلائل پر روشنی ڈالی جن کے تحت محدثانہ لحاظ سے فقہ حنفی کی برتری ثابت کی جاتی ہے۔^۱
 اسی زمانہ کے القاسم دیوبند اور المنار مصر میں اس جلسہ کے حالات و تقاریر شائع ہوئی تھیں۔
 علامہ نے دارالعلوم کے معانیہ اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر سے جو گہرے تاثرات اخذ کئے تھے
 وہ لائق مطالعہ ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث میں تیرہ سو سال کے اکابر محدثین کے علوم و کمالات اور
 ابحاث و افادات سے واقف کرایا جاتا تھا۔ نزاعی مسائل میں ہر حدیث کے رجال و طرق او
 ر اسانید و متون پر بحث ہوتی تھی، پھر فیصلہ سنایا جاتا تھا۔

حضرت یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ چالیس سال کے مطالعہ و درس حدیث کے بعد میں نے یہ رائے
 قائم کی ہے کہ فقہ حنفی ہی اوفق بالحدیث ہے۔ بحر چند معدود مسائل کے کہ ان میں کچھ کمزوری پاتا ہوں۔
 یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ فقہ لب الدین ہے کہ قرآن مجید حدیث و آثار صحابہ و تابعین کا عطر
 کشید ہو کر فقہ میں آگیا ہے اور یہی صحیح ترتیب ہے کہ قرآن و حدیث سے فقہ کی طرف آنا چاہئے اور
 جو لوگ اپنے ذہن میں ایک مسئلہ طے کر کے پھر اسی کو حدیث و قرآن سے ثابت کرنے کی سعی
 کرتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں کیونکہ وہ فقہ سے قرآن حدیث کی طرف چلنا چاہتے ہیں۔

درس حدیث کی اسی شان کو ہم حضرت شاہ صاحبؒ کا ایک تجدیدی کارنامہ سمجھتے ہیں اور اس
 بارے میں آپ کا اتباع جمید علماء نے کیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اب رفتہ رفتہ درس کی یہ شان تحقیق
 رو بہ انحطاط ہے۔ اس دور کے بیشتر مدارس میں درس بخاری شریف ہونے لگا ہے جن میں اس کا
 حق ادا نہیں ہوتا، راقم الحروف نے مقدمہ انوار الباری میں لکھا تھا کہ صحیح بخاری شریف سے قبل
 تقریباً ایک سو کتب حدیث مدون ہو چکی ہیں۔ جن میں احادیث کے ساتھ صحابہ و تابعین کے آثار
 بھی تھے۔ مثلاً مسانید امام اعظمؒ، موطا امام مالک، مرویات عبداللہ بن مبارک، مسند امام جعفر
 صادق، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، سنن دارمی، مسند امام شافعی و مسند امام احمد وغیرہ،
 ان سب کتب حدیث و آثار کی روشنی میں ائمہ اربعہ مجتہدین کی فقہ مرتب ہو چکی تھیں کہ ان کے بعد
 امام بخاریؒ نے اپنی الگ فقہ کے مطابق احادیث مجروح جمع کیں۔ آثار صحابہ و تابعین کی سابق

۱۔ حضرت امام اعظمؒ کے تلمیذ خصوصی اور سیدنا امام بخاریؒ کے استاذ حدیث امام عبداللہ بن مبارکؒ نے (جن کی
 نہایت مدح امام بخاریؒ نے کی ہے اور یہ بھی لکھا کہ لوگوں نے اس جلیل القدر علم اہل زمانہ کو چھوڑ کر جاہلوں کی تقلید کر لی
 اور اشارہ امام اعظمؒ کی طرف کیا) ارشاد فرمایا کہ لوگ یوں کیوں کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ فقہ حنفی کا ہے انکو تو یہ کہنا چاہئے کہ در
 حقیقت حدیث کی شرح اسی مسئلہ پر منطبق ہوتی ہے (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ انوار الباری)

حیثیت کو ختم کیا جس کے اتباع میں ہر دور کے اہل حدیث نے اپنی نئی نئی اور الگ فقہ بنائی اور اس طرح بیسیوں فقہ معرض وجود میں آ گئے۔

محدث داؤد ظاہری اور ابن حزم ظاہری نے تو مستقل طور سے ظاہریت کی بنیاد قائم کر دی جس کے ذریعہ فقہ مذاہب اربعہ کو صفحہ ہستی سے معدوم کرنے کے لئے ہر قسم کے حربے استعمال کر لئے گئے تاہم ان کو نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

(۳)..... ابن حزم ظاہری متوفی ۴۵۶ھ کے بعد حافظ ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ کا دور آیا یہ ظاہریت میں ابن حزم سے بھی بڑھ گئے اگرچہ دعوے ضلی فقہ کے اتباع کا بھی ساتھ رہا۔ روایتی لحاظ سے دونوں اپنے اپنے وقت کے بڑے محدث تھے اگرچہ اپنے موافق احادیث کو اصل مرتبہ سے اوپر چڑھانے اور مخالف احادیث کو گرانے کی اور صحیح حدیثوں کو موضوع دہاگل قرار دینے کی عادت دونوں میں رہی۔ ایسے ہی بہت سے اوصاف و عادات میں دونوں باہم مشابہ تھے، لیکن درایتی اعتبار سے دونوں کے بارے میں اکابر امت نے علمہ اکثر من عقلمہ کا فیصلہ صادر کیا ہے اور بقول بعض اکابر چونکہ حافظ ابن تیمیہ بہت ہی بری اور بے باک بھی تھے اس لئے جمہور سلف و خلف کے خلاف اتنا کچھ لکھ گئے جن کی جرأت اس سے قبل و بعد کسی نے نہیں کی تھی۔

ہمارے حضرت شاہ صاحب درس حدیث اور مجالس علم میں حافظ ابن تیمیہ کے علم و فضل جلالت قدر و وسعت معلومات کی مدح کے ساتھ ان کے اصولی و فروعی مسائل میں تفردات پر سخت گرفت بھی فرمایا کرتے تھے اور جس اعتناء کے ساتھ متقدمین کے اختلاف پر بولتے تھے، حافظ ابن تیمیہ کے خلاف جمہور مختارات پر بھی کڑی نقد و بحث کیا کرتے تھے کسی حدیث کو اگر انہوں نے اپنی درایت کے ذریعہ گرانے کی سعی کی تو اس پر ناگواری کے لہجہ میں یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ کیا حافظ ابن تیمیہ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ خدا کا دین یا پیغمبر کی حدیث ان کی عقل کے موافق اترنی چاہئے تھی، اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ حافظ ابن تیمیہ صرف اپنی کہتے ہیں، دوسروں کی نہیں سنتے، عقائد کے اختلاف میں حافظ ابن تیمیہ کے استواء علی العرش کو بمعنی استقرار و تمکن مراد لینے اور نزول باری کو انتقال مکانی پر محمول کرنے کا ذکر کر کے فرمایا کرتے تھے کہ ایسے مسائل لے کر اگر وہ آئیں گے تو اپنے دارالحدیث میں انہیں گھسنے بھی نہیں دوں گا۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ حافظ ابن تیمیہ سے پہلے تقریباً چالیس اکابر محققین متکلمین اسلام نے قرآن و سنت کی روشنی میں عقائد اسلام کے بارے میں جو فیصلے کئے تھے ان میں سے بہت

سوں کو حافظ ابن تیمیہؒ نے توڑ پھوڑ کر الٹ پلٹ ❶ کر دیا تھا اور اس لئے بقول حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اس وقت کے تقریباً تمام ہی علماء امت نے انکی مخالفت کر کے قید و بند کا مستحق ٹھہرایا تھا اور حافظ ابن تیمیہؒ نے ان کی طرف سے جو تاویلات کر کے جواب دی کی اس کو علمائے امت نے درخود اعتناء بھی نہیں سمجھا۔ اس کی مزید وضاحت کے لئے احقر نے اسی اکابر امت کی وہ تنقیدات یکجا کر دی ہیں جو اب تک حافظ ابن تیمیہؒ پر کی گئی ہیں اور کچھ ضروری حصے انوار الباری قسط ۱۱ میں سفر زیارت نبویہ اور توسل نبوی کے جواز کی بحث میں بھی درج ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔

یہاں مختصر اہی عرض کرنا ہے کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ بھی ایک تجددیدی کارنامہ تھا کہ وہ اپنے درس حدیث میں جہاں قدیم اسباحث پر سیر حاصل بحث اور بطور حرف آخر فیصلہ کن کلام فرماتے تھے اسی شان اعتناء کے ساتھ حافظ ابن تیمیہؒ کے اصولی و فروعی تقررات پر بھی مفصل کلام فرمایا کرتے تھے اور اگر جدید سلفیت اور تیمیت کے مقابلہ میں جوابی مواد کی طرف توجہ نہ کی گئی تو بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ ہم لوگ جمہور امت کے عقائد و مسائل سے دور ہو جائیں گے اور شاید اسی فتنہ کا احساس کر کے حافظ ابن حجر عسقلانی صاحب فتح الباری نے متبعین ابن تیمیہؒ کو تمہین کا لقب دیا تھا واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۴)..... حضرت شاہ صاحبؒ اپنے تلامذہ کو بہت ہی تاکید فرمایا کرتے تھے کہ اپنے وطن جا کر تفسیر قرآن مجید کا درس دیں تاکہ عوام و خواص اور خاص کر نو تعلیم یافتہ حضرات علماء سے وابستہ ہوں اور ان میں دینی شعور و احساس اجاگر ہو اور وہ اسلامی تعلیمات سے واقف ہو کر علماء کے دوش بدوش ملکی و مذہبی خدمات انجام دیں، چنانچہ حضرتؒ کے تلامذہ نے خاص طور سے صوبہ سرحد، پنجاب و سندھ میں درس قرآن مجید کی طرف پوری توجہ دی جس کے نہایت عمدہ اثرات رونما ہوئے۔ حضرتؒ کے تجددیدی کارناموں کی فہرست طویل ہے۔ اور اس مختصر مضمون میں زیادہ کی گنجائش نہیں۔ متے نمونہ از خروارے تھوڑا سا لکھ دیا ہے۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

❶..... ان میں سے امام طحاوی متوفی ۳۲۰ھ، علامہ اشعری متوفی ۳۲۰ھ، محقق ماتریدی متوفی ۳۳۳ھ، علامہ لاکاکی متوفی ۳۱۸ھ، علامہ بقی متوفی ۳۵۸ھ، علامہ ابن عبدالبر متوفی ۴۶۳ھ، امام الحرمین متوفی ۶۸۱ھ، امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ، ابن جوزی حنبلی متوفی ۹۵۷ھ، امام رازی متوفی ۶۰۶ھ، وغیرہ ہم نے ہر عقیدہ پر سیر حاصل کلام کیا ہے مگر حافظ ابن تیمیہؒ نے سب کے خلاف اپنا عقیدہ اصرار کیا۔ مثلاً امام الحرمین کی مخالفت اپنے فتاویٰ میں جگہ جگہ کی ہے۔ امام غزالی نے خدائے تعالیٰ کو مکان و جہت سے موزن ثابت کیا تھا تو ان کو اشد کفر اسن الیہود قرار دیا۔ امام رازی کی کتاب اساس القدس کے رد میں التائیس لکھی اور کواکب دراری مناجات اللہ و کتاب العرش میں باری تعالیٰ کیلئے بذیہ فوقیت حسیہ ثابت کی اور ان عقائد میں محدث ابن خزیمہ کا اتباع کیا جن کو تمام علماء نے علم کلام سے عاری قرار دیا ہے۔ مختصر یہ کہ حافظ ابن تیمیہؒ نے بہت سے عقائد ان اساتذہ حنابلہ سے حاصل کئے جن کا مکمل مدلل رد خود علامہ ابن جوزی حنبلی لکھ چکے تھے اور وہ رد دفع شیعہ التشبیہ و للرد علی المجسّم ممن یثقل مذہب الامام احمد کے نام سے شائع شدہ ہے (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو انوار الباری شرح صحیح البخاری جلد ۱۱)

امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ

از حضرت مولانا عبد الحلیم چستی دامت برکاتہم
(فاضل دیوبند۔ ایم۔ اے۔ کراچی پاکستان)

عنوان بالا کے تحت محدث کشمیری علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ کی زندگی اور علمی کارناموں پر ایک محققانہ اور قائلانہ تنقیدی مقالہ برصغیر کے مشہور و معروف علمی رسالہ ماہنامہ معارف اعظم کراچی میں ۱۹۶۱ء کے تین مسلسل شماروں (ستمبر اکتوبر اور نومبر) میں شائع ہوا ہے۔ مقالہ نہایت طویل ہے لیکن تحقیق اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے، فاضل مقالہ نگار حضرت مولانا عبد الحلیم چستی زید مجددہ نے علامہ کشمیری کی علمی زندگی کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جن پر اس سے پہلے کسی نے بحث نہیں کی ہے چنانچہ مقالہ کے آغاز ہی میں خود بھی تحریر فرماتے ہیں۔

ہم نے اس مختصر مقالہ میں علامہ انور شاہ کے سوانح کے حصہ سے زیادہ تعرض نہیں کیا یہ کام ان کے سعادت مند فرزندوں کے کرنے کا ہے اور انہیں اپنی پہلی فرصت میں موصوف کی ایک جامع سوانح حیات مرتب کرنا چاہئے۔ اسی طرح ہم نے ان امور سے بھی زیادہ بحث نہیں کی ہے جن سے ان کے تلامذہ نے اعتناء کیا ہے، اس مختصر مقالہ میں ہم نے علامہ انور شاہ کی علمی زندگی کی بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن پر اس سے پہلے اس نوع پر بحث نہیں ہو سکی ہے۔

بہر حال جہاں تک مقالہ کا تعلق ہے، قابل مطالعہ ہے اہل علم ہی اس سے حظ حاصل کر سکتے ہیں مقالہ کے آغاز میں سات آٹھ صفحات پر فاضل مقالہ نگار نے حضرت فخر المجد ثین علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی زندگی کے حالات (مثلاً نام، ولادت، سلسلہ نسب، تعلیم و تربیت، سفر حجاز اور واپسی کے بعد مدرسہ فیض عام کا قیام دارالعلوم دیوبند میں تدریس کی ابتداء از دو واجی زندگی کا آغاز اور غیر معمولی قوت حافظہ وغیرہ باتیں) مختصر تحریر فرماتے ہیں چونکہ زیر مطالعہ کتاب کے ابتدائی صفحات میں ہم نے حضرت امام العصرؒ کے حالات زندگی مفصل طور پر قلمبند کئے ہیں اس لئے مقالہ کے اس حصے کو دہرانا باطلع ہوگا۔ کوئٹہ

وسعت معلومات و کثرت مطالعہ:..... تحصیل علوم سے فراغت کے بعد آغاز عمر ہی میں علامہ انور شاہؒ کا دائرہ معلومات اس قدر وسعت اختیار کر چکا تھا کہ اس عہد کے نامور علماء جن کی

وسعت معلومات اور کثرت مطالعہ پر اس کی تالیفات شاہدِ عدل ہیں اپنی تحقیقات علامہ موصوف کے حضور پیش کرتے اور موصوف ان پر بیش بہا علمی فوائد کا اضافہ فرماتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے نامور محدث شوقِ نیوی نے ۱۳۱۳ھ میں جب آثار السنن کی کتاب الصلوٰۃ مکمل کر لی تو اس زمانہ کے جن اربابِ نظر اور اکابرِ اہل علم کو یہ کتاب بھیجی گئی ان میں ایک صغیر الحسن محدث علامہ محمد انور شاہ بھی تھے لیکن ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں اس پر بیش بہا اضافہ کی سعادت جس کے حصہ میں آئی وہ صرف علامہ انور شاہ کی ذاتِ ستودہ صفات تھی۔

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقات اور اضافہ معلومات کا دائرہ محدثِ نیوی کے مذاق تک محدود رہا ہے۔ موصوف نے عنوانِ احادیث، اسنادِ رجال اور جرح و تعدیل سے متعلق وہی تحقیقات پیش کی ہیں جو محدثِ نیوی کے مذاق کے مطابق تھیں۔ فقہ حدیث کی بحثیں حقائق، معارف، اسرارِ بلاغت اور توجیہات حدیث سے بہت ہی کم اعتناء کیا پھر بھی یہ اضافہ اصل سے دو گنا تکنا ہو گیا ہے ①۔

اور اس افادہ علمی کی وجہ سے موصوف نے نیلِ الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین (ص ۵۶) میں یہ لکھا ہے ”کنت مرافقاً فیہ“ میں آثار السنن کی ترتیب و تدوین میں ان کا رفیق کا تھا، چنانچہ محدثِ نیوی کے فرزند کا بیان ہے۔

نوفانی کہتا ہے ناظرین باتمکین معلوم فرمائیں کہ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ تیرہ سو بارہ ہجری میں فارغِ تحصیل ہوئے ہیں جیسا کہ ان ہی کی شرح فیض الباری علی صحیح البخاری میں لکھا ہوا ہے اور علامہ نیوی نے آثار السنن تیرہ سو چھ ہجری سے کچھ قبل ہی لکھنا شروع کیا اور تیرہ سو تیرہ ہجری میں آخر ابواب الصلوٰۃ تک تمام کر دیا۔ علامہ نیوی کا اوشحۃ الجید، حبیل المین، رد السکین، تبیان تحقیق المعلی وغیرہ تالیف کرنا اور انکا معجم طبرانی وغیرہ کا نشان بتانا کہ فلاں فلاں کتب خانہ میں ہے اور معرفۃ السنن بیہقی میرے کتب خانہ میں ہے یہ سب مولانا انور شاہ کشمیری کی طالب علمی کے زمانہ میں تھا۔ جبکہ وہ فارغِ تحصیل بھی نہیں ہوئے تھے لہذا مولانا انور شاہ نے جو ”الاتحاف الفرقدین“ میں لکھا ہے کہ انی کنت مرافقاً فیہ اس سے مراد بعد اتمام آثار السنن قبل الطباعت ہے، مولانا شوقِ نیوی اپنی تحقیقات عجیبہ و فوائد غریبہ نادرہ جدیدہ دکھانے اور معلوم کرانے کے لئے

①۔ علامہ موصوف کے اس بیش بہا اضافہ کا نام الاتحاف الاحناف ہے مجلس علمی ذابحیل جس کا قیام ہی علامہ انور شاہ کے علوم کے نشر و اشاعت ہے اس نے شاہ صاحب کے اس نادرہ روزگار شاہکار کے اصل نسخہ کا محدث و تعدیل میں نو نو کر کر اس کو محفوظ کر لیا ہے۔

تسویات آثار السنن قبل الطباع بذر بعد ذاک بھیجتے ہوئے جس طرح کہ اور بعض علماء کے پاس آثار السنن کو بھیجا ہے، مولینا انور شاہ کشمیری کی مولینا نیوی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ان کے شاگرد حکیم مولوی محمد عیسیٰ مرحوم ساکن موضع جانا ضلع پٹنہ نے بندہ سے بیان کیا تھا کہ مولینا انور شاہ مدرسہ امینیہ دہلی میں کہتے تھے کہ ہم لوگ مولینا شوق نیوی سے جو تمہارے جوار کے ہیں ملاقات کریں گے مگر چونکہ ۱۳۲۲ھ میں بروز جمعہ ۷ رمضان شریف مولینا نیوی کا وصال ہو گیا اسی وجہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ خلاصہ یہ کہ آثار السنن جس کی آخر کتاب الصلوٰۃ ۱۳۱۳ھ میں تمام ہو گئی اور مولینا انور شاہ ۱۳۱۲ھ میں کتب درسیہ مروجہ سے فارغ ہوئے ۱۳۱۲ھ کے بعد شوق نیوی ان کو بھیجی الٰہی تحقیقات کہ جن سے کتب محدثین خالی ہیں، دکھانے کے لئے اجزاء آثار السنن بذر بعد ذاک بھیجتے ہوں گے اور علامہ کشمیری کچھ رائے دیتے ہوں گے واللہ اعلم۔ اس اعتبار سے من نوع مراقت کی جاسکتی ہے جو کہ بعد اصل تالیف و اتمام ہے نہ کہ وقت تالیف ہے، کیونکہ اس وقت تو مولینا انور شاہ محض طالب علم تھے۔ ① (القول الحسن فی الرد علی انکار المدین وفی تائید آثار السنن از ابن نیوی ج ۱ ص ۱۹)

تبحر علمی: ضبط و اتقان ذکاوت و ذہانت، فہم و فراست، دقت نظر جدت فکر، وسعت مطالعہ، کثرت معلومات، استحصار علوم اور تبحر میں اپنی نظر آپ ہی تھے صرف و نحو، معانی و بیان شعر و ادب، منطق و فلسفہ لغت فقہ، اصول فقہ، کلام، تصوت، تاریخ، رجال، طبقات، تفسیر، حدیث اور اصول حدیث، غرض ہر فن میں مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے اور عربی و فارسی نظر و نظر پر یکساں قادر تھے۔ الٰہی جامعیت اور ہر فن میں ناقدانہ مہارت کی وجہ سے حکیم الامت مولینا اشرف علی تھانوی موصوفی علوم میں ان کے اساتذہ سے بھی فائق سمجھتے تھے وہ فرماتے تھے۔

”مولینا انور شاہ صاحب بہت بڑے مہر عالم تھے یہاں تک کہ ہے تو گستاخی لیکن سچی بات کو کیوں چھپاؤں میرا یہ خیال ہے کہ وہ اپنے اکثر اساتذہ سے بھی علوم میں بڑھ گئے تھے“ ②

حفظ حدیث: علامہ انور شاہ بلاشبہ حفاظ حدیث میں تھے حفظ حدیث کی حقیقت سمجھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محدثین کی اصطلاح میں حفظ حدیث سے مراد استحضار اور

① شاہ صاحب کو اپنے زمانہ طالب علمی ہی میں ہندوستان کے ایک نامور وسیع النظر محدث کے اہم علمی کارنامہ پر اضافہ کی سعادت اگر حاصل ہو گئی تھی تو یہ شاہ صاحب کی دسمت نظر کی اور بھی زیادہ قوی دلیل ہے۔

② ملاحظہ ہو الاضافات الیومیہ من الافادات القومیہ (ملفوظات حکیم الامت مولینا اشرف علی تھانوی) اشرف المطابق تھانہ بھون ۱۹۳۱ھ ج ۷، ص ۱۱۱

تذکرہ نہیں ہے یعنی احادیث کا لوگ زبان پر ہونا، بلکہ معرفت یعنی ملکہ فن مراد ہے اور حقیقت میں یہی معیار حفظ ہے اور متاثرین ائمہ جن کے یہاں اسی کا اعتبار ہے، اسی معیار پر متاخرین حفاظ میں سے حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنے اکابر شیوخ کو جانچا اور پرکھا ہے۔ موصوف انباء النعمانی انباء النعمانی حافظ زین الدین عبدالرحیم عراقی التوفی ۸۰۶ھ اور ان کے تلمیذ رشید حافظ نور الدین علی یثربی التوفی ۸۰۷ھ میں موازنہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

لم نر فی هذا الفن امتن منه وعلیه تخرج غالب اهل عصره ومن اخصهم به صهره شیخنا نور الدین الہیثمی وهو الذی دہبہ وعلّمہ کیفیۃ التخریج والتصنیف وهو الذی یعمد لہ خطب کتبہ وینسبہالہ وصالہ الہیثمی لشدة محارسة اکثر استحضار المتون من شیخہ حتی یظن من لا خبرہ لہ انه احفظ منه ولیس کذا لک لان الحفظ المعرفة ۱

ہم نے فن حدیث میں حافظ عراقی سے زیادہ متقن و پختہ نہیں دیکھا، اس زمانہ کے اکثر اہل علم نے ان ہی سے کسب کمال کیا ہے اور ان کے داماد ہمارے شیخ نور الدین یثربی ہیں شیخ عراقی نے انہیں پڑھایا۔ تصنیف اور تخریج احادیث کا ڈھنگ بتایا تھا وہ انکی کتابوں پر دیباچے لکھتے اور ان کی نسبت بھی حافظ یثربی کی طرف کرتے تھے یثربی کو مزاوت اور کثرت مشق کی وجہ سے احادیث کے متون اپنے شیخ عراقی سے زیادہ یاد ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ جس کو حقیقت حال کی خبر نہ تھی وہ یہ خیال کرتا تھا کہ شیخ یثربی حافظ عراقی سے بڑے حافظ تھے حالانکہ واقعہ ایسا نہ تھا کیونکہ حفظ ملکہ فن سے عبارت ہے۔

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حفظ حدیث کے لئے حافظہ میں ملکہ فن کا پایا جانا کافی ہے استحضار و تذکرہ شرط نہیں ہے چنانچہ شیخ یثربی صاحب مجمع الزوائد اور شیخ زین الدین عراقی صاحب اللصیہ کے بارے میں حافظ ابن حجر کا یہ لکھنا کہ یثربی فی الفور حدیث کی تخریج کرتے اور بتا دیتے تھے اس بنا پر پڑھے لکھے لوگ ان کو بڑا حافظ سمجھتے تھے حالانکہ نور الدین یثربی نے شیخ عراقی ہی سے سب کچھ سیکھا تھا اور شیخ عراقی کو فن کا ملکہ تھا، گو فی الفور حدیثوں کی تخریج سے قاصر تھے۔ یہ بات علامہ انور شاہ کو بھی حاصل تھی اس لئے ہم نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے ان کو متون احادیث پر

۱..... ملاحظہ ہو انباء العمر بحوالہ درس البہار من دہم المعاجم والاشیخات والصلوات از حافظ عبدالحی الکاتانی التوفی ۱۳۸۳ھ طبع قادی ۱۳۳۶ھ ص ۱۹۷، ۱۹۸ و شذرات الذہب فی اخبار من ذہب الزین الحمدانی مکتبہ القدوسی مصر ۱۳۵۱ھ ج ۷ ص ۲۸۳ ذیل طبقات الحفاظ للذہبی از حافظ جلال الدین سیوطی طبع دمشق ص ۴۷۳، والبدر الطالع محاسن بعد القرن السالط القاضی محمد شوکانی طبع قاہرہ ۱۳۲۸ھ ج ۳

نہایت غائر نظر تھی اور وہ علل و اسانید سے واقف تھے مراتب رجال کا انہیں علم تھا وہ صحیح و سلیم کو سمجھتے تھے اور فن جرح و تعدیل کے ماہر تھے راویوں کے تشاہدہ رفع کرنے میں ید طولی رکھتے تھے اور ان فنون میں ان کو بڑا اتفاق اور رسوخ حاصل تھا ان کے رسائل اور امالی آج بھی اس امر پر شاہد عدل ہیں۔

فقہ و خلافیات کا حفظ:..... علامہ انور شاہ حدیث ہی کے حافظ نہ تھے، بلکہ فقہ اور خلافیات کے بھی حافظ تھے تذکرہ کی کتابوں میں بعض ارباب کمال فقہاء کے متعلق یہ فقرہ لکھا ہوا ملتا ہے۔ ”کان حافظاً للفقہ والخلاف“ یا ”کان حافظاً للمذہب“ کہ وہ فقہ اور خلافیات کے حافظ تھے۔ مذاہب ائمہ ان کو یاد تھے۔ یہ بات علامہ انور شاہ کو بھی حاصل تھی، ان کو اصول و کلیات ہی نہیں جزئیات مسائل پر بھی عبور حاصل تھا اور اختلافی مسائل میں ہر ایک امام کا مسلک بھی بر زبان تھا، ہر مسئلہ میں ائمہ اور مشائخ کے مختلف اقوال بھی از بر تھے۔ ائمہ اربعہ کے اختلافات کے منشا اور مبنی پر بھی ان کی نظر پوری طرح تھی فقہ پر ان کی نظر کیسی غائر تھی اور ائمہ کے اقوال جیسے انہیں کیسے متحضر تھے اس کا اندازہ موصوف کے حسب ذیل بیان سے کیا جاسکتا ہے:

ليس عندي فن أصعب من الفقه حتى اني في الفنون كلها ذوراي
وتجربته أحكم بما أريد وانتخب من أقوالهم ما أريد واقتنع (الفرع) الآ
راء من عندي لا أحتاج إلى تقليد أحد ولكني في الفقه مقلد بحت ليس
رأى سوى الرواية ولذا قد يصعب على الافتاء فان الناس لا يكون
عندهم الا قول واحد ويكون عندي فيه اقوال عن الأمام او عن المشايخ
والتصحيح قد يختلف ولست من اصحاب الترجيح وحينئذ الفتى بما
يقرب بمذاهب الاثمه وآثار السلف والسنة ❶

میرے نزدیک فقہ سے مشکل ترین فن کوئی نہیں جملہ فنون میں میری ایک رائے اور تجربہ ہے کہ جس کی وجہ سے میں فیصلہ کرتا ہوں اور ائمہ فن کے اقوال میں سے جن کے قول کو چاہتا ہوں انتخاب کرتا ہوں، میں اپنی طرف سے ان کے راویوں پر تفریع کرتا ہوں اور کسی کی تقلید کا محتاج نہیں ہوں لیکن فقہ میں مقلد محض ہوں بجز روایت امام کے کوئی رائے نہیں رکھتا اسی وجہ سے فتویٰ دینے میں مجھے بڑی دشواری پیش آتی ہے کیونکہ لوگوں کے سامنے ایک قول کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور میرے پیش نظر امام یا مشائخ کے متعدد قول ہوتے ہیں پھر کبھی صحیح میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور میں اصحاب ترجیح میں سے نہیں ہوں، میں ایسے وقت میں مذاہب ائمہ اور آثار سلف اور سنت سے قریب تر جو قول ہوتا ہے اس پر فتویٰ دیتا ہوں۔

طبقات فقہاء پر نظر:..... طبقات فقہاء پر بھی ان کی نظر غیر معلولی وسیع تھی اور اس فن میں بصیرت کا یہ حال تھا کہ کبار فقہاء کے متعلق ان کی اپنی خاص آراء تھیں کہ کون کس درجہ کا فقیہ ہے اور نقل میں اس کی کیا حیثیت ہے کون فقیہ النفس ہے اور کون نہیں؟ چنانچہ امام ابو جعفر احمد بن محمد طحاوی المتوفی ۳۲۱ھ کے متعلق فرماتے ہیں:

امام طحاوی مذہب امام اعظمؒ کے سب سے زیادہ عالم نہیں بلکہ دیگر مذاہب ائمہ کے بھی سب سے زیادہ واقف تھے وہ امام شافعیؒ کے بیک واسطہ شاگرد تھے اور امام مالکؒ سے بدو واسطہ تلمذ رکھتے تھے اور امام اعظم ابو حنیفہؒ سے ان کو بس واسطہ تلمذ کا فخر حاصل ہے، کتاب شرح معانی الآثار کے باب الحج میں موصوف نے تصریح کی ہے کہ امام احمدؒ سے بھی ان کو بیک واسطہ اجازت حاصل ہے طحاوی مجتہد و مجدد ہیں جیسا کہ ابن الاثیر جزری نے لکھا ہے کہ وہ مجدد تھے۔

میں کہتا ہوں کہ شرح حدیث ان کا تجدیدی کارنامہ ہے۔ وہ شرح حدیث میں مجمل حدیث کو بتاتے ہیں، حدیث کے غوامض و دقائق بیان کرتے ہیں۔ بحث و تحقیق کرتے ہیں اعتراضات کے جوابات دیتے ہیں اور وہ اس انوکھے طریقہ کے امام ہیں کیونکہ متقدمین صرف احادیث کو بطور سنن و متن روایت کرنے پر اکتفا کرتے تھے ❶۔

اور فیض الباری میں ہے کہ مالکیہ نے ان کی تصانیف سے حنفیہ کی بنسبت زیادہ اعتناء کیا ہے۔ ❷ علامہ موصوف ملک العلماء ابو بکر بن مسعود کاشانی المتوفی ۵۸ھ کی کتاب البدائع والسنائع فی ترتیب الشرائع کی بہت تعریف کرتے تھے اور اس کے متعلق فرماتے تھے۔

عراقی فقہاء حنفیہ کی تالیفات میں خراسانی فقہاء حنفیہ کی تصانیف کی بنسبت زیادہ رسوخ و اتقان پایا جاتا ہے لیکن کتاب البدائع باوجودیکہ اس کا مولف ملک العلماء ابو بکر کاشانی خراسانی ہے مگر اس کی یہ کتاب اتقان و ثبوت میں فقہاء میں سے فقہائے عراق کی مثل ہے بلکہ حسن ترتیب میں ہمارے فقہاء حنفیہ رحمہ اللہ کی تمام کتابوں سے فائق ہے، یہ نہایت نادر المثال کتاب ہے، اگر کوئی عالم درف نگاہی اور رقت نظر سے اس کا مطالعہ کرے تو وہ فقیہ النفس بن جائے یہ کتاب مدرس اور مولف کے لئے مغنی کی بنسبت زیادہ مفید ہے۔ ❸

مولف کے بارے میں ایسا بصیرت افروز تبصرہ فقہاء میں سے کسی اور فقیہ سے منقول نہیں اسی

❶..... ملاحظہ ہو المعروف الہدی علی جامع الترمذی مکتبہ رحیمیہ سہارنپور ص ۲۶ و معارف السنن از مولینا محمد یوسف بنوری طبع کراچی ۱۳۸۳ھ ج ۱ ص ۱۱۴ نیز فیض الباری ج ۲ ص ۲۵۱ و جلد ۳ ص ۳۷۳۔ ❷..... فیض الباری ج ۳ ص ۶۹۔ ❸..... ملاحظہ ہو نفحة العنبر من ہدی شیخ الانور مولینا محمد یوسف بنوری ص ۸۵۔

طرح علامہ موصوف کی فقیہ زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم حنفی المتوفی ۹۷۰ھ، محمد امین بن عمر عابدین دمشقی حنفی المتوفی ۱۲۵۲ھ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی المتوفی ۱۲۳۹ھ اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے متعلق جو رائے ہے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے فرماتے ہیں:

ان ابن نجیم افقہ عندی من الشامی لما اری فیہ ان امارات التفقہ تلوح و الشامی معاصرہ للشاہ عبدالعزیز الدہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ و هو افقہ ایضا عندی من الشامی رحمہ اللہ تعالیٰ و کذا شیخ مشائخنا رشید احمد کنکوہی قدس سرہ افقہ عندی من الشامی ۵ میرے نزدیک بلاشبہ ابن نجیم، علامہ شامی سے زیادہ فقیہ ہیں، کیونکہ مجھے ان میں تفقہ کے آثار بہت روشن نظر آتے ہیں۔ فقیہ شامی شاہ عبدالعزیز دہلوی کے معاصر ہیں اور میرے خیال میں شاہ صاحب شامی سے زیادہ فقیہ ہیں اور اسی طرح ہمارے شیخ الشیوخ رشید احمد گنگوہی قدس سرہ میرے نزدیک شامی سے بڑھ کر فقیہ ہیں۔

بعض مشاہیر ائمہ فن کے متعلق رائے:..... اسی طرح دیگر ائمہ فن اور اکابر علماء کے متعلق بھی ان کی خاص رائیں ہیں۔ چنانچہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی المتوفی ۶۳۰ھ، حافظ ابن تیمیہ المتوفی ۷۲۸ھ شیخ تقی الدین بن دینق العید المتوفی ۷۰۲ھ، حافظ ابن عبدالبر المتوفی ۷۴۳ھ، جمال الدین یلعی المتوفی ۷۶۲ھ اور حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ کے متعلق علامہ موصوف فرماتے ہیں۔

”میرے نزدیک شیخ اکبر رحمۃ اللہ تعالیٰ اس امت کی عظیم ترین شخصیتوں سے ہیں وہ حقائق کی تہہ تک پہنچتے ہیں اور اس فن میں وہ سب سے آگے ہیں اور اپنا نظیر نہیں رکھتے ہیں، حافظ ابن تیمیہ بلاشبہ ٹھانٹیں مارتا ہوا ایک بحر بکراں ہے لیکن چند اصولی اور فروعی مسائل میں وہ جمہور امت سے منفرد ہیں، حالانکہ حق پر جمہور علماء ہیں، ابن تیمیہ کشف و کرامات کے بھی منکر ہیں البتہ مصداق کشف کے قائل ہیں اور وہ اس کو فراست مومن سے تعبیر کرتے ہیں..... ان کی طبیعت میں تیزی بہت ہے، وہ اپنی تحقیق کو وحی آسمانی سمجھتے ہیں، اگرچہ وہ حقیقت کے خلاف کیوں نہ ہوں اور مخالف کی وہ پروا نہیں کرتے ہیں، اگرچہ وہ حق پر ہی کیوں نہ ہوں، یہ اہل علم کے وہ طبقات و مراتب ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا فرمایا ہے۔ ان میں سے بعض میں بڑا اعتدال ہے اور وہ نہایت انصاف پسند ہیں: جیسے شیخ تقی الدین ابن دینق العید، ابن

عبدالہر اور زبانی، بعض میں اعتدال نہیں ہوتا، ان کی طبیعت میں شدت اور حدت ہوتی ہے جیسے ابن تیمیہ ہیں بعض میں شدت تعصب کے ساتھ بیدار مغربی بلا کی ہوتی ہے جیسے حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں ۱۔

مصطلحات فن پر اضافے: علامہ انور شاہ نے مصطلحات فن پر بھی اضافے کئے ہیں اصول فقہ ایک نہایت دقیق اور مشکل فن ہے اور ہمیشہ سے دقیقہ سنج اور دقیق النظر جو علماء کی بحث و نظر کی آماجگاہ بن رہا ہے۔ اس اہم فن کے بعض مصطلحات پر علامہ موصوف کو اضافہ کا فخر حاصل ہے۔

ائمہ فن نے تواتر کی تعریف کی ہے اور تواتر اسناد کو بیان کیا ہے لیکن نہ اس کے اقسام سے پورا اعتناء کیا اور نہ انہیں منضبط کیا اور نہ اس کے اقسام کو جدا گانہ ناموں سے ممتاز و متعین کیا۔ تواتر کی بحث کلام اور اصول دونوں جگہ ہے۔ لیکن اصولیین اور متکلمیین دونوں ہی اس باب میں خاموش ہیں۔ اسلامی دنیا میں علامہ انور شاہ نے پہلی مرتبہ تواتر کے اقسام سے اعتناء کیا اور اس کو اقسام اربعہ میں منحصر کیا۔ اس کی ہر قسم کو ایک ایک خاص اور مستقل ناموں سے نامزد کیا۔ تواتر کے وہ اقسام اربعہ حسب ذیل ہیں:

- (۱)..... تواتر الاسناد۔ (۲)..... تواتر الطبقة۔ (۳)..... تواتر العمل والتوارث۔
- (۴)..... تواتر القدر المشترك۔

ان اقسام اربعہ کا تذکرہ علامہ موصوف نے اپنے رسالہ یل الفرقین فی مسئلۃ رفع الیدین (ص ۲۲) میں اور علامہ شبیر احمد عثمانی نے (مقدمہ) فتح الملہم بشرح صحیح مسلم (ص ۵) میں ان کی خوب وضاحت کی ہے اور اردو میں اس کی تشریح فیصلہ مقدمہ بہاولپور طبع لاہور ۱۹۳۵ء میں بھی مذکور ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے اس تقسیم کی داد ان الفاظ میں دی ہے:

وهذه الاقسام الاربعة للتواتر وان كانت جزئيا منتشرة في كتبهم لكنهم لم يكونوا يذكرونها عند التقسيم واول من ربح القسمة وسمى كل قسم باسمه فيما نعلم الشيخ العلامة الانور اطل الله بقاءه وهو تقسيم حسن ۱۔

یہ تواتر کی چار قسمیں ہیں اگرچہ اس کی جزئیات اصولیین کی کتابوں میں منتشر طور پر پائی جاتی ہیں لیکن وہ تقسیم کے موقع پر ان کا تذکرہ نہیں کرتے تھے سب سے پہلے جس اصولی نے تواتر کو چار قسموں میں منقسم کیا اور ہر ایک قسم کو ایک مخصوص نام سے ممتاز و متعین کیا وہ ہمارے علم

۱۔ ملاحظہ ہو فیض الباری صحیح البخاری مطبوعہ حجازی، قاہرہ ج ۲ ص ۱۹۳۔ ۲۔ ملاحظہ ہو (مقدمہ) فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ۱۳۵۲ھ ص۔

میں شیخ علامہ انور شاہ اٹال اللہ بقاءہ ہیں اور یہ تقسیم بہت خوب ہے۔

علامہ انور شاہ کی اس تقسیم کی خوبی ندرت اور جامعیت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ ماہرین فن نے مصطلحات فنون پر مستقل اور جداگانہ کتابیں لکھی ہیں اور درسی کتابوں کے حواشی سے بھی مفید مفید باتیں سیٹ لی ہیں اور گونا گوں معلومات جمع کرنے میں خود داد تحقیق دی ہے ان کے یہاں بھی تواتر کے اقسام تواتر لفظی و معنوی سے زیادہ نہیں ہیں ①۔

اسی طرح علامہ موصوف نے حدیث صحیح کی بھی ایک جداگانہ تقسیم کی ہے اور اس کو بھی اقسام

اربعہ میں منقسم کیا ہے ②۔

اسی طرح طبقات کتب حدیث میں بھی علامہ موصوف کی رائے جمہور علماء سے کچھ مختلف ہی ہے ③۔

اہل کمال معاصرین کا خراج عقیدت:..... حقیقت یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بعد ہندوستان کی سر زمین پر ایسا متقن، وسیع النظر محقق اور جامع عالم پیدا نہیں ہوا اور ہندوستان و پاکستان کے متاخرین محدثین میں ملا محمد عابد سندھی المتوفی ۱۲۵۷ھ کے بعد علامہ انور شاہ کے سوا کوئی حافظ حدیث نہیں گزرا ہے۔

علامہ موصوف بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے تھے اور اس دور میں اللہ تعالیٰ کی زبردست حجت اور برہان تھے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے فتح الہم صحیح مسلم میں ایک موقع پر علامہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

سألت الشيخ العلامة النقي التقى الذي لم تر العيون مثله ولم يرهو مثل نفسه ولو كان في سالف الزمان لكان له شأن في طبقة اهل العلم عظيم وهو سيدنا ومولينا الانور الكشميري ثم الديوبندی اطل الله بقاءه عن تفسير اوائل سورة النجم وتحقيق روية النبي صلى الله عليه وسلم ربه فقرر الشيخ تقريراً حسناً بليغاً جامعاً لاشتات الروايات واطواف الكلام منبهاً على اغوار القرآن فالتصمت منه ان يقيد بالكتابة لتعم الفائدة فاستجاب للملتمس وعلى الله اجره مع وجود الشواغل الكثيرة ④۔

میں نے خدا ترس، پاک طینت شیخ علامہ انور شاہ جن کا مثل ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا اور نہ خود انہوں نے اپنا مثل دیکھا ہے۔ اگر وہ گزشتہ زمانے میں ہوتے تو اہل علم کے طبقہ میں

①..... ملاحظہ ہو کتاب التعلیقات از سید شریف علی جرجانی المتوفی ۸۱۶ھ طبع مصر ۱۳۵۷ھ ص ۱۷۵۔ ②..... ملاحظہ ہو (مقدمہ) فیض الباری ج ۱ ص ۵۸۔ ③..... ایضاً ج ۱ ص ۵۷۔ ④..... ملاحظہ ہو فتح الہم صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۲۵۔

ان کا بڑا مرتبہ ہوتا، وہ ہمارے سردار مولانا نور شاہ کشمیری ثم دیوبندی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں تادیر قائم رکھے۔ میں نے ان سے سورۃ النجم کی ابتدائی آیتوں کی تفسیر اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار الہی کی تحقیق کے متعلق درخواست کی تھی، جس کو انہوں نے شرف قبولیت بخشا اور نہایت نفیس اور فصیح و بلیغ تقریر کی جس میں متفرق روایات اور بحث کے تمام گوشوں کو سیٹ لیا ہے اور قرآن مجید کی گہرائیوں پر تنبیہ فرمائی ہے پھر میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس کو قلمبند فرمائیں تاکہ اس سے فائدہ عام ہو جائے۔ انہوں نے گونا گوں مشغلوں کے باوجود میری یہ بات بھی مان لی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا اجر دے۔

مفسر عثمانی آیت شریفہ قل یا اهل الكتاب تعالوا الی کلمہ سوآء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرك به شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا رباً من دون اللہ کی تفسیر میں حیات مسیح علیہ السلام کے موضوع پر علامہ کے رسالہ کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”اس موضوع (حیات مسیح السلام) پر مستقل رسالے اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مگر میں اہل علم کو توجہ دلاتا ہوں کہ ہمارے مخدوم علامہ فقید النظر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری اطال اللہ بقاۃ نے رسالہ ”عقیدہ الاسلام“ میں جو علمی لعل و جواہر ودیعت کئے ہیں، ان سے متمتع ہونے کی ہمت کریں، میری نظر میں ایسی جامع کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔“

اور آیت شریفہ قل الروح من امر ربی الآیہ کی تفسیر میں روح پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اس (بحث) میں میرے نزدیک قول فیصل وہی ہے جو بقیۃ السلف بحر العلوم انور شاہ صاحب اطال اللہ بقاۃ نے فرمایا۔“

علامہ شبیر احمد عثمانی نے فیض الباری علی صحیح البخاری پر جو تقریر لکھی ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں:

قال الشيخ تاج الدين السبكي في القفال المروزي كان اماما كبيرا وبحرا عميقا غواصا على المعاني الدقيقة، نقي القريحة ثاقب الذهن عظيم المحل كبير الشأن دقيق النظر عديم النظر (في زمانه) وحكي قول ابن السمعاني فيه! كان وحيد زمانه فقها وحفظا ورعا. هذه كلمات كنت رايتها في حق ذاك الامام وصادفتها تصديق في نابغة الهند الشهير وعالمها بحر العلوم مولانا السيد محمد انور شاہ الكشميري ثم الديوبندي رحمه الله سواء بسواء من غير شطط والحرء فكان اماما كبيرا وبحرا عميقا غواصا على

المعالی الدقیقة الی آخر ما قال لم اکن فی عدد اصحابہ و تلامذہ
غیر انی و فقلت للاستفادة من صحبته و مجالسہ و مذاکرہ فی
المشکلات و الغوامض برہة غیر قصيرة و من طالع کتابی فتبع
المہم علمی شرح صحیح مسلم تبیین له ذاک ❶

شیخ تاج الدین سبکی نے مقال مروزی کے بارے میں فرمایا تھا کہ وہ بلند پایا امام اور علم کے
گہرے سمندر، دقیق معانی کے غوطہ زن پاکیزہ طبع، روشن دماغ، با عظمت بلند مرتبت،
دقیق النظر اور یگانہ عصر عالم تھے اور ان کے متعلق ابن السمعانی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ فقہ
حفظ حدیث اور ورع و تقویٰ میں یکتائے روز گاتھے یہ کلمات میں نے اس امام موصوف کے
بارے میں پڑھے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی کلمات ہندوستان کے مشہور و معروف عالم
بحر العلوم محمد انور شاہ کشمیری ثم دیوبندی رحمۃ اللہ پر بھی پورے پورے صادق آتے ہیں اور
اس میں ذرا مبالغہ نہیں ہے، کیونکہ یہ بھی بلند پایہ امام علم کے گہرے سمندر تھے انہیں و دقیق
معانی تک رسائی حاصل تھی..... میں نے ان کے تلامذہ میں سے ہوں اور نہ میرا ان کے
ہم سبتوں میں شمار ہے بس مجھے ان کی صحبتوں اور مجلسوں میں ان کے ساتھ مشکلات فن اور
دقیق مسائل میں مذاکرہ سے ایک زمانہ دراز تک استفادہ کا موقع ملتا رہا ہے جو کوئی میری
کتاب فتح المہم شرح صحیح مسلم کا مطالعہ کرے گا اس پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی۔

مورخ ہند مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ موصوف کی جن الفاظ میں تصویر کھینچی ہے وہ بھی
ہدیہ ناظرین ہے فرماتے ہیں:

”مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے، ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی
سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے، اور
وسعت نظر، قوت حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے، علوم حدیث
کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ
مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے، اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ
کرے کہ مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قال اللہ و قال الرسول کا نعرہ
بلند رکھا..... حضرت مرحوم سے ملاقاتوں میں علمی استفادہ کے مواقع ملتے رہے، ہر
سوال کے وقت ان کی خندہ پیشانی سے یہ سوسا ہوتا تھا کہ وہ سوال سے خوش ہوتے
اہل کمال کی یہ بڑی پہچان ہے، جب اہل کمال سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ شبہ کے اصل

منشاء کو سمجھ جاتا ہے اور جواب دے کر خوش ہوتا ہے۔ مرحوم معلومات کے دریا حافظہ کے بادشاہ اور وسعت علمی کی نادر مثال تھی۔ ان کو زندہ کتب خانہ کہنا بجا ہے۔ شاید ہی کوئی کتاب مطبوعہ ہو یا قلمی ان کے مطالعہ سے بچی ہو۔ ①

علامہ انور شاہ کی جلالت علمی اور رفعت شان کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ جیسا عالم ربانی کسی موقع پر کسی علمی مسئلہ کی وضاحت کرتا اور وضاحت کی کہیں علامہ انور شاہ سے داد تحقیق مل جاتی تو ان کو بڑی مسرت ہوتی تھی ایک موقع حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے موصوف کی حق پسندی اور کمال علمی و عملی کی داد تحقیق یوں دی ہے، فرماتے ہیں:

”مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریکات حاضریہ میں بہت سرگرم تھے اور میں بالکل علیحدہ تھا۔ لیکن باوجود اس اختلاف مشرب کے میرے رسالہ ترجیح المراج سے بہت متاثر تھے اور کہتے تھے کہ صدیوں کے بعد یہ بات نظر آئی کہ اپنی لغزشوں سے رجوع کر کے اس کو شائع کیا جاوے۔ یہی ایک بات حق پسندی اور کمال علمی و عملی کے لئے کافی ثبوت ہے جس کی اس وقت میں کہیں نظیر نہیں ②۔

انسان کا چہرہ اس کے خیالات اور علوم کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ علامہ انور شاہ کا چہرہ اس حقیقت کا پورا پورا مصداق تھا، چہرہ انور پر ایسا نور تھا کہ مسلمان ہی نہیں کافر بھی اگر نظر اٹھا کر دیکھ لیتا تو پکارا مٹھتا تھا کہ یہ چہرہ تو کسی بہت ہی بڑے عالم کا ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا بیان ہے:-

”مولانا (انور شاہ) کسی جلسہ مناظرہ (بھاگل پور) میں شریک تھے، جس میں اور بڑے بڑے علماء موجود تھے۔ اس جلسہ کا صدر ایک ہندو کو بنایا گیا تھا جو بہت معمر اور تجربہ کار شخص تھا، وہ جس وقت جلسہ میں آیا اس نے سب علماء کو دیکھ کر مولانا کے متعلق کہا کہ ان سب میں یہ بڑے عالم معلوم ہوتے ہیں۔ واقعی غضب کا قیافہ شناس شخص تھا کہ محض صورت دیکھ کر پہچان گیا کہ یہ سب سے بڑے عالم ہیں حالانکہ اس وقت تک کسی کی تقریر بھی نہیں سنی تھی ③۔

علامہ انور شاہ ورع تقویٰ کے صفات سے آراستہ اور محاسن اعمال اور مکارم اخلاق کے پیکر تھے، حق گوئی اور اتباع سنت کے بڑے دلدادہ تھے، اس کے آثار ان کے چہرے بشرے پر نمایاں

①..... ملاحظہ ہو یادِ رفیعان مطبوعہ کراچی ص ۱۶۹، ۱۷۰۔ ②..... ملاحظہ ہو الاضافات الیومیہ من الافادات القومیہ ج ۷

ک ۲۲۷۔ ③..... ملاحظہ ہو الاضافات الیومیہ ج ۷ ص ۱۲

تھے۔ ان کی ذہانت حقیقت میں نور علی نور تھی۔

اردو کتابوں کے مطالعہ کا شوق:..... علامہ انور شاہ نے درس و تدریس اور وعظ و تقریر میں طلبہ اور عوام کی سہولت کی وجہ سے اردو زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنا دیا لیکن اردو زبان میں حقائق و علوم چونکہ منتقل نہیں ہوئے تھے اس لئے موصوف نے اردو میں لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ اس میں تصنیف و تالیف کو پسند کیا، مگر جب اہل حق نے اردو زبان میں تصنیف و تالیف کر کے علوم کو عام کرنا شروع کیا تو موصوف نے بھی اردو کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اس کا اندازہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حسب ذیل بیان سے کیا جاسکتا ہے، فرماتے ہیں:

مولانا انور شاہ صاحبؒ نے ایک صاحب سے فرمایا کہ ”میں سمجھتا ہوں کہ اردو کی کتابوں میں علوم نہیں ہیں، اس لئے میں کسی اردو تصنیف کو دیکھنا بیکار سمجھتا ہوں لیکن جب سے تفسیر بیان القرآن دیکھنے کا اتفاق ہوا یہ معلوم ہوا کہ اردو کی تصانیف میں بھی اب علوم موجود ہیں اور اس وقت سے مجھے اردو کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا اور جو بے وقعتی اردو کی کتابوں کی میرے خیال میں پہلے تھی وہ جاتی رہی“ ۵

دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث کی اہم خصوصیت:..... دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث کی اہم خصوصیت اور امتیازی شان طلبہ میں حدیث نبویؐ کا صحیح مذاق اور فقہ حدیث کا ملکہ راسخ پیدا کرنا تھا۔ فقہ حدیث نہایت غامض علم ہے۔ اس لئے محدثین اور فقہاء کے مقابلہ میں فقہاء محدثین کی تعداد نہایت قلیل ہے، اس فن کے ماہرین انگلیوں میں گنے جاسکتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے عجالہ نافعہ میں مشہور ترین ائمہ فن کو نام بنام گنایا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کی اصل غایت اسی علم کی نشر و اشاعت ہے اس فن میں اکابرین دیوبند کا طریقہ حقیقہ نہایت معتدل ہے درس حدیث میں علامہ انور شاہ کے تجدیدی کارناموں پر روشنی ڈالنے سے پہلے اکابر دیوبند کے طریقہ حقیقہ کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے علامہ انور شاہ کی وہ تاریخی تقریر جو موصوف نے ۱۳۳۰ھ میں عالم اسلام کے نہایت نامور فاضل اور وسیع النظر محدث علامہ سید رشید رضا التونفیؒ ۱۳۵۴ھ کی دارالعلوم دیوبند میں آمد کے موقعہ پر کی تھی، کافی ہے اس اہم تاریخی تقریر کا موضوع فقہ حدیث اور اکابر دیوبند کا طریقہ حقیقہ ہے، علامہ موصوف کی یہ تقریر عربی میں ہے لیکن طویل ہے اس لئے اس کا ترجمہ لکھا جاتا ہے ۵۔

”مدرسہ دیوبند کی غایت و غرض درس حدیث اور فقہ حدیث ہے..... ہمارے اکابر کا

حدیث اور فقہ میں ایسا معتدل و بہتر طریقہ ہے جس میں افراط و تفریط نہیں ہے میری مراد اس سے یہ ہے کہ ائمہ اربعہ، امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، اور امام احمد بن حنبل اکثر و بیشتر اصول اربعہ کی پابندی کرتے ہیں اور وہ اس طرح سے کہ امام مالک اہل مدینہ کے علم کی اقتداء کرتے ہیں بلکہ کبھی وہ حدیث مرفوعہ پر بھی اس کو ترجیح دیتے ہیں۔ امام شافعی ہر باب میں اصح حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ امام احمد، اصح، صحیح، حسن اور ضعیف حدیث سے بھی جس کا ضعف کمتر درجہ کا ہو استدلال کرتے ہیں۔ اور وہ ان دونوں طریقے (اصح صحیح و ضعیف) کو درست سمجھتے ہیں، موصوف نے اپنی مسند میں اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے اور ابو حنیفہ ان قسموں کی تمام حدیثوں کو قابل عمل سمجھتے ہیں اور اختلاف کی صورت میں ان کو ایک محل پر جمع کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے حنفیہ کے یہاں تاویلات زیادہ ہیں اور شوافع کے یہاں راویوں پر جرح زیادہ ہے۔ امام شافعی پہلے امام ہیں جو بلا مؤکد و عاصد اور شاہد حدیث مرسل کو قابل حجت نہیں سمجھتے ہیں۔ فن حدیث کے تکتہ شناس امام بخاری نے امام مالک و شافعی کے اصول کو اپنایا اور اپنا خضر راہ بنایا۔ چنانچہ وہ صحیح بخاری میں اصح مافی الباب کو لاتے ہیں اور عمل سلف کی موافقت کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں اسی وجہ سے وہ اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث کا ذکر نہیں کرتے جو دوسری حدیث کے معارض و مخالف ہو۔ انہوں نے صلوٰۃ کسوف کے بیان میں دو رکوع والی حدیث پر اکتفا کیا اور اپنے اصول اور قواعد کی پابندی کی تین چار اور پانچ رکوع والی حدیثوں کو نظر انداز کر دیا۔

امام مسلم نے راویوں کی ثقاہت پر اعتماد کیا۔ چنانچہ انہوں نے باب الکسوف میں تین چار رکوع والی حدیثوں کو ہی نہیں بلکہ پانچ رکوع والی حدیث کو بھی جو امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے (کوئی مرفوع حدیث نہیں) صحیح مسلم میں درج کیا ہے امام بخاری نے تحقیق و تنقیح کی ہے اور امام مسلم نے اصول و قواعد کی رعایت کی ہے۔ ایسی اختلافی صورتوں میں ہمارے مشائخ توسط و اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں، تشدد و اور تسامح سے گریز کرتے ہیں اور متعارض حدیثوں کی ایسی توجیہ کرتے ہیں کہ جو غور سے سنتا ہے قبول کرتا ہے، نمبر ۳ کی مثال حدیث قلین ہے اس کو یزید بن زائع کامل بن طلحہ ابراہیم الحجاج، ہدیہ بن خالد، کعب اور یحییٰ بن حسان نے اذالمغ الماء قلین او غلا ثا جب پانی دو تین قلعہ (بڑا مٹکا جس میں ڈھائی مٹکا پانی آتا ہے) ہو وہ ناپاک نہیں ہوتا لفظ تولیع (او) کے ساتھ روایت کیا ہے تو یہ تخمین و اندازہ کے لئے ہے کہ جب دو تین قلعہ پانی

ہوگا تو ایک طرف سے دوسری طرف نجاس کا اثر نہ ہوگا اور امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کا یہی اصل مذہب ہے چنانچہ شیخ ابن ہمام اور شیخ ابن نجیم نے اس امر کی تصریح کی ہے حدیث قلین کے محل کے قلین سے جو حدیثیں اس کے معارض تھیں وہ اپنے حال پر باقی رہیں اور معارضہ سے بچ گئیں۔ جیسے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کی ممانعت والی حدیث اور بدتن میں کتے کے منہ ڈالنے والی حدیث اپنے محل میں قابل عمل ہیں۔ اور اس کی مثال دے کر امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے والی حدیثیں ہیں۔ حنیفہ نے نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے پر قرآنی آیت واذ قرأ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور حدیث رسول واذ اقری القرآن فانصتوا جب امام پڑھے تو تم چپ رہو اور حدیث من کان له امام فقرأه الامام قراءة له (جس کا امام ہو تو امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے) سے استدلال کیا اور انہوں نے لا تقرأوا الا بما لقرآن (سورۃ فاتحہ کے بغیر اور کچھ نہ پڑھا کرو) والی حدیث کی تاویل کی کیونکہ جس نے سورۃ فاتحہ نماز میں نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی۔ اور یہ اس لئے کیا کہ آیت شریفہ کے شان نزول میں کوئی صحیح روایت نہیں ہے۔ لہذا لفظ کے عموم کا اعتبار ہوگا (نہ خصوص مورد کا) نیز امام بیہقی نے کتاب القرأت میں امام احمد سے نقل کیا ہے کہ علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ آیت نماز میں قرأت کے بارے میں اتری ہے اور حدیث واذ قرأ فانصتوا جب امام پڑھے تو تم چپ رہو صحیح حدیث ہے۔ امام احمد بن حنبل اور ان کے شاگرد ابو بکر بن الاثرم نے اس کی تصحیح کی ہے۔ پھر امام مسلم نے باب التشہد میں حدیث کے ہر دو طریق ابو موسیٰ اشعری و ابو ہریرہ کی تصحیح کی ہے اور بعد ازاں ابن حزمہ، حافظ ابو جعفر، جریر طبری، حافظ ابو عمر بن عبد البر، حافظ ابن حرم اندلسی ظاہری، حافظ زکی الدین عبد العظیم منذری اور خاتم الحفاظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس حدیث کی تصحیح کی ہے یہ تو اسناد کے اعتبار سے اس حدیث کا پایہ ہے اور باعتبار تعامل سلف وائمہ تو اس پر صحابہ کرام کی بڑی جماعت امام مالک احمد ابو حنیفہ کا عمل ہے۔ اور ایسی حدیث جس کے راوی ثقہ ہوں پھر سلف کا عمل بھی اس کا موید ہو تو وہ حدیث صحیح ہے، وہ نہ کسی جرح سے متاثر ہوتی ہے اور نہ کسی قدح سے اثر پذیر۔

اور حدیث من کان له امام فقرأه الامام له قراءة کو شیخ ابن الہمام نے مسند ابن منیع سے نقل کیا ہے اور اس کی تصحیح بھی کی ہے کیونکہ اس کی سند بخاری و مسلم کی شرط پر ہے اور اب تک اس میں کسی علت کا سراغ نہیں لگ سکا، اس کی سند یہ ہے۔

اخبرنا اسحاق بن يوسف الأزرق قال حدثنا سفيان وشريك عن
موسى ابن ابي عائشة عن عبد الله بن شداد عن جابر بن عبد الله

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الحديث
اور پھر ترمذی کی ایک موقوف اور حدیث کی دیگر کتب میں ایک مرسل حدیث اس موید اور
معاخذ ہے اب تو وہ بلاشبہ صحیح ہے۔

ہمارے شیخ الشیوخ مولینا رشید احمدؒ نے حدیث عبادہ کی جو محمد بن اسحاق کے طریق سے مروی
اور اس کے یاق لعنکم نفر اون خلف امامکم قالو نعم یا رسول اللہ لہذا ہذا قال
لا تفعلوا الحدیث۔

شاید تم اپنے امام کے پیچھے پڑھتے ہو، لوگوں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ ہم جلدی جلدی پڑھ
جاتے ہیں تو آپ نے فرمایا سورۃ فاتحہ کے علاوہ کچھ نہ پڑھا کرو، کی تو جیسہ میں فرمایا ہے یہ اباحت اور جواز
کی دلیل تو ہو سکتی ہے، وجوب کی دلیل نہیں، کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم حضور اکرم ﷺ کی اجازت کے بغیر
پڑھتے تھے، اسی بناء پر آپ نے ان سے دریافت فرمایا تھا کہ شاید تم میرے پیچھے پڑھتے ہو، انہوں نے
جواب دیا جی ہاں۔ تو آپ نے فرمایا بس سورۃ فاتحہ پڑھ لیا کرو، کیونکہ قرآن کی تمام سورتوں میں سورۃ
فاتحہ کا نماز کے لئے پڑھنا متعین ہو چکا ہے کہ امام اور منفرد کی نماز اس کے پڑھے بغیر نہیں ہوتی۔ حضور
ﷺ نے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے جواز کی علت یہ بتائی ہے کہ وہ قرآن کی تمام سورتوں میں
نماز کے لئے متعین ہو چکی ہے۔ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ امام اور منفرد کے حق میں اس سورۃ کے
پڑھے بغیر نماز کا نہ ہونا ظاہر ہے اور متقدمی کے حق میں اس کا اثر کم سے کم اباحت ہوا۔ حنفیہ کا اس کے
واجب ہونے پر اتفاق ہے۔ البتہ اس کی اباحت و کراہت کا مسئلہ احناف میں مختلف فیہ ہے۔

اور ہمارے مشائخ نے مسئلہ رفع الیدین اور آئین بالجہر کے مسئلہ میں فرمایا ہے کہ نماز میں رفع
یدین کرنا اور باواز بلند آئین کہنا حضور اکرم ﷺ اور صحابہ سے ثابت ہے اور اس طرح رفع یدین
اور اخفائے آئین بھی صحیح سند سے ثابت ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ اور
علی رضی اللہ عنہ سے ترک رفع یدین اور اسی طرح اخفائے آئین صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اور سلف
سالکین سے ثابت ہے۔ تو ایسی صورت میں ان دونوں باتوں کو سنت ہونا چاہئے۔ اب بحث
صرف ترجیح میں رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آغاز و انجام میں راہ راست کی توفیق دینے والا ہے ❶۔

❶ فتاویٰ شامیہ جلد اول مرتبہ محمد داؤد راز میں ۳۷۳، میں اخبار احمدیہ امرتسر موری ۱۱ رمضان ۱۳۹۵ھ کے حوالہ سے درج
ہے۔ مرحوم (یعنی علامہ انور کشمیری بھی رفع الیدین کے منسوخ کے قائل نہیں ہیں بلکہ اپنے شاگردوں کو فرمایا کرتے تھے کہ گاہے
گاہے اس پر عمل کر لینا چاہئے تاکہ قیامت میں یہ سوال نہ ہو کہ اس سنت کو کیوں چھوڑا۔ اس کے گواہ مولوی عبدالکبیر صاحب کشمیری
رحمہم اللہ ہیں۔ یہ امر قائل ذکر ہے کہ مولوی عبدالکبیر صاحب حضرت شاہ صاحب کے طالب و شاگرد تھے ۱۹۷۹ء میں وفات
پانگے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس نصیب کرے۔ مقامی طور بھی چند برگزیدہ حضرات نے ان سے وفات سے پہلے کی بار اس
سے متصل حوالہ کیا تو انہوں نے منہ نہ کھولا نہ بیان کیا تا یہ فرمائی۔ گوئدہ

پھر مولینا محمد قاسم نانوتوی کی تلمذ سے ہمارے شیخ عدل حجۃ مسند وقت مولینا محمود الحسن نے علوم کی تکمیل کی۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے فیوض سے مستفید فرمائے۔ وہی اس وقت مدرسہ کے صدر مدرس ہیں۔ اس ملک میں ان ہی کی اسناد پر مدار ہے۔ موصوف اپنے مشائخ کے طریق حق پر قائم ہیں حق تعالیٰ نے ان کو روایات متعارضہ میں مطابقت پیدا کرنے اور تعارض کو رفع کرنے اور مشکلات حدیث کو حل کرنے کا ملکہ خاص عطا فرمایا ہے۔ بطور مثال ایک واقعہ پیش خدمت ہے۔ انہوں نے مجھ سے ایک مرتبہ فرمایا کہ کسوف کی نماز میں جو تعداد رکوع احادیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہ آپ کے ساتھ خاص ہے۔ کسی خاص وجہ سے آپ نے ایسا کیا ہے۔ لیکن امت کو آپ نے ایک ہی رکوع کی ہدایت کی ہے، چنانچہ فرمایا ہے صلوا کما حدثت صلوۃ صلیتموها من المکتوبۃ جو فرض نماز کہ تم عنقریب پڑھ چکے ہو اس جیسی نماز پڑھو یعنی صبح کی۔ ایسے ہی کسوف کی نماز پڑھا، میں نے عرض کیا کہ سادات شافعیہ تو اس تشبیہ کو تعدد رکوع پر محمول کرتے ہیں وحدت رکوع پر نہیں فرمایا یہ تو بدیہی کو نظری بناتا ہے۔ کیونکہ حضور اکرم نے جب سب کی آنکھوں کے سامنے مجمع عام میں کسوف کی نماز متعدد رکوع سے پڑھی اور امت کے لئے تعدد رکوع ہی کو مشروع کرنا تھا تو پھر آپ سے جو صحابہ نے مشاہدہ کیا تھا اس کا حوالہ کیوں چھوڑ دیا اور صبح کی نماز میں تشبیہ کی طرف میلان فرمایا یہ محض اس لئے کہ آپ نے متعدد رکوع کسی اور عارض کی وجہ سے کئے تھے اور آپ نے امت کو نماز کے مشہور و معروف طریقہ کی طرف ہدایت فرمائی ۱۔

اس تقریر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بزرگان دیوبند نے جس طرح دو حدیث سے خصوصی اعتناء کیا اسی طرح اس فن کے مشکلات کے حل کرنے پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ علامہ انور شاہ نے یہ کام ہمہ وجوہ پایہ تکمیل کو پہنچایا۔

درس حدیث میں تجدیدی کا رنامہ:..... علامہ موصوف درس میں کتاب ہی نہیں پڑھاتے بلکہ علوم کا درس دیتے تھے، جس سے طلبہ کے ذہن میں جلاء نظر میں وسعت اور معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا تھا اور انہیں اپنی پڑھی ہوئی چیزوں سے کام لینے کا ڈھنگ آتا تھا اور اس حیثیت سے طلبہ کے لئے یہ درس بڑی افادیت کا حامل تھا اور ان کے معراج کمال کے لئے یہ بھی کچھ کم نہ تھا لیکن درس حدیث میں علاوہ موصوف کا تجدیدی کا رنامہ یہ ہے کہ انہوں نے حدیث کی شرح میں ہر فن کا اجراء کیا اور جس طرح علامہ شرف الدین طیبی شافعی التونی ۳۳۷ھ نے احادیث کی شرح میں فقہ حدیث کے فن کو برتا اور فن بلاغت کے اسرار و معارف اور لغت و کلام کے نکات کو سمجھایا اور ان فنون

کو شرح حدیث میں جاری کر کے دکھایا ہے۔ اسی طرح علامہ انور شاہ نے درس حدیث میں تمام متداول علوم و فنون کو حدیث کی شرح میں برتا اور ان کے اجراء کا طریقہ اور سلیقہ سکھایا ہے اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مغز حدیث تک رسائی کے لئے جملہ علوم میں دستگاہ ضروری ہے۔

اس درس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ علامہ نے اس میں مشکلات علوم کو حل کیا ہے اور فن کی دقیق باتوں کو سمجھایا ہے، ہندوستان اور پاکستان میں بھی ایسے بہت سے جید علماء گزرے ہیں جن کے خواہی و شروخ نے مشکل سے مشکل کتاب کو پانی کر دیا ہے اور ان سے استفادہ آج آسان ہو گیا ہے لیکن ایسے علماء جنہوں نے کسی خاص فن کے مشکلات کو حل کیا ہے خال خال ہی ہیں، صرف علامہ انور شاہ کے متعلق یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی علوم کے مشکلات کو موصوف ہی نے سب سے زیادہ حل کیا ہے، ان وجوہ سے ان کے درس کی تقریروں (امالی) میں جو تنوع پایا جاتا ہے وہ امالی کی علمی دنیا میں اور کہیں نہیں ملتا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، لغت ادب اور نحو کی متعدد امالی زیر طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں اور یہ سب ائمہ جن کی امالی ہیں اور بعض امالی تو ایسے ائمہ فن کی ہیں جن کو ہفت علوم میں اجتہاد کا دعویٰ ہے مگر ان میں سے کسی میں اس نوع کا تنوع اور ہمہ گیری نہیں ہے۔ فقہ کی امالی میں فقہی مسائل ہی سے بحث ہے دور لغت کی امالی کا دائرہ شعر و ادب تک محدود ہے نحو کی امالی کا تعلق نحوی مسائل سے ہے علامہ انور شاہ کی امالی میں ہر فن سے اعتناء ہے اور اس کے مشکلات کو حل کیا گیا ہے اس لئے اس میں تنوع پایا جاتا ہے اور موصوف کو اگرچہ نہایت محنتی اور ذکی تلامذہ ملے جنہوں نے اپنی استعداد کے مطابق ان کے درس کی تقریروں کو بڑی محنت اور جانفشانی سے قلمبند کیا اور ان کے علوم سے علمی دنیا کو متعارف کرایا، جو ان کا ناقابل فراموش علمی احسان ہے۔

ضبط امالی کے صفات اربعہ:..... لیکن یہ حقیقت ہے کہ علامہ موصوف کے علوم کو قید تحریر میں لانے کے لئے محض ذکاوت و محنت ہی کافی نہ تھی بلکہ علوم و فنون میں تبحر اور وسعت نظر بھی درکار تھی جو ان صفات اربعہ سے آراستہ ہوتا وہی ان کے درس سے پورا پورا استفادہ کر سکتا اور ان کی درس کی تقریروں کو اچھی طرح قید تحریر میں لاسکتا تھا۔ اس موقع پر علامہ انور شاہ کے درس کے متعلق بے ساختہ وہ فقرہ زبان قلم پر جاری ہو جاتا ہے،..... جو علامہ محقق کمال الدین ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ نے علامہ الدھر شیخ محمد بن محمد المشدالی، المتوفی ۸۶۳ھ کے درس کے متعلق کہا تھا کہ:-

هذا الرجل لا ينتفع بكلامه ولا ينبغي ان يخضر درسه الا حذاق

العلماء

اس مرد کامل کی باتوں سے ماہرین علماء ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور انہی کو اس کے درس میں حاضر ہونا سزاوار اور لائق بھی ہے۔

علامہ انور شاہ کے تلامذہ کو علوم میں وہ خداقت و مہارت حاصل نہ تھی جس سے وہ امام عصر کی درسی تقریروں کو اچھی طرح سمجھ سکتے اور قید تحریر میں لاسکتے، دوران مطالعہ میں امام عصر کی امالی میں کہیں کہیں جو بعض موٹی موٹی غلطیاں نظر آ جاتی ہیں وہ اسی کا نتیجہ ہیں کہ اس اہم کام سے عہدہ بردار ہونا اس کے تلامذہ کے بس کا کام نہ تھا۔ مجھے اس کا اندازہ مولینا سید مناظر احسن گیلانی کی امالی صحیح مسلم کے دیکھنے سے ہوا جو انہوں نے مسلم شریف کے سبق میں علامہ موصوف سے سن کر قلم بند کی تھیں۔ حالانکہ مولینا مناظر احسن گیلانی نے علوم کی تحصیل اس دور کے ارباب کمال سے کی تھی اور فقہ، منطق، فلسفہ، اصول اور کلام وغیرہ کی چوٹی کی کتابیں ان اساتذہ سے پڑھی تھیں جن کے درس کی ہندوستان میں بڑی دھوم تھی لیکن انہوں نے جیسی کچھ درسی تقریریں سمجھی اور لکھی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے غنتی اور ذکی طالب علم بھی امام عصر کی پوری باتیں سمجھ نہیں پائے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بجز کا اعتراف امالی صحیح مسلم ۱ میں کیا ہے۔ اور جس مقام پر جو بات سمجھ میں نہیں آئی ہے وہاں نقطہ ذال دئے ہیں، علامہ موصوف کے علوم کی عظمت ان کے دل و دماغ میں ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ یہ امالی ان کو جان سے زیادہ عزیز تھی، اس کے گم ہو جانے کا ان کو ساری عمر افسوس رہا اور وہ اس کی گمشدگی پر بڑی حیرت سے یہ شعر جس کو مجدد الف ثانی اپنے مکتوبات میں بکثرت نقل کرتے ہیں، پڑھتے تھے

آنچه از من گمشده گر از سلیمان گم شد
ہم سلیمان ہم پری ہم اہرمن بگریستے

علامہ انور شاہ کے تلامذہ کا ان کے علوم کو کما حقہ مدد نہ کر سکنے پر بھی امام شافعی کا وہ قول یاد آتا ہے جو انہوں نے امام مالک کے معاصر امام لیث بن سعد المتوفی ۲۵۷ھ کے متعلق فرمایا تھا، امام شافعی کا قول یہ ہے:

اللیث الفقه من مالک الا ان اصحابہ ضیعہ.

امام لیث امام مالک سے زیادہ فقیہ تھے لیکن امام لیث کے شاگردوں نے ان کو ضائع کر دیا۔

۱..... امالی صحیح مسلم کا یہ مجموعہ کسی طرح علامہ شبیر احمد عثمانی کے ہاتھ آ گیا تھا موصوف نے فتح الکلبم بشرح صحیح مسلم میں اس سے استفادہ کیا ہے اور امالی کا حوالہ بھی دیا ہے (فتح الکلبم ج ۲ ص ۲۲۳) لیکن یہ معلوم کیوں جامع امالی مولینا مناظر احسن گیلانی کا نام لینے سے گریز کیا۔ ہمیں مولینا محمد یوسف صاحب بنوری زید مجد ہم کے توسط سے یہ مجموعہ علامہ عثمانی کے چھوٹے بھائی فضل احمد عثمانی سے دیکھنے کے لئے ملا تھا۔ گو یہ مجموعہ زیادہ صحیح نہیں مگر علامہ انور شاہ کے علوم کا آئینہ دار اور بہت سے علمی فوائد کا حامل ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تشریح یہ کی ہے:

یعنی لم یدونوا فقہہ کما دونوا فقد مالک وغیرہ وان کان بعضهم قد جمع منها شیئا ①

امام شافعی کے قول کا مطلب یہ ہے کہ امام لیث کے شاگردوں نے ان کی فقہ کو مدون نہیں کیا جس طرح امام مالک وغیرہ کی فقہ کو شاگردوں نے مدون کیا ہے گو بعض تلامذہ نے ان کے کچھ مسائل بھی جمع کیا (لیکن وہ قابل ذکر کارنامہ نہیں ہے)

یہی صورت علامہ انور شاہ کے ساتھ پیش آئی، ان کے شاگردوں نے ان کے علوم کو مدون نہ کر کے ان کو ضائع کر دیا، آج ان کی جو امالی ہم کو ملتی ہیں وہ ان کے علوم کا ایک کرشمہ ہیں اور یہ بھی وہ باتیں ہیں جو ان کے شاگردوں نے اپنی فہم و بصیرت کے مطابق لکھ لی ہیں اور علامہ نے بھی طلبہ کی استعداد کے پیش نظر بغیر طلب عام واقفیت کے لئے بیان کر دی تھیں۔ اگر مسائل محقق ہوتا اور سوالات بھی علمی کرتا تو امالی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا، جیسے حافظ ابن حجر عسقلانی کو حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمن سخاوی المتوفی ۹۰۲ھ ملے، کہ جب جی چاہا تقریر ضبط کرانے کے لئے خادم کو بھیج کر بلا لیا، یا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی طرح انہیں بھی کوئی محمد عاشق پھلتی مل گیا ہوتا، جو باصرار ان سے ان کے علوم کو مدون کراتا تو علمی دنیا ان کی امالی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی۔

علامہ انور شاہ کی امالی کو قید تحریر میں لانے کے لئے موزون ترین شخصیت علامہ شبیر احمد عثمانی کی تھی وہ بڑے ذہین طباع اور علوم معقول و منقول میں حاذق تھے، انہیں افہام و تفہیم کا بڑا اچھا سلیقہ اور بیان اور حسن ترتیب کا بھی ملکہ تھا۔ عربی تحریر و تقریر پر بھی پوری قدرت حاصل تھی علامہ انور شاہ کو بھی ان کے فہم و فراست پر پورا اعتماد تھا اور یہ بھی علامہ موصوف کی جامعیت ژرف نگاہی اور وسعت معلومات کے قائل اور قدردان تھے، اس لئے فتح الملہم بشرح صحیح المسلم میں جگہ جگہ ائمہ فن اور کتاب علماء کے اقوال کے ساتھ علامہ انور شاہ کے اقوال کو بھی زیب قرطاس کیا ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے صحیح مسلم کی شرح میں بڑی محنت کی اپنی پوری جوانی اس میں لگا دی تھی پھر بھی وہ پوری نہ ہو سکی قرآن مجید پر اردو میں حواشی اور تفسیر ان کا بڑا کارنامہ ہے جس کے لئے آئندہ نسلیں ان کی ممنون ہوں گی۔ لیکن ان کے مرتبہ کا کام یہ تھا کہ وہ حجۃ الاسلام مولینا محمد قاسم نانوتویؒ کی کتابوں کے مضامین اپنی زبان میں بیان کر جاتے یا تو عوام و خواص دونوں ان سے استفادہ کر سکتے، یا علامہ انور شاہ کشمیری کی صحاح ستہ پر امالی (درسی تقریروں) کو قید تحریر میں لاتے تو یہ علمی

دنیا پر ان کا بہت بڑا احسان ہوتا اور ان کی بقا کے لئے اور کسی چیز کی ضرورت نہ ہوتی لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے یہ کام نہیں کیا ان کے مقابلہ میں حضرت انور شاہؒ نے اپنی فطری صلاحیتوں سے وہی کام لیا جو ان کے دل و دماغ کا اچھے سے اچھا مصرف ہو سکتا تھا، ان کی اس دماغی فوقیت کا راز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوتوں سے وہ کام لیا جو ان کے ہم عصروں کی دسترس سے باہر تھا۔ علوم قرآن و حدیث، فقہ اصول، کلام اور فلسفہ سے متعلق اپنی تالیفات اور امالی میں جس قدر مواد یکجا کر دیا ہے، وہ علوم کا گویا نچوڑ ہے۔ تاہم علامہ انور شاہ کے بعض تلامذہ نے ان کے علوم کو جس قدر اور جس صورت میں بھی مرتب و مدون کر دیا ہے۔ وہ بھی اہل علم کے لئے بڑا کار آمد اور قیمتی سرمایہ ہے اور آج علامہ موصوف کے گونا گوں علوم میں تبحر کے معلوم کرنے کا واحد ذریعہ یہی امالی ہیں۔ گویا ایک ہوشمند عالم کو مختلف موضوع پر ان کے مختصر رسالوں کے مطالعہ سے ان کی جامعیت، جلالت شان اور ہر فن میں مجتہدانہ بصیرت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے لیکن جو تنوع ان کی امالی میں ہے وہ تالیفات میں نہیں، کیونکہ ان کے موضوع خاص ہیں، جن کی بحث کے گوشے بھی مخصوص اور محدود ہوتے ہیں اس کے برعکس درس کے حدود نہایت وسیع ہیں اس میں بہت سے مسائل زیر بحث آ جاتے ہیں۔

علامہ انور شاہ کی امالی اگرچہ پوری صحاح ستہ پر ہیں لیکن "العرف الشذی علی جامع الترمذی" فیض الباری علی صحیح البخاری اور معارف السنن جس میں علامہ موصوف نے مشکلات علوم کی توضیح و تشریح کی ہے۔ امالی علی صحیح مسلم، امالی علی سنن ابی داؤد اور امالی علی سنن ابن ماجہ زیادہ اہم ہیں اول الذکر تین کتابیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہندوستان کی سر زمین پر پہلی اور آخری ہیں ہندوپاک میں علوم سے معمور ایسی مفید اور جامع کتابیں کبھی نہیں لکھی گئیں۔ میں جب ان امالی کو دیکھتا ہوں تو استاذ اور شاگردوں کو دعا کیں دیتا ہوں۔

ان امالی میں علامہ انور شاہؒ نے اس زمانہ میں حنفی مذہب کو حدیث کی بنیاد پر جس طرح مستحکم کیا ہے وہ حقیقت میں ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ اکثر مواقع پر علامہ موصوف کی دقت نظر اور علوم و فنون میں حذاقت ان کو متقدمین کی صف میں بھی ممتاز نمایاں کر دیتی ہے۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء پھر کمال یہ ہے کہ ان کی تنقید کے الفاظ میں ایسی احتیاط ہے کہ ادب کا پہلو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ موصوف بایں ہمہ علم و فضل اخلاق و تقویٰ کے کیسے بلند مقام پر فائز تھے۔

اکابر دیوبند کے کمالات کے جانچنے کا معیار:..... اکابر دیوبند میں محقق عارف باللہ حاجی امداد اللہ مہاجر کی، امام سنت مولینا رشید احمد گنگوہی، حجت الاسلام مولینا محمد قاسم نانوتوی اور مولینا محمد یعقوب نانوتوی قدس اللہ اسرار ہم کے علمی و عملی کمال کے جانچنے کا جو صحیح ترین معیار ہے

بھلا اللہ اس معیار پر علامہ انور شاہ کشمیری پورے اترتے ہیں یہ حقیقت پسندانہ معیار بھی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بتا دیا ہے فرماتے ہیں۔

”لوگ کہتے ہیں کہ رازی اور غزالی پیدا ہونا بند ہو گئے، مگر بالکل غلط ہے، ہمارے حضرات رازی اور غزالی سے کم نہ تھے، علوم میں بھی کمال میں بھی، بات یہ ہے کہ حیات میں قدر نہیں ہوتی، مر جانے کے بعد رحمۃ اللہ علیہ اور پچاس برس گزر جانے کے بعد قدس سرہ ہو جاتے ہیں اور تماشل کے معلوم ہونے کا بڑا اچھا معیار ہے۔ ان کی تحقیقات کو بھی دیکھ لیا جائے اور ان حضرات کی بھی، اس سے معلوم ہو جائے گا ①۔“

عارف تھانویؒ حسن العزیز میں فرماتے ہیں:

”ان حضرات کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کر دیا جائے اور بتلایا نہ جائے تو دیکھنے والے رازی غزالی کے زمانہ کی بتلا دیں گے ②۔“

جس کو اس امر میں تامل ہو وہ علامہ موصوف کی تصانیف کا موازنہ قدماء کی تصانیف سے کر کے دیکھ لے، حقیقت آشکارا ہو جائے گی مثلاً تکفیر کے موضوع پر جن ائمہ فن نے قلم اٹھایا ان میں تبتہ الاسلام امام غزالی، ابن حزم، ابن تیمیہ اور ابن قیم وغیرہ کا نام سرفہرست ہے لیکن جامعیت استیعاب مباحث اور تنقیح مناط علامہ انور شاہ کے رسالہ اکفای المسجدین فی ضروریات الدین (مجلس علمی ڈابھیل، سورت) میں ہے ان ائمہ کے یہاں نہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارا دعویٰ کس حد تک صداقت پر مبنی ہے۔

علامہ موصوف نے اپنی خداداد فہم و فراست اور ذکاوت و بصیرت سے اپنے رسائل اور امالی میں مشکلات علوم کو جس طرح حل کیا ہے، ان کو بلحاظ جامعیت و توسعت نظر عالمانہ تدقیق اور کمان فن بڑے بڑے اہل کمال ائمہ کی تحقیقات کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کی توضیح سے یہ مضمون کتاب بن جائے گا اس سے ہم اس کی چند مثالوں پر اکتفاء کرتے ہیں۔

کتاب الایمان کی معرکہ الاراء بحث الایمان یزید و ینقص میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم میں شیخ اکبر نجی الدین ابن عربی المتوفی ۶۳۸ھ شیخ عبد الوہاب شعرانی المتوفی ۷۳۳ھ اور علامہ ابو محمد علی بن حزم المتوفی ۴۵۶ھ کا قول پیش کرنے کے بعد علامہ انور شاہ کا قول نقل کیا ہے ③۔

①..... ملاحظہ ہو الاضافات الیومیہ من الاضافات القومیہ طبع کراچی ج ۲ ص ۲۹۹، ۲۰۰۔ ②..... ملاحظہ ہو حسن العزیز ملفوظات حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی شائع کردہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھلون بھارت ج ۲ ص ۲۸۳

③..... ملاحظہ ہو فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۵۹

اس مسئلہ پر کہ کفار بھی معاملات میں مخاطب ہیں، علامہ شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم میں حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۳ھ اور علامہ بد الدین عینی کا کلام نقل کرنے کے بعد حافظ انور شاہ کا فیصلہ نقل کیا ہے ❶۔

نزول عیسیٰ کی بحث میں علامہ عثمانی نے فتح الملہم میں علامہ انور شاہ کی پر مغز بحث کو پیش کر کے اسے اکتفا کیا ہے اسی طرح معراج کے باب میں آیت شریفہ ولقد راہ نزلة أخریٰ کی توضیح میں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیدار الہی کی بحث میں علامہ عثمانی نے صرف علامہ انور شاہ کا کلام نقل کیا ہے اور کسی محقق کے کلام کو پیش کرنے کی حاجت نہیں سمجھی ہے۔

حدیث شریف نورانی ارادہ کی تشریح میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم میں مشہور شارح بخاری شیخ ابو عبد اللہ محمد بن علی مارزی مالکی المتوفی ۵۳۶ھ کا قول نقل کرنے کے بعد علامہ انور شاہ کا قول پیش کیا ہے، پھر یہ لکھا ہے ولا یخفی مافیہ من اللطافة

اسی طرح صح ربع رأس (چوتھائی سر کے مسح کی فرضیت) کی بحث میں علامہ عثمانی نے فقیرانہ الولید محمد بن رشید مالکی المتوفی ۵۹۵ھ اور محقق کمال الدین ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ وغیرہ کی بحث کے بعد علامہ انور شاہ کا نقطہ نظر پیش کیا ہے ❷۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے وضو میں سات مرتبہ پاؤں دھونے کے متعلق حافظ ابو زکریا مالکی الدین نووی المتوفی ۷۶۷ھ کا کلام نقل کرنے کے بعد علامہ عثمانی نے حافظ ابن حجر عسقلانی کی توجیہ پیش کی ہے اور علامہ انور شاہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا جو مستدل پیش کیا ہے وہ نقل کیا ہے، یہ مستدل ان دونوں حفاظ حدیث کی نظر میں نہیں ہے علامہ موصوف کی تحقیقات کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ حق تعالیٰ کا فیضان آج بھی اس امت پر ویسا ہی جاری و ساری ہے جیسا کہ پہلے تھا، ملا علی قاری المتوفی ۱۰۱۳ھ نے حدیث ان اللہ یبعث علی رأس کل مائة من یجدد لها دینہا پر بحث کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے:-

ان هذا التجديد امر اضافی لان العلم کل السنہ فی التنزل کما ان الجہل کل عام فی الترقی وانما یحصل ترقی علما و زماننا بسبب تنزل العلم فی او اننا والا فلا مناسبة بین المقتدمین والمتاخرین علما وعملا وحلما وفضلاً وتحقیقا وتدقیقا ❸۔

❶ فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۷۸۔ ❷ ملاحظہ ہو فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۹۰

❸ ملاحظہ ہو مرقاة المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح از علامہ علی قاری مطبوعہ مجدد مصر ۱۳۰۹ھ ج ۱ ص ۴۴۸

یہ تجدید ایک امراضانی ہے کیونکہ علم سال بسال گھٹتا جاتا رہا ہے اور جبل بڑھتا جا رہا ہے ہمارے دور کے علماء کی ترقی ہمارے علم کے تنزل کے سبب سے ہے ورنہ متقدمین اور متاخرین علماء میں علم و عمل، علم و فضل اور تحقیق و تدقیق کے اعتبار سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ یہ کوئی حکم کلی نہیں ہے متاخرین علماء میں جو اباب کمال اس حکم سے مستثنیٰ ہیں ان میں علامہ انور شاہ بھی داخل ہیں۔ سچ ہے:

ہنوز آں ابر رحمت درخشان است
خم و خم خانہ مہر باونشان است
نقصان ز قابل است و گرنہ علی الدوام
فیض سعادتش ہمہ کس را برابر است

موصوف کی علامہ انور شاہ کے الفاظ سے شہرت کی وجہ:..... علامہ انور شاہ کشمیری اکثر ایسی اونچی بات کہتے ہیں جس کو بغیر تمہید و تہیہ مقدمات طلبہ کو سمجھانا مشکل ہوتا ہے، اس امر کا صحیح اندازہ ایک مدرس مزاج انسان ہی کر سکتا ہے جس طرح علمی دنیا میں وقت نظر علوم عقلی میں مہارت اور جہالت علمی کی وجہ سے علی بن محمد جر جانی التوفی ۸۱۶ھ کو علامہ سید شریف جر جانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسی طرح محمد انور شاہ کو اہل علم کے طبقہ میں علامہ محمد انور شاہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جن اہل علم نے اس خوان علم کے زلزلہ بانی کی وہ آسمان علم کے درخشان ستارے بنے اور اصل عہد کے اکابر علماء میں ان کا شمار ہوا۔ ان میں جو وسعت نظر پیدا ہوئی وہ علامہ انور شاہ کے حلقہ درس کا فیضان ہے، ایسے ہی نامور تلامذہ کو مولینا سید سلیمان ندویؒ نے دائرہ علم سے تعبیر کیا ہے، یاد رفتگان میں لکھتے ہیں:

”بعض مشاہیر کے نام جو مجھے معلوم ہیں وہ یادگار کے طور پر سپرد قلم کرتا ہوں، مولینا مناظر احسن گیلانی، مولینا ابوالماثر محمد حبیب الرحمن منو، مولینا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، مولینا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، مولینا محمد یوسف صاحب بنوری ان میں سے ہر ایک بجائے خود دائرہ علم ہے“ ①

مشکل پسندی اور مختصر نگاری:..... حقیقت و صداقت، عقیدت و محبت سے بلند ہے اس لئے علامہ انور شاہ کے ساتھ اس کا بھی اعتراف ہے کہ ان کی طبیعت میں مشکل پسندی اور مختصر نگاری تھی

اس لئے ان کی تحریر و تقریر کو عوام کیا خواص کے لئے بھی سمجھنا مشکل ہے ان کی تقریر کے متعلق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے فرماتے ہیں:

”وہاں (شملہ) کے بعض معززین تعلیم یافتہ صاحبوں نے مولانا انور شاہ صاحب سے جو کہ اس سفر میں تھے اعجاز القرآن پر بیان کرنے کی فرمائش کی چنانچہ بیان کیا گیا مضمون غامض تھا، وہ لوگ بھی نہیں سمجھے پھر ان پر اعتراض کیا گیا کہ ایسے بیان سے کیا نفع جو سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ یہ بیان تو مدرسہ دیوبند میں بیٹھ کر کرنا تھا، اس کا جواب بھی وعظ میں نہیں دیا کہ شاہ صاحب نے جو ایسا بیان کیا ہے وہ اخطار انہیں کہ سہل بیان پر قادر نہیں بلکہ ایک مصلحت سے قصد بیان کیا ہے اور مصلحت یہ ہے کہ آج کل مدعیان علم بہت زیادہ پیدا ہو گئے ہیں اور اجتہاد کا دروازہ کھل گیا ہے حتیٰ کہ انگریزی پڑھ پڑھ کر قرآن و حدیث کا اردو ترجمہ دیکھ کر علوم میں دخل دینے لگے ہیں تو شاہ صاحب نے دکھلادیا کہ تم اہل علم کے کلام کو بھی نہیں سمجھ سکتے، چہ جائیکہ قرآن حدیث میں اجتہاد کر سکو۔“

بتلائے اس بیان سے یہ نفع تھوڑا ہوا کہ تم کو اپنے جہل پر اطلاع ہو گئی۔ سب شرمندہ ہو گئے، مجھ، جاہلوں کا علماء پر اعتراض کرنا بھی ناگوار ہوتا ہے۔ اس لئے بھی یہ جواب دیا گیا ①۔

اسی مشکل پسندی اور مختصر نگاری کی بنا پر ان کے قلم سے جو دو چار رسالے نکل گئے ہیں ان کو بڑے سے بڑا محقق بار بار مطالعہ کئے بغیر پوری طرح نہیں سمجھ سکتا چنانچہ فاتحہ خلف الامام جیسے پامال موضوع پر جب قلم اٹھایا تو ایسا رسالہ لکھا کہ اہل علم کو اشتہار میں یہ لکھنا پڑا کہ بڑے بڑے علماء اس کو مشکل سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے معمولی استعداد کے لوگ اس کو طلب کرنے کی زحمت نہ کریں۔ یہ عجیب و غریب اشتہار مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی نے کلیات شیخ الہند کے سرورق کی پشت پر دیا تھا کہ:

فصل الخطاب، فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں محدثانہ تحقیقات اور عالمانہ مضامین کافی الحقیقت بے مثل رسالہ جو اکابر محدثین کی تصنیفات کا سچا نمونہ ہے، دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے عربی زبان میں بکمال انصاف تحریر فرمایا ہے، بڑے بڑے علماء بھی مشکل سے سمجھ سکتے ہیں، کم استعداد مولوی طلب نہ فرمادیں ②۔

① ملاحظہ ہو ایضادات الیومیہ من الاضافات القومیہ ج ۶ ص ۱۶۶۔ ② ملاحظہ ہو کلیات شیخ الہند مطبع قادی

علامہ انور شاہ میں اگر تصنیف و تالیف کا اچھا سلیقہ ہوتا اور ان میں مشکل پسندی، ایجاز اور مختصر نگاری نہ ہوتی اور ان کو اپنے معاصر محدث ناقد شیخ محمد زاہد کوثری کا پیرایہ بیان اور ترتیب و تہذیب ملی ہوتی اور یہ کام ان کے ہاتھوں انجام پاتا، تو دنیا میں صحاح ستہ کے سمجھنے کے لئے کسی اور کتاب کی حاجت نہ رہ جاتی اور کسی کو اس پر قلم اٹھانے کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ مگر ان سب بے نفسوں کو اخفائے حال میں اتنا اہتمام تھا کہ وہ چاہتے ہی نہ تھے کہ دنیا میں ان کو عالم کی حیثیت سے پہچانا جائے، بزرگوں کے جبر نے تدریس پر بھی آمادہ کیا اور نہ ان کو یہ بھی گوارہ نہ تھا۔



بحر العلوم..... مولینا انور شاہ کشمیری

از فخر ملت اسلامیہ حضرت اقدس مولینا سید ابو الحسن علی ندوی دامت برکاتہم
(ناظم اعلیٰ دارالعلوم ندوۃ العلماء لاہور)

حضرت مولینا انور شاہ کشمیریؒ اس دور کے عظیم علماء ربانیین میں تھے قوت حفظ تبحر علمی اور سلف کے کارناموں کے بارے میں جن لوگوں کو شبہ تھا انہیں شاہ صاحب کو دیکھ کر ان روایات پر یقین کرنا پڑا۔ مجھے ان سے تلمذ کا شرف حاصل تو نہیں، لیکن ان کی صحبت میں بیٹھ کر اور ان کے تلامذہ سے مل کر اپنے کو بھی ان کے تلامذہ میں سمجھنے کا ایک احساس ہوتا تھا، لاہور اسٹیشن پر ایک بار دیوبند یا سرینگر جاتے ہوئے ایک ملاقات یاد ہے، میں مولینا احمد علی صاحب لاہوری کیساتھ (جن کو حضرت شاہ صاحب بڑی عقیدت تھی) اسٹیشن پر حاضر ہوا بھاگ دوڑ اور مسافروں کے ہنگامہ کے دوران بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی مجلس ایک پر شکوہ محفل مذاکرہ اور مجلس علمی میں تبدیل ہو گئی اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا علم کے دفتر کھل گئے ہوں۔

۱۳۵۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں میرا طویل قیام تھا، جب شاہ صاحب ڈابھیل سے تشریف لائے تھے میں پہلی مرتبہ اپنے بڑے بھائی اور مربی مولینا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کا (جوان کے عزیز شاگرد تھے) سلام پہنچانے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ شاہ صاحب نے بڑی محبت سے جواب دیا اور خیریت دریافت کی اس کے علاوہ بھی طلبہ کے ساتھ ان کی خدمت میں کئی بار حاضر ہوا اور علم کے اس پیکر اور سلف کی ایک نادریادگار کی زیارت سے اپنی آنکھیں روشن کیں جس پر مجھے فخر ہے۔ ہندوستان کے تمام علماء حق اور ممالک عربیہ کے باخبر علماء کو شاہ صاحب کے علمی کمالات کا معترف پایا۔

شدید مصروفیت اور طبیعت کی ناسازی کی حالت میں بستر پر لیٹے لیٹے یہ چند سطریں لکھوا دیں ہیں جو کسی طرح ایسی باکمال ہستی کے شایان شان نہیں۔ اللہ تعالیٰ ملت اسلامیہ کو پھر ایسا سرآمد روزگار عالم اور ایسا بحر العلوم عطا کرے۔ والسلام



حضرت شاہ صاحب..... ایک مکمل لائبریری

از حبان الہند حضرت مولینا احمد سعید صاحب دہلوی مرحوم

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے موقع پر جامع مسجد دہلی میں جو ماتمی اجلاس منعقد ہوا اس میں ملک کے نامور مقرر فصیح اللسان واعظ اور قومی رہنما حضرت مولینا احمد سعید صاحب دہلوی نے جو فاضلانہ تقریر ارشاد فرمائی ہے وہ اس قدر جامع ہے کہ ہم اس کو بطور ایک مضمون کے یہاں شامل کرنا موزوں خیال کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس اجتماع کی صدارت حضرت علامہ مولینا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مرحوم نے فرمائی تھی۔ (کوندو)

حضرات اہل میں نے صدارت کی تحریک کے سلسلہ میں عرض کیا تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے صحیح حالات اور ان کے حقیقی اوصاف و کمال تو حضرت مفتی صاحب قبلہ ہی بیان فرمائیں گے کیونکہ ”قدر گو ہر شاہ داند یا بداند جو ہری“

حضرت مفتی صاحب قبلہ نہ صرف شاہ صاحب کے ہم عصر اور ہم سبق ہیں بلکہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی کے فخر میں دونوں شریک ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ایک ہی چشمہ فیض کے دو دریا ہیں جو ایک ہی منبع سے جاری ہوئے ہیں یا ایک دریا کی دو نہریں ہیں یا ایک بحر ناپید اکنار سے نکلے ہوئے دو سمندر ہیں۔ اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق صحیح معلومات اور حقیقی حالات تو مفتی صاحب بیان فرمائیں گے مجھ جیسا جاہل حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و فنون اور ان کے کمالات ظاہر و باطنیہ کے متعلق کیا عرض کر سکتا ہے۔ ایک وہ شخص جو سمندر کے کنارے کھڑا ہوا ہو اور جس کو سمندر کی گہرائی اور عمق میں کبھی غوطہ لگانے کی نوبت نہ آئی ہو، وہ اس تجربہ کار غواص کے متعلق کیا رائے ظاہر کر سکتا ہے جو ہمیشہ سمندر کے عمق میں سے موتی نکال کر لائے، جس نے بڑے بڑے طوفانوں میں جہاز رانی کی خدمت انجام دی ہو اور جو تمام خطرناک طوفانوں کا مقابلہ کرتا رہا ہو اور جس نے بڑے بڑے جہازوں کی باخدا کی ہو اور جو بڑے بڑے سمندروں کی شناسائی کا فخر حاصل کر چکا ہو۔ اس کے اوصاف و کمالات وہ خشکی کا کیڑا کیا بیان کر سکتا ہے جس نے سمندر کی صورت بھی نہ دیکھی ہو۔ جس طرح ایک خشکی کا کیڑا اور نا آشنا ہے بحر اس مگر مجھ کے

کمالات ظاہر کرنے سے عاری ہے جو چوہیں کھٹنے پانی کی گہرائیوں اور سیلاب کے لیے پناہ جھکولوں سے کھیلتا رہتا ہے۔ اسی طرح مجھ جیسا جاہل حضرت مولینا انور شاہ صاحب کے کمالات و اوصاف کے بیان سے قاصر و عاجز ہے۔ واللہ علی ما اقول وکیل۔

علم کی فضیلت:۔ حضرات! میں چاہتا ہوں کہ اس مختصر وقت میں آپ کے سامنے صرف تین باتیں عرض کروں ایک علم کے متعلق دوسری علماء کے متعلق اور تیسری حضرت شاہ صاحب کی وفات کے سلسلہ میں۔

علم کی فضیلت کا تذکرہ آپ نے بار بار سنا ہوگا بالخصوص عربی مدارس کے جلسوں میں تو عام طور پر علم کے فضائل کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ علم کی شان اور اس کا مرتبہ صرف اس دعا سے معلوم ہو سکتا ہے جو اللہ جل ذکرہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلقین کی ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو ایک دعا تعلیم فرماتے ہیں یعنی ہمارے حبیب! ہم سے فلاں چیز طلب کرو۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ایک چیز اپنے حبیب کو دینا چاہتے ہیں تو وہ کیا چیز ہوگی۔ پھر دینا بھی اس طرح چاہتے ہیں کہ خود فرماتے ہیں کہ پہلے مجھ سے مانگو تا کہ اس شے کی اہمیت اور زیادہ ہو جائے خیال ہوتا تھا کہ شاید مال و دولت طلب کرنے کی ہدایت کی جائے گی یا اولاد کی طلب کے متعلق ارشاد کیا جائے گا یا کہا جائے گا کہ جنت مانگو۔ لیکن دیکھئے ان میں سے ایک چیز بھی نہیں بلکہ ارشاد ہے قل رب زدنی علما آپ ہم سے علم کی زیادتی طلب کیجئے۔ گو یا اللہ تعالیٰ کی نظر انتخاب نے اپنے محبوب کے لئے جو چیز مفید اور نافع اور ان کی شان کے لائق ضروری سمجھی اور جس کے طلب کرنے کی ہدایت کی وہ علم کی زیادتی تھی۔ جس پیغمبر کی شان میں وعلیہ السلام تکتہ نعلہم اور وکسان فضل اللہ علیہ عظیم ارشاد فرما چکے تھے اسی پیغمبر کو تعلیم فرماتے ہیں کہ زیادتی علم ہم سے طلب کرو اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ علم کا مرتبہ اور علم کی شان کس حد تک بلند ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں اور بھی عرض کیا جاسکتا ہے لیکن قلت وقت کو مد نظر رکھتے ہوئے صرف ایک ہی بات پر اکتفا کرتا ہوں۔

علماء کی فضیلت:۔ معزز حاضرین! ہر چند کہ علم کی فضیلت سے اہل علم کی فضیلت معلوم ہوتی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کے متعلق صرف ایک حدیث بیان کروں۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ آپ نے اہل علم کی فضیلت کا بیان سنا ہوگا کہ طالبان علم کے قدموں کے نیچے فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں، آپ نے سنا ہوگا کہ مچھلیاں دریائوں اور چوئیاں اپنے سوراخوں میں علماء کی بقاؤں کی

کے لئے دعا کیا کرتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ قیامت میں شہداء کا خون اور مفتیان دین کے فتاویٰ کی سیاہی یہ دونوں چیزیں ترازو کے دونوں پلوں میں رکھ کر وزن کی جائیں گی تو فتاویٰ کی سیاہی کا وزن شہداء کے خون کے وزن سے زیادہ ہوگا۔ حالانکہ خون ایک بہت وزنی چیز ہے لیکن اہل علم کے لوگوں کی سیاہی اس وزن پر بھی غالب آجائے گی۔

آپ کو شاید پتہ ہوگا کہ علماء دین میں علم الہی کے خیمے ہیں جب کوئی عالم مر جاتا ہے تو گویا علم الہی کا ایک خیمہ زمین سے اٹھالیا جاتا ہے۔ اہل علم اور حضرات علماء کا گرد وہ ہے جن کی ضرورت مسلمانوں کو جنت میں بھی پیش آئے گی حالانکہ جنت عمل کی جگہ نہیں ہے، وہاں کسی عمل پر استفسار نہ ہوگا، بلکہ طلب انعامات کے سلسلہ میں علماء کی ضرورت واقع ہوگی۔ حضرت حق کی طرف سے گھڑی گھڑی انعامات کے طلب کا تقاضا ہوگا۔ کہا جائیگا کہ مانگو کیا مانگتے ہو۔ اب یہ کون بتائے گا کہ کیا مانگا جائے۔ اس لئے اہل علم کی ضرورت ہوگی کہ ہماری رہنمائی کیجئے اور ہم کو بتائیے کہ اللہ جل ذکرہ سے کیا مانگیں۔ یہ تمام وہ فضائل ہیں جو آپ کو بار بار سننے کو اتفاق ہوا ہوگا لیکن میں آپ کو صرف ایک روایت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے فضل العالم علی العابد کفضل علی ادناکم۔ اس حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہونے ایک جاہل عابد پر عالم کی فضیلت کو اس طرح بیان فرمایا ہے اور اس طرح تشبیہ دی ہے کہ ایک عابد پر عالم کو ایسی بزرگی حاصل ہے جیسے میری بزرگی ایک ادنیٰ مسلمان پر۔ اب آپ خیال کیجئے کہ نبی کریم کو اپنے ایک امتی پر کس قدر بلندی اور برتری حاصل ہے کہاں حضور ذات اقدس اور کہاں آپ کا ایک ادنیٰ امتی۔ جو فرق ان دونوں مرتبوں کے مابین ہے وہی فرق ایک عابد اور عالم کے مابین ہے۔

حضرت شاہ صاحب:..... معزز حاضرین! میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ مجھے حضرت شاہ صاحب کی ذات کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے اگرچہ ان کے حقیقی کمالات و اوصاف تو مفتی صاحب ہی بیان فرمائیں گے۔

حضرت! میں اس امر کو ذرا تفصیل کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو ہندوستان میں جو کچھ علمی اثرات اور اہل علم کا وجود نظر آ رہا ہے۔ یہ سب دہلی کے اس خاندان کا فیض ہے جو شیخ نرور کے چتے میں دفن ہے اور جن کا یہ احسان ہے کہ اس نے ہندوستان کو احادیث رسول اللہ سے آشنا کیا ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد جس خاندان کو خدمت حدیث کا شرف حاصل ہے وہ شاہ عبد الرحیم صاحب کا خاندان ہے۔ اسی خاندان کے بزرگوں میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبد العزیز صاحب، شاہ عبد القادر صاحب، شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ

علیہم اجمعین ہیں یہ تمام حضرات اس مبارک خاندان کے افراد ہیں۔ ان میں بعض حضرات ہجرت فرما کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اور بعض آج بھی شیخ زور کے چھتہ میں جس کو آج مہندیان کہتے ہیں، آرام کی غیند سو رہے ہیں۔ دہلی والے جانتے ہو گئے کہ ایک زمانہ ہوا جب اس قبرستان کی مسجد میں شبینہ بھی ہوا کرتا تھا۔ یہی قبرستان ہے کہ جہاں علم کے سمندر کے سمندر دفن ہیں۔ آج تو علماء دیوبند کے نام سے مشہور ہیں مثلاً مولینا رشید احمد صاحب، مولینا محمد قاسم صاحب وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ یہ سب خاندان ان کے شاگرد ہیں۔ گویا دارالعلوم دیوبند اس تلامذہ خیر سمندر کا ایک ٹکڑا ہے جو کبھی ترکمان دروازے کے باہر موجیں مارا کرتا تھا اور جس کی بے پناہ طغیانیاں کئی کئی آسمان سے باتیں کرتی تھیں اور آج بھی جس کی خاموش روانی اہل بصیرت پر مخفی نہیں ہے۔

حضرت دیوبند اسی خاندان سے عبارت ہے جس کا نام شاہ عبدالرحیم صاحب کا خاندان ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے لوگوں کو جس طرح علم ظاہر اور باطن میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے خاندان سے منسوب کیا جاتا ہے اسی طرح علم باطن میں ان لوگوں کی نسبت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ کی جاتی ہے جو خلیفہ تھے میانجی نور محمد صاحب کے۔

شاہ عبدالرحیم دہلوی اور میانجی نور محمد جھنجیالوی:۔۔۔ میری اس مختصر تفصیل کے بعد آپ یقیناً اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ اس دارالعلوم دیوبند میں جو کچھ ہے وہ مولینا شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی اور میاں جی نور محمد صاحب جھنجیالوی کی تعلیم کا خلاصہ ہے جو چمن حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی کے ایک چھتہ میں لکایا تھا جس کو شیخ زور کا چھتہ کہا جاتا تھا۔ اسی چمن کی یہ عطرینیاں اور اسی گلستان کے یہ پھول ہیں جس سے آج نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا اس کی خوشبو سے مہک رہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے ایک بنجر اور خشک زمین میں اپنے کمالات علمیہ کی ختم ریزی کی تھی اور اس دارالحرب میں قرآن اور حدیث کی اشاعت اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا درس شروع کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ شاہ صاحب کی یہ خلاصانہ سعی مشکور بار آور ہوئی۔ اسی خشک زمین میں علم نبوی اور علم الہی کے سمندر ناپید اکنار بن کر بے اور چمنستان نبوی کی شاخیں دہلی اور دیوبند سے گزرتی ہوئی تمام عالم پر سایہ فگن ہوئیں۔

حضرت مولینا محمد انور شاہ صاحب کون تھے؟ اسی چمن ولی اللہ کے ایک بار آور اور ثمر دار درخت تھے جو اپنے گنجان سایہ سے تمام عالم کو مستفید کر رہے تھے اور جس درخت کے شیریں پھلوں سے ایک عالم اپنی سگئی کو دور کر رہا تھا۔ حضرت شاہ صاحب ایک فیض جاری کے ایسے سرد اور شیریں چشمہ تھے جس کے پانی کا بہاؤ نہ صرف ہندوستان تک محدود تھا بلکہ تمام عالم اسلامی اسی چشمہ سے سیراب ہوا۔

تھا اس کا منہ اگرچہ دیوبند میں تھا لیکن اس کا دھارا چین، بخارا، جاوا، مصر اور ترکی میں پڑتا تھا۔
برادران محترم! ایسے باکمال حضرات کیا روز روز پیدا ہوتے ہیں۔ صدیوں میں کہیں امت
میں ایسے پیدا ہوتے ہیں؟ شاہ صاحب کا علمی، تبحر ان کا حافظہ ان سے دریافت کیجئے جن لوگوں کو
شرف صحبت حاصل ہے۔

آپ حافظ ابن تیمیہ کو بحر لا ساحل لہ فرمایا کرتے تھے لیکن خود بھی شاہ صاحب بحر
لا ساحل لہ تھے حافظہ کی یہ حالت تھی کہ برسوں کی پڑھی ہوئی کتاب کو جب کسی حوالہ کی غرض سے
کھولنا چاہتے تھے تو خود فرماتے تھے ”حسبنا اللہ ونعم الوکیل“ یہ جملہ کہہ کر کتاب کھولا
کرتے تھے اور وہی صفحہ نکل آیا کرتا تھا جہاں سے شاہ صاحب کو حوالہ دینا مقصود ہوتا تھا۔

ابھی آپ نے مولانا سلطان محمود صاحب سے سنا کہ فتح القدیر جیسی بڑی کتاب شاہ صاحب نے
اکس دین میں ختم کر دی تھی۔ ایک دفعہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ غریب خانہ پر تشریف لائے انشاء
گفتگو میں حیات الحیوان کا ذکر نکل آیا۔ فرمانے لگے ہاں میری نے خوب کتاب لکھی ہے۔ میں نے
تین دفعہ اس کو بالاستیعاب پڑھا ہے۔

کسی کتاب کا شاہ صاحب کے سامنے نام لیجئے وہ کتاب نہ صرف شاہ صاحب کی پڑھی ہوئی
ہوگی بلکہ اس کی عبارتیں کی عبارتیں اور صفحات کے صفحات شاہ صاحب کو حفظ یاد ہوں گے۔ کسی
واقعہ کا تذکرہ شاہ صاحب کے سامنے آیا اور شاہ صاحب نے اس کے تمام متعلقات بیان کرنے
شروع کر دیئے۔ مطبوعہ کتب کے علاوہ حضرت شاہ صاحب کو صد ہا قلمی کتب کی عبارتیں محفوظ
تھیں۔ جو کتابیں آج تک پریس اور مطابع کی مرہون منت نہیں ہیں شاہ صاحب کو ان کے بھی
صفحات حفظ تھے۔ شاہ صاحب سے کسی مسئلہ میں گفتگو کیجئے اور کسی وقت کیجئے آپ کو یہ معلوم ہوگا
کہ شاہ صاحب اس مسئلہ کے لئے بڑی دیر سے مستعد بیٹھے ہوئے اس امر کا انتظار کر رہے تھے کہ
یہ مسئلہ کوئی مجھ سے دریافت کرے اور میں اس کا جواب دوں۔

زندہ لا بھری:..... معزز حاضرین! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ نے دو شنبہ کی شام کو
دیوبند کی خاک میں کسی انسان کو دفن نہیں کیا ہے بلکہ آپ نے ایک ایسے مکتبہ کو خاک میں ملایا ہے
جس میں ہر فن کی بے شمار کتابیں الماریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ آپ نے ایک ایسے کتب خانہ کو
زمین کی تہہ میں چھپا دیا ہے جس کی کتابیں احاطہ احصاء و شمار سے خارج تھیں۔ ہائے مسلمانوں کی
بد قسمتی ہائے قوم کی حرمان نصیبی کیا چیز ان کے ہاتھ سے تلف ہوگئی ہم جیسے جاہلوں کی ہزاروں
زندگیاں بھی شاہ صاحب پر قربان کر کے شاہ صاحب کو زندہ رکھا جاتا تب بھی شاہ صاحب کی

زندگی بہت سستی تھی کسی لائبریری میں تو کتاب کے تلاش کرنے اور عبارت کو ڈھونڈتے میں کچھ وقت اور دشواری بھی ہوتی ہے لیکن حضرت شاہ صاحب کے استحضار کی تو یہ حالت تھی کہ ادھر سائل کے منہ سے فقرہ نکلا اور ادھر شاہ صاحب نے کتاب کی عبارت پڑھنی شروع کی۔

دنیا سے بے رغبتی:..... اس علمی تبخیر اور کمالات ظاہری اور باطنی کے ساتھ ساتھ زہد و تقویٰ کی یہ حالت تھی کہ جس طرح وہ اپنے علم میں تمام معاصرین سے ممتاز تھے، اسی طرح زہد و تقویٰ اور اپنے درجہ پر ہیزار گاری میں بھی بے مثل تھے۔ کوئی نہیں جانتا کہ ان کو ڈھاکہ یونیورسٹی اور مدرسہ عالیہ کلکتہ نے بار بار طلب کیا۔ بڑی بڑی تنخواہیں پیش کیں۔ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں وفود حاضر ہوئے لیکن شاہ صاحب نے کبھی بڑی تنخواہ کو ترجیح نہیں دی اور ہمیشہ دیوبند اور ڈابھیل کے خشک ٹکڑوں کو پسند فرمایا۔ ۱۳۱۵ھ میں پہلی مرتبہ دیوبند سے تشریف لائے اور مدرسہ امینیہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے، مدرسہ امینیہ کی وہ ابتدائی حالت تھی میں کیا عرض کروں کہ مولانا امین الدین اور مولانا نور شاہ صاحبان نے کس عسرت کے ساتھ زندگی بسر کی ہے اس کی پور تفصیل تو حضرت مفتی صاحب آپ کے رو برو بیان کریں گے۔ ان واقعات کو کم و بیش ۳۵، ۳۰ سال گزر چکے ہیں۔ آج ان باتوں کے جاننے والے شاید چند ہی حضرات ہوں گے۔

شاہ صاحب کی موت کا صدمہ:..... حضرات! جس طرح شاہ صاحب جیسے بزرگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایسے بزرگوں کی موت صدیوں خون کے آنسو رلایا کرتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ موت ہر شخص کو آتی ہے۔ موت سے بچنے والا کوئی شخص نہیں ہے۔ شاہ صاحب کی موت کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی اکابر وفات پا چکے ہیں۔ قدرت کا یہ خاص شغل ہے وہ ہمیشہ بنائی بگاڑتی رہتی ہے خود ہی ایک پودے کی پرورش کرتی ہے۔ اس میں پھل اور پھول پیدا کرتی ہے۔ اس کی ہری ہری ٹہنیوں کو ٹھنڈا اور خوشگوار سایہ عطا کرتی ہے۔ ایک چھوٹے سے پودے کو اتنا اونچا کرتی ہے کہ وہ آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے جب یہ پودا عجائبات قدرت پر ایک شاہد ہو جاتا ہے تو اس کو فنا کر دیتی ہے اور قدرت اس حصہ زمین کو ان پودوں کے لئے خالی کرا لیتی ہے۔ جو بیج خاموشیوں اور ختم کی گہرائیوں میں گوشہ نشین ہوا کرتے ہیں۔ الغرض قدرت کا یہی کام ہے۔ موت و حیات روزمرہ کا کھیل ہے۔ نہ کسی کی زندگی مسرت افزا ہے نہ کسی کی موت روح فرسا ہے اور یہی مطلب ہے لا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم۔

میرے معزز دوستو! میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ موت من حیث الموت شاہ صاحب کی موت کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن میرے بھائی شاہ صاحب کی موت، ایسے زمانہ میں واقع

ہوتی ہے جو زمانہ ہے قحطِ الرجال کا جو دور ہے فقدانِ کمال کا شاہ صاحب اگر ایسے عہد میں مرتے کہ جس زمانہ میں شاہ صاحب کا جواب اور ان کا مثل یا ممکن موجود ہوتا تو یقیناً اس قدر صدمہ اور رنج کی ضرورت نہ تھی۔ رونا تو یہ ہے کہ شاہ صاحب نے ایسے زمانہ میں وفات پائی ہے جب کہ ان کا قائم مقام کوئی نظر نہیں آتا۔ قلق تو یہ ہے، غم تو یہ ہے، صدمہ تو اسی کا ہے کہ اس فقدانِ رجال کے عہد میں شاہ صاحب کی موت ایک ناقابلِ تلافی نقصان کا موجب ہے۔ مستقبل قریب تو قریب میں تو عرض کرتا ہوں مستقبل بعید میں بھی شاہ صاحب کی تلافی کا کوئی سامان نظر نہیں آتا۔

حاج بن یوسف کا ظلم:۔۔۔ آپ حضرات نے غالباً حجاج کا نام سنا ہوگا۔ یہ وہ ظالم ہے جس کے دامن پر ستر ہزار بے گناہوں کے خون کے دھبے پڑے ہوئے ہیں اسی کے متعلق حضرت حسن بصری فرمایا کرتے تھے کہ اگر تمام انبیاء اپنی امتوں کے ظالم قیامت میں لے آئیں تو امت محمدیہ کی طرف سے حجاج ہی کا وجود تا مسعود سب کا جواب ہو جائے گا۔

حجاج مروانیوں کے دور میں امیر تھا۔ اہل بیت اور ان کے معاونین کا بدترین دشمن تھا۔ صد ہا تابعین کو تو محض اس جرم میں قتل کرایا تھا کہ وہ سیدنا حسن اور سیدنا حسین کو ذریت رسول کیوں کہتے ہیں یہ کہا کرتا تھا کہ ذریت کا تعلق تو لڑکے کی اولاد سے ہوتا ہے۔ اگر رسول اللہ کا کوئی بیٹا ہوتا تو بے شک اس کی اولاد ذریت رسول ہو سکتی تھی۔ حضرت فاطمہؑ کی اولاد کو ذریت رسول کہنا غلط ہے۔ اسی انوارِ فاسد خیال کی بنا پر اس نے پیغمبروں، علما، اور صلحاء کو قتل کر دیا تھا۔

حضرت شععی کا واقعہ:۔۔۔ حسن اتفاق دیکھئے اسی زمانہ میں ایک بزرگ علامہ شععی بھی تھے جو اپنے عہد کے بہت بڑے تابعی بھی تھے ان کے متعلق بھی یہ مشہور تھا کہ وہ سیدنا حسین کو ذریت رسول کہتے ہیں۔ اس ظالم نے ان کو بھی گرفتار کر لیا اور جب وہ دربار میں اس موذی کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے سخت غصے کے لہجے میں ان سے کہا کہ کیا تم حسن اور حسین کو ذریت رسول کہتے ہو؟ انہوں نے کہا بے شک، اس نے کہا اچھا اس بات کو قرآن سے ثابت کر دو ورنہ کھانا کھانے سے بیشتر تم کو قتل کرا دوں گا۔ اور وہ کھودہ آیت "لندع ابناءنا و ابنائکم" نہ پڑھنا اس کا مطلب ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں۔

اہل باطل اور گمراہ لوگوں کا ہمیشہ قاعدہ رہا ہے کہ یہ بد بخت حدیث کو چھوڑ کر قرآن سے دلیل مانگا کرتے ہیں، اور اس خبیث نے تو یہ کہا کہ قرآن کی بھی ایک آیت کو مستحسی کر لیا۔ اور آیت مہلکہ جو اس بارے میں بالکل صاف تھی اس سے ان کو استدلال کرنے کو منع کر دیا۔ جب اس نے اس آیت کے علاوہ ان سے استدلال طلب کیا تو حضرت شععی نے بے ساختہ و نسلکِ حمینا کا

رکوع پڑھنا شروع کیا۔ اور اس کی رکوع کی یہ آیت کلا ھدینا ونوحا ھدینا من قبل ومن ذریئہ داؤد سلیمان وایوب ویوسف وموسیٰ وھرون وکذلک نجزی المحسنین وزکریا ویمحیٰ وعیسیٰ والیاس کل من الصالحین پر پوری آیت میں اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ نبیوں کا ذکر فرمایا ہے جس میں حضرت عیسیٰ کو بھی ذریت نوح میں شمار کیا گیا ہے۔ حضرت شععی نے آیت پڑھ کر فرمایا، اگر حضرت عیسیٰ جو مریم کی اولاد ہیں اور جن کا باپ کوئی نہیں ہے، ایک عورت کے بطن سے پیدا ہو کر حضرت نوح کی ذریت ہو سکتے ہیں تو امام حسن اور امام حسین فاطمہ کے بطن سے پیدا ہو کر رسول اللہ کی اولاد کیوں نہیں ہو سکتے حجاج یہ سن کر دنگ رہ گیا اور کہنے لگا، خدا کی قسم میں نے تو آج تک اس آیت پر غور ہی نہیں کیا۔ شععی اگر تم کہو تو تم کو کسی بڑے عہدے پر فائز کر دیا جائے اور اگر تمہاری خواہش ہو تو تم کو واپس تمہارے وطن میں پہنچایا جائے۔ علامہ شععی نے فرمایا اس سے زیادہ میری کوئی خواہش نہیں ہے ❶۔

سعید بن جبیر:..... حجاج نے اپنے مظالم کے آخری دور میں ایک دوسرے تابعی حضرت سعید بن جبیر کی گرفتاری کا حکم صادر کیا اور سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ کیا تا کہ سعید بن جبیر کو گرفتار کر کے پیش کیا جائے۔ سپاہی جب روانہ ہوئے تو ان کو طلاق وعتاق کی قسمیں دلائی گئیں۔ یہ لوگ گئے اور حضرت جبیر کو انہوں نے گرفتار کر لیا سپاہیوں نے سعید سے معذرت کی اور اپنی مجبوری کا اظہار کیا لیکن سعید خوشی خوشی ان کے ہمراہ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں ایک راہب کا صومعہ تھا جہاں سپاہیوں نے منزل کی اور سعید سے اصرار کیا کہ وہ رات کو صومعہ میں رہیں کیونکہ وہاں شب کے وقت شیر آیا کرتا تھا۔ لیکن سعید نے صومعہ میں پناہ لینے سے انکار کر دیا اور سپاہیوں سے وعدہ کیا کہ مجھ سے اطمینان رکھو میں جاؤں گا نہیں سپاہی رات کو صومعہ میں پناہ گزین ہو گئے اور سعید صومعہ سے باہر رات بھر نماز پڑھتے رہے رات کو شیر آیا اور سعید بن جبیر کے تلوے چاٹتا رہا۔ سپاہیوں نے بھی دروازے میں سے یہ واقعہ دیکھا صبح کو تمام سپاہی سعید بن جبیر کی انتہائی خوشامد کرنے لگے اور اپنا قصور معاف کرانے کی خواہش ظاہر کی سعید بن جبیر نے فرمایا، تمہارا کیا قصور ہے مجھے تو شہید ہونا ہے۔ ہاں اتنا بتا دیتا ہوں کہ میرا قتل آخری قتل ہوگا۔ میرے بعد حجاج کسی اور بے گناہ کو قتل نہ کر سکے گا۔ بہر حال سعید بن جبیر حجاج کے قلعہ میں پہنچے اور حجاج کو اطلاع دی گئی کہ ملزم حاضر ہے۔ حجاج نے سعید کو اپنے رو برو پیش کرنے کا حکم دیا اور نہایت خشم آلود لہجے میں دریافت کیا کہ تیرا نام کیا ہے؟ سعید نے جواب میں کہا ”سعید بن جبیر“ حجاج نے کہا نہیں بلکہ شقی بن کسیر، سعید نے فرمایا میری ماں میرا نام تجھ سے زیادہ جانتی

[illegible]

حجاج نے ان کے سامنے آلات لہو و لعب پیش کئے، اس پر سعید بن جبیر کی آنکھوں سے آنسو نکل گئے۔ حجاج نے کہا سعید تیرے لئے خرابی ہو۔ سعید نے فرمایا خرابی تو اس کے لئے ہے جو جنت سے محروم رہے اور دوزخ میں داخل کیا گیا۔ حجاج نے کہا سعید تجھ کو کس طرح قتل کیا جائے اور تو کون سے طریقہ قتل کو پسند کرتا ہے۔ سعید نے فرمایا، یہ مجھ سے دریافت کرنے کی بات نہیں ہے۔ جس طرح مجھ کو قتل کریگا، خدا تعالیٰ اسی طرح تجھ کو قتل کریگا لہذا تو خود طریقہ قتل پسند کر۔ جو طریقہ تجھ کو پسند ہو اسی طرح مجھ کو قتل کر دے، حجاج نے کہا۔ میں چاہتا ہوں تجھ کو معاف کر دوں۔ سعید نے فرمایا اگر یہ معاف کرنا اللہ کی جانب سے ہو تو میں اس کو قبول کرتا ہوں اور اگر تیری طرف سے ہو تو مجھ کو قبول نہیں۔ حجاج نے جلاو حکم دیا کہ لے جاؤ اس کو قتل کر دو، سعید کو جلا دے کہ جب دروازہ پر پہنچا تو سعید ہنس دیئے۔ حجاج نے کہا اس کو لوٹا کر لاؤ جب دوبارہ حاضر کئے گئے تو حجاج نے دریافت کیا تم کیوں ہنسے؟ سعید نے فرمایا۔ تیری جرأت اور اللہ کے علم پر مجھ کو ہنسی آگئی۔ حجاج نے حکم دیا۔ ہمارے سامنے اسے قتل کرو۔ چنانچہ آپ قبلہ رخ ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا: کُلْ نَفْسٌ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ..... انی وجہت ارحمی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔

حاج نے کہا اس کا منہ قبلہ کی طرف سے پھیر دو۔ چنانچہ سعید کا منہ قبلہ کی جانب سے پھیر دیا گیا اس پر سعید نے فرمایا واللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ حاج نے

حکم دیا اس کا منہ اوندھا کر دو اور اوندھا کر کے زمین پر لٹا دو۔ اس پر سعید نے کہا منہا عسلفکم
وفیہا نعیدکم ومنہا نخرجکم تارۃ اخری چنانچہ حجاج لاچار ہو گیا اور اس نے قتل کا حکم
دے دیا۔ سعید بن جبیر نے کلمہ شہادت پڑھا اور شہید ہو گئے۔

حضرت حسن بصریؒ کو جب سعید بن جبیرؒ کی شہادت کا علم ہوا تو بہت روئے اور فرمایا
اللہم انت رقیبت علی فاسق ثقیف واللہ لو ان اهل المشرق
والمغرب اشتروکوا فی قتله لا کبہم اللہ فی النار

حضرت حسن بصریؒ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سعید بن جبیرؒ اس مرتبہ کے آدمی تھے کہ اگر ان کو
اہل مشرق و مغرب مل کر بھی قتل کرتے تو اللہ تعالیٰ ان سب کو منہ کے بل دوزخ میں ڈال دیتا۔ اس
واقعہ دہخراش کے بعد حجاج زیادہ نہ جی سکا اور مر گیا۔

امیر المومنین عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو خواب میں دیکھ کر حالت دریافت کی تو حجاج نے کہا
مقتول کے بدلہ میں ایک ایک مرتبہ قتل کیا گیا لیکن سعید بن جبیرؒ کے قتل کی پاداش میں ستر مرتبہ قتل
کیا گیا ہوں۔ علامہ دمیری نے اس قصہ کو نقل کر کے شبہ کیا کہ سعید بن جبیرؒ تابعی تھے۔ ایک تابعی کو
قتل کی پاداش میں ستر مرتبہ قتل کیوں کیا گیا۔ حالانکہ یہ صحابہؓ کو بھی قتل کر چکا تھا۔ جیسا کہ عبد اللہ بن
زبیرؓ گوصرا تھا اور عبد اللہ بن عمرؓ کو کنایہ و اشارہ۔

شبہ کی وجہ یوں سمجھئے کہ صحابہؓ کے قتل کے سلسلہ میں تو صرف ایک مرتبہ قتل ہو حالانکہ صحابی کا مرتبہ
تابعی سے افضل ہے اور اس شبہ کا جواب دمیری نے یہ دیا کہ سعید بن جبیرؒ کو جس وقت قتل کیا گیا اس
وقت سعید کی مثل مسلمانوں میں کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ اور دوسرے حضرات کے قتل کے وقت اور
حضرات موجود تھے۔ جو کم و بیش مرنے والوں کی جگہ پر کر سکتے تھے۔

حاصل کلام: آپ حضرات معاف کیجئے، میری تقریر طویل ہو گئی یہ تو ضمنی طور پر آ گیا اور یہ آیا
بھی کیوں صرف اس لئے کہ قحط الرجال اور فقدان باکمال کے عہد میں شخص واحد کی موت ہزاروں
اور لاکھوں کے برابر ہو جاتی ہے۔ حضرت مولینا انور شاہ صاحب کی موت ایسے دور کی موت ہے جن
کے بعد ان کا مثل اور جانشین کوئی نہیں ہے۔ سب سے بڑی وجہ رنج و الم یہ نہیں کہ شاہ صاحب کی
وفات کیوں ہو گئی؟ شاہ صاحب تو بہر حال یہاں سے زیادہ آرام و آسائش میں تشریف لے گئے۔
وہ اب بہترین زندگی میں ہیں۔ من عمل صالحا من ذکر او أنسی و هو مو من فلحیۃ
حیوۃ طیبۃ۔ مال شاہ صاحب کا نہیں ہے سوال تو اپنی حراما نصیبی کا ہے جو چیز کہیں نہیں ملتی تھی جو
مسئلہ تلاش کرنے سے دستیاب نہیں ہوتا تھا جو واقعہ کتب کی ورق گردانی سے میسر نہ ہوتا تھا وہ شاہ

جانب کے حافظہ کے کتب خانہ میں مل جاتا تھا۔

شاہ صاحب کا سیاسی عقیدہ..... دور حاضر کی سیاست کا جہاں تک تعلق ہے اور عہد حاضر میں آزادی وطن اور آزادی ہندوستان کا جہاں تک سوال ہے کون نہیں جانتا کہ اس میں شاہ صاحب کا وہی مسلک تھا جو عام طور پر اپنے اکابر کا مسلک رہا ہے وہ باوجود اس ضعف و ناتوانی کے بھی جیل جانے کے لئے آمادہ تھے۔ انہوں نے لاہور میں ایک دفعہ لائن والی مسجد میں علماء کو خطاب کر کے فرمایا تھا۔ کچھ کر تو یہ وقت بار بار نہیں آتا میں علماء سے کہہ رہا ہوں تم کو تو روٹی دین کے نام پر ملتی ہے دین کے لئے تم بھی کچھ کر لو میں اس قدر ضعیف ہو گیا ہوں کہ اب ضعف کی وجہ سے چلنا پھرنا بھی مشکل ہو گیا ہے لیکن اس ضعف و ناتوانی کے باوجود بھی میں جیل جانے کے لئے تیار ہوں۔

ان الفاظ سے شاہ صاحب کی جرأت و ہمت اور آزادی وطن کے جذبہ کا بہ آسانی حال معلوم ہو سکتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کو جو خط شاہ صاحب نے جیل میں لکھا ہے جب آپ اس کو سنیں گے تو اس امر کا خود اندازہ لگائیں گے کہ حضرت شاہ صاحب (اس زمانہ کی) کانگریس کے کس قدر حامی تھے اور ملک کی موجودہ تحریکات سے مرحوم کو کس قدر دلچسپی تھی۔ اس سنگلاخ اور پتھر ملی باد میں ان کا وہی نظریہ تھا جو ان کے اکابر کا تھا اور بالخصوص جو حضرت شیخ الہند کا تھا۔

نمک کی تحریک..... آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ جب گاندھی جی نے نمک کے قانون کی سول ہڑتانی شروع کی تھی تو لوگوں نے مذاق شروع کر دیا تھا بالخصوص مسلمان تو اس تحریک کا بہت ہی مذاق اڑاتے تھے اور بعض نے تو اس تحریک کا نام، نمکین سول نافرمانی، رکھ دیا تھا۔ مسلم اخبارات جو مکی تحریکات سے علیحدہ تھے انہوں نے اس تحریک پر سو قیانہ بھیتیاں بھی اڑائی تھیں لیکن حضرت شاہ صاحب نے اس زمانہ میں یہ اعلان کیا تھا کہ مذہب اسلام میں نمک مباح الاصل ہے جیسا کہ ہوا پانی اور خورد و گھاس شاہ صاحب کے اس اظہار خیال پر اکثر حضرات بہت کچھ چراغ پا ہوئے تھے اور بعض اصحاب نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ آج جب گاندھی جی نے نمک کے سول نافرمانی شروع کی ہے تو شاہ صاحب کو بھی نمک کی روایت مل گئی حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس قسم کے اعتراضات نہایت لغو اور مبہمل تھے اور یہ اعتراضات وہی لوگ کرتے تھے جو نہ مذہب سے واقفیت رکھتے تھے اور نہ جن کو تہذیب و دیانت سے کوئی حصہ لا ہے۔

شاہ صاحب کا کسی مسئلہ کو ضرورت کے موقع پر یہ بیان فرمانا یا اس کو ظاہر کر دینا یہ قابل تحسین و قابل تسنؤ و تمیہان تھا۔ سلمانوں کو اس پر خوشی اور مسرت کا اظہار کرنا چاہئے تھا۔ آج دنیا کے عقلاء جن چیز کی غوی کو سمجھتے ہیں الحمد للہ مقدس مذہب اسلام میں وہ چیز چودہ سو برس پہلے موجود تھی۔ نمک کے ٹیکس

کی خرابی اور نمک کے ٹیکس کو ظلم بتانے والے اور اس کے خلاف جدوجہد کرنے والے آج پیدا ہوئے لیکن مذہب اسلام کی حق پسندی اور انصاف کو ملاحظہ کیجئے کہ وہ چودہ سو برس پہلے اس عجز کو ناجائز کر چکا ہے۔ یہ موقع فخر و مباہات اور حقانیت اسلام کے اظہار کا تھا یا شاہ صاحب مرحوم پر اعتراض کا لیکن ان لوگوں کا کیا اعلان ہو سکتا ہے جن کی بصیرت اللہ تعالیٰ نے سلب کر لی ہو اور جنہوں نے آنکھیں بند کر کے استعمار و استبداد کی حمایت کو اپنا شعار بنالیا ہو۔ **لہم قلوب لا یفقهون بہا۔**

بہر حال شاہ صاحب کے اس اعلان حق کا یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں کے عام طبقہ کو نمک کی تحریک سے ہمدردی ہو گئی۔ برادران ملت! شاہ صاحب خدا کے فضل و کرم سے اتنی خوبیوں کے مالک تھے کہ ان کی اوصاف و کمالات احصاء و استقصار مجھ جیسے جاہل کے لئے ناممکن ہے۔ شاہ صاحب نے جو کچھ کابرا عن کا بر شاہ ولی اللہ صاحب اور میانجی نور محمد صاحب سے حاصل کیا تھا اس کے بیان کو دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہیں۔ اگر مزید تفصیل معلوم کرنی ہے تو جناب صدر کی تقریر کا انتظار کیجئے۔ میں اپنی تقریر کو اپنے عجز و قصور کے اعلان کے ساتھ ختم کرتا ہوں اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔

اللہم آنس وحشته وآمن روعته ولقن حجتہ و بیض غرته و ارحم
غربتہ قنقبل حسناتہ و کفر سیاتہ انک علی کل شیء قدير و صلی
اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین برحمتک یا
ارحم الراحمین

(مطبوعہ ماہنامہ دارالعلوم جولائی ۱۹۶۶ء)



کمالات انوری

(از حضرت مولینا انوری صاحب لائل پوری)

مولینا محمد صاحب لائل پوری (المعروف محمد انوری) حضرت شیخ الہند کے دست مبارک پر بیعت شدہ مرید اور صحبت یافتہ تھے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے تلمیذ ارشاد رہے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے ساتھ محبت کی وجہ سے ہمیشہ اپنے آپ کو انوری لکھتے تھے۔ موصوف حضرت مولینا شاہ عبدالقادر صاحب لائل پوری کے فیوض و کمالات روحانی سے بھی مستفید ہوئے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ کرام میں انہیں ایک خاص مقام حاصل ہے آپ اہل قلم تھے اور معلوم ہوا ہے کہ پاکستان میں حضرت موصوف نے اپنے استاذ جلیل حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ کی سوانح حیات ”انوار انوری“ بھی مرتب کی تھی۔ جو کہ ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے لیکن احقر کی نظروں سے ابھی وہ نہیں گزری اس کے علاوہ اس کی بعض تالیفات قیمہ میں (۱) السنن والآثار، (۲) جلد ضخیم، اور بعین من احادیث النبی الامین اور سیرت النبی (۳۰۰ صفحات) کافی مشہور ہیں۔

آپ نے مسلمان بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مدرسۃ البنات کے نام سے متعدد مدارس قائم کر کے نہایت عظیم دینی کارنامہ انجام دیا ہے جہاں سے لڑکیوں کی خاصی تعداد ویشی تعلیم سے فیض یاب ہو کر فارغ التحصیل ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ آخر علم و فضل کا یہ آفتاب ۲۲ جنوری ۱۹۷۰ء کو لائل پور میں غروب ہو گیا۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ ایک محتاط اندازہ کے مطابق ایک لاکھ مسلمان ان کی نماز جنازہ میں شامل تھے۔

عنوان بالا کے تحت مولینا مرحوم کے متعدد معلوماتی مضامین سالہا سال سے رسالہ دارالعلوم میں شائع ہوئے ہیں۔ جنہیں اگر یکجا کیا جائے تو حضرت شاہ صاحب کے حالات پر ایک عظیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ بہر حال مشکل سے رسالہ مذکور کے چند شمارے احقر کے ہاتھ آئے تھے، قلت گنجائش کی وجہ سے انہیں من و عن شامل کتاب نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے چند پرچوں کے کچھ منتخب حصے (بقید ماہ و سال) عنوان بالا کے تحت ہدیہ ناظرین ہیں (کوئٹہ)

۱۔ ایک دفعہ بہاولپور میں ابی کی شرح مسلم سے حوالہ نکالنا تھا کتاب ہمارے پاس نہ تھی۔ قادیانی مختار مقدمہ کے پاس یہ کتاب تھی۔ حضرت نے فرمایا حج صاحب لکھتے ان صاحب نے حوالہ دینے میں دھوکہ دیا ہے، یہ کتاب میرے پاس نہیں ہے، اس کو کہو کہ عبارت

پڑھے، جب اس نے عبارت پڑھی تو آپ نے خود کتاب اس سے لے کر حسینا اللہ فرمایا اور فوراً حوالہ نکال لیا، وہ لوگ دیکھتے ہی رہ گئے۔

۲۔ وہیں بھادپور کا واقعہ ہے کہ قادیانی شاہد نے حضرت سے سوال کیا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ ”ہمارا دین متواتر ہے اور تواتر کے اقسام میں سے کسی ایک قسم کا منکر بھی کافر ہے۔“ آپ کو چاہئے کہ امام رازی پر کفر کا فتویٰ دیں کیونکہ فواح الرحوت شرح مسلم الثبوت، میں علامہ بحر العلوم نے لکھا ہے کہ امام رازی نے متواتر معنوی کا انکار کیا ہے۔“

ہمارے پاس اتفاق سے وہ کتاب بھی نہ تھی۔ حضرت شاہ صاحب نے فوراً فرمایا جج صاحب لکھنے میں نے بیس سال ہوئے یہ کتاب دیکھی تھی اب ہمارے پاس یہ کتاب نہیں ہے امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ جو حدیث ہے ”لا تجتمع امتی علی الضلالة“ یہ حدیث تواتر معنوی کے رتبے کو نہیں پہنچی۔ اس حدیث کے متواتر معنوی ہونے کا انکار فرمایا ہے نہ کہ تواتر معنوی کے تحت ہونے کی مکر ہیں، مولینا عبداللطیف صاحب ناظم مظاہر العلوم سہارنپور اور مولینا مرتضیٰ حسن صاحب (جو اس مجلس میں موجود تھے) حیران تھے کہ حضرت کیا جواب دیں گے۔ سن کر حیرت میں رہ گئے۔ ان صاحب نے حوالہ پیش کرنے میں دھوکے سے کام لیا ہے اس کو کہو کہ عبارت پڑھے دوز میں ان سے کتاب لے کر عبارت پڑھتا ہوں، چنانچہ قادیانی شاہد نے عبارت پڑھی، بعینہ وہی عبارت نکلی جو حضرت نے پہلے حفظ پڑھ کر سنائی تھی جج صاحب خوشی سے اچھل پڑا۔ حضرت مولینا غلام محمد صاحب دین پوری بھی اس مجمع میں تھے حضرت موصوف کا چہرہ مبارک مسرت سے کل گیا۔ (یہ حضرت، حضرت مولینا عبید اللہ صاحب کے مربی تھے اور مولینا احمد علی صاحب لاہوری مرحوم کے بھی پیر تھے، اولیاء اللہ میں سے تھے)۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ جج صاحب یہ صاحب ہمیں ٹھم (لا جواب) کرنا چاہتے ہیں۔ میں چونکہ طالب علم ہوں، میں نے دو چار کتابیں دیکھ رکھی ہیں، میں ان شاء اللہ ان سے ٹھم نہ ہوں گا۔

۳۔ حضرت مولینا محمد علی صاحب مونگیری نے ایک اجتماع کیا تھا وہاں حضرت مولینا شیخ الہند، حضرت مولینا خلیل احمد صاحب سہارنپوری اور اکابر دیوبند سہارنپور مدعو تھے۔ ہزاروں ہزار علماء مجتمع تھے۔

قادیانیوں نے کہا کہ ہر دو مناظرین عربی زبان میں تقریر کریں گے۔ حضرت شاہ صاحب بھی مدعو تھے۔ حضرات نے حضرت شاہ صاحب کو تیار کر دیا حضرت (شاہ صاحب) نے فرمایا کہ دونوں مناظرین عربی اشعار میں اپنا مافی الضمیر ظاہر کریں گے، اور فی البدیہہ بولنا ہوگا اور کوئی کاغذ کوئی

کتاب اپنے پاس نہ رکھیں گے وہ لوگ تیار نہ ہوئے۔

یہ قصہ حضرت راجپوری گولاہور میں مولینا ابراہیم صاحب میاں چنوں والوں نے بھی سنایا تھا۔
مولینا ابراہیم صاحب اس وقت بہاولپور میں مدرس تھے۔ مولینا فرماتے تھے کہ حضرت مفتی عزیز الرحمن اور حضرت شاہ صاحب نے خود بھی درس ترمذی میں ہمیں سنایا تھا۔ پھر فرمایا۔
”جاہلین تم نے کیا سمجھا؟ میں ان شاء اللہ اس پر قادر ہوں۔“

مولینا ابراہیم صاحب نے یہ بھی سنایا تھا کہ پھر حضرت شاہ صاحب نے عربی زبان میں تقریر فرمائی۔
۴۔ ایک دفعہ کشمیر تشریف لے جا رہے تھے بس کے انتظار میں سیالکوٹ کے اڈے پر تشریف فرما تھے۔ ایک پادری آیا اور کہنے لگا کہ آپ کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے بڑے عالم دین ہیں۔ فرمایا نہیں میں ایک طالب علم ہوں۔ اس نے کہا کہ اسلام کے متعلق آپ کو علم ہے؟ فرمایا کچھ کچھ پھر ان کے صلیب کے متعلق فرمایا کہ تم غلط سمجھے ہو اس کی یہ شکل نہیں ہے پھر نبی کریم کی نبوت پر چالیس دلائل دئے۔ دس قرآن سے دس تورات سے، دس انجیل سے، دس عقلی۔ وہ پادری آپ کی تقریر سن کر کہنے لگا۔ اگر مجھے تنخواہ کالاج نہ ہوتا تو میں آپ کی تقریر، آپکا علوم میں اس قدر استحضار دیکھ کر مسلمان ہو جاتا نیز یہ کہ مجھے بہت سی باتیں اپنے مذہب کے متعلق آپ سے معلوم ہوئیں حضرت شاہ صاحب نے فرمایا، جب آپ کو حق معلوم کر کے بھی توفیق نہ ہوئی کہ ایمان لے آتے تو معلوم ہوا کہ ایمان کی کوئی قدر و قیمت آپ کے ہاں نہیں۔ محض تنخواہ کالاج ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ پادری نہایت شرمندہ ہو کر چلا گیا۔

۵۔ مولینا عبدالعزیز محدث گوجرانوالہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولینا عبید اللہ سندھی نے فرمایا تھا کہ اس قسم پر کوئی کفارہ نہیں جو اس امر پر کھائی جائے کہ مولینا انور شاہ صاحب اس زمانہ میں بے نظیر عالم ہیں۔ مولینا غلام رسول انی والے استاد رحمہ اللہ نے پہلی بار جب قادیان میں (مسئلہ ختم نبوت پر) حضرت شاہ صاحب کی تقریر سنی تو فرمایا کہ ”علم ہو تو انور شاہ والا ہو ورنہ ہمارے علم سے تو جاہل ہی اچھے، مولینا ابراہیم میر صاحب سیالکوٹی نے اس وقت فرمایا تھا یعنی قادیان ہی میں کہ۔

مجسم علم دیکھنا ہو تو شاہ صاحب کو دیکھ لو

حضرت مولینا حسین احمد صاحب مدنی نے حضرت شاہ صاحب کی وفات پر دیوبند میں تعزیتی جلسے میں فرمایا تھا کہ میں ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو ایک لاکھ حدیثیں یاد ہیں۔ ایسے

حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو تحسین حفظ یاد ہیں لیکن ایسا عالم دین کہ کتب خانہ کا کتب خانہ میں سینہ میں محفوظ ہو، سوائے حضرت مولانا نور شاہ صاحب کے کوئی نہیں دیکھا۔

۶۔ مولانا ظفر علی خان مرحوم کہا کرتے تھے کہ جی چاہتا ہے کہ شاہ صاحب کے چہرے کو دیکھتا رہوں۔ اگست ۱۹۲۲ میں زمیندار کے ایک شمارے میں ایک طویل مقالہ حضرت شاہ صاحب کے مناقب و کمالات پر لکھا لکھتے ہیں کہ حضرت مولانا نور شاہ صاحب مدظلہ کی فطری علوم میں خصوصاً علم حدیث میں پیش کرنے سے تمام ایشیا عاجز ہے۔ (ملفوظات مختصراً) رسالہ دارالعلوم دیوبند ج ۷ شمارہ ۴ جولائی ۱۹۶۳ء

۷۔ حضرت اقدس شاہ صاحب قدس سرہ کا وعظ سادہ ہوتا تھا چھوٹے چھوٹے جملے جو پوری طرح ذہن نشین ہو جائیں ارشاد فرماتے تھے۔

لہذا نہ میں ایک دفعہ وعظ فرمایا غالباً ۳۳۳۳ تھا۔ فرمایا تمام عالم کی روح ذکر اللہ ہے جب تک اللہ تعالیٰ کی یاد قائم رہی گی۔ عالم قائم رہے گا جب دنیا اللہ تعالیٰ کی یاد چھوڑ دے گی تو سمجھو کہ عالم کے کوچ کا وقت آ گیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا لا تقوم الساعة حتی یقال فی الارض اللہ اللہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک ایک شخص بھی اللہ اللہ کرنے والا رہ جائے گا۔ جب ایک بھی اللہ اللہ کر نیوالا نہ رہے گا۔ تو قیامت قائم ہو جائے گی، کیونکہ جب روح نہ رہی تو روحانی کام کا نہیں۔ اسے گرا دیا جائے گا۔

معلوم ہوا کہ سارے عالم کی روح اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ مقصود اصلی ذکر الہی ہے اور یہ نماز روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ احکام سب اس کے پیرائے ہیں بخاری شریف میں حدیث ہے کہ جب بندہ ایک دفعہ اخلاص سے سبحان اللہ کہتا ہے تو آدھا پلہ آخرت کی ترازو کا بھر جاتا ہے، آخرت کی ترازو اتنی بڑی ہے کہ جتنا کہ زمین اور آسمان کا درمیانی حصہ نظر آتا ہے۔ اور جب بندہ الحمد للہ کہتا ہے صدقاً من قلبہ تو نصف پلہ باقی بھر جاتا ہے۔ سبحان اللہ نصف الایمان والحمد للہ تمام المیزان اور جب کہتا ہے۔ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر تو اس کی سمائی زمین و آسمان میں نہیں ہوتی چیر کر عرش کو نکل جاتا ہے اور ترمذی شریف میں یہ بھی آیا ہے کہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم جنت کے خزانوں میں سے ایک قیمتی خزانہ ہے۔ اس کا ثواب آخرت میں کھلے گا۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کو اس حدیث پر ختم فرمایا ہے۔

کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان حیبتان الی

الرحمن سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم

دو کلمے جو زبان پر خفیف ہیں، آسانی سے ادا ہو جاتے ہیں آخرت کی ترازو میں بڑے وزنی ہیں۔ (حضرت) رحمٰن کو بہت محبوب ہیں (وہ یہ ہیں) سبحان الله وبحمده وسبحان الله العظيم خیال فرمائیں کہ جو مختصر ان کا ورد ہر وقت رکھتا ہے کس قدر ثواب اس کو ملے گا۔ (ملفوظات مختصر) دارالعلوم جلد ۲۸ شمارہ ۲ نومبر ۱۹۶۳ء

۸۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: یہ جو حدیث شریف میں آیا ہے انما اراکم من وراء ظہری یہ دیکھنا بطور معجزہ تھا ایسا ہی ثابت ہے امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ سے اور فلسفہ جدیدہ نے ثابت کر دیا کہ قوت باصرہ تمام اعضاء بدن میں ہے۔

۹۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: جتنا استفادہ مجھ سے ڈاکٹر اقبالؒ نے کیا ہے کسی مولوی نے نہیں کیا ڈاکٹر صاحب علوم قرآن و حدیث پر کافی دسترس رکھتے تھے اور انہوں نے مولینا میر حسن صاحب سیالکوٹی مرحوم سے باقاعدہ پڑھا تھا۔

(ملفوظات مختصر) دارالعلوم اپریل ۱۹۶۵ء

۱۰۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ امام بخشؒ نے ایک صاحب کو تعزیت نامہ لکھ کر بھیجا ہے۔

انا نعزیک لانا علی ثقة

فلا المعزی بباق بعدمیتہ

ولا المعزی وان عاش الی حین

ترجمہ: ہم آپ کو صبر کی تلقین کرتے ہیں اور ہماری زندگی کا کچھ اعتبار نہیں لیکن یہ سنت ہے

دین کی، پس نہ تو معزی باقی رہیا اپنی میت کے بعد نہ تعزیت کرنے والا۔ اگرچہ ایک

زمانے تک جیتے رہیں (آخر سب کو موت ہے)

۱۱۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ حافظ ابو زرعہ رازی نے فرمایا کہ جرجان میں آگ لگنے

سے ہزار ہا گھر جل گئے اور قرآن بھی جلے لیکن یہ آیات نہ جلیں:

ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ وَلَا تَحْسَبَنَّ

اللَّهُ عَافِيًا لِّعَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصَوْهَا

وَقَسْفِي رَبِّكَ إِنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ. تَنْزِيلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ

وَالسَّمَوَاتِ الْعُلَى. الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ

۵۔ اذکار میں امام محی الدین نے ان اشعار کو امام شافعی کی طرف منسوب کیا ہے کہ اصل اشعار امام اعمش کے ہوں امام شافعی نے کسی جگہ ان کا استعمال کیا ہو جس سے مغالطہ ہو گیا ہو۔ واللہ اعلم۔ (کوئٹہ)

وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرَىٰ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ
 مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ. اَلَيْسَ طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ. وَمَا
 خَلَقَ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَهُ. مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ
 يُطْعَمُوا. اللَّهُ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ. وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا
 تَوَعَّدُونَ. قُلْ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ إِنَّهُ الْحَقُّ مِثْلَ مَا أَنْتُمْ تَنْطَلِقُونَ.

فرمایا یہ تجربہ ہے کہ آیات مذکورہ لکھ کر کسی برتن میں بند کر کے دکان یا گھر میں رکھنا حفاظت کے لئے
 محرب ہے۔

فرمایا کہ ایک آدمی یا کئی آدمی مل کر ہر سورت کی آخری آیت پڑھ کر پانی پر دم کرے تو اس کا
 مرض کے لئے مفید ہے یہ ایک سوچودہ دم ہو گئے۔

۱۳۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ: ”علم نحو عراق میں مدون ہوا لیکن اس کی ابتداء حضرت علی
 سے ہوئی آپ نے ایک آدمی کو سنا کہ یہ آیت ”إِنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ“
 میں ”رَسُولُهُ“ کو کسرہ سے پڑھ رہا تھا تو آپ کو فکر ہوئی کہ امت کو ان مہالک سے کس طرح بچایا
 جائے تو آپ نے ابو سود دلی کو فرمایا کہ ایک ایسا اصول بتاؤ کہ خطاء لفظی سے لوگ محفوظ رہیں
 پھر خود آپ نے ان کو ایک اصول بتایا فاعل مرفوع وکل مفعول منصوب وکل مضاف الیہ مجرور
 پھر انسح نحوہ پھر اسود دلی نے اس کی تدوین افعال تعجب سے شروع کی آپ نے تصویب
 فرمائی پھر حروف مشبہ بالفعل لکھے مگر لکھن کو چھوڑ گئے حضرت کے فرمانے پر اس کو بھی لکھا۔

(ملفوظات مختصراً) دارالعلوم دیوبند جلد ۲۹ شماره ۲۴ ماہ مئی

نسخہ کمال

آن بکون مغفوراً ماعلم مشاء معذراً غیر مستغفر و تتم بالتبص

حرفات ہر نذر و صبح ہند سر شو جوانی خود او با با اجداد تشریف و قیف لعل کرم
 صبا مسعودہ صفت در غیوریت فقیہ لڑخیز لکھ کر در میدان جود و غیور سر نو و

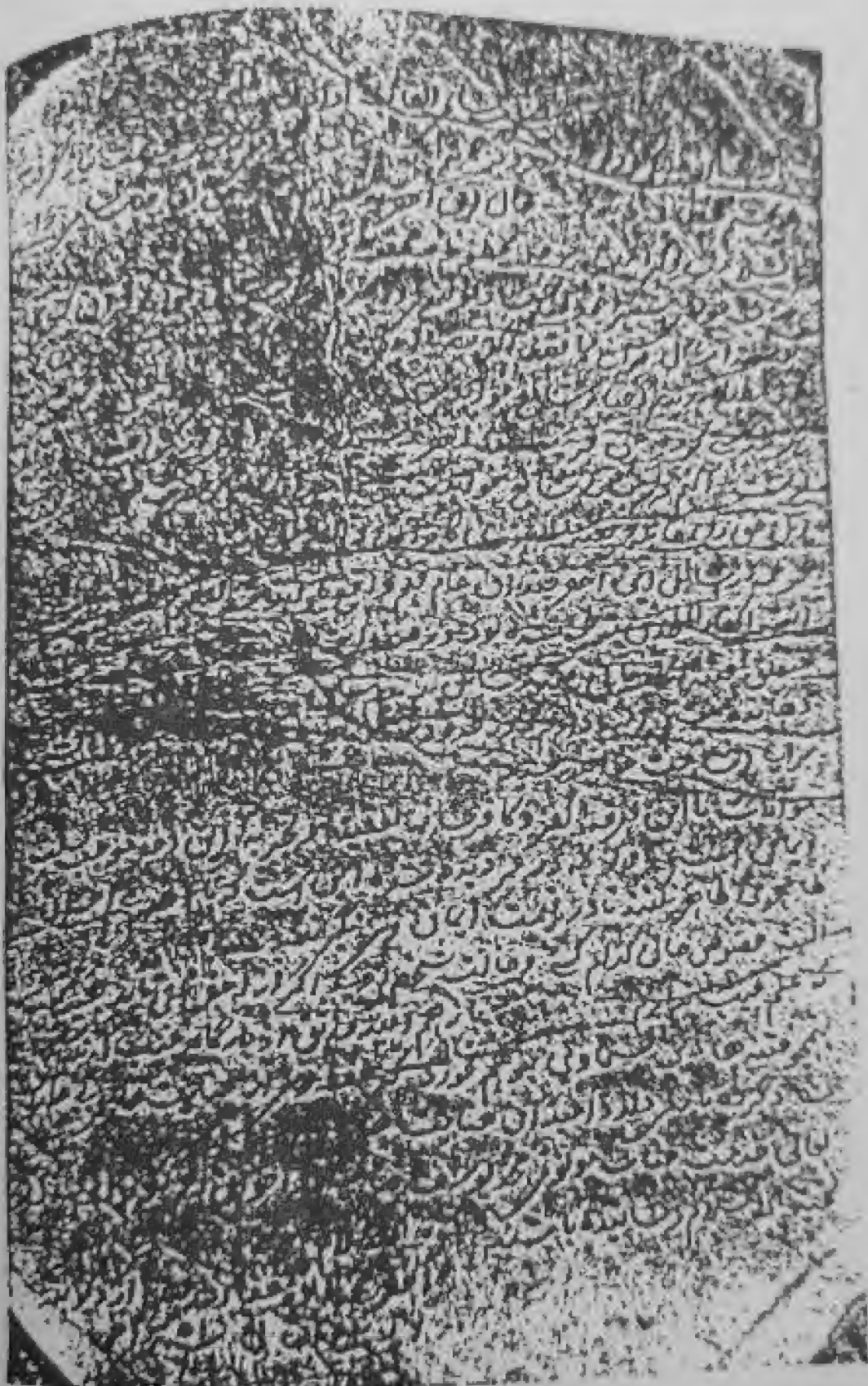
نماز دست و قضا لعل شمشیر بدوق بنای عمر و قضا
 قاب لعل شمشیر

نظم محمد زین العابدین

شرائط صحیحہ فی الواجب العقل و اللب و اللذ و لی

شاید در مسجرات مالی تمام امور خویش بآل صحت و ثبات تو اسر
 سبب زور و جود و تو جو و سر قضا کرد و آتون و آتون مسماہ مذکور و
 نیز عاود تو کشتن جسی و در شایست مالی را با ملک مذکور و جملہ نقد

حضرت علامہ کشمیری کا یہ فتویٰ در بارہ جہ سے کہ واجب غافل و بالغ ہو اور جہ میں قضا کیا جائے۔
 (بکھر یہ سوال تا ملحق خام حسن۔ متفق سو پور)



سرینگر کے مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد حسین وفائی کے ایک تاریخ خط کا جواب
 (چشمگیری مولوی عبدالرحمن صاحب وفائی استاذ جامعہ مدنیہ العلوم حضرت بل)

علامہ محمد انور شاہ

اور

فتنہ قادیانیت

از فاضل گرامی مولانا بدر الحسن در بھنگوی مدبر الداعی و پابند

شیخ الاشراق شہاب الدین مقتول ۵۸ھ نے اپنی مایہ ناز تصنیف حکمت الاشراق کے اندر ایک جگہ لکھا ہے کہ "العلم ليس وفقا على قوم" یعنی علم و فن پر کسی خاص عہد کے لوگوں کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ یہ ممکن ہے کہ زمانہ کے لحاظ سے بعد میں آنے والا شخص علمی قابلیت اور فنی لیاقت و صلاحیت میں بہت سے پیش روؤں پر بھی سبقت لے جائے۔

قریب قریب یہی بات مولینا محمد قاسم نانوتوی متوفی ۱۲۹ھ نے بھی اپنے ایک فارسی مکتوب میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کے علمی تجر اور دقت نظر کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرمائی ہے مولینا کے بعینہ الفاظ یہ ہیں۔

"تقدم و تاخر زمان را اور اعتبار علم و عدم آں دخل نیست اگر مارا پر سند مارا اورین قدر برگزاتل نیست کہ شاہ صاحب قدس اللہ اسرارہ در فہم دقایق از اکثر پیشیناں گونے سہقت بردہ اند"

(قاسم العلوم مکتوب سوم ۴۴)

اور غالباً یہی مفہوم اس روایت کا بھی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ نہ معلوم میری امت کا اول بہتر ہے یا آخر! او کما قال شاعرانہ حشیت سے ابوالعلا معری نے بھی اس مفہوم کو خوب ادا کیا ہے۔

انی وانت کنت الاخیر زمانہ

لان بمالم تستطعہ الاوائل

حقیرین کے فضل و تقدیم کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے اور تاریخی واقعات اور اہل اس کی تائید کرتے ہیں کہ بعد کے زمانوں میں بھی وقفہ وقفہ سے بعض بڑی ہی فقید المثل اور نامور روزگار شخصیتیں ابھری ہیں جن کے بارے میں بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے علوم

دفن کی جامعیت، وقت نظر اور غیر معمولی تجربہ و استخراج کے لحاظ سے اپنے بہت سے پیشروں پر بھی پیچھے چھوڑ دیا۔

قریب کے زمانہ میں اس کی عمدہ مثال علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی ذات ہے جن کے پاس میں ان کے جلیل القدر معاصر اور اپنے عہدے کے نامور محدث علامہ زاہد بن الحسن الکوثریؒ کی شہادت یہ ہے کہ:

”علامہ ابن الہمام (متوفی ۸۶۱ھ) کے بعد انور شاہ صاحب کے پایہ کا کوئی دوسرا شخص پیدا نہیں ہوا جو متن احادیث سے نئے نئے مباحث و نکات کے استنباط و استخراج کی اہلیت رکھتا ہو اور یہ وقفہ (شاہ صاحب اور ابن ہمام کے درمیان) کوئی معمولی وقفہ نہیں ہے۔ (مقدمہ التصريح نما تواتر فی نزول اسح از شیخ عبدالفتاح ابو نعیمہ ۲۶)

محقق عصر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جنہیں شاہ صاحب کی صحبت و رفاقت حاصل تھی ان کی بلند پایہ کتاب فتح الملہم میں علامہ انور شاہ صاحب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں

لم تر العیون مثله ولم یروہو مثل نفسه (فتح الملہم ۳۳۵)

۱۔ اس جملہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں چند ہی خوش نصیب اور یگانہ دکان کے مرتب ہیں جنہیں ان کے بلند پایہ معاصرین نے اس کا مصداق قرار دیا ہے سب سے پہلے نام اس سلسلہ میں مشہور عارف کھت شیخ ابوالقاسم کشمیریؒ متوفی ۱۲۶۱ھ کا ملتا ہے جن کا رسالہ تشریف فی تصوف کی اہم ترین کتابوں میں شمار ہوتا ہے ان کے عہد میں اگرچہ علم و فضل کی کمی نہیں تھی لیکن ظاہر و باطن کی جامعیت اور وقت نظر میں شیخ ابوالقاسم اپنی نظیر آپ تھے۔

(۲) تشریف کے بعد اس کا مصداق جتہ الاسلام امام غزالیؒ متوفی ۵۰۵ھ کو قرار دیا گیا اور بلاشبہ امام غزالیؒ اس کے صحیح مصداق ہے انھوں نے فی الواقع ان کی نظیر نہیں دیکھی شریعت و طریقت دونوں کی جامعیت کے ساتھ عقلی علوم میں تجربے، عمل و بہت ذہانت و مشکلات جن کو نہایت سلیس اور مختلفہ اسلوب میں حل کرنے کی اہلیت یہ تمام اوصاف انہیں بیک وقت جمع تھے

(۳) امام غزالیؒ کے بعد مشہور فقیہ و محدث ابن قدامہ حنبلیؒ متوفی ۶۸۲ھ جن کی المعنی نقد کی بلند پایہ کتاب مافی جاتی ہے ان کے بارے میں ان کے معاصرین حاجب مالکیؒ نے کہا تھا لم تر العیون مثله ولم یروہو مثل نفسه اور یہ حقیقت ہے کہ وہ فقہی کے علاوہ ابن قدامہؒ کو فقہاء کے مذاہب پر بڑا عبور حاصل تھا اور یقیناً وہ اپنے زمانہ کے عظیم المظہر محقق اور مسلم نام تھے۔

(۴) ابن قدامہ حنبلیؒ کے بعد اس خصلہ کا استعمال امام اتقی الدین بن دقین العید متوفی ۷۰۳ھ کے بارے میں ابن سیدناں ہمیریؒ نے کیا تھا کہ لم تر العیون مثله۔ اور بلاشبہ غلط و ناقصان وقت نظر نگاہی اور استنباط فوائد و لطائف میں ابن دقینؒ کی نظیر نہیں ملتی حضرت شاہ عبدالمعز صاحب محدث دہلویؒ نے اپنی محققانہ تصنیف بیستان المحدثین کے ائمہ ان کے بارے میں لکھا ہے عہد سچا کے بعد سے ساتویں صدی ہجری تک متبن حدیث سے دقائق و اسرار اور لطائف و نکات کے استنباط و استخراج میں امام ابن دقینؒ العید کا مثیل پیدا نہیں ہوا۔ انہوں نے حضرت براء بن عازبؓ کی صرف ایک روایت سے چار سو فوائد مستنبط کیے تھے ان کی کتاب احکام الاحکام اور امام شریح الاسلام اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں علم و فضل کے ساتھ ساتھ ان دقین العیدؒ کو بدقتوی اور کرامات و خوارق سے بھی نوازہ تھا وہ بلاشبہ فقید المثال انسان تھے۔ (بقیہ حاشیہ کے مندرجہ بالا صفحہ ۳۱۷)

یہ تو دنیا کی آنکھوں نے ان کی نظیر دیکھی اور نہ خود آپ نے اپنے کسی ثانی اور مماثل کو دیکھا۔ علامہ انور شاہ صاحبؒ کے علمی کارناموں کا دائرہ تو بے حد وسیع اور ان کی افادیت بڑی ہمہ گیر تھی لیکن خصوصیت کے ساتھ ان کا وہ کارنامہ جو انہوں نے اصولی حیثیت سے دین کے بقا و تحفظ کے لئے انجام دیا ہے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

انہیں اپنی زندگی کے آخری ایام میں دو چیزوں کا زبردست احساس تھا جن میں سے ایک تو الحاد و ہریت کا زور ہے دوسرے مرزا غلام احمد قادیانی کی خود ساختہ نبوت کا فتنہ ان دو باتوں کے احساس نے ان کو کافی فکر مند کر رکھا تھا۔

اول الذکر فتنہ کے استیصال کے لئے ان کے بیشتر اور مدوح امام وقت مولینا محمد قاسم نانوتویؒ نے ۱۲۹ھ نے اپنی تالیفات کے اندر گرانقدر مواد فراہم کر دیا تھا۔ پھر بعض وجوہ سے ان دنوں قادیانیت کے فتنے نے زیادہ زور اختیار کر لیا تھا جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے انتہائی خطرناک چیلنج تھا اس لئے علامہ نے زیادہ توجہ اس کے استیصال اور امت کو اس کی تباہ کاری سے محفوظ رکھنے کی طرف مبذول رکھی۔

تاہم الحاد و ہریت کے سد باب کے لئے بھی آپ کے دور رسالے یادگار ہیں۔ ایک تو ضرب الحاق جو حدوث عالم اور اثبات وجود باری پر آپ کی بے مثال نظم ہے جو چار سوا شععار پر مشتمل ہے اس نظم کی فنی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر اقبالؒ جیسا فلسفہ کا مبصر بھی اس نظم پر وجد کیا کرتا تھا۔

اس نظم کے استناد کے لئے جہاں آپ نے صدر الدین شیرازی کی اسفار اربعہ اور فرید وجدی اور ہستانی کی دائرہ المعارف کے بکثرت حوالے دیئے ہیں وہیں امام وقت مولینا محمد قاسم نانوتویؒ کی تقریر واپدیر اور مکاتیب قاسم العلوم میں سے ساتویں مکتوب کو بھی خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

(یہ حوالہ گزشتہ صفحے کے) (۵) ابن دقیق العید کے بعد اس جملہ کا استعمال امام ابن تیمیہؒ نے ۷۲۸ھ کے لئے ہوا اور اس میں شک نہیں کہ ابن تیمیہؒ بھی بطور پر اس کے اہل تھے۔

روایت اور دلائل دونوں سے کامل مناسبت جملہ فنون کا غیر معمولی استحضار سلف و خلف کے مسلک پر بحیر العقول و دسترس کے ساتھ بے پناہ جرأت و محبت اور شجاعت و بہادری کے اندر دنیا نے ان کی نظیر نہیں دیکھی۔ البتہ اپنے بعض نظریات پر وحی آسمانی کی طرح ان کے یقین و اعتماد نے بعض جلیل القدر معاصرین اور بعد کے علماء کو ان پر زبان طعن و دراز کرنے کا موقع دیا۔ کسی نے یہ کہا ہے کہ ان کا علم ان کی عقل سے بھی بڑھ گیا تھا۔

(۶) امام ابن تیمیہؒ کے بعد حافظ شمس الدین ذہبی نے جو فقہ میں اہم شافعی کے شیع اور عقیدہ تائید ہیں اپنے شیخ اور اشام کے نامور محدث حافظ ابو الجراح حزی شافعی متوفی ۷۴۲ھ کے بارے میں فرمایا تھا کہ لم تر المعین مثلاً اور ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمانا صحیح تھا اس لئے کہ حافظ حزی فن حدیث میں بے مثال تھے (فیہ المعبر من حدیث الشیخ الانور ۱۹۹-۱۹۳)۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کتاب "مرقاۃ الطائر" ہے۔ یہ بھی حدوث عالم ہی کے موضوع پر ہے۔ اس کا ذکر پہلے ایک نوٹ میں آچکا ہے۔

قادیانیت کے فتنہ کے سلسلہ میں آپ نے اپنے کمال بصیرت سے یہ اندازہ فرمایا تھا کہ اس کی فتنہ سامانی اور شرانگیزی دنیا کے تمام فتنوں سے بڑھ کر ہے چنانچہ اس کو مٹانے کے لئے پورے طور پر سرگرم ہو گئے اپنے اجلہ اصحاب اور علامہ کو بھی اس کام کے لئے آمادہ کیا اور خود بھی تمام مرگ اس مبارک کام میں مصروف رہے۔

آپ کے علامہ میں سے جن لوگوں نے آپ کے اس مشن کو کامیاب بنانے کی سعی کی ان میں مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی اور مولانا محمد یوسف بنوری خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

علامہ محمد انور شاہ صاحب کو اس فتنہ کی خطرناکی کا احساس کتنا شدید تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ خود اپنے بیان کے مطابق مسلسل چھ مہینے تک وہ اس کی وجہ سے انتہائی کرب اور قلبی اذیت میں مبتلا رہے حتیٰ کی خینک اچاٹ ہو گئی تھی جس کا صحت پر بھی ناخوشگوار اثر مرتب ہونے لگا تھا ۵

اس شدت احساس ہی کا اثر تھا کہ تصنیف و تالیف کی طرف طبعی میلان نہ ہونے کے باوجود آپ نے قادیانیت پر متعدد تالیفات کیں اور آئندہ کام کرنے والوں کے لئے انتہائی بیش قیمت علمی مواد فراہم کر دیا حتیٰ کہ بستر مرگ پر بھی آپ کو اسی کا خیال دامن گیر رہا۔ چنانچہ آپ کی سب سے آخری تصنیف جو خاتم النبیین کے نام سے موسوم ہے وہ عین مرض الموت کی یادگار ہے اس کی تمحیض بھی نہیں ہوئی تھی کہ پیغام اجل آپہنچا۔

درس حدیث میں بھی موقع بہ موقع مرزا غلام احمد قادیانی کے استدالات کی کمزوری اور اس کی محرقانہ سرگرمیوں پر متنبہ فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ فیض الباری کے ج ۳، ص ۷۳، ج ۲، ص ۳۸۰، ۳۸۹ وغیرہ اس کے شاہد ہیں۔

آپ کے اس مجاہدانہ کارنامہ میں درحقیقت وہی روح کارفرما تھی جو ولی اللہی مکتب فکر کے اساطین و اعیان کا طرہ امتیاز ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کے عہد میں شیعیت کا فتنہ زوروں پر تھا۔ جس سے دین کا بڑا حصہ متاثر ہو رہا تھا اس لئے حضرت شاہ ولی اللہ نے جہاں نئے دور کے تغیرات کا اندازہ کر کے پورے دینی نظام کی حکیمانہ تشریح و ترجمانی فرمائی وہیں دونوں بزرگوں نے شیعیت کا زور توڑنے کے

لئے بھی بھرپور سعی کی جس کا اندازہ از قرائن الفاہ اور فقہ اشاعریہ جیسی محققانہ کتابوں سے ہوتا ہے۔
حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے عہد میں شرک و بدعت کا زور تھا اس لئے جہاں انہوں نے سید احمد
شہید کی قیادت و رفاقت میں دین کو سر بلند کرنے کے لئے اپنی جان تک قربان کر دی وہیں مسلمانوں
کی زندگی سے شرک و بدعت کے مہلک جراثیم دور کرنے کے لئے بھی انتہائی جدوجہد فرمائی اور
ایضاح الحق الصریح اور تقویۃ الایمان جیسی محققانہ اور اثر انگیز کتابیں تحریر فرمائیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے عہد میں ایک طرف تو کفر و الحاد کا زور اور جدید عہد کے
تھمے تھے اور دوسری طرف عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کی مشترکہ پورش نے ہندوستان میں اسلام
اور مسلمانوں کے لئے انتہائی سنگین اور نازک صورت حال پیدا کر دی تھی۔

اس لئے انہوں نے ایک طرف تو حقائق و معارف کے پیش بہا اصول مدون کئے اور علم کلام کی
بنیاد ایسے اصولوں پر رکھی جو علامہ شبیر احمد عثمانی کے بقول ناقیامت کا راہدہ رہیں گے۔
دوسری طرف عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کا جم کر مقابلہ کیا اور علی حثیت سے ان کے سارے
استدلالات کی کمزوری واضح کر دی ۱۔

علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ کے زمانے میں قادیانیت کا فتنہ اسلام کے لئے سب سے بڑا چیلنج
اور فحش کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے دین مجید کے خلاف ایک منظم بغاوت تھی اس لئے انہوں نے
اس فتنہ کا بھرپور مقابلہ کیا اور اس موضوع پر ایسی فاضلانہ اور تحقیقی کتابیں تصنیف فرمائیں جو ان کی
علمی عظمت اور غیر معمولی عبقریت کا لازوال شاہکار ہیں۔ بقول مولانا محمد یوسف بنوری، اگر علامہ
نے اور کوئی کام اپنی زندگی میں انجام نہ دیا ہوتا صرف رد قادیانیت پر آپ نے جو کام کیا ہے وہی
ایک مل آپ کے نامہ اعمال میں ہوتا تو آپ کو زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی تھا ۲۔

جیسا کہ عرض کیا گیا علامہ انور شاہ صاحبؒ کو اس فتنہ کی سامانی کا احساس بڑا شدید تھا اس لئے
آپ کی اس سلسلہ کی تمام تحریروں سے خواہ وہ انظم میں ہوں یا نثر میں ایمانی غیرت و حمیت اور جوش
خروش کا اندازہ ہوتا ہے۔

مستقل طور پر اس موضوع پر آپ کی پانچ کتابیں یادگار ہیں:

۱۔ ”التصريح بما تواتر في نزول المسيح“ یہ اپنے موضوع پر سب
سے جامع ترین کتاب ہے اس کے اندر آپ نے نزول مسیح سے متعلق احادیث و آثار جمع کئے ہیں
اس کی جامعیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ قاضی شوکانی جیسے وسیع النظر محدث نے جب

اس موضوع پر قلم اٹھایا تو انہیں کل ۲۹ حدیثیں مل سکیں جبکہ علامہ انور شاہ صاحب نے ستر نہایت ہی واضح اور صریح روایتیں جمع کر دی ہیں۔

کتاب پہلے مفتی محمد شفیع صاحب کے مقدمہ کے ساتھ ہندوستان میں چھپ چکی تھی۔ اب عالم اسلام کے نامور محقق شیخ ابو الفتح ابوغدہ کی تعلیقات کے ساتھ دوبارہ بڑے آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ ابوغدہ کی تعلیمات نے کتاب کی افادیت دو چند کر دی ہے۔ (۲)۔ "اکفار الملحدين" یہ اس سلسلے کی دوسری اہم اور محققانہ تصنیف ہے تکفیر کا مسئلہ اور ہی نازک اور دقیق ہے اس طرح کے پیچیدہ مسئلے کے بارے میں مبصرانہ اور فیصلہ کن رائے دینا انور شاہ جیسے عبقری وقت ہی کا حصہ تھا۔ آپ نے پوری تحقیق و تدقیق کے ساتھ یہ حقیقت واضح کر دی کہ کسی شخص کو دین سے خارج کب متصور کیا جاسکتا ہے اور اس کے لئے اصول و ضوابط کیا ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کسی مسلمان کی تکفیر ایک سنگین جرم ہے اسی طرح کسی ایسے شخص کو جو دین کی بیخ کنی پر آمادہ ہو اور ضروریات دین کو بھی بے چوں و چرا تسلیم نہ کرتا ہو بلکہ شریعت کے واضح احکام ہدایت کو اپنی تحریف و تاویل کا نشانہ بناتا ہو تو اسے بدستور مسلمانوں کے زمرہ میں شامل سمجھنا اور اس کی تکفیر کے سلسلہ میں ایسی احتیاط برتنا جس سے دین کی بنیاد مہندم کرنے والوں کو اپنی سرگرمیاں تیز کرنے کا اور موقع نئے بدترین قسم کی مداخلت ہے، شریعت کی رو سے اس کا جواز ہرگز نہیں ہے۔ علامہ محمد انور شاہ نے مسئلہ کے ہر پہلو پر قرآن و حدیث کی روشنی میں انتہائی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور تمام سربراہ اور مفسرین و محدثین اور فقہاء و متکلمین کی شہادتیں اس سلسلہ میں جمع کر دی ہیں اور محققین کی کتابوں کے بعض ایسے ابواب سے مواد اکٹھا کر دیا ہے جہاں عام طور پر دوسروں کا ذہن مشغول بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

ان سے پہلے امام غزالی جیسے یگانہ روزگار اور امت کے بعض دوسرے اساطین نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔ "فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة" امام غزالی کی مشہور کتاب ہے خود علامہ انور شاہ صاحب نے بھی اس کا جوہری خلاصہ اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے۔ لیکن دونوں کتابوں کے تقابلی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے "اکفار الملحدين" کے مصنف کی ذہنی پرواز کتنی بلند ہے بعد میں آنے والوں کے اس طرح کے تاثر و مفاخر جب سامنے آتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ کم ترک الاول للآخر فجزا اللہ عن المسلمین خیر الجزاء۔

(۳)۔ "عقیدہ الاسلام" اس کتاب کا اصل موضوع خود علامہ کی صراحت کے مطابق حضرت عیسیٰ کی حیاء اور ان کے دوبارہ نزول کے بارے میں قرآن حکیم کے بیان کردہ

دلائل کو جمع کرنا ہے۔ لیکن ضمن طور پر اس کتاب میں اتنے اہم اور گراں قدر مسائل زیر بحث آتے ہیں کہ جن کا احصاء بھی مشکل ہے۔

(۴)۔ ”تحیۃ الاسلام“ یہ سابق الذکر کتاب پر خود علامہ کے قلم سے انتہائی بصیرت افروز اور محققانہ حاشیہ ہے اس لئے ان دونوں کتابوں کو ایک بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔

علامہ نے یہ کتاب کس تحقیق و تدقیق کے ساتھ تصنیف فرمائی ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ عقیدۃ الاسلام اور تحیۃ الاسلام میں بلا واسطہ جن کتابوں کا حوالہ مذکور ہے ان کی تعداد تین سو تک پہنچتی ہے جن میں تفسیر و حدیث فقہ و اصول تصوف و حقائق لغت و نحو معانی و بیان و تاریخ و سیر فلسفہ حتیٰ کہ عہد نامہ جدید و عتیق سب ہی طرح کی کتابیں شامل ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ کے وقت اندازہ ہوتا ہے کہ صدر الدین شیرازی کی اسفار اربعہ فرید و جدی اور بستانی کی ”دائرۃ المعارف“ شیخ محی الدین ابن عربی کی فتوحات مکیہ جیسی کتابوں کا ایک ایک صفحہ علامہ کی نظروں کے سامنے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ زاہد بن الحسن الکوثریؒ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور دوسرے ارباب علم و فضل نے اسے اپنے موضوع پر منفرد کتاب تسلیم کیا ہے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اپنے تفسیری نوائد میں لکھتے ہیں۔ اس موضوع پر میری نظر میں ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی (ترجمہ شیخ الہند)

خود شاہ صاحبؒ کی زندگی میں ایک وسیع النظر عالم جو جرمنی وغیرہ میں بھی رہ چکے تھے جب ان کی نظر سے یہ کتاب گزری تو انہوں نے خاص اس غرض سے دیوبند کا سفر کیا کہ اگر دنیا میں اس پایہ کا کوئی محقق موجود ہے تو اس کے شرف ملاقات سے ہمکنار ہونا چاہئے ❶۔

(۵)۔ ”خاتم النبیین“ مذکورہ بالا کتابوں کے برخلاف اس کی زبان فارسی ہے جو آپؒ نے خاص اپنے وطن کشمیر کے لوگوں کو قادیانیوں کی تلبس سے بچانے کے لئے تصنیف فرمائی تھی۔ اس کتاب کا اصل موضوع آیت ختم نبوت کی تفسیر ہے۔ یہ رسالہ مختصر ہونے کے ساتھ خاصا دقیق ہے۔ علامہ کی دوسری تصانیف کی طرح اس سے بھی صحیح معنوں میں علماء ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ تمام کتابیں رد قادیانیت کی غرض سے تالیف کی گئی ہیں لیکن ان کی حیثیت محض مناظرانہ کتابوں کی نہیں ہے بلکہ صحیح علمی ذوق رکھنے والوں کو بسا اوقات ان کتابوں کا ایک صفحہ پڑھ کر ایسی نادر تحقیقات، علمی نکات و لطائف اور اچھوتے افکار ہاتھ آتے ہیں جو ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے بھی بمشکل مل سکتے ہیں۔

بہر کیف! اس وقت مقصود صرف یہ تھا کہ قادیانیت کے سلسلہ میں شاہ صاحب کے کارنامہ کا

مختصر تعارف کرا دیا جائے اگر توفیق نے مساعادت کی تو مولانا محمد قاسم نانوتوی اور علامہ انور شاہ کے اچھوتے اور نادار علمی تحقیقات سے آئندہ لوگوں کو روشناس کرنے کی سعی کروں گا۔ والسلسلہ الموفق وبیدہ الزمہ التحقیق۔

ائمہ فن کے فکر و نظر کی بلندی اور علم کی گہرائی کو جانچنے کا معیار محض تصانیف کی عددی کثرت ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اصل چیز کیفیت ہوتی ہے کیت نہیں۔ مولانا محمد یوسف بنوری نے اس سلسلہ میں بڑا ہی پر لطف استدلال کیا ہے کہ شیخ جلال الدین سیوطی انتہائی کثرت تصانیف ہیں۔ اس کے برخلاف امام ابن دقیق العید کی اصل تصانیف کل دو ہیں۔ ان میں بھی ایک تو دستیاب ہے اور دوسری کے منتشر اور ناقص تمام اقتباسات ائمہ فن کی کتابوں میں ملتے ہیں مگر اس کے باوجود ابن دقیق العید کی دقت نظر پر شیخ جلال الدین سیوطی کی کثرت تصانیف کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ اس سلسلہ کا یہ واقعہ بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری نزیل قاہرہ جو اپنے زمانے کے بلند پایہ متکلم تھے عربی اور ترکی زبانوں میں ان کی متعدد تصانیف موجود ہیں۔ انہیں ۱۳۵ھ میں جب مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے علامہ انور شاہ صاحب کا رسالہ مرقاة الطارم علی حدوث العالم پیش کیا تو انہوں نے اس رسالہ کو پڑھ کر فرمایا کہ۔

”میں نہیں سمجھتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی اس پایہ کا محقق بھی ہو سکتا ہے۔“

پھر صدر الدین شیرازی کی اسفار اربعہ (جس کے صفحات ہزاروں تک پہنچے ہیں) کی طرف اشارہ کر کے فرمایا میں اس چند ورق رسالہ کو اس کتاب پر ترجیح دیتا ہوں۔ (مقدمہ عقیدہ الاسلام ۸) یہ واقعہ خود شیخ مصطفیٰ صبری کی عظمت کا بھی آئینہ دار ہے کہ ان کی حقیقت بین نظروں میں محض کاغذ کے پتاروں کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ اصل چیز علمی گہرائی اور فکر و نظر کی پختگی ہے۔

(منقول از دارالعلوم دیوبند)



فرعیات کے بارے میں

حضرت شاہ صاحب کا طرز فکر

(حضرت مولینا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی (سابق مفتی اعظم پاکستان)

ممتاز علماء اسلام کا طرز فکر کے عنوان سے ایک مقالہ پندرہ روزہ ترجمان دہلی کے اکتوبر ۱۹۷۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے اس مقالہ میں خاص طور پر حضرت مولینا اشرف علی تھانوی حضرت مولینا محمد انور شاہ کشمیری حضرت مولینا شبیر احمد عثمانی حضرت مولینا سید حسین احمد مدنی حضرت مولینا سید سلیمان ندوی اور حضرت مولینا ابوالکلام آزاد (رحمۃ اللہ تعالیٰ) کا تذکرہ آیا ہے۔

میں استاذی الکترم مولینا محمد نور الدین صاحب زید مجرہ کا ممنون کرم ہوں جنہوں نے میری توجہ اس گرانقدر مقالہ کی طرف مبذول کی۔

میرے ایک خط کے جواب میں اخبار ترجمان دہلی کے مدیر اعلیٰ محترم القام عبدالسلام صاحب رحمانی کا بیان ہے کہ یہ مضمون پاکستان کے اخبار جنگ میں شائع ہوا تھا جسے ہم نے افادیت کے خیال سے شائع کر دیا۔

بہر حال حضرت شاہ صاحب کے متعلق اس میں جو اقتباس ہے۔ اسے من وعن نقل کر کے شامل کتاب کیا گیا اور یہ اقتباس مولینا محمد شفیع صاحب کے قلم سے ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ وحدت امت کے نام سے مولینا مرحوم کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے جس میں حضرت مفتی صاحب نے ان زریں خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا اور مولینا محمد انور شاہ صاحب بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اسی جلسہ میں تشریف لائے میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نماز فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت سر پکڑے ہوئے بہت معصوم بیٹھے ہیں میں نے پوچھا حضرت! کیسا مزاج ہے؟ فرمایا ہاں ٹھیک ہے میاں مزاج کیا پوچھتے ہو عمر ضائع کر دی! میں نے عرض کیا حضرت آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں اور دین کی اشاعت میں

گزاری ہے۔ ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں۔ جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی؟ فرمایا میں تمہیں صحیح کہتا ہوں عرض کیا حضرت بات کیا ہے؟ فرمایا کہ ہماری عمر بچہ ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کد و کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ مسلکوں پر حقیقت کی ترجیح قائم کر دیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں۔ یہ رہا ہے خلاصہ خود ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔ اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابو حنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں؟ کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا۔ وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔ اور امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسلک کے فقہاء جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آتے ہیں کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو صواب، محتمل الخطا (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو خطا، محتمل الصواب (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں ان تمام بحثوں، تحقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔ پھر فرمایا ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطا؟ اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی صحیح ہے یا یہ کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو۔ اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو دنیا میں تو یہ ہے ہی قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع دین حق تھا؟ آمین بالجہ حق تھا یا (آمین) بالسر حق تھی برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے؟ اور حشر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے الفاظ یہ تھے :-

”اللہ تعالیٰ شافعی کو رسوا کرے گا نہ ابو حنیفہؒ کو نہ مالکؒ کو نہ احمد بن حنبلؒ کو جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے جنہوں نے نور ہدایت چار سو پھیلا دیا ہے۔ جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کریگا کہ وہاں میدان محشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابو حنیفہؒ نے صحیح کہا تھا یا شافعیؒ نے غلط کہا یا اس کے

برعکس، یہ نہیں ہوگا تو جس چیز کو نہ دنیا میں نکھرنا ہے۔ نہ برزخ میں اور نہ محشر میں اس کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی، اپنی قوت صرف کر دی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی مجمع علیہ اور سب ہی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سب ہی کے نزدیک اہم تھیں جن کی دعوت انبیاء کرام لے کر آئے تھے جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھیں۔ آج یہ دعوت تو نہیں دی جا رہی ہے یہ ضروریات دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوچھل ہو رہی ہیں اور اپنے داعیوں کے چہرے مسخ کر رہے ہیں اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے رہنا چاہئے تھا وہ پھیل رہے ہیں، گمراہی پھیل رہی ہے۔ الحاد آ رہا ہے، شرک و بت پرستی پل رہی ہے حرام حلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فرعی و در فرعی بحثوں میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی۔“

حضرت شاہ صاحبؒ کے درس حدیث کی خصوصیات

از حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کا ندھلوی مرحوم
سابق شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور، پاکستان

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کا ندھلویؒ، حضرت شاہ صاحبؒ کے تلمیذ رشید رہے ہیں موصوف نے حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم و کمالات کو بطور جذب مقلد طبعی حاصل کر کے اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں کو منور فرمایا تھا۔ نہایت جلیل القدر محدث و مفسر بے نظر ادیب و محکم مشہور مؤلف و مصنف، وسیع المطالعہ، کثیر التصانیف اور تقی و تقی عالم دین تھے حضرت شاہ صاحب سے بیعت و سلوک کا شرف و امتیاز بھی انہیں حاصل تھا پہلے دارالعلوم دیوبند میں تفسیر حدیث اور فقہ کے استاد تھے اور بعد ازاں جامعہ اشرفیہ لاہور میں شیخ الحدیث کے منصب عظیم پر فائز ہو کر تشنگان علوم کی پیاس بجھا رہے تھے۔ ۷ رجب ۱۳۹۲ھ کو آپ کا انتقال ہوا۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعہ

خدمت حدیث میں شرح مشکوٰۃ المصابیح مطبوعہ دمشق ان کا محدثانہ کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ مقدمہ البخاری، مقدمہ الحدیث تحفۃ القاری، محل مشکلات البخاری۔ جلاء العینین ذرائع الیدین اور تقلید و اجتہاد وغیرہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ حضرت الاستاذ محدث کشمیری کے عنوان سے آپ کا ایک گرانقدر مقالہ حیات نور میں شامل ہے قلت گنجائش کی وجہ سے اگرچہ ہم نے اسے من و عن جزو کتاب نہ بنایا لیکن تاہم اس سے کافی استفادہ کیا۔ مولانا مرحوم نے اور باتوں کے علاوہ اس مقالہ میں حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث کی امتیازی خصوصیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس لئے مضمون کے اس حصے کو ذیل میں درج کیا گیا۔

اپنے فاضل اجل استاد کے تبحر علمی اور آفتاب فضل و کمال کی ضیا باری کا طرز جمیل کن الفاظ میں بیان فرمایا ہے قابل مطالعہ ہے۔ (کوندو)

حضرت کے درس کی شان عجیب تھی جس کو اب دکھانا تو ممکن نہیں البتہ بتانا کچھ ممکن ہے۔

- (۱) درس حدیث میں سب سے اول اور زیادہ توجہ اس طرف فرماتے تھے کہ حدیث نبوی کی مراد باعتبار قواعد عربیت و بلاغت واضح ہو جائے۔ حدیث کی مراد کو علمی اصطلاحات کے تابع بنانے کو پسند نہ فرماتے تھے کیونکہ اصطلاحات بعد میں پیدا ہوئیں اور حدیث نبوی زمانہ

درجہ مقدم ہے حدیث کو اصطلاح کے تابع کرنا خلاف ادب ہے۔

(۲) خاص خاص مواضع میں حدیث نبوی کا مأخذ قرآن کریم سے بیان فرماتے اور اسی مناسبت سے بہت سی مشکلات قرآنیہ کو حل فرمادیتے تھے۔

(۳) حسب ضرورت اسماء الرجال پر کلام فرماتے خصوصاً جن روایہ کے بارے میں محدثین کا اختلاف ہوتا تو اس جرح و تعدیل کے اختلاف کو نقل کر کے اپنی طرف سے ایک قول فیصل بتلا دیتے کہ یہ راوی کس درجہ میں قابل قبول ہے۔ اس کی روایت حسن کے درجہ میں ہے یا صحیح کے، یا قابل رد ہے یا قابل اغماض یا لائق مسامحت؟ اور اغماض و مسامحت میں جو فرق ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں زیادہ تر فیصلہ کا طریقہ یہ بھی رکھتے کہ جب کسی راوی کی جرح و تعدیل میں اختلاف ہوتا تو یہ بتلا دیتے کہ یہ راوی ترمذی کی فلاں سند میں واقع ہے اور امام ترمذی نے اس روایت کی تحسین یا تصحیح فرمائی ہے۔

(۴) فقہ الحدیث پر جب کلام فرماتے تو اولاً ائمہ اربعہ کے مذاہب نقل فرماتے اور پھر ان کے وہ دلائل بیان فرماتے جو ان مذاہب کے فقہاء کے نزدیک سب سے زیادہ قوی ہوتے پھر ان کا شافی جواب اور امام اعظمؒ کے مسلک کی ترجیح بیان فرماتے تھے۔

(۵) نقل مذاہب میں قدماء کی نقول پیش فرماتے اور ان کو متاخرین کی نقول پر پیش فرماتے اور ان کو متاخرین کی نقول پر مقدم رکھتے، ائمہ اجتہاد کے اصل اقوال پہلے فرماتے پھر مشائخ کے اقوال ذکر فرماتے تھے۔

(۶) مسائل خلافیہ میں تفصیل کے بعد یہ بتلا دیتے کہ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے گویا وہ ایک قسم کا فیصلہ ہوتا جو طلبہ کے لئے موجب طمانیت ہوتا۔

(۷) درس بخاری میں تراجم کے حل کی طرف خاص توجہ فرماتے اولاً بخاری کی غرض و مراد واضح فرماتے تھے ثانیاً یہ بھی بتلاتے کہ اس ترجمۃ الباب میں امام بخاری نے ائمہ اربعہ میں کس امام کا مذہب اختیار فرمایا ہے اور پوری بخاری آپ سے پڑھنے کے بعد یہ واضح ہوتا کہ سوائے مسائل مشہورہ کے اکثر جگہ امام بخاری نے امام ابو حنیفہ اور امام مالکؒ کی موافقت کی ہے۔

(۸) حافظ ابن حجر عسقلانی چونکہ امام شافعی کے مقلد ہیں اس لئے امام شافعی کی تائید میں جا بجا امام طحاوی کے اقوال اور استدلال نقل کر کے اس امر کی پوری سعی کرتے ہیں کہ امام طحاوی کا جواب ضرور ہو جائے، بغیر امام طحاوی کا جواب دیئے گزرنے کو حافظ عسقلانی یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے حق شافعیست ادا نہیں کیا درس میں حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ کوشش رہتی تھی کہ مسائل

فقہیہ میں بغیر حافظہ کا جواب دیئے نہ گزریں۔

(۹) اصرار شریعت میں شیخ محی الدین بن عربی اور شیخ عبدالوہاب شعرانی کا کلام زیادہ نقل فرماتے تھے۔

(۱۰) درس حدیث کی تقریر موجز و مختصر مگر نہایت جامع ہوتی تھی (جس سے ذی علم مستفید ہو سکتے تھے) ہر کس و نا کس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔

خلاصہ یہ کہ آپ کے حلقہ درس میں بیٹھ کر محدثین سلف کی یاد تازہ ہوتی تھی جب متون حدیث پر کلام فرماتے تو یہ معلوم ہوتا کہ امام طحاوی یا بخاری و مسلم بول رہے ہیں۔ فقہ الحدیث پر بولتے تو امام محمد بن الحسن الشیبانی معلوم ہوتے۔ حدیث کی بلاغت پر گویا ہوتے تو افتخارانی اور جرجانی کا خیال گزرتا اصرار شریعت بیان فرماتے تو ابن عربی و شعرانی کا گمان ہوتا تھا۔



قادیانیت کے خلاف

حضرت محدث کشمیریؒ کا جہاد

(مرتبہ گویندو)

آج سے تقریباً ۵۷ سال قبل یعنی ۱۹۲۰ء ۱۳۴۰ھ کے قریب قادیانی فتنہ اپنی تمام مشرمانوں کے ساتھ پورے ہندوستان کے اطراف و اکناف میں اور خصوصاً پنجاب میں ایک خوفناکی صورت سے اٹھا۔ سادہ لوح اور بھولے بھالے لوگوں کی نہ جب کمی تھی اور نہ اب ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں بہت سے لوگ قادیانی فتنہ کے شکار ہو گئے۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ اس فتنہ کو انگریزی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی اور یہ لوگ بھی انگریزی حکومت کے قدم کو مضبوط کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے جیسا کہ مرزا قادیانی نے خود بھی اپنی کئی تصانیف میں متعدد جگہوں پر اظہار کیا کہ ان پر انگریزوں کی وفاداری فرض ہے مثلاً ایک موقع پر لکھتے ہیں:

”سب سے پہلے میں یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ میں ایسے خاندان میں سے ہوں جس کی نسبت گورنمنٹ نے ایک مدت دراز سے قبول کیا ہوا ہے کہ وہ خاندان اول درجہ پر سرکار دولت مدار انگریزی کا خیر خواہ ہے..... میرے والد صاحب اور خاندان ابتداء سے سرکار انگریزی کے بدل و جان ہوا، خواہ وفادار رہے اور گورنمنٹ عالیہ انگریزی کے معزز افسروں نے مان لیا کہ یہ خاندان کمال درجہ خیر خواہ سرکار انگریزی ہے..... یہی وجہ ہے کہ میرا باپ اور میرا بھائی اور خود میں بھی روح کے جوش سے اس بات میں مصروف رہے کہ اس گورنمنٹ کے فوائد اور احسانات کو عام لوگوں پر ظاہر کریں اور اس کی اطاعت کی فرضیت کو لوگوں کے دلوں میں جمادیں ۵۔“

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے

فتنہ ملت بیضا ہے اہانت اس کی
جو مسلمان کو سلاطین کا پرستار کرے

بہر حال اس فتنہ کا مرکز قادیان (مشرق پنجاب) تھا۔ (اور بعد ازاں ربوہ میں جو پاکستان میں

۵۔ درخواست بکھور الفیٹ گورنر پنجاب خاکسار غلام احمد از قادیان مورخہ ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء مندرجہ تلخیص رسالت

جلد ہفتم ۹۰۸ مولفہ میں قاسم علی قادیانی

واقع ہے، مغل ہو چکا تھا وہاں بھی اب اللہ کے فضل سے اس کا کلی طور پر خاتمہ ہی ہوا، کیونکہ حکومت پاکستان نے علماء اسلام کے مشورے سے اس فرقہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا (اور آہستہ آہستہ اس کے اثرات ساری دنیا میں پھیلنے لگے۔ یہاں تک کہ جاہل لوگوں سے گزر کر تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس سے متاثر ہونے لگا۔ برصغیر میں انگریزی پڑھے لکھے لوگ جو عموماً اسلام سے ناواقف تھے اور مرزا قادیانی کی عیاری اور مکاری کو تاڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اس فتنہ کا شکار ہونے لگے۔ اس لئے اس فتنہ کا خاتمہ کرنے کے لئے علماء ربانی کمر بستہ ہوئے جن میں امام العصر حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ والبرکات کا نام نامی سرفہرست ہے۔

فتنہ قادیانیت کے خاتمہ کے لئے مشہور اہلحدیث عالم اور مفسر قرآن حضرت مولینا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ کی خدمت بھی قابل دید ہیں۔

۱۔ امام الزناظرین حضرت مولینا ابوالوفاء ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمہ اللہ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں امرتسر میں پیدا ہوئے ہیں۔ حضرت موصوف کی خودنوشت سوانح حیات کے مطابق ان کے والد ماجد علاقہ ڈورہ اسلام آباد کشمیر کے رہنے والے تھے جو کشمیر سے امرتسر پشینہ کا کاروبار کرنے کے لئے آتے تھے اور بعد ازاں امرتسر میں ہی سکونت پذیر ہوئے۔ ان کے بیان کے مطابق کشمیری اقوام میں ایک گوٹ منٹو جو کہ یہاں کے برہمنوں کی ایک شاخ ہے کے ساتھ ان کا تعلق تھا۔ مولینا مرحوم کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ اس عظیم المرتب مرد مجاہد نے اپنی تمام عمر اسلام کی خدمت میں صرف فرمادی یہ امر قابل ذکر ہے کہ مولینا موصوف اس امتیازی خصوصیت کے مالک ہیں جنہوں نے مختلف نظریہ کے علماء دین سے استفادہ کیا ہے۔ پنجاب میں مولینا حافظ عبدالمنان صاحب دیوبند میں مولینا محمود الحسن صاحب اور کانپور میں مولینا احمد حسن صاحب (رحمہم اللہ تعالیٰ) ان کے شیخ الحدیث رہے ہیں۔

یوں تو اس ولیہ اور حق گو عالم دین اور موجد حقیقی نے اپنی ساری عمر شرک و بدعت کے خاتمہ کے لئے صرف فرمادی لیکن پھر بھی تردید قادیانیت میں ان کی ناقابل فراموش خدمات کو اس سب پر فوقیت اور ترجیح دی جاسکتی ہے۔ علم و عمل کے اس بحر بیکران نے قادیانیت کے خلاف اتنی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں کہ خود حضرت موصوف نے ایک بار تحریر فرمایا ہے کہ ”مجھے خود ان کا شمار یا نہیں آپ کے مناظرہ و تحریروں اور تقریروں سے مرزا قادیانی (علیہ مایلیہ) کتنا تنگ آ گیا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۱۵ھ میں ۱۹۰۷ء کو مولوی ثناء اللہ کے ساتھ آخری فیصلہ کے عنوان سے مرزا نے لکھا ہے۔

مولوی ثناء اللہ نے مجھے بہت بدنام کیا میرے قلم کو گرانا چاہا وغیرہ اس لئے میں یہ دعا کرتا ہوں کہ ہم دونوں میں جو جھوٹ ہے وہ سچ کی زندگی میں مر جائے۔ پھر کیا ہوا وہ تو آج بھی بفضل خدا زبان زد خاص و عام ہے یعنی مرزا قادیانی کے مرنے کے کوئی ۴۰ سال بعد مولینا امرتسری انتقال فرما گئے۔

علامہ امرتسری نے بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ قرآن پاک کی کئی تفسیریں لکھے کریم پر بار احسان رکھا ان میں تفسیر القرآن، کلام الرحمن خاص طور پر مشہور ہیں۔ آخر علوم اسلامیہ کا یہ بے لوث عالم، دلیری اور حق گوئی کا یہ پہاڑ اور مسلک اہل حدیث کا یہ یکتا خادم ۱۵ مارچ ۱۹۳۸ء (۱۳۹۷ھ) کی صبح کو دوشنبہ کے دن اپنے رفیق اعلیٰ سے جہلا اور اس طرح سے علم و فضل کا یہ آفتاب تابان سرگودھا (پاکستان) کی زمین میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعہ سال وفات کا مادہ ”هو المغفور“ ہے۔ زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے۔ (کوندہ)

حضرت موصوف قدس سرہ، حضرت شاہ صاحب کے ہم عصر اور حضرت شاہ صاحب کے قدردان تھے اس لئے اس موقع پر مولینا موصوف کا تذکرہ کرنا ضروری بن گیا۔

الغرض حضرت محدث کشمیری نے جب یہ دیکھا کہ امت مسلمہ ایک سخت امتحان میں مبتلا ہے جس میں اس کی تباہی کا بھی خطرہ ہے تو انہوں نے قادیانی فرقہ کے غلط عقائد کی تردید میں ایک منظم مہم چلانے کا فیصلہ فرمایا کیونکہ مسئلہ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کے فتنے سے حضرت شاہ صاحب بے چین رہتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ امت محمدیہ میں داخلی اور اندرونی فتنہ ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے تردید قادیانیت کے لئے کیا کچھ کیا وہ بجائے خود ایک اہم باب ہے اور اس پر ایک عظیم کتاب بھی مرتب ہو سکتی ہے۔

یوں تو زیر نظر کتاب کے کئی مقالات میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے قادیانی فتنہ کے بچ کئی کے لئے کیا کیا اقدامات فرمائے۔ لیکن ان میں مولینا بدر الحسن درہنگوی اور مولینا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کے گرانقدر مقالات چونکہ خاص اسی موضوع پر ہیں اس لئے ان ہر دو مقالات سے بھی حضرت شاہ صاحب کی مساعی جمیلہ کے متعلق بڑی حد تک آگہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا کہ حضرت شاہ صاحب نے قادیانی فرقہ کے غلط عقائد کی تردید میں ایک ہمہ گیر اور منظم مہم چلانے کا فیصلہ کیا حضرت نے اپنے تلامذہ سمیت غیر منقسم ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ شروع کیا۔ جگہ جگہ تبلیغی جلسوں کا انعقاد کیا اور مسلمانوں کو قادیانی فتنے سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ حضرت نے پنجاب اور صوبہ سرحد کا دورہ کیا قادیانی مبلغین سے مناظرے اور مباحثے کئے خاص کر فیروز پور پنجاب کے تاریخی مناظرہ میں اپنے رفیق کار علامہ شبیر احمد عثمانی سمیت قادیانی دجل و فریب کا پردہ پوری طرح چاک کر دیا۔ خاص قادیان میں جا کر قادیانیوں کو صراطِ مستقیم دکھائی تاکہ کسی طرح سے یہ امت خداوند کریم اور رسول برحق کی ہانپائی سے باز رہے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے قابل فخر تلامذہ کی اعانت سے تردید قادیانیت میں مختلف رسالے عربی زبان میں شائع کر کے مصر و شام اور دوسرے اسلامی ممالک میں مفت تقسیم کرائے تاکہ یہ ممالک بھی قادیانی فرقہ کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہ سکیں۔ مسئلہ حیات عیسیٰ علیہ السلام پر پہلے ایک رسالہ عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام لکھا اس کے بعد پورا اس کے حواشی یا ضمیمہ کے ”تحیۃ الاسلام“ نام سے دوسرا رسالہ تالیف فرمایا۔ مسئلہ کفر و اسلام کے حدود پر حضرت نے رسالہ الکفار الملعونین فی شئیء من ضروریات الدین تالیف فرمایا خاتم نبوت پر ختم انہیں کے نام سے فارسی زبان میں بھی ایک کتاب تصنیف فرمائی اور یہ آپ نے خصوصیت سے اپنے وطن کشمیر کی ضرورت کو سامنے رکھ کر تحریر فرمائی کیونکہ ان دنوں کشمیر میں بھی قادیانی فتنہ سر اٹھا چکا

تھا۔ اس کتاب کے متعلق یہاں یہ عرض کرنا ہے جانہ ہوگا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے مرض وفات میں رد و رد فرمایا ہم نے عرضائع کی اور کوئی کام آخرت کے لئے نہ کیا۔ ہاں یہ رسالہ "خاتم النبیین" اس لعین قادیانی کے رد میں لکھا ہے تو قہ ہے کہ شاید یہی میری نجات کا ذریعہ ہو جائے ①۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ "خاتم النبیین" نامی یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور بقول مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی یہی انکی خاتمة التصانیف بھی قرار پائی ہے۔

اس سے پہلے اردو زبان میں بھی حضرت شاہ صاحبؒ نے دعوت حفظ ایمان کے نام سے کئی رسالے تصنیف فرمائے ہیں اور وہ بھی غالباً ان دنوں کشمیر کی ضرورت کو مد نظر رکھ کر ہی لکھے۔ ایک رفیق سے ہمیں دعوت حفظ ایمان کے دو جز ہاتھ آئے۔ مرزا قادیانی کے مبلغ علم کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ نے جو تذکرہ فرمایا ہے اسے ضبط تحریر میں لانا خالی از دستچسبی نہ ہوگا۔

یہ شخص معمولی درجہ کی فارسی اور اردو کا مالک ہے۔ شروظ نظم میں کوئی اعلیٰ پایہ نہیں رکھتا۔ عربی میں تک بندی یا سرقہ کر سکتا ہے اور صوفیہ کرام جسے فن حقائق کہتے ہیں۔ اس میں سے کسی حقیقت کو صحیح نہیں سمجھ سکا۔ قرآن مجید کی مناسبت سے اس قدر محروم ہے کہ اپنی مطبوعات میں نہایت کثرت سے آیات غلط اور مخرف نقل کرتا جاتا ہے۔ تعلیم اس کی باب اور بہاء اللہ کی تعلیم سے مسروق ہے۔ بہاء اللہ کی کتابیں یہاں بیشتر موجود نہیں تھیں۔ جس کی وجہ سے کچھ وقفہ رہا، اب کہ کتابیں اس کی آگئیں ناظرین نے اس سے فاضحہ کو ثابت کر دیکھا یا مع ہذا اس دجال کی دیدہ دہی اس درجہ تک ہے کہ کہتا ہے۔

زنده شد ہر نبی بآمدنم ☆ ہر رسولے نہاں بہ چیر مہم
(یعنی) ہر نبی میرے آنے سے زندہ ہوا ہے نہیں تو مرے پڑے تھے اور ہر رسول میرے
چولے میں چھپا پڑا ہے ②۔

اسی طرح اکفار المحدثین فی ضروریات الدین میں بھی ایک جگہ مرزا کے علم کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"بدعی دعاوی بسیطة عاطلة مع غاية جهله وقلة فهمه حتی انه لا
تستطیع تلفیق عبارة صحیحة فی الفارسیة فکیف بالعربیة ویزعمها
حقائق وهی فی الحقیقة بقائق" ③

جس رسالہ دعوت حفظ ایمان کے متعلق سطور بالا میں ہم نے عرض کیا اس کے آخر میں حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں۔

حکومت کشمیر کو پھر بحیثیت رحمت ہونے کے متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ کل عالم اسلام مصر، شام، عرب، عراق، ہندوستان، کابل وغیرہ قادیانیوں کو مسلمان نہیں سمجھتے ہیں ان کی بھرتی اسکولوں اور فیکوں میں مسلمانوں پر احسان نہیں اور ہمیشہ موجب تصادم و خلل امن رہے گی۔

اہل کشمیر پر واضح رہے کہ جو قادیانی اخبار کشمیر سے جاری ہو وہ قادیانی عقائد یعنی کفر کی خم ریزی ہے۔ عنقریب شاخ و برگ دکھلائے گا۔ مسلمان اپنی جیسی خالی کر کے کفر نہ خریدیں والسلام۔
العارض محمد انور شاہ کشمیری عفی اللہ عنہ

از دیوبند ۲۲ ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ

الغرض شاہ صاحب نے اپنی علالت بڑھاپا اور علمی مشاغل کی کثرت کے باوجود دن رات اس فتنہ کی روک تھام میں صرف کر دیئے۔ انہوں نے ہندوستان کے دوسرے علماء و فضلاء کو بھی اصلاح قوم کی طرف متوجہ کیا۔

چنانچہ شاہ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے شاگردوں نے اپنے استاد کے شروع کئے ہوئے کام کو جاری رکھا۔ اور اب بھی وہ اس ضمن میں اپنے فرائض سے بدستور عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔
جزاہم اللہ خیرا۔

مقدمہ بہاولپور:..... تردید قادیانیت میں شاہ صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ بہاولپور کے معرکہ الآراء تاریخی مقدمہ میں شہادت دینا ہے۔ یہ مقدمہ ایک مسلمان عورت نے جو احمد پور شرقیہ ریاست بہاولپور کی رہنے والی تھی۔ اپنے خاوند کے خلاف دائر کیا تھا۔ اس عورت کا یہ کہنا تھا کہ اس کا شوہر مرزائی ہونے کی وجہ سے خارج اسلام ہو چکا ہے اور خارج از اسلام مرد کے ساتھ مسلمان عورت کا نکاح حرام ہے اس لئے اس کا نکاح نسخ قرار دیا جائے۔

یہ مقدمہ کافی عرصہ تک زیر سماعت رہا تقریباً سات سال تک بہاولپور کی ادنیٰ و اعلیٰ عدالتوں میں زیر سماعت رہتے ہوئے آخر میں دربار معلیٰ بہاولپور پہنچا۔ ۱۹۳۲ء میں یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس مسئلہ پر فریقین یعنی قادیانی اور غیر قادیانی علماء سے روشنی ڈالنے کو کہا جائے تاکہ ان کے بیانات کی روشنی میں مقدمہ کا صحیح طور پر فیصلہ کیا جاسکے۔

قادیانیوں نے اس مقدمہ کو جیتنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگا رکھی تھی قادیان کا بیت المال اور ارجال کا مقدمہ کی پیروی کے لئے وقف ہوئے۔

ادھر مدعیہ بے چاری ایک غریب گھرانے کی لڑکی نہایت کس مپرسی میں وقت گزار رہی تھی۔

ملک کے ممتاز مسلمان علماء کو شہادت میں لانا اس کے بس سے باہر تھا اس لئے بہاولپور کے مسلمانوں کی انجمن موید الاسلام نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مقدمہ کی پیروی کا انتظام کیا۔ ملک بھر کے ممتاز علماء کو خطوط لکھ کر مقدمہ کی پیروی اور شہادت کے لئے طلب کیا۔ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ ان دنوں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں صدر مدرس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اور کچھ وقت سے علیل ہونے کی وجہ سے دیوبند تشریف لائے ہوئے تھے بے حد کمزور ہو چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود سامان سفر باندھے ڈابھیل جانے کو تیار تھے تو اس دوران بہاولپور سے مولینا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ کی طرف سے وہ خط ملا جس میں حضرت کو بہاولپور کے اس مقدمہ میں شہادت دینے کی دعوت دی گئی تھی چنانچہ انہوں نے ڈابھیل کا سفر ملتوی کیا اور علماء کی ایک بڑی جماعت کے ہمراہ بہاولپور تشریف لائے آپ کے ہمراہ حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی بھی تھے کئی روز تک بیانات ہوتے رہے۔ حضرت شاہ صاحب نے نہایت مدلل بحث کی اور فرقہ قادیانیہ کی تردید میں ایک بصیرت افروز تقریر ارشاد فرمائی۔ حضرت شاہ صاحب اور ان کے ساتھیوں کی مساعی جمیلہ کا ظہور تھا کہ یہ مقدمہ ۷ فروری ۱۹۳۵ء کو بحق مدعیہ فیصل ہوا۔ جو اسی زمانے میں کتابی صورت میں شائع ہوا لیکن آج کل نایاب ہے۔

بہر حال بہاولپور کے اس معرکہ الآراء مقدمہ میں حضرت شاہ صاحب نے بیان دے کر مرزائیت کی بنیادوں کو منہدم اور قادیانی دجل و فریب کے تمام پردوں کو پارہ پارہ کر کے فرقہ مرزائیہ ضالہ کا ارتداد دنیا پر واضح کیا۔

انجمن موید الاسلام بہاولپور کے شائع کردہ البیان الازہر کے مطابق شیخ الاسلام والمسلمین اسوۃ السلف وقدوة الخلف حضرت مولینا محمد انور شاہ صاحب نے ۱۹ اگست کو بہاولپور کی سرزمین کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمایا۔ حضرت کی رقامت میں پنجاب کے بعض علماء مولینا عبد الحنان صاحب خطیب آسٹریلیا مسجد لاہور و ناظم جمعیۃ علماء پنجاب، مولینا محمد صاحب لائل پوری (تلمیذ حضرت شاہ صاحب) فاضل دیوبند اور مولینا محمد زکریا صاحب لدھیانوی وغیرہم بھی تشریف لائے، ریاست بہاولپور اور ملحقہ علاقہ کے علماء اور ملاقاتی اس قدر جمع ہوئے کہ حضرت کی قیام گاہ پر بعض اوقات بیٹھنے کی جگہ نہ ملتی تھی اور زائرین مصافحہ سے بھی محروم رہتے تھے۔ ۲۵ اگست ۱۹۳۲ء کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا بیان شروع ہوا، عدالت کا کمرہ امراء و رساء ریاست اور علماء سے پر تھا۔ عدالت کے بیرون میدان میں دور تک مشاہدین کا اجتماع تھا۔ باوجودیکہ حضرت شاہ صاحب عرصہ سے بیمار تھے اور جسم مبارک بہت ناتوان ہو چکا تھا مگر متواتر پانچ روز تک تقریباً

پانچ پانچ گھنٹے یومیہ عدالت میں تشریف لا کر علم و عرفان کا دریا بہاتے رہے۔ مرزائیت کے کفر و ارتداد اور دجل و فریب کے تمام پہلو بے نقاب کئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے بیان ساطع البرہان میں مسئلہ ختم نبوت اور مرزا کے ادعاء نبوت و وحی مدعی نبوت کے کفر و ارتداد کے متعلق جس قدر مواد جمع ہے اور ان مسائل و حقائق کی توضیح و تفصیل کے لیے جو ضمنی مباحث موجود ہیں شاید مرزائی نبوت کے رد میں اتنا علمی ذخیرہ کسی ضخیم سے ضخیم کتاب میں بھی یکجا نہیں ملے گا۔

انجمن مویۃ الاسلام بہاولپور کے منتظمین نے اس مقدمہ کی کاروائی بیانات اور فیصلہ وغیرہ تین حصوں میں شائع کیا ہے۔ بیانات علماء ربانی کے نام سے جو کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس میں حضرت شاہ صاحبؒ کا بیان بھی ہے لیکن اس میں تفصیلات درج نہیں ہیں۔ جو عبارات اثناء بیان میں تشریحات اور تفسیرات کے ساتھ پیش فرمائی جاتی تھیں وہ بھی پوری درج نہیں کی گئیں صرف اتنا بیان شائع ہوا ہے جو حضرت شاہ صاحبؒ حج صاحب کو املا کرواتے تھے اس میں حوالہ جات کی عبارات کا صرف اول اور آخری لفظ لے لیا گیا ہے، حالانکہ حضرت شاہ صاحب پوری عبارت مع تشریح و تفسیر سناتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ کرام میں سے ایک اہم شاگرد مولینا سید احمد رضا صاحب بخاری مدظلہ العالی حضرت شاہ صاحب کے ملفوفات گرامی پر مشتمل کتاب نطق انور اور حصہ اول میں اس مقدمہ کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:-

۱۱۲ اور ۱۳ ستمبر کو متعدد مجالس میں حضرت نے اسی مقدمہ بہاولپور کے حالات اور اپنی شہادت بیان کے کچھ حصے سناتے ہوئے فرمایا تھا کہ:-

میں نے عدالت میں پانچ وجوہ سے تکفیر مرزائیت کا ثبوت پیش کیا تھا۔ (۱) دعوائے نبوت (۲) دعوائے شریعت (۳) توہین انبیاء علیہم السلام (۴) انکار متواترات و ضروریات (۵) سب انبیاء علیہم السلام فرمایا کہ میں نے عدالت کے سامنے سب کی تشریح کی اور اس سے پہلے یہ ثابت کیا کہ سورۃ بقرہ میں جو اصول ارشاد فرمائے گئے ہیں ان ہی میں سے یہ بھی ہے کہ خدا کی اطاعت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے برگزیدہ بندوں کی بھی اطاعت کی جائے جس کو قصہ حضرت آدم علیہ السلام اور شیطان سے واضح کیا گیا ہے۔ سب کے معنی برا بھلا کہنا ناسزا کہنا ہے کالی دینا نہیں۔ اس کے لئے قذف کا لفظ آتا ہے۔ اور سب کی بہت اقسام ہیں مگر جو وہاں کے متعلق اور حسب حال تھیں وہ تین اقسام بیان کیں:

(۱) سب لڑولی جو بلا قصد آجائے جبکہ مقصد کوئی دوسری چیز بیان کرنا ہو۔

(۲) سب تعریفی دوسرے کے کندھے پر ہندو رکھ کر چھوڑنا جیسے مرزا نے انجیل وغیرہ سے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات بیان کئے ہیں اور مقصد اپنا دل شہنشاہ کرنا ہے۔ چنانچہ در چاد ورق کے بعد کہیں جا کر حوالہ دیتے ہیں ورنہ بڑی تفصیل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف شان حالات لکھتے چلے جاتے ہیں تاکہ دوسروں کے قلوب سے ان کی عزت و وقعت کم کریں۔ حالانکہ خود تعزیرات ہند میں ہے کہ اگر کوئی ہندوستانی کسی انگریز مورخ کے لکھے ہوئے کسی واقعہ کو بلا کم و کاست نقل کر دے اور اس سے نفرت پھیلتی ہو و اس پر مقدمہ قائم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کو جرم سمجھا گیا ہے۔

(۳) سب صریحی: یہ ظاہر ہے اور میں نے اس کو بھی ثابت کیا اور اس سلسلہ میں مرزا کا یہ شعر

پڑھ کر سنالیہ

ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو ☆ اس سے بہتر غلام احمد ہے
اس پر وکیل مرزا یحییٰ نے اعتراض کیا کہ مولینا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) کے ایک شعر میں بھی ایسا ہی مضمون ہے اس کا کیا جواب ہے؟ وہ شعر یہ ہے

مردوں کو زندہ کیا زندوں کو مرنے نہ دیا

اس مسیحائی کو دیکھیں ذرا ابن مریم

اس پر عدالت میں جو ہزاروں کا مجمع تھا اور ان میں ہندو بھی تھے ذرا گھبرایا کہ شاید اس کا جواب مجھ سے نہ ہو سکے تو میں نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی اور کہا کہ شعر میں ایک تو شاعری ہوتی ہے دوسرے جھوٹ (احسنہ کذبہ کہ شعر میں جتنا زیادہ جھوٹ ہو اتنا ہی زیادہ اچھا سمجھا جاتا ہے) اور تیسرے مبالغہ شاعری میں تخیل اور خیال آفرینی ہوتی ہے یعنی حقیقت شئی کے آس پاس آنا اور خود اس کو ظاہر نہ کرنا جس کا مقصد اچھنبے میں ڈالنا ہوتا ہے۔

اور یہ بھی قابل ذکر ہے کہ کسی چیز کی حقیقت کو بتلانا یہ خاصہ خدا کا ہے کہ وہی اشیاء کی حقائق کو کماہی بلا کم و کاست بیان کر سکتا ہے دوسرا نہیں۔

پس شاعر اپنے کی شاعرانہ جذبات میں یہ ظاہر ہی نہیں کرنا چاہتا کہ میں کوئی حقیقت بیان کر رہا ہوں نہ وہ اس کا مدعی ہوتا ہے۔ البتہ اپنے کسی اچھوتے تخیل یا خیال آفرینی کی صرف داد چاہتا ہے۔

چنانچہ حضرت الاستاذ مولینا شیخ الہند کی مراد یہ ہے کہ ہمارے مشائخ طریقت و شریعت نے مردہ دلوں کو زندہ کیا اور زندہ دلوں کو مرنے نہ دیا۔ اس مصرعہ میں صرف دل کا لفظ محذوف ہے جس سے شاعر نے اچھنبے میں ڈالا اور خیال آفرینی کی داد چاہتی ہے۔

پھر چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرنے کے بارے میں بڑے مشہور و نامور پیغمبر ہیں اس لئے ان کو اس میں سب سے بڑا فرض کیا ہے اور دوسرے مصرعہ سے منشا یہ ہے کہ وہ دیکھیں تو اس کی داد دے سکتے ہیں جیسے بڑے چھوٹوں کی کارگزاری پر داد دیا کرتے ہیں۔

لہذا حضرت مولینا رحمۃ اللہ علیہ کے شعر میں خالص ایمان ہے اور مرزا کے شعر میں خالص کفر ہے۔ کیونکہ حضرت مولینا رحمۃ اللہ علیہ نے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس منقبت احیاء موتی میں سب سے زیادہ معظم و مکرم قرار دیکر اپنے اکابر کو بھی ان کے چھوٹوں کے مرتبہ میں اقرار دے کر اپنی طرف سے حضرت مسیح علیہ السلام کی بڑی سے بڑی عظمت کا اقرار فرمایا ہے اور اس کے برعکس مرزا صاحب نے اپنے شعر کے پہلے مصرعہ میں تو حضرت مسیح علیہ السلام کے ذکر مبارک سے اعراض کی تحقیر کی جیسے کسی کمتر کے ذکر کو ناقابل التفات سمجھ کر ایسا کہا جاتا ہے اور دوسرے مصرعہ میں مزید اہانت یہ کہ صاف طور سے یہ کہہ دیا کہ اس سے یعنی حضرت مسیح علیہ السلام سے بہتر غلام احمد ہے۔ نعوذ باللہ من هذا الکفریات۔ اس سے زیادہ کفر کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ شعر میں جھوٹ ہوا کرتا ہے اور اس کا قائل اس کے جھوٹ ہونے کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔

تیسرے مبالغہ ہوا کرتا ہے کہ شاعر چھوٹی چیز کو بڑا دکھاتا ہے اور خود قائل بھی سمجھتا ہے کہ یہ غلط ہے اور اگر کسی مجمع میں اس سے دریافت کیا جائے تو وہ اس کے زائد از حقیقت ہونے کا اقرار کر لے گا۔

اس مسکت و مدلل جواب سے ان کا اعتراض ختم ہو گیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے مزید فرمایا کہ ختم نبوت کا عقیدہ اسلام کے اہم اور بنیادی مسائل میں سے ہے اور خاتم النبیین کے جو معنی قادیانی بیان کرتے ہیں آیات قرآنی و احادیث صحیحہ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ ختم نبوت کا عقیدہ قرآن مجید کی بہت سے آیات سے احادیث متواتری المعنی سے اور قطعی اجماع امت سے روز روشن کی طرح ثابت ہے۔ اس کا منکر قطعاً کافر ہے۔ کوئی تاویل و تحقیق اس میں قبول نہیں کی گئی اس میں تاویل و تخصیص کرنے سے وہ شخص ضروریات دین میں تاویل کرنے کی وجہ سے منکر ضروریات دین سمجھا جائے گا۔ ختم نبوت کے بارے میں ہمارے پاس تقریباً دو سو احادیث ہیں۔

قادیانی و کلاء کی طرف سے اس ضمن میں یہ کہا گیا کہ حدیث میں ہے کہ قرآن شریف کی ہر آیت کے ایک ظاہری معنی ہیں اور ایک باطنی اور تاویل کرنے والے کو کافر نہیں سمجھا گیا۔

اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے فرمایا کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے اور باوجود قوی نہ ہونے کے اس کی مراد ہمارے نزدیک صحیح ہے اس حدیث میں لفظ بطن سے تو جو کچھ حضور ﷺ کے دل میں تھا وہ سب منکشف نہیں ہے۔ مجملہ ہم سمجھتے ہیں کہ ظہر قرآن کی مراد وہ ہے جو قواعد

لفت اور عربیت سے اور اولہ شریعت سے علماء شریعت سمجھ لیں اور اس کے تحت میں قسمیں ہیں اور باطنی سے یہ مراد ہے کہ حق تعالیٰ اپنے ممتاز بندوں کو ان حقائق سے سرفراز کر دے اور بہتوں سے وہ خفی رہ جائیں۔ لیکن ایسا کوئی باطن جو مخالف ظاہر کے ہو اور قواعد شریعت اسکو رد کرتے ہوں مقبول نہ ہوگا۔ اور رد کیا جائے گا اور بعض اوقات باطنیت الحاد تک پہنچا دے گا۔ حاصل یہ ہے کہ ہم مکلف فرمانبردار بندے اپنے مقدر کے موافق ظاہر کی خدمت کریں اور باطن کو خدا کے سپرد کر دیں۔

رہا تاویل کا مسئلہ تو اخبار احاد کی تاویل اگر کوئی شخص قواعد کے مطابق کرے تو اس کے قائل کو بدعتی نہیں کہیں گے البتہ اگر قواعد کی رو سے صحیح نہیں تو وہ خاطی ہے۔

فرمایا مرزا صاحب نے آیات قرآنی کو اپنے اوپر چسپاں کیا ہے جیسا کہ آیت ھُوَ الَّذِیْ ارْسَلْ رَسُوْلَهٗ الْاٰیَۃِ کے متعلق کہا کہ اس میں میرا ذکر ہے اور دوسری جگہ محمد رسول اللہ آلیہ میں کہا کہ اس میں میرا نام محمد رکھا گیا اور رسول بھی، اسی طرح اور کئی تصریحات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ آیات قرآنی کو اپنے اوپر چسپاں کرتے تھے جس سے رسول اللہ ﷺ کی توہین ہوتی ہے اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین اور حضرت مریم کی شان میں بھی گستاخی کی ہے۔ ان سب سے قرآن مجید کی صریح آیات کی تکذیب ہوتی ہے۔

وکیل قادیانی نے مرزا صاحب کی طرف سے صفائی میں بعض عبارتیں ایسی پیش کیں جن سے انبیاء علیہم السلام کی مدح نکلتی ہے۔ تو اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ:

جب ایک جگہ کلمات توہین ثابت ہو گئے تو دوسری ہزار جگہ بھی کلمات مدحیہ لکھے ہوں اور شاخوانی کی ہو تو وہ کفر سے نجات نہیں دلا سکتے، جب کہ تمام دنیا اور دین کے قواعد مسلمہ اس پر شاہد ہیں کہ اگر ایک شخص تمام عمر کسی کی اتباع اور اطاعت گزاری کرے اور مدح و ثنا کرتا رہے لیکن کبھی کبھی اس کی سخت ترین توہین کر دیا کرے تو کوئی انسان اس کو واقعی مطیع و معتقد نہیں کہہ سکتا۔

فرمایا:۔ مدحیہ اشعار تحقیقی نہیں ہوتے بلکہ بشر کے کلام انکل کے ہوتے ہیں اور شاعرانہ محاورہ نئی نوع کلام کی تسلیم کی گئی ہے۔ فرق یہ ہے کہ جو خدا کا کلام ہوگا تو وہ عقیدہ ہوگا اور وہ کسی طرح انکل نہ ہوگی۔ بلکہ حقیقت حال ہوگی نہ کم نہ بیش اور بشر انتہائی حقیقت کو نہیں پہنچتا، تخمینہ الفاظ کہتا ہے اور خود شاعر کی نیت بھی اس کو عالم سے منوانا نہیں ہوتی۔ پھر جھوٹے اور شاعر میں یہ فرق ہے کہ جھوٹا کوشش کرتا ہے کہ میرے کلام کو لوگ سچ مانیں اور شاعر کی یہ کوشش بالکل نہیں ہوتی بلکہ وہ خود بھی سمجھتا ہے کہ لوگ میرے اس کلام کو حقیقت پر نہیں سمجھیں گے چنانچہ مرزا صاحب نے خود اپنی کتاب دافع

اہلہ کے ص ۲۰ پر لکھا ہے کہ یہ باتیں شاعرانہ نہیں بلکہ واقعی ہیں۔

انبیاء علیہم السلام میں باہمی فضیلت کا باب فرق مراتب کا ہے اور جو پیغمبر افضل ہے تو کسی قرینہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کسی دوسرے سے افضل ہے اور نبی کریم ﷺ سے یہ فرق مراتب اس احتیاط سے امت کو پہنچا ہے کہ اس سے فوق تصور نہیں لیکن ایسی فضیلت دینا کسی پیغمبر کو اگرچہ واقعی ہو جس سے دوسرے کی توہین لازم آتی ہو کفر صریح ہے۔

مرزا صاحب کے عقائد کے متعلق فرمایا:

مرزا صاحب کی پیدائش چونکہ مسلمان گھرانہ میں ہوئی تھی اور نسلی کافر نہیں تھے اس لئے ابتداء میں ان کی نشوونما تمام اسلامی عقائد پر ہوئی اور وہ ان کے پابند رہے۔ پھر تدریجاً ان سے الگ ہونا شروع کیا۔ یہاں تک کہ آخری اقوال میں بہت سے ضروریات دین کے قطعاً مخالف ہو گئے۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے باطل اور جھوٹے دعوؤں کو رواج دینے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی کہ اسلامی عقائد کے الفاظ وہی قائم رکھے جو قرآن مجید و احادیث میں مذکور ہیں۔ اور عام و خاص مسلمانوں کی زبان پر جاری ہیں لیکن ان کے حقائق کو ایسا بدل دیا کہ جس سے ان عقائد کا بالکلہ انکار ہو گیا۔ (مثلاً جس طریق سے نفخ صور یا قیامت کی خبر قرآن مجید و حدیث میں آئی ہے اس سے بالکل انکار ہے صرف ظاہری الفاظ رکھے مگر معنی الٹ دیئے)۔

اس لئے ان کی کتابوں سے ایسے اقوال پیش کرنا جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بعض عقائد میں ہلکت و الجماعت کے ساتھ شریک ہیں۔ ان کے اقوال و افعال کفریہ کا کفارہ نہیں بن سکتے جب تک اس کی تصریح نہ ہو کہ جو عقائد کفریہ انہوں نے اختیار کئے تھے ان سے توبہ کر چکے ہیں۔ اور جب تک توبہ کی تصریح نہ ہو۔ چند عقائد اسلام کے الفاظ کتابوں میں لکھ کر کفر سے نہیں بچ سکتے کیونکہ زندیق اسی کو کہا جاتا ہے جو عقائد اسلام ظاہر کر دے اور قرآن و حدیث کے اتباع کا دعویٰ کرے لیکن ان کی ایسی تاویل و تحریف کر دے جس سے ان کے حقائق بدل جائیں۔ لہذا جب تک اس کی تصریح نہ دکھائی جائے کہ مرزا صاحب ختم نبوت اور انقطاع وحی کے اس معنی کے لحاظ سے قائل ہیں جس معنی سے کہ صحابہ و تابعین اور تمام امت محمدیہ قائل ہے۔ اس وقت تک ان کی کسی

ای عبارت کا مقابلہ میں پیش کرنا مفید نہیں ہو سکتا جس میں خاتم النبیین کے الفاظ کا اقرار کیا ہو۔ اسی طرح نزول مسیح وغیرہ عقائد کے الفاظ کا کسی جگہ اقرار کر لینا یا لکھ دینا بغیر تصریح مذکور کے بے فائدہ نہیں ہے۔ خواہ وہ عبارت تصنیف میں مقدم ہو یا موخر۔

یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مرزا صاحب اپنی آخر عمر تک دعویٰ نبوت پر قائم رہے اور اپنے کفریہ

عقائد سے کوئی توبہ نہیں کی، علاوہ ازیں اگر یہ ثابت بھی نہ ہو تو کلمات کفریہ اور عقائد کفریہ کہنے اور لکھنے کے بعد اس وقت تک ان کو مسلمان نہیں کہہ سکتے جب تک ان کی طرف سے ان عقائد سے توبہ کرنے کا اعلان نہ پایا جائے اور یہ اعلان ان کی کسی کتاب یا تحریر سے ثابت نہیں کیا گیا۔

مرزا صاحب کے ایک قول سے جو تریاق القلوب حاشیہ ۷۷۷ سے نقل کیا گیا ہے اور جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

غرض جیسا کہ صوفیوں کے نزدیک مانا گیا ہے کہ مراتب وجود دور و بیہ ہیں۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے اپنی خو، طبیعت اور دلی مشابہت کے لحاظ سے قریباً ڈھائی ہزار برس اپنی وفات کے بعد پھر عبد اللہ پر عبد المطلب کے گھر میں جنم لیا اور محمد کے نام سے پکارا گیا۔
حضرت شاہ صاحبؒ نے حسب ذیل نتائج اخذ فرمائے:

(۱) اس قول سے لازم آیا کہ سرور عالم محمد کوئی چیز نہیں تھے۔ اور آپ کا تشریف لانا بعینہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تشریف لانا ہے۔ گویا یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بروز ہیں اور اصل ابراہیم علیہ السلام رہے اور آئینہ رسول اللہ ﷺ ہوئے اور چونکہ ظل اور صاحب ظل میں مرزا صاحب کے نزدیک عینیت ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنے کو ”عین محمد“ کہتے ہیں۔ تو جب محمدؐ بروز ابراہیم ہوئے تو مرزا صاحب عین ابراہیم بھی ہوئے۔ اس سے صاف لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ رسول اللہ کا کوئی وجود بالاستقلال نہیں اور نہ ان کی نبوت کوئی مستقل شے ہے۔

(۲) رسول اللہ ﷺ ابراہیم علیہ السلام کے بروز ہوئے اور خاتم النبیین آپ ہوئے کہ خاتم بروز اور ظل ہوتا ہے صاحب ظل اور اصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح مرزا صاحب آنحضرت کے بروز ہوئے تو خاتم النبیین مرزا صاحب ہوئے نہ کہ آنحضرت ﷺ۔

(۳) جب رسول اللہ ﷺ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بروز ہوئے تو جملہ کمالات نبوت اگر مجتمع ہوں گے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام میں ہوں گے نہ کہ آنحضرت میں اور یہ باطل و بے معنی ہے۔

فرمایا:

مرزا صاحب کی کتابیں دیکھنے سے یہ بات پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ان کی ساری تصانیف میں صرف چند ہی مسائل کا تکرار اور دور ہے، ایک ہی مسئلہ اور ایک ہی مضمون کو بیسیوں کتابوں میں مختلف عنوانوں سے ذکر کیا ہے اور پھر سب اقوال میں اس قدر نہایت تعارض پایا جاتا ہے اور خود مرزا صاحب کی ایسی پریشان خیالی ہے اور بالقصد ایسی روش اختیار کی ہے جس سے نتیجہ

عزیز ہے اور ان کو بوقت ضرورت مفصل و ملکہ باقی رہے۔

چنانچہ کہیں تو وہ ختم نبوت کے عقیدہ کو اپنے مشہور اور اجماعی معنی کے ساتھ قلعی اور اجماعی عقیدہ سمجھتے ہیں اور کہیں ایسے عقیدہ بتلانے والے مذہب کو لعنتی اور شیطان مذہب قرار دیتے ہیں۔ کہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کو تمام امت محمدیہ کے عقیدہ کے موافق متواتر اہل دین میں داخل کرتے ہیں اور اس پر اجماع ہونا نقل کرتے ہیں اور کہیں اس عقیدہ کو شرک و کفر کا عقیدہ بتلاتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کے متعلق مرزا صاحب کے جو اقوال ان کی کتب دافع البلاء اور ضمیر انجام آتھم وغیرہ میں ہیں۔ ان کتابوں سے پیش کر کے دکھلایا گیا تھا کہ ان میں بہت سی سبب و سبب درج ہے۔ ان کے بارے میں وکیل قادیانی نے جواب دیا کہ ان میں عیسائی مخاطب ہیں اور ان اقوال میں ان لوگوں کے اعتقادات کے مطابق جو ان کی کتابوں میں درج ہیں انہیں الزامی جواب دیئے گئے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے ان دشنام آمیز الفاظ کو اپنی شبہات میں بسلسلہ توہین عیسیٰ علیہ السلام بیان نہیں کیا اور کہا کہ میں موجب ارتداد مرزا صاحب کے سلسلہ میں اس قسم کی کوئی خطا پیش نہیں کرتا جس میں کہ مجھے بہت سے بحث کرنی پڑے بلکہ میں اس چیز کو لیتا ہوں جسے انہوں نے قرآن کی تفسیر بتایا ہے اور اسے حق کہا ہے۔

غرض میں نے مرزا صاحب کی نیت پر گرفت نہیں کی زبان پر کی ہے اور نہ ہی وجہ ارتداد میں تعریض کو لیا ہے بلکہ جس جھوٹ کو اس نے قرآن مجید سے مستند کیا اور اسے قرآن مجید کی تفسیر گردانا اور جس جھوٹ کو اپنی جانب سے حق کہا اس کو وجہ ارتداد قرار دیا اور اس ضمن میں مرزا صاحب کے حسب ذیل اقوال داخل کئے:

(۱) ”مگر میرے نزدیک آپ کی یہ حرکات جائے افسوس نہیں کیونکہ آپ تو گالیاں دیتے تھے اور یہودی ہاتھ سے کسر نکال لیا کرتے تھے۔“

(۲) ”عیسائیوں نے آپ کے بہت سے معجزات لکھے ہیں، مگر حق بات یہ ہے کہ آپ سے کوئی معجزہ نہیں ہوا۔“

اس سے صریح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین نکلتی ہے کیونکہ ”میرے نزدیک“ اور ”حق بات“ کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مرزا صاحب کے اپنے فیصلہ کے الفاظ ہیں۔

وکیل قادیانی نے صوفیاء کرام کے بعض ایسے قابل اعتراض اقوال پیش کئے جو مرزا صاحب

”ہم نے اولیاء اللہ کو ان کی ملہارت، تقدس و تقویٰ کی بے شمار خبریں سن کر اور ان کے شواہد اعمال و اعمال اور اخلاق سے تائید پا کر ان کو ولی مقبول تسلیم کر لیا ہے۔ تو ان کے بعد اگر کوئی کلمہ، مغایر یا موسم ہمارے سامنے ان کا آتا ہے تو ہم اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی توجیہ کریں اور حل نکالیں لیکن کسی شخص کی راست بازی ثابت ہونے سے پیشتر ہی اس کے قطعیات (مبالغہ میں ڈالنے والے کلمات) پیش کر کے اس کو مسلم الثبوت مقبولوں پر قیاس کرنا عاقل کا کام نہیں نہ ان کی تاویل کی ضرورت“

حاصل یہ کہ کسی کی راست بازی اگر جداگانہ کسی طریقہ اور دلیل سے معلوم ہو چکی ہو تو ہم محتاج تاویل و توجیہ ہونگے اور اگر زیر بحث صرف یہی کلمات موہم اور مغالطہ آمیز ہیں اور اس سے پیشتر کچھ سامان خیر کا ہی نہیں تو ہم یہ کھوئی پوچھی اس کے منہ پر مار دیں گے۔

قادیانی وکیل نے کہا کہ اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں اور جو کلمہ لا الہ الا اللہ کہے اس کو بھی کافر کہا درست نہیں۔ اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحب نے فرمایا:

”یہ بات کہ اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں ہے بے علمی اور ناواقفیت پر مبنی ہے کیونکہ حسب تصریح و اتفاق علماء اہل قبلہ کے یہ معنی نہیں کہ جو قبلہ کے طرف منہ کرے وہ مسلمان ہی ہے چاہے سارے عقائد اسلام کا انکار ہی کرے۔“

قرآن مجید میں منافقین کو عام کفار سے زیادہ کافر ٹھہرایا گیا حالانکہ وہ فقط قبلہ کی طرف منہ نہیں کرتے تھے بلکہ تمام ظاہری احکام اسلامیہ بھی ادا کرتے تھے۔

اہل قبلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اتفاق کیا ضروریات دین پر اور اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے کی مراد یہ ہے کہ کافر نہ ہوگا جب تک نشانی کفر کی اور علامت کفر کی اور کوئی چیز موجبات کفر میں سے نہ پائی گئی ہو۔

ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ قادیانی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ عام ارکان اسلام کے پابند ہیں اور تبلیغ اسلام میں کوشش کرتے ہیں پھر ان کو کافر کیسے کہا جائے گا؟ اس کے جواب میں فرمایا:

صحیح حدیث میں یہ تصریح ہے کہ ایک قوم ایسی آئے گی جس کے متعلق آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ دین اسلام سے نکل جائے گی اور ان کو قتل کرنے میں بڑا ثواب ہے۔ یہ لوگ نماز

روزے کے پابند ہو گئے بلکہ ظاہری خشوع و خضوع کی کیفیات بھی ایسی ہوں گی کہ ان کے نماز، روزے کے مقابلہ میں مسلمان اپنے روزے کو بھی بیچ سمجھیں گے لیکن اس کے باوجود جب کہ بعض ضروریات دین کا انکار ان سے ثابت ہو تو ان کی نماز روزہ وغیرہ ان کو حکم کفر سے بچانہ سکی۔

ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ فقہاء نے ایسے شخص کو مسلمان ہی کہا ہے جس کے کام میں ۹۹ وجہات کفر کی موجود ہوں اور صرف ایک وجہ اسلام کی اس کے جواب میں فرمایا:

اس کا منشا بھی یہی ہے کہ فقہاء کا منشا نہیں سمجھا گیا اور نہ ان کے وہ اقوال دیکھے جن میں صراحت پائی گیا ہے کہ یہ حکم اپنے عموم پر نہیں ہے بلکہ اس وقت ہے جب کہ قائل کا صرف ایک کلام مفتی کے سامنے آئے اور قائل کا کوئی دوسرا حال معلوم نہ ہوا اور نہ اس کے کلام میں کوئی تصریح ہو جس سے معنی کفر متعین ہو جائے تو ایسی حالت میں مفتی کا فرض ہے کہ معاملہ تکفیر میں احتیاط برتے اور اگر کوئی خفیف سے خفیف احتمال ایسا نکل سکے جس کی بناء پر یہ کلام کفر سے بچ سکے تو اسی احتمال کو اختیار کرے اور اس شخص کو کافر نہ کہے۔ لیکن اگر ایک شخص کا یہی کلمہ کفر اس کی سینکڑوں تحریرات میں بعنوانات والفاظ مختلفہ موجود ہو جس کو دیکھ کر یہ یقین ہو جائے کہ یہی معنی (معنی کفری) مراد لیتا ہے یا خود اپنے کلام میں معنی کفری کی تصریح کر دے تو باجماع فقہاء ایسے شخص پر قطعی طور پر کفر کا حکم لگایا جائے اور اس کو مسلمان ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

ایک شبہ یہ پیش کیا گیا کہ اگر کوئی کلمہ کفر کسی تاویل کے ساتھ کہا جائے تو اس پر کفر کا حکم نہیں لگے گا۔ اس کے جواب میں فرمایا:

اس میں تصریحات فقہاء سے ناواقفیت کا فرما ہے کیونکہ حضرات فقہاء و متکلمین کی تصریحات موجود ہیں کہ تاویل اس کلام اور اس چیز میں مانع تکفیر ہوتی ہے جو ضروریات دین میں سے نہ ہو لیکن ضروریات دین میں اگر کوئی تاویل کرے اور اجماعی عقیدہ کے خلاف کوئی نئے معنی تراشے تو بلاشبہ اس کو کافر کہا جائے گا۔ اس کو قرآن مجید نے الحاد اور حدیث نے زندقہ قرار دیا ہے۔

زندیق وہ ہے جو مذہبی لٹریچر بدل دے یعنی الفاظ کی حقیقت بدل دے مرزا صاحب نے بہت سے اسلامی عقائد کے حقائق بدل دیئے ہیں گو ان کے الفاظ وہی رہنے دیئے ہیں اس لئے ان کو حسب تصریحات مذکورہ بالا کافر ہی قرار دینا پڑے گا۔ اور ان عقائد کے تحت ان کا اتباع کرنے والا بھی اس طرح کافر سمجھا جائے گا۔

دکیل قادیانی کی طرف سے شیخ محی الدین عربی اور دیگر بزرگوں کے اقوال نقل کر کے یہ ثابت کیا گیا کہ ان کے نزدیک بھی نبوت مرتفع ہونے سے یہ مراد ہے کہ شریعت والی نبوت مرتفع ہو گئی نہ کہ

مقام نبوت اور وہ حضور ﷺ کے قول لانا نبی بعدی کا مطلب سمجھتے ہیں کہ آپ کے بعد کوئی ایسا نبی نہیں ہوگا جو آپ کی شریعت کے خلاف ہو بلکہ جب بھی ہوگا آپ کی شریعت کے ماتحت ہوگا۔ اس کے جواب میں ہماری طرف سے ان حضرات کے اقوال کی تو جیہیں بیان کی گئیں۔ اور میں نے کہا کہ دین کے معاملہ میں انکے اقوال دوسروں پر کوئی حجت نہیں ہو سکتے کیونکہ دینی معاملات میں سوا نبی کی وحی کے اور کوئی بات قطعی نہیں ہے۔

وکیل قادیانی کی طرف سے کہا گیا کہ حضرت شیخ اکبر اور حضرت مجدد صاحب اور مولینا روم کی کتابوں میں ہے کہ تمام اقسام وحی کی جو قرآن میں مذکور ہیں خدا کے نیک بندوں (اولیاء اللہ) میں پائی جاتی ہیں اور وہ وحی جو نبی میں ہے وہ خاص ہے اور وہ شریعت والی وحی ہے جو انبیاء علیہم السلام کو ہوتی ہے وہ اس امت کے بعض کامل افراد کو بھی ہوئی ہے اور جیسا کہ مولینا رومی نے کہا کہ ہوتی تو وہ وحی حق ہی ہے لیکن صوفیاء عام لوگوں سے پردہ کرنے کی خاطر اسے وحی دل بھی کہہ دیتے ہیں اور جن طریقوں سے انبیاء علیہم السلام کو وحی یا الہام ہوتا ہے ان ہی طرق سے اولیاء اللہ کو ہوتا ہے اگرچہ اصطلاحاً ان کا نام رکھنے میں فرق مراتب کے لئے فرق کیا ہے کہ انبیاء کی وحی کو وحی اور اولیاء کی وحی کو الہام کہتے ہیں اور ولی پر بھی وحی بواسطہ ملک ہوتی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس پر بحث کے دوران فرمایا کہ:

”صوفیاء کے یہاں ایک باب ہے جس کو شطیحات کہتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ان پر حالات گزرتے ہیں اور ان حالات میں کچھ کلمات ان کے منہ سے نکل جاتے ہیں جو ظاہری قواعد پر چسپاں نہیں ہوتے اور بسا اوقات غلط راستہ لینے کا سبب بن جاتے ہیں۔ صوفیاء کی تصریح ہے کہ ان پر کوئی عمل پیرا نہ ہو اور تصریح کرتے ہیں کہ جن پر یہ احوال نہ گزرے ہوں یا جو ان کی اصطلاحات سے واقف نہ ہو وہ ہماری کتابوں کا مطالعہ نہ کریں۔“

مجھلا ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص جو کسی حال کا مالک ہوتا ہے دوسرا خالی آدمی ضرور اس سے الجھ جائے گا لیکن دین میں کسی زیادتی کی کے صوفیاء میں سے کوئی قائل نہیں اور اس کے مدعی کو کافر بالاتفاق کہتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ صوفیاء نے نبوت بمعنی لغوی لے کر مقسم بتایا ہے اور اس کی تفسیر خدا سے اطلاع پانا۔ دوسرے کو اطلاع دینا کی ہے اور اس کے نیچے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام دونوں کو داخل کیا اور نبوت کی دو قسمیں کر دیں، نبوت شرعی اور نبوت غیر شرعی۔

نبوت شرعی کے نیچے وحی اور رسل دونوں درج کر دیئے تو اب ان کے لئے نبوت غیر شرعی

الہام کے کشف والہام کے لئے نکھر گئی اور مخصوص ہو گئی۔

پھر صوفیاء کی تصریح ہے کہ کشف والہام کے ذریعے مستحب کا درجہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا صرف اسرار معارف اور مکاشفہ اس کا دائرہ ہیں، اور تصریح فرماتے ہیں کہ ہمارا کشف دوسرے پر حجت نہیں۔ ہمارا کشف ہمارے لئے ہے۔

کشف اسے کہتے ہیں کہ کوئی پیرایہ آنکھوں سے دکھلایا جس کی مراد کشف والا خود نکالے الہام اسے کہتے ہیں کہ دل میں کوئی مضمون ڈال دیا اور سمجھا دیا جائے وحی یہ ہے کہ خدا اپنا ضابطہ کا پیغام کسی نبی یا رسول پر بھیجے پھر وحی قطعی ہے اور کشف والہام ظنی ہیں۔ بنی آدم میں وحی پیغمبروں کے ساتھ مخصوص ہے، غیروں کے لئے کشف یا الہام ہے یا معنوی وحی ہو سکتی ہے، شرعی نہیں ❶۔

حضرت شاہ صاحب گو بہاولپور کے اس تاریخی مقدمہ میں اپنے ایک شاگرد رشید مولانا محمد صاحب انوری لالکپوری ❷ بھی ہمراہ تھے۔ موصوف کو حضرت شاہ صاحب نے مختار مقدمہ بنوادیا تھا۔ مولانا ممدوح اس تاریخی سفر میں شب و روز انیس یوم تک حضرت شاہ صاحب کے ساتھ رہے۔ نیز حضرت کے عدالتی بیان میں جس قدر حوالہ جات کتب کی ضرورت پیش آتی تھی وہ بھی مولانا موصوف ہی نکال کر پیش کرتے تھے۔ جن کو حضرت شاہ صاحب خود پڑھ کر چنچ صاحب کو سناتے تھے۔ حضرت الاستاذ محدث کشمیری کے عنوان سے حضرت شاہ صاحب پران کا ایک فاضلانہ مقالہ ”حیات انور“ میں ہے۔ طوالت کے خوف سے اسے شامل کتاب نہ کیا گیا البتہ کتاب مذکور کے ان صفحات کو من و عن جزو کتاب بنایا گیا جن میں موصوف نے وضاحت سے تحریر فرمایا ہے کہ کس طرح دلائل و براہین سے حضرت شاہ صاحب نے فاضل حج کو قائل کیا کہ قادیانی امت خارج از دائرہ اسلام ہے۔

چنانچہ مولانا لالکپوری یوں رقمطراز ہیں۔

”حضرت کا حافظہ اس وقت قابل دید و شنید تھا جب حوالہ دیتے، کتاب کھولتے ہی فوراً انگشت مبارک عبارت پر ہوتی۔ حج صاحب لکھئے! عبارت یہ ہے بعض دفعہ احقر کو حکم فرماتے کہ عبارت نکال کر دکھاؤں، ب بعض مرتبہ صفحہ بھی ارشاد فرماتے۔ بیان بیٹھ کر فرماتے لیکن حوالہ جات پیش فرماتے وقت کھرے ہو جاتے تو راقہ شریف کی بعض آیات عبرانی الفاظ میں سنائیں اور اپنے دست مبارک سے لکھ کر حج صاحب کو دیں۔ چنانچہ ایک آیت احقر کو یاد ہے۔

❶ ملاحظہ ہو نطق انور جلد اول ص ۲۸-۵۰۔ ❷ مولانا لالکپوری ۲۲ جنوری ۱۹۷۰ء کو لائل پور میں انتقال کر گئے۔

ایک کتاب اعجاز کے مطابق ایک لاکھ سے زائد افراد نے آپ کی نماز جنازہ ادا کی رحمۃ اللہ رحمۃ واسعہ

نابی مقربخ میحخ کاموخ یا قییم لخ الوهخ الاوتشماعون. نسی من
قربك من احلك كاحيك یقیم لك الهك الیه تسمعون.

ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام نے اپنے دست مبارک سے لکھ کر اس
آیت کا بنی اسرائیل میں اعلان فرمایا۔

(شاہ صاحبؒ نے) فرمایا:

جج صاحب لکھے، ہمارا دین متواتر ہے اور دنیا میں کوئی دین متواتر نہیں تو اتر کی تعریف بیان
فرما کر اس کے اقسام تو اتر اسناد ❶، تو اتر طبقہ ❷، تو اتر قدر مشترک ❸ اور تو اتر تورات ❹ بیان
فرمائے، فرمایا تو اتر کی ایک قسم مصنوعی بھی ہے، اور تو اتر کی کسی ایک قسم کا منکر کافر ہے۔ مرزا غلام احمد
نے تو اتر کے جمیع اقسام کا انکار کیا ہے جرح کے روز جلال دین شمس مرزا کی مختار مدعا علیہ نے سوال کیا
کہ آپ نے تو اتر کے منکر کو کافر کہا ہے حالانکہ یہ تو ایک اصطلاح ہے جو علماء نے گھڑ رکھتی ہے۔ اس
کا منکر کیسے کافر ہو سکتا ہے؟ ارشاد فرمایا کہ تم لوگ مانتے ہو یا نہیں کہ یہ قرآن مجید وہی قرآن ہے جو
حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور ہم تک محفوظ چلا آیا؟ جلال الدین نے کہا کہ ہم مانتے
ہیں، فرمایا کہ اس حالت میں حفاظت کا نام تمہارے ہاں کیا ہے؟ جلال الدین نے کہا تو اتر۔ فرمایا
اس کا منکر کافر ہو گا یا نہیں، مرزا کی مختار نے اقرار کیا فرمایا کہ میں یہی تو کہہ رہا تھا، قادیانی مختار نے
سوال کیا کہ امام رازی نے تو اتر معنوی کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ فواحی الرحمن شرح مسلم الثبوت میں
بحر العلوم نے تصریح کی ہے۔ فرمایا، جج ہمارے پاس فواحی الرحمن کتاب موجود نہیں ہے۔ بتیں

❶..... تو اتر اسنادی یہ ہے کہ صحابہ سے بسند صحیح متصل مذکور ہو۔ ❷..... تو اتر طبقہ یہ ہے کہ جب یہ معلوم نہ ہو کہ کس نے
کس سے لیا اور صرف یہی معلوم ہو کہ پچھلی نسل نے اگلی نسل سے سیکھا جیسا کہ قرآن مجید کا تو اتر ہے۔ ❸..... تو اتر قدر
مشترک یہ ہے کہ کئی حدیثیں بطور خبر واحد آئی ہوں اور ان میں قدر مشترک متفق علیہ حصہ وہ حاصل ہو جو تو اتر کو پہنچ جائے
مثلاً نبی کریم ﷺ کے معجزات، جو کچھ متواتر ہیں اور کچھ اخبار آحاد ہیں، ان اخبار آحاد میں اگر کوئی مضمون مشترک ملتا ہے
تو وہ قطعی ہو جاتا ہے۔ اس سے بعض ایسی احادیث جو باعتبار لفظ و سند متواتر نہیں ہیں وہ باعتبار معنی کے متواتر ہو جاتی ہیں
اگر ان معانی کو بہت سی سندوں سے اتنے راویوں نے بیان کیا ہو جن کا جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو۔ ❹..... تو اتر تورات
یہ ہے کہ نسل نے نسل سے لیا ہو مثلاً بیٹے نے باپ سے لیا ہو اور باپ نے اپنے باپ سے۔ ان جملہ اقسام کے تو اتر کا
انکار کفر ہے۔ اگر متواترات کے انکار کو کفر نہ کہا جائے تو اسلام کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی ان متواترات میں تاویل کرنا
یا مطلب بگاڑنا کفر صریح ہے کفر بھی تو یہ ہوتا ہے کفر بھی فعلی کوئی شخص ساری عمر نماز پڑھتا رہے اور ۲۰ سال کے بعد ایک بت
کے آگے سجدہ کر دے تو یہ کفر فعلی ہے۔ کفر تو یہ ہے کہ کوئی شخص کہہ دے کہ خدا کے ساتھ صفوں میں یا فعل میں کوئی
شریک ہے۔ اس طرح بھی کفر تو یہ ہے کہ رسول اللہ کے بعد کوئی اور نبیا وغیرہ آئے گا، کیونکہ تو اتر تورات کے ذیل میں
ساری امت اس علم میں شریک ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔

سال ہوئے میں نے یہ کتاب دیکھی تھی ان صاحب نے حوالہ دینے میں دھوکا دیا ہے، بحر العلوم امام رازی کے متعلق لکھتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ جو حدیث ہے لا تجمع امتی علی المضلالة یہ تو اتر معنوی کے درجہ کو نہیں پہنچتی، یہ نہیں کہ تو اتر معنوی کے حجتہ ہونے کا انکار کرتے ہیں بلکہ اس حدیث کے متواتر ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ حج صاحب نے قادیانی مختار کو حکم دیا کہ اصل عبارت پڑھ کر سنائے، اس نے ذرا تامل کیا تو حضرت شاہ صاحب نے کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لی کہ لاؤ میں عبارت سناتا ہوں، اس نے کہا میں سنا دیتا ہوں۔ جب سنایا تو وہی عبارت تھی۔ جو حضرت نے ارشاد فرمائی تھی۔ فرمایا، حج صاحب، یہ صاحب ہمیں ٹھم کرنا چاہتے ہیں لیکن میں چونکہ طالب علم ہوں دو چار کتابیں دیکھ رکھی ہیں میں ان سے ان شاء اللہ ٹھم نہیں ہوں گا۔

قادیانی مختار نے سوال کیا آپ نے فرمایا مدعی وحی نبوت واجب القتل ہے تو رسول اللہ نے ابن صیاد کو کیوں قتل نہ فرمایا، بلکہ فاروق اعظم کو بھی روک دیا، فرمایا حج صاحب لکھئے ابن صیاد نابالغ تھا اور نابالغ کو شریعت میں قتل نہیں کیا جاتا۔ سوال آپ نے فرمایا تھا کہ رسول اللہ کی خدمت میں مسلمانہ کذاب کے دو قاصد آئے، حضور نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تم بھی مسلمانہ کا عقیدہ مانتے ہو؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو فرمایا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کو قتل کرنا، اب سوال یہ ہے کہ حضور نے رواج کا اتباع کیا؟ فرمایا کہ نبی کریم کا یہ فرمانا کہ قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا یہ بجائے خود تشریحی حکم ہے، نبی رواج کا قبیح نہیں ہوتا بلکہ حکم خداوندی کا قبیح ہوتا ہے۔

حضرت کی قیام گاہ پر زائرین کا ہجوم رہتا تھا ہر وقت کسی نہ کسی مومنوع پر تقریر فرماتے رہتے تھے۔ بہت سے لوگ حضرت سے بیعت بھی ہوئے۔ رات دن یہی شغل تھا۔ رات کے ایک بجے تک بیٹھے رہتے۔ قرآن وحدیث وفقہ تصوف وغیرہ علوم وفنون کے دقیق مسائل علماء کرام و صوفیاء عظام دریافت کرتے رہتے ہر ایک کے جواب میں ایسی محقق اور مبسوط تقریر فرماتے گویا ساری عمر اسی میں لگائی ہے۔ ایک عالم دین نے مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدت شہود کے متعلق سوال کیا، بس پھر کیا تھا تین دن عصر سے مغرب تک اور مغرب سے عشاء تک اسی پر بیان فرماتے رہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کی عبارات زبانی سنا ہے ہیں۔ معارف لدنیہ میں یہ فرماتے ہیں، مکتوبات شریفہ میں یہ فرماتے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ کی یہ تحقیق ہے، عیقات میں شاہ اسماعیل شہیدؒ نے یوں فرمایا، حضرت شیخ اکبر محی الدین العربیؒ نے فتوحات میں یہ فرمایا ہے فصوص الحکم میں یہ ارشاد ہوتا ہے، حضرت مولینا حاجی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی نظمیں یہ نظمیں وحدۃ الوجود پر طویل طویل پڑھ کر سنار ہے ہیں، حضرت مولینا دین پوری نور اللہ قدہم بھی مع اپنے خدام کے تشریف فرما رہتے تھے۔ مولینا غلام محمد صاحب گھوٹوی حضرات مولینا عبداللطیف ناظم مدرسہ مظاہر العلوم،

مولینا مرتضیٰ حسن صاحب حکیم عبدالرشید افسر الاطباء بھاو پور غرض ہر طبقہ محفوظ ہوتا تھا حضرت ہلم صاحب سہارنپوری بڑی عقیدت کے ساتھ دوزانو سامنے بیٹھے رہتے تھے اور استفادہ فرماتے رہتے تھے مولینا شمس الدین بھاو پوری مرحوم کے کتب خانہ سے معجم کبیر طبرائی کا قلمی نسخہ منگایا، حضرت ہلم آئے احقر کو حکم فرمایا کہ روزانہ مجھے اس میں احادیث نقل کر کے دیا کر چنانچہ نشان دہی فرمائی جاتی اور احقر کو یہ سعادت نصیب ہوتی فرمایا کہ قلمی کتاب کا پڑھنا مشکل ہوتا ہے میں آپ کو طریقہ سکھاتا ہوں چنانچہ تھوڑی سی رہنمائی سے احقر نے خوب سمجھ لیا۔ معجم کے اس نسخہ میں کہیں اعراب و نقاط کا نام و نشان نہ تھا نہیں۔ مولینا مفتی محمد شفیع صاحب اور مولینا محمد مرتضیٰ حسن مرحوم کے بیانات پہلے خود ملاحظہ فرماتے۔ جگہ جگہ رہنمائی فرماتے جب خود تسلی فرمالیتے تو کچھری میں جانے دیتے، لیکن خود حضرت کوئی تیاری نہ فرماتے، ایک بجے شب تک تو جیسے اوپر گزرا وعظ و تلقین و ارشاد بیان مسائل ہوتا رہتا، صرف ایک گھنٹہ آرام فرماتے۔ دو بجے تہجد کے لئے اٹھتے، فجر کی نماز تک مراقبہ رہتے۔ پاس انفاس میں مشغول رہتے، اول وقت نماز فجر کی امامت خود کرتے پھر سورج نکلنے تک کچھ پڑھتے رہتے، چائے پی کر موٹر سے کچھری تشریف لے جاتے، سات بجے سے ایک بجے تک بیان ہوتا رہتا۔ ضعف و نقاہت بغایت تھا لیکن تکان مطلقا محسوس نہ فرماتے تمام رفقاء سفر و دیگر علماء کا خوب اہتمام سے تفقد فرماتے رہتے۔ مجلس مشاورت میں خاص خاص علماء کو شامل فرماتے۔ احقر پر اتنی نوازشات و عنایات کی بارش ہوتی رہتی تھی کہ بیان سے باہر۔ ہذا احقر کو نے قادیانیوں کی کتب سے بعض نئی باتیں نکال کر پیش کیں۔ بہت خوش ہوئے اور بار بار علماء کو بلا کر دکھاتے۔ جب تک احقر مجلس مشاورت میں حاضر نہ ہوتا بات شروع نہ فرماتے تخلیہ میں بھی مشورہ فرماتے اور باصرہ فرماتے کہ تیری اس میں کیا رائے ہے؟ بھاو پور شہر میں جامع مسجد و دیگر مقامات پر قادیانیت کے خلافت تقریر کرنے کے لئے علماء کو بھیجتے رہتے تھے، دو دفعہ احقر بھی بھیجا، ان ایام میں اس قدر حضرت کے چہرہ مبارک پر انوارات کی بارش ہوتی رہتی تھی، ہر شخص اس کو محسوس کرتا تھا۔ احقر نے بار بار دیکھا کہ اندھیرے کمرے میں مراقبہ فرما رہے ہیں لیکن روشنی ایسی جیسے بجلی کے قمقمے روشن ہوں، حالانکہ اس وقت بجلی گل ہوتی تھی۔ بھاو پور جامع مسجد میں جمعہ کی نماز حضرت اقدس ہی بڑھایا کرتے تھے بعد نماز کچھ بیان بھی ہوتا تھا ہزاراں ہزار کا مجمع رہتا تھا پہلے جمعہ میں فرمایا کہ ”حضرات! میں نے ڈابھیل جانے کے لئے سامان سفر باندھ لیا تھا کہ یکا یک مولینا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ کا خط دیوبند موصول ہوا کہ شہادت دینے کے لئے بھاو پور آئیے۔ چنانچہ اس عاجز نے ڈابھیل کا سفر ملتوی کیا اور بھاو پور کا سفر کیا۔ یہ خیال کیا کہ ہمارا نامہ اعمال تو سیاہ ہے ہی، شاید یہی بات میری نجات کا باعث بن جائے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا جانبدار ہو کر بھاو پور میں آیا تھا۔ بس اس فرمانے پر تمام مسجد میں، چنانچہ جہاں پہنچی ہوگی

دعا کرے مار مار کر اور پھوٹ پھوٹ کر رہے تھے۔ خود حضرت پر ایک عجیب کیفیت وجد طاری تھی۔ ایک مولوی صاحب نے اختتام وعظ پر فرمایا، کہ حضرت شاہ صاحب کی شان ایسی ہے، اور آپ ایسے بزرگ ہیں وغیرہ حضرت فوراً کھڑے ہو گئے فرمایا حضرت ان صاحب نے غلط کہا ہے ”ہم ایسے نہیں ہیں بلکہ ہمیں تو یہ بات یقین کے درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ ہم سے گلی کا کتا بھی اچھا ہے، ہم اس سے گئے گزر رہے ہیں۔“ سبحان اللہ! اکسار اور تواضع کی حد ہو گئی۔

لاہور اسی سفر کے سلسلہ میں دو روز قیام فرمایا تھا آسٹریلیین بلڈنگ کی مسجد میں بعد نماز فجر وعظ فرمایا۔ علماء و فضلاء عوام و خواص بالخصوص ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور ان کے ساتھی اہتمام سے حاضر ہوتے تھے۔ بیان ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، مالک تعالیٰ سے علاقہ پیدا کرو۔ غرض حضرتؒ نے خطبہ شروع فرمایا۔

الحمد لله نحمده ونستعينه الخ وعظ کرسی پر بیٹھ کر فرما رہے تھے۔ احقر کے دل میں وسوسہ گزرا کہ مسجد میں شاید کرسی بچھانا سوء ادب ہو حضرت نے فوراً خطبہ بند کر دیا، فرمایا کہ مسجد میں کرسی بچھانا نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ چنانچہ مسلم شریف میں روایت ہے کہ ایک مالک کے جواب دینے کے لئے حضور ﷺ کے لئے مدینہ کے بازار سے کرسی لائی گئی۔ راوی کہتا ہے کہ اس کرسی کے پائے سیاہ تھے غالباً لوہے کے تھے۔ مصلیٰ کے قریب رکھی گئی حضور نبی کریم ﷺ نے اس پر بیٹھ کر جوابات دیئے۔ یہ فرمایا اور پھر خطبہ شروع فرما کر حضرتؒ نے وعظ کیا احقر نماز امت سے پسینہ پسینہ ہو گیا۔

بہر کیف قادیانی مختار نے کہا کہ تحذیر الناس میں مولینا محمد قاسم نانوتویؒ نے بھی بعد خاتم النبیین نبی کا آماجوبیز کیا ہے۔ فرمایا حج صاحب لکھے حضرت مولینا محمد قاسم نے اپنے الہامی مضمون میں نبی کریم ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کے متعلق دلائل و براہین ساطعہ بیان فرمائے ہیں اور اکثر عبد اللہ بن عباسؓ کی علمی توجیہات فرمائی ہیں ان لوگوں پر حیرت ہے جو تحذیر الناس کو بغور و بالاستیعاب دیکھتے نہیں۔ اسی رسالہ میں جا بجانی کریم ﷺ کا خاتم النبیین زمانی ہونا اور اس کا اجماعی عقیدہ ہونا اور اس پر اپنا ایمان ہونا ثابت فرمایا ہے۔ رسالہ کے صفحات کی عبارت میں آپ کو لکھوانا چاہتا ہوں، حضرت مولینا فرماتے ہیں۔ سو اگر اطلاق و عموم ہے، تب تو ثبوت خاتمیت زمانی ظاہر ہے۔ ورنہ تسلیم کردم خاتمیت زمانی بدلالة التزامی ضرور ثابت ہے۔ ادھر تصریحات نبوی مثل انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا نبي بعدي او كما قال جو بظاہر بطرند کو اسی لفظ خاتم النبیین سے مانو ہے، اس بات میں کافی ہے کیونکہ یہ مضمون درجہ تو اتر کو پہنچ گیا ہے اور اس پر اجماع بھی منعقد ہو گیا ہے گو الفاظ مذکور مستند تو اتر منقول نہ ہوں سو یہ عدم تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی یہاں ایسا ہی ہوگا

جیسا تو اتر تعداد رکعات فرائض دو ترو غیرہ باوجود یکہ الفاظ احادیث مشعر تعداد رکعات متواتر نہیں جیسا اس کا منکر کافر ہے ایسا ہی اس کا منکر بھی کافر ہوگا۔

اسی رسالہ کے دوسرے صفحات میں بھی جا بجا حضور کی خاتمیت زمانی کا اقرار فرمایا ہے۔ نیز مناظر عجیبہ جو صرف اسی موضوع پر ہے اور آپ حیات قاسم العلوم، انتصار الاسلام وغیرہ کتب مصنف حضرت نانوتویؒ دیکھنا چاہئے حضرت مولینا مرحوم حضور ﷺ کے لئے تین طرح کی خاتمیت ثابت فرماتے ہیں۔ ایک بالذات یعنی مرتبہ حضور کا خاتمیت ذاتی کا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ وصف نبوت کے ساتھ موصوف بالذات ہیں اور انبیاء کرام ﷺ موصوف بالعرض اور آپ کے واسطے سے جیسا کہ عالم اسباب میں موصوف بالنور بالذات آفتاب ہے۔ اس کے ذریعے سے تمام کواکب قمر وغیرہ اور دیگر اشیاء ارضیہ متصف بالنور یہی حال وصف نبوت کا ہے حضور نبی کریم ﷺ اس سے متصف بالذات ہیں اور اسی وجہ سے آنحضور کو سب سے پہلے نبوت ملی۔ حدیث میں ہے کنت نیا و اوم منجل بین الماء والطين اور دوسرے حضرات انبیاء ﷺ حضور کے واسطے سے متصف بالنور ہوئے حدیث میں ارشاد ہے لو کان موسیٰ حیالما وسعد الاتباعی اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر چارہ نہ ہوتا چارہ ۳ کے آخری رکوع میں ارشاد ہوتا ہے و اذا اخذ الله ميثاق النبين لم اتيناكم من كتاب وحكمة لم جاءكم رسول مصدق لما معكم لتؤمنن به ولتنصرنه الا یہ۔ اس آیت سے صاف واضح ہے کہ نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ جیسا کہ اس امت کے رسول ہیں، نبی الانبیاء ﷺ کی جماعت کو ایک طرف رکھا گیا اور نبی کریم کو ایک طرف اور سب سے حضور پر ایمان لانے اور مدد کرنے کا عہد و پیمان لیا گیا، آیت میں لم جاءکم فرما کر تصریح فرمادی گئی کہ حضور ﷺ کا زمانہ ظہور سب سے آخر میں ہوگا۔

آیت ميثاق در وے ثم ہست

ایں ہمہ از مقتضائے ختم ہست

ثم عربی زبان میں تراخی کے لئے آتا ہے اسی واسطے علی فترۃ من الرسل الایہ فرمایا۔ حدیث میں ہے "اننا دعوة ابی ابراہیم" میں اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں۔ تمام انبیاء علیہم السلام حضور ﷺ کی تشریف آوری کی بشارات دیتے آئے چنانچہ تورات شریف، انجیل شریف و دیگر صحف میں باوجود تحریف لفظی و معنوی ہو جانے کے اب بھی متعدد آیات موجود ہیں جو حضور کی خاتمیت اور افضلیت کا پتہ دیتی ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ تشریف لا کر اتباع شریعت محمدیہ کرنا اسی فضیلت اور خاتمیت کا عملی مظاہرہ ہوگا۔ لیلۃ المعراج میں انبیاء علیہم السلام کا صف بندی کر کے امام کا تختہ رہنا اور حضور ﷺ کا امامت کرنا بھی اسی امر کی صراحت کرتا ہے۔ واسئل من اولئنا من

ملکت من رسلنا الایہ بھی اس کی طرف مشیر ہے کہ لیلۃ المعراج میں انبیاء علیہم السلام کا اجتماع حضور ﷺ کے ساتھ ہوا۔ اور ابن حبیب عبد اللہ بن عباس سے راوی ہیں کہ یہ آیت لیلۃ المعراج میں نازل ہوئی (القرآن) اور انسا خطیبہم اذا انصتوا اور احادیث شفاعت بھی اسی فضیلت محمدیہ کا اعلان کرتی ہیں معلوم ہوا کہ حضور ﷺ پر نبوت کا اختتام ہوا اور پہلے انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نہ کسی کا زندہ رہنا ضروری تھا، تاکہ بطور نمائندہ سب کی جانب سے حضور ﷺ کے دین کی نصرت کریں۔ چنانچہ یعنی لیلۃ کا انتخاب ہوا۔ اس لئے کہ آپ انبیاء نبی اسرائیل کے خاتم نہیں اور سلسلہ اسحاقی اور اسماعیلی کو جو زدیہ منظور ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تین امور کا اعلان فرمایا:

(۱) ایسا بنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم اے بنی اسرائیل! میں فقط تمہاری طرف مبعوث ہو کر آیا ہوں۔

دوسری جگہ آل عمران میں ورسولاً الی بنی اسرائیل فرمایا گیا ہے ”صرف بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر“۔

(۲) مصداقاً لما بین یدی من التوراة: میرے پاس جو کتاب (توریت) ہے اس کی تصدیق کرنے والا ہوں۔

(۳) ومبشراً برسول یأتی من بعدی اسمہ احمد میں ایک عظیم الشان رسول برحق کی خوشخبری سنانے آیا ہوں جو میرے بعد مبعوث ہوں گے ان کا نام احمد ہے قرآن عزیز اعلان کرتا ہے کہ وہ رسول برحق جن کے متعلق عالم ارواح میں انبیاء علیہم السلام سے عہد و پیمان ہوا اور بشارات دی گئی تھیں آچکا۔ جاء الحق وصدق المرسلین۔ حدیث شریف میں ہے انی اولی الناس بعیسی بن مریم الخ مجھے عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ قرب ہے بہ نسبت تمام لوگوں کے اور بلاشبہ وہ نزول فرمائیں گے۔ انبیاء اسرائیل کے آخری نبی اولوالعزم کا خاتم النبیین علی الاطلاق کے دین کی نصرت کے لئے تشریف لانا اور شریعت محمدیہ پر عمل فرمانا حضور ﷺ کے افضل الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہونے کا عملی مظاہرہ ہے۔ فضیلت محمدیہ کو دنیا پر واشگاف کر دینا منظور ہے آپ کا حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں تشریف لانا ایسا ہی ہے۔ جیسے ایک نبی دوسرے نبی کے علاقہ میں چلا جائے۔ چنانچہ حضرت یعقوب حضرت یوسف علیہ السلام کے علاقہ میں تشریف لے گئے تھے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے تو نبی ہی ہوں گے لیکن بہ حیثیت حکما عدلا تشریف آوری ہوگی بطور جمعیت فرمانے کے تشریف آوری ہوگی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ قرب قیامت میں عیسائی اقوام کی مسلمانوں سے مذبحیڑ ہے گی لہذا اہل کتاب کی اطلاع کے لئے

تشریف لائیں گے ثالث وہی ہوتا ہے جو ہر دو فریق کے نزدیک مسلم ہو۔ ہماری کتابیں عقیدہ الاسلام، تحفۃ الاسلام، التصریح بما تواتر فی نزول اسحٰب اس باب میں دیکھنا چاہئے۔

دوم خاتمیت زمانی یعنی آپ کا زمانہ نبوت اس عالم مشاہدہ میں تمام انبیاء علیہم السلام کے آخر میں ہے۔ آپ کے بعد کسی کی نبوت کی تقویض نہ ہوگی حضرت عیسیٰ علیہ السلام آں حضور ﷺ سے پہلے ہی بنائے جا چکے ہیں۔ نزول عیسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ اسلام کا اجماعی اور متواتر عقیدہ ہے۔

مرزا غلام احمد نے اجماع کو حجت مانا ہے اور اس کے منکر پر لعنت کا اعلان کیا ہے (انجامِ محترم ۴۴) (مرزا صاحب نے کفار کے تواتر کو بھی حجت مانا ہے چہ جائیکہ تمام امت محمدیہ کے تواتر سے ثابت شدہ عقیدہ (تریاق القلوب) حضرت نانوتویؒ نے تیسری خاتمیت مکانیہ ثابت فرمائی ہے یعنی وہ زمین جس میں نبی کریم ﷺ جلوہ افروز ہوئے وہ تمام زمینوں میں بالاتر اور آخری ہے اور اس کے اوپر کوئی زمین نہیں اس کا بدل لائل ثابت فرمایا ہے۔

قادیانی مختار مقدمہ نے سوال کیا کہ امام مالکؒ سے منقول ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے قائل ہیں۔ احقر سے فرمایا کہ ابی کی شرح مسلم شریف نکالو۔ چنانچہ ۶۶۶ ج ۶ بطور مصرعے ذیل کی عبارت پڑھ کر سنائی:

وفي العتبه قال مالك بينا الناس قيام يستمعون لاقامة الصلوة فتعشاهم غمامة فاذا عيسى قد نزل الخ عتبه میں ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا در انحالیکہ لوگ کھڑے نماز کی اقامت سن رہے ہوں گے۔ اچانک ان کو ایک بادل ڈھانپ لگا یا ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے۔

امام مالکؒ کا بھی وہی عقیدہ ہے جو ساری امت محمدیہ کا اجماعی اور متواتر عقیدہ ہے۔ ہم نے جمع کیا ہے کوئی تیس اکتیس صحابہ رضی اللہ عنہم احادیث نزول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے راوی ہیں۔ تابعین کا تو احصاء بھی مشکل ہے امام ترمذیؒ نے پندرہ صحابہ کوائے ہیں ہم نے مزید پندرہ کا اضافہ کیا۔ چنانچہ مسند احمد و کنز العمال و دیگر کتب حدیث کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں۔

ہمارے رسالہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح کا مطالعہ کیجئے۔

قادیانی نے سوال کیا کہ علماء بریلوی، علماء دیوبندی پر کفر کا فتویٰ دے رہے ہیں اور علماء دیوبند علماء بریلوی پر (حضرت شاہ صاحبؒ) نے ارشاد فرمایا (تج صاحب! احقر بطور وکیل تمام جماعت دیوبند کی جانب سے گزارش کرتا ہے کہ حضرات دیوبند ان کی تکفیر نہیں کرتے، اہلسنت والجماعہ اور مرزائی مذہب والوں میں قانون کا اختلاف ہے۔ علماء دیوبند اور علماء بریلی میں واقعات کا اختلاف ہے۔ قانون کا اختلاف نہیں۔ چنانچہ فقہاء حنفیہ نے تصریحات فرمائی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کلمہ کفر کسی شبہ کی بنا پر کہتا ہے تو اس کی تکفیر نہ کی جائے گی)۔ دیکھو درالبحار اور بحر الرائق۔

حضرت شاہ صاحب کے سیاسی نظریات

(کونسلر)

دارالعلوم دیوبند نے ابتداء سے ہی اپنا تعارف ایک مذہبی ادارہ کی حیثیت سے کرایا تھا اور اس نے اپنا نصب العین یہی مقرر کیا تھا کہ مسلمانوں میں اسلامی علوم کی اشاعت کی جائے اور دینی روح کی تربیت کی جائے اس کے بانی اور معاونین بھی خواہوں کا یہ خیال تھا کہ اس دینی ادارے کو ہجرت کی سیاست کی سرگرمیوں اور پارٹیوں کی دھڑے بند یوں سے بچا کر خالص دینی خدمت انجام دینے کے لئے وقف کر دیا جائے تاکہ مسلمان اپنے ذہن اور اس کے احکامات کو اچھی طرح سمجھ کر اپنی زندگی کو اپنے اسلاف کی زندگیوں کا نمونہ بنائیں، اور ایک بار پھر اپنے کھوئے ہوئے وقار کو پائیں لیکن سیاسیات سے یہ اجتناب زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا اور رفتارِ وقت کے تقاضوں کے باعث سیاست کے قدم دارالعلوم میں داخل ہو گئے۔

مولینا رشید احمد (گنگوہی) اور مولینا محمد قاسم (نانوتوی) یہ وہ حضرات تھے جو حاجی امداد اللہ صاحب کی سرپرستی میں کاربائے عظیم انجام دے چکے تھے، ۱۸۵۷ھ علم آزادی بلند کر کے شامی ملی، تھانہ بھون وغیرہ میں انگریزی اقتدار کا مقابلہ کیا تھا۔ ان کے سینوں میں ہمیشہ آزادی اور جہاد کی آگ سکتی رہی یہی وجہ تھی کہ حضرت شیخ الہند میں انگریزی اقتدار کے فنا کر دینے کا جذبہ مستقل طور پر جاگ رہا ہو گیا تھا۔

کیونکہ حضرت شیخ الہند کا اعتقاد تھا کہ انگریز ہندوستان کا سب سے بڑا دشمن ہے اور ہندوستان جو مذہبی اور روحانی ملک ہے انگریز اسے بالکل ناستک اور بے دین بنا کر رکھ دینا چاہتا ہے۔ اور ظلم کرنا انگریز کا شیوہ بن گیا ہے۔

حضرت موصوف چونکہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے واقعات صغریٰ کی وجہ سے پوری طرح نہیں دیکھ سکے تھے۔ لیکن ایامِ بلوغت میں اپنے والدین اور اساتذہ خصوصاً مولینا رشید احمد گنگوہی اور مولینا محمد قاسم نانوتوی سے وہ انسانیت سوز مظالم اور بربریت کے معاملات سنے جو انگریزوں نے اہل ہند کے ساتھ کئے تھے۔ اس لئے آپ کے دل میں انگریزی حکومت کی نفرت تھی۔

۱۸۵۷ء سے پانچ سال بعد ۱۸۶۲ء میں خاندانِ ولی اللہ کے جانشین اور سید احمد شہید کے

خلفاء نے آزاد سرحد پر باقاعدہ جنگ شروع کی جس کے مقابلہ کے لئے وائسرائے ہند کو بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ ۱۸۶۳ء میں انبالہ کے مقدمہ کے بعد ہی تحریک دارالعلوم دیوبند شروع ہو گئی۔ جو مسلمانان ہند کی ایک مہتمم بالشان مذہبی علمی اور سیاسی تحریک تھی ۱۔

آخر ۱۹۱۴ء میں جب سیاسی اشخاص کی گرفتاری اور نظر بندی کا سلسلہ شروع ہوا تو مولینا محمد علی جوہر، مولینا شوکت علی اور مولینا آزاد جیسے اکابر بھی گرفتاری سے نہ بچ سکے۔ ان حالات میں مولینا محمود الحسن کا حکم مولینا عبید اللہ سندھی کے پاس پہنچا کہ میں حجاز جاتا ہوں تم کا بل پہنچو۔

چنانچہ ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند تحریک آزادی ہند ہی کے سلسلے میں حجاز مقدس کو روانہ ہوئے تو انگریزوں نے آپ کو گرفتار کر کے کئی سال نظر بند رکھا۔ تحریک خلافت کے اس دور میں ہجرت کے بعد حضرت شیخ الہند نے قید و بند کی جو مصیبتیں مالٹا میں جھیلیں اس نے دیوبند کے اساتذہ اور طلباء میں خاص طور سیاسی احساسات کو بیدار کر دیا۔

۱۹۱۹ء میں امن و جدوجہد کا آغاز ہوا، تحریک حریت کے سلسلے میں خفیہ میٹنگوں کے بجائے کھلے عام جلسے ہونے لگے۔ خلافت کمیٹی وجود میں آئی۔ تحفظ ملت اور مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے جمعیۃ العلماء ہند قائم کی گئی جس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں لکھنؤ کے مولینا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں ہوا۔

۱۳ جون ۱۹۲۰ء کو مالٹا سے رہائی کے بعد حضرت شیخ الہند دیوبند واپس تشریف لائے جہاں انگریزوں کے ساتھ ترک موالات اور تحریک خلافت نے آپ کو خاص طور پر سرگرم عمل کر دیا۔

یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ جب مالٹا سے رہا ہو کر حضرت واپس تشریف لائے تو نصاریٰ سے ترک موالات کا مسئلہ زیر غور تھا قرار پایا کہ یہ مسئلہ حضرت شاہ صاحبؒ سے تحریر کر لیا جائے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ ہی نے فتویٰ لکھا اور حضرت شیخ الہند کی خدمت اقدس میں سنایا۔ مولینا لاکپوری فرماتے ہیں کہ صرف دس سطور تھیں لیکن ایسا جامع مانع کہ حضرت شیخ الہند نہایت محفوظ ہوئے ۲۔
مولینا لاکپوری اپنے ایک مضمون ”کمالات انوری“ مطبوعہ رسالہ دارالعلوم جولائی ۱۹۶۳ء میں رقمطراز ہیں کہ:

”جب حضرت شیخ الہند قدس سرہ مالٹا سے تشریف لائے تو حضرت کو فکر تھی کہ یہاں کے علماء اختلاف نہ کریں اس لئے سب سے پہلے حضرت شاہ صاحبؒ نے انگریز کی

موالات ترک کرنے اور ان کی ملازمت چھوڑنے پر فتویٰ حاصل کر لیا۔
بہر حال حضرت شیخ الہندؒ کی مالٹا سے رہائی کے بعد آپ کی عمر نے زیادہ وفات کی اور ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو آپ داعی اجل کو لبیک فرما گئے رحمہ اللہ رحمۃ واسعہ۔

حضرت شیخ الہندؒ کی سیاسی خدمات کا تذکرہ فرماتے ہوئے شاہ صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وہ جانا بازی جو حضرت شیخ الہندؒ نے دکھائی ہے وہ تو کوئی کیا دکھائے گا۔ ہاں احق ضرور واضح کر دینا چاہیے ①۔

حضرت شیخ الہندؒ کے خاص فیض یافتوں میں سے مولینا مدنی، مولینا عبید اللہ سندھی اور مولینا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ تو سیاستین کی صف اول میں داخل ہو گئے۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ چونکہ اشاعت علم دین اور تبلیغ اسلام کو زندگی کا نصب العین بنا چکے تھے اور خالص علمی آدمی تھے اس لئے سیاست کے میدان میں بہت کم نظر آئے لیکن اس کے باوجود ملکی مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے مختصر الفاظ میں یوں عرض کیا جاسکتا ہے کہ ملکی سیاست میں آپ بھی اپنے استاد محترم حضرت شیخ الہندؒ کے مسلک کے پیرو اور برطانوی امپریلزم کے سخت ترین مخالف تھے۔ انگریزی حکومت سے آپ کو قلبی تفرقہ تھا۔ ایک بار لاہور میں علماء سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم لوگوں کو پیٹ کے لئے روٹی بھی دین کے نام پر ہی ملتی ہے۔ آخر تم بھی کچھ کیا کرو۔ میں آجکل اتنا علیل ہوں کہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوں لیکن پھر بھی اس حالت میں جیل جانے کے لئے تیار ہوں۔

آپ شروع سے آخر تک جمعیتہ علماء دیوبند کی مجلس عاملہ کے رکن اعلیٰ رہے اور ہمیشہ اپنے گراں قدر اور فاضل مشوروں سے جمعیتہ کی رہنمائی فرماتے تھے۔ مولینا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب اکثر آپ سے مشورہ لینے کے لئے خود دیوبند تشریف لاتے تھے۔ جمعیتہ علماء کے علاوہ مجلس احرار ہند کے حال پر بھی حضرت مرحوم کا گوشہ چشم التفات مبذول رہا اور اس کے قائدین کی بھی حضرت مرحوم نے اپنے علم و فضل اور روحانی قوت سے قیادت و رہنمائی فرمائی اور انہیں انگریزی راج کی مخالفت کے ساتھ ساتھ روحانیت کی مہم پر لگا دیا۔ احرار نے اس فتنہ کے استیصال کے لئے قابل قدر سرگرمی کے ساتھ جو ناقابل جہاد کیا اس میں حضرت شاہ صاحب کا ہاتھ نمایاں تھا۔

تحریک حریت کشمیر میں بھی مجلس احرار کو حضرت شاہ صاحبؒ کی تمام تر ہمدردیاں شامل حال تھیں۔

جمعیتہ العلماء کی صدارت: ۱۳۰۲ اور ۱۳۰۳ء نومبر ۱۹۲۸ء کو پشاور میں جمعیتہ علماء ہند کا آٹھواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ جس کی صدارت حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمائی اور ایک نہایت بصیرت

افروز، معرکہ الاراء اور تاریخی خطبہ صدارت ارشاد کیا جس میں بہت سے اہم دینی شرعی و سیاسی موضوعات پر اپنے مجتہدانہ خیالات کا اظہار فرمایا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب شدھی سنگٹھن اور ہندو مسلم بلوؤں کے طویل سلسلہ نے پورے ہندوستان کی فضا کو مکدر کر رکھا تھا اور مشہور نہرو رپورٹ نے مسلم لیگ، مجلس خلافت اور جمعیتہ العلماء ہند اور کانگریس کے درمیان کشیدگی پیدا کر دی تھی اختلافات کے اس پر آشوب دور میں حضرت شاہ صاحب نے اپنے خطبہ صدارت میں جو رہنمایانہ خیالات ظاہر کئے ان کا اندازہ کرنے کے لئے آپ کے اس خطبہ سے چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

حب وطن کی شرعی حیثیت:..... حضرت شاہ صاحب نے فرمایا:

”ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے ہوئے اور رہتے ہوئے صدیاں گزر گئیں انہوں نے اس ملک پر صدیوں حکومت کی آج بھی ہندوستان کے چپے چپے پر مسلمانوں کی شوکت و رفعت کے آثار موجود ہیں۔ موجود نسل کا خمیر ہندوستان کے آب و گل سے ہے۔ ہندوستان میں ان کی عظیم الشان مذہبی اور تمدنی یادگاریں ہیں کروڑوں روپے کی جائیدادیں ہیں عالی شان تعمیرات اور وسیع قطعات زمین کے مالک ہیں ان کو ہندوستان سے ایسی محبت ہے جیسے ایک سچے حب وطن کو ہونی چاہیے اور کیوں نہ ہو جب ان کے سامنے اپنے سید و مولا اپنے محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا حب وطن میں اسوۂ حسنہ موجود ہے۔ وہ یہ کہ حضور نے کفار کے جور و ستم سے مجبور ہو کر حکم خداوندی کے تحت اپنے پیارے وطن مکہ معظمہ سے ہجرت کے وقت وطن عزیز کو خطاب کر کے فرمایا۔“

خدا کی قسم خدا کی تمام زمین میں تو مجھے سب سے زیادہ پیارا شہر ہے اور اگر میری قوم مجھے تجھ سے نہ نکالتی تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا۔

اس کے بعد جب حکم الہی سے آپ نے مدینہ طیبہ میں سکونت فرمائی اور ہجرت کے بعد دار الحجرت سے منتقل ہونا محبوب و مستحسن نہ تھا۔ اس لئے گویا مدینہ طیبہ آپ کا وطن ہو گیا اور اس میں بحیثیت وطن رہنا تھا تو اس کے لئے یوں دعا فرمائی۔

اللہم حبب الینا المدینۃ کحبنا مکہ ارلاش اللہم بارک لنا فی صاعنا و فی مدنا و فی ثمرناضعفی ما جعلت بمکۃ من البرکۃ اللہم

ان ابراہیم عبدک و خلیک دعاک لاجل مکة للبرکة و انا محمد عبدک
و رسولک ادعوک لاهل المدينة ان تبارک لهم فی مدہم و صاعہم
مثلی ما ببارک لاهل مکة مع البرکة برکتین۔

خدا یا اللہ! یہ کو ہمارے دلوں میں ایسا محبوب بنادے جیسا ہم مکہ سے محبت کرتے ہیں یا اس سے
بھی زیادہ محبت دیدے اے اللہ! ہمارے صاع ہمارے مد اور ہماری کھجوروں میں مکہ کی برکت
سے دو چند برکت عطا فرما خداوند! آپ کے بندے آپ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے
آپ سے مکہ والوں کے لئے برکت کی دعا کی تھی۔ میں تیرا بندہ اور تیرا رسول محمد ہوں۔ اہل
مدینہ کے لئے تیری بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ ان کے مد اور صاع میں اس برکت سے جو
برکت اہل مکہ کو عطا فرمائی دو چند برکتیں عطا فرما۔ ایک برکت کے ساتھ دو برکتیں نازل فرما۔

خطبہ جاری رکھتے ہوئے حضرت شاہ صاحب نے ارشاد کیا کہ:

سید الکونین علیہ السلام کے جذبات حب وطن یہ ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے کیا ممکن ہے کہ مسلمان
چاہے مسلمان ہو کر اس جذبہ حب وطن سے خالی ہو۔ اور چونکہ ہندوستان میں دوسری قومیں بھی آباد
ہیں ان کو طبعی طور پر اپنے وطن ہندوستان سے محبت ہونی چاہئے، اس لئے تمام ہندوستان کے قلوب
میں ہندوستان کی آزادی کی خواہش ایک ہی مرتبہ اور ایک ہی درجہ پر ہونی لازم ہے ❶۔

افغانی خطرہ کا حل:..... حضرت شاہ صاحب نے وضاحت فرمائی کہ یہ خطرہ کہ آزادی کے
وقت اگر کسی مسلمان حکومت نے ہندوستان پر حملہ کیا تو مسلمان کا رویہ کیا ہوگا نہایت پست خیال
ہے اور اس کا نہایت سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے ہمسایوں کی طرف سے کسی
معاہدہ کی وجہ سے مطمئن ہو گئے اور ہمسایہ کی تعدی کا شکار نہ ہوں گے تو ان کا رویہ اس وقت وہی
ہوگا جو کسی شخص کا اس کے گھر پر حملہ ہونے کی حالت میں ہوتا ہے اگرچہ حملہ آور اس کا ہم قوم اور ہم
مذہب ہو اس سے زیادہ ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جب مسلمانان ہندوستان اپنے معاہدہ
کی وجہ سے پابند ہوں اور غیر مسلم اقوام سے اس کا معاہدہ نہ برتاؤ واجب ہو تو ایسی حالت میں کسی
مسلمان بادشاہ کو مذہباً اس کی اجازت نہیں کہ مسلمانان ہند کے معاہدے کو توڑے اور ہندوستان پر
حملہ آور ہو بلکہ اس پر واجب ہوگا کہ وہ مسلمانان ہند کے اس معاہدے کا پورا پورا احترام کرے۔

رسول خدا علیہ السلام کا ارشاد ہے:

ذمة المسلمین واحدة يسعى بها ادناهم

مسلمانوں کا عہد اور ذمہ داری ایک ہے ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی کوئی عہد کرے تو دوسروں

پراس کا احترام لازم ہے۔

اسی طرح حضور ﷺ کا دوسرا ارشاد ہے:

كل صلح جائز الا صلحا احل حراما او حرم حلالا
یعنی سوائے اس صلح کے جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کر دے ہر قسم کی صلح جائز اور درست ہے۔

مخلصانہ یقین دہانی:..... میں نہایت بلند آہنگی کے ساتھ برادران وطن کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ معاہدہ کر لیں اور اس معاہدہ کو دیانتداری اور خلوص کے ساتھ پورا کریں۔ سیاسی چالوں اور نمائشی پالیسی سے کام نہ لیں تو مسلمانوں کو پورا وفادار مخلص ہمسایہ پائیں گے۔ کیونکہ مسلمان حکم قرآن کے بموجب معاہدہ پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔
ارشاد خداوندی ہے:

الا الذين عاهدتم من المشركين ثم لم نقضوكم شيئا ولم يظاهروا عليكم احدا فاتمرو اليهم عهدهم الى مديتهم ان الله يحب المتقين..... وقال ايضا..... فما استقاموا لكم فاستقيموا لهم ان الله يحب المتقين.
جن غیر مسلموں سے تم نے معاہدہ کیا اور انہوں نے ایفائے عہد میں تمہارے ساتھ کسی نہیں کی اور تمہارے خلاف کسی کو مدد نہیں دی تو تم بھی معاہدہ کی مدت تک معاہدہ پورا کرو بیشک اللہ تعالیٰ پر ہیزگاروں سے محبت کرتا ہے۔

اسی طرح فرمایا:

جب تک غیر مسلم تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی سیدھے رہو بے شک اللہ پر ہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے

دارالاسلام، دارالحرب یا دارالامان:..... اس خطبہ میں آپ نے ہندوستان کی شرعی حیثیت کی عالمانہ وضاحت فرمائی:

اس موقع پر ایک اور بات بھی قابل غور ہے جس کو پیش نظر نہ رکھنے سے بسا اوقات شدید غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ وہ بات یہ ہے کہ مسائل شرعیہ تین قسم کے ہیں۔ اول جو اسلامی حکومت اور انکی شوکت کے ساتھ متعلق ہیں۔ دوسرے جو دارالامان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تیسرے وہ جو دارالحرب میں جاری ہوتے ہیں۔ ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ دارالامان کا حکم دیا جاسکتا ہے۔ دارالاسلام کے احکام جاری ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ہمارے شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ العزیز نے تصریح فرمائی ہے کہ ہندوستان دارالاسلام نہیں ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا فتویٰ اس وقت کا ہے جب موجودہ زمانہ کے لحاظ سے ہندوستان میں اسلامیات کا رنگ بہت گہرا تھا۔

ایسی صورت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم دارالامان کے احکام کتب مذہب میں تلاش کریں ❶ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے خطبہ صدارت پر حاضرین کی توجہ حضور ﷺ کے اس معاہدہ کی بعض دفعات کی طرف مبذول کی جو آن حضور نے ابتداء زمانہ ہجرت میں باہم مسلمانوں مہاجرین و انصار اور یہود مدینہ کے ساتھ کیا تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے معاہدے کے متعدد دفعات کا ترجمہ پیش کرنے کے بعد دارالحرب اور دارالامان کے بہت سے احکام و مسائل اخذ کئے اور ان احکام و مسائل پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد فرمایا کہ میرا مقصود اس بحث کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کے احکام کا فرق واضح ہو جائے اور مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے ہم وطن غیر مسلموں اور ہمسایہ قوموں سے کس طرح اور کتنی مذہبی رواداری اور تمدنی و معاشرتی شرائط پر صلح و معاہدہ کر سکتے ہیں۔

یہ پیش بہا علمی خطبہ صدارت ۸۲ صفحات پر شائع ہوا ہے جس میں اس زمانہ کے سیاسیات پر بصیرت افروز مباحث کے بعد صوبہ سرحد کے بعض مراسم قبیحہ کی اصلاح کے متعلق بھی مفید مباحث ہیں۔ آخر میں عربی قصیدہ ہے۔ طوالت کے خوف سے اس کے آخری دو شعر نقل کئے جاتے ہیں:

واخر دعوانا ان الحمد للہ

ہدینا لہذا مرشد ای مرشد

صلوۃ و تسلیم علی خیر خلقہ

ختم جمیع الانبیاء محمد ❷



❶ اہل علم تفصیل کے لئے درمختی کے اس باب کو ملاحظہ فرمائیں جس میں اختلاف دار کے احکام بیان کئے گئے ہیں
❷ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو خطبہ صدارت مذکور

حضرت شاہ صاحب آئینہ کمالات صالحین کشمیر

از جناب سید میر قاسم صاحب سابق وزیر اعلیٰ جموں کشمیر

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں عقیدت کا یہ گلدستہ ہماری استدعا پر احترام آمیز جناب سید میر قاسم صاحب (سابق وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر) نے عنایت فرمایا ہے۔ جناب سید میر قاسم صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں گزشتہ تیس سال سے آپ سینکڑوں کشمیریوں کی صف اول میں چلے آ رہے ہیں۔ ریاست جموں کشمیر میں آپ قریباً اٹھارہ سال وزیر اور تین سال ڈھائی ماہ تک (۲۱ دسمبر ۱۹۷۱ء تا ۲۴ فروری ۱۹۷۵ء) وزیر اعلیٰ کی گدی پر کامیابی اور نیک نامی سے فائز رہے۔ اس کے بعد آپ مارچ ۱۹۷۵ء تک ہند کی مرکزی کابینہ میں سول سپلائر اور امداد باہمی کے وزیر رہے۔ خطہ جنت نظر کے بہت سے پیچیدہ سیاسی مسائل کی عقدہ کشائی آپ کے ناخن تدبیر اور ایثار کی مرہون منت ہے۔ (کوندو)

تازہ خواہی داشتن گرد اغہائے سینہ را
گا ہے گا ہے باز خواں این قصہ پارینہ را

کشمیر - رشی بھومی:..... سرزمین کشمیر کو جن خصوصیت پر فخر ہے ان میں قدرت اور فطرت کے عطیات بھی ہیں اور اس وادی کے فرزندوں کے ذہنی علمی اور روحانی کمالات بھی قدیم الایام سے کشمیر کو خدا دوست رشیوں اور زمینوں کی جائے پناہ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ہندوستان کے اہم مقامات کے مطابق زمانہ قدیم خاص کر ویدک پیریڈ میں بھارت کے جو لوگ خدائی احکام اور معیاری دھرم کی روشنی میں زندگی بسر کرنا چاہتے تھے وہ اپنی عمر کے پچیس سال حصول علم میں اور دوسرے پچیس سال (یعنی پچاس سال کی عمر تک) گھربار بسانے میں صرف کرتے تھے اور اس کے بعد گھربار، بیوی بچوں اور مال و جائیداد سے قطع تعلق کر کے بقیہ زندگی کو ہالیہ کے غیر آباد پہاڑوں اور جنگلوں میں تنہا کر پاد خدا کے لئے مخصوص کر دیتے تھے۔ کشمیر کی سرزمین اس زمانہ میں غیر آباد اور جنگلوں سے ڈھانپی ہوئی تھی۔ اس لئے یہ تارک الدنیا سنت سادھو پیر پنچال کو عبور کر کے یہاں پہنچ جاتے تھے اور یکسوئی کے ساتھ عبادت

برہمات کے پتیا کے لئے کشمیر کو ہمالیہ کے دوسرے پر بہار کو ہستان پر ترجیح دیتے تھے اور کشمیر میں
مر جانے کو سیدھا سورگ میں پہنچ جانے کے برابر سمجھتے تھے۔ کشمیر کے شیش ناگ اور امر ناتھ جیسے
مکیشروں پر ان کے تیر تھے اور جگہ جگہ سے غاروں میں یا چشموں اور ندی نالوں کے کناروں پر ان
ریشیوں اور مینوں کے عبادت خانے اور مٹھ تھے اور سنسکرت زبان میں وید اُپنشد اور دوسرے علوم کے پانٹھ
تائے تھے جن کے آثار کہیں کہیں اب تک باقی ہیں بعد میں ان خدا دوست لوگوں کے بتائے ہوئے
راستوں سے گزر کر کچھ گڈریئے، کسان اور دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ جنہوں نے کشمیر کے میدانی
علاقوں کو آباد کر کے بستیاں بسائیں اور پھر ایک نئی دنیا نئی زبان اور نئے لوگ پیدا ہو گئے جو کشمیری
کہلائے ویدک دھرم اور اس کے بعد یجن دھرم اور بدھ دھرم کے سادھوں، سننوں، بھکشوؤں اور مینوں
کے کشمیر آنے کا برابر تاننا بندھا رہا۔ آبادی کے بعد وادی کا مشہور نام تو کشمیر ہی رہا لیکن خدا دوست لوگوں
کی محبوب و مرغوب جائے عبادت ہونے کی وجہ سے علمی دنیا میں اس کو ”رشی بھومی“ جیسے عبادت گزاروں
کی سر زمین کے نام سے بھی پکارا جاتا رہا۔ رفتہ رفتہ یہ رشی بھومی و دونوں اور عالموں کا ایک ایسا مرکز بن
گئی کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں برہمن لوگ جب اپنے چار پانچ سال کے بچے کو جیو (زنار)
پہنانے کی رسم ادا کرتے تھے۔ تو بچے کی زبان سے کہلاتے کہ ”میں علم حاصل کرنے کے لئے کشمیر جاؤں
گا“ اور چند ایک قدم اس کو شمال کی طرف چلا کر اس قول کو عمل کی صورت دینے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

کشمیر۔ پیرواری:..... تیرہویں صدی عیسوی تک کشمیر کی فضا میں مذہب اسلام کے نام سے نا آشنا
تھیں، حالانکہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں تب تک یہ دین دور دور تک پھیل چکا تھا اور اس کے
مرد بادشاہت سے لیکر درویشی اور فقیری تک ہندوستان کی عوامی زندگی کے ہر شعبے میں حصہ دار بن چکے
تھے۔ آخر کار ۱۳۲۵ء ۷۲۵ھ میں پہلا مسلمان فقیر حضرت سید عبدالرحمن شرف الدین بلبل شاہ رحمۃ اللہ
علیہ سرینگر میں دریائے جہلم کے کنارے اترے اور ایک سہانی صبح کو اس کی اذان سحری نے بادشاہ وقت
(مہاراجہ کشمیر گیا پوررن چن) کے بے چین دل میں تلاش حق کی دہلی ہوئی آگ کو ہوادے دی۔ مہاراج
نے درپچہ کھول کر دیکھا تو درویش کو نماز صبح میں مصروف اور سر بسجود پایا اور وہ عابد کی اس ادا پر دل دے
بیٹھا۔ وہ بہادر انسان جواب تک بڑے بڑے معرکے سر کر چکا تھا اور جس کی خارا شکاف شمشیر کشمیر کے
اندرونی و بیرونی سوراخوں سے اپنا لوہا منوا چکی تھی اور جو کشمیر کے سیاہ و سفید کا مختار مطلق العنان تھا اس کو
ایک تنہا، نہتے اور غریب الوطن فقیر کی نماز سراپا گداز نے ہمیشہ کے لئے فتح کیا۔ اور وہ اس مرد روشن ضمیر
کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے ”رن چن مہاراج“ سے ملک صدر الدین شاہ کشمیر بن بیٹھا۔

مشیت ایزدی کے اس ظہور کے بعد باغ کشمیر کا دروازہ دنیا بھر سے آنے والی، روحانی، ہستیوں،

علماء و فضلاء اور اولیاء و اصفیاء کے لئے کھل گیا اور اس کے بعد اس ملک میں نہ صرف ہندوستان سے بلکہ عرب و عجم ایران، افغانستان، ترکستان و خراسان کوفہ و بغداد اور بلخ و بخارا وغیرہ ممالک سے فقراء و درویش، علماء و عرفاء اور خدا دوست لوگ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں وارد ہونے شروع ہوئے۔ حقیقت پوچھو تو یہ وہی سنت سادھو یوگی، ریشی اور منی تھے جو کئی ہزار سال قبل زبان لباس اور ناموں کی تفاوت کے ساتھ کشمیر کو رشی بھوی کا لقب دلوا چکے تھے۔ اب ان کا قافلہ نئی شکل و صورت اور نئے ناموں کے ساتھ دوبارہ آ رہا تھا۔ ان کا کام تو وہی تھا جو پہلے بھی سرانجام دے گئے تھے یعنی خدا کا نام بلند کرنا، سچائی کی حمایت کرنا، نیکیاں پھیلانا، برائیوں سے روکنا یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام کرنا۔ لیکن نام نئے تھے اور کام کی اصطلاحات جدید تھیں۔ اب کشمیر کے یہ نو وارد حضرات کی جماعت عالم، عابد، عارف، سالک، اہل اللہ اور ولی اللہ کے ناموں سے پکارے جا رہے تھے۔ اس لئے اب وادی کشمیر کو بھی ”رشی بھوی“ کے بدلے ”پیر واری“ یا بابغ اہل ارشاد و ہدایت کے نام سے پکارا جانے لگا۔ چونکہ انسانی نجات کے بنیادی اصول کی اقدار ہمیشہ سے وہی تھیں جن کی تجدید و اشاعت اسلام کر رہا ہے لہذا معنی وہی پرانا تھا، اور معنی کی روح بھی پرانی تھی البتہ مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اصطلاحات اور الفاظ ضرور نئے تھے اور الفاظ کے انداز بھی نئے تھے۔ کشمیر کے ان نئے فرزندوں نے بھی ”رشی بھوی“ کو پیر واری بنا لینے کے بعد اپنے کمالات کی وجہ سے کشمیر کا نام چارواگ عالم میں روشن کیا۔ ان میں سے ایسے بڑے علماء و فضلاء، عقلاء و رشی اور ولی پیدا ہوئے جن کا وجود اولاد آدم کو اندھیروں اور ظلمتوں سے نجات دلانے کا روشن مینار تھا ابتداء میں قدرۃ یہ لوگ باہر تشریف لائے۔ مثلاً حضرت سید عبدالرحمن بلبل شاہ (م ۷۲۷ھ) جو حضرت شیخ اشيوخ شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلفاء کے خلفاء میں سے تھے حضرت میر سید علی ہمدانی (م ۸۶۷ھ) جو سلسلہ کبروی کے تاجداروں میں سے تھے اور آپ کے خاندان کے درجنوں اولیاء القیاء خاص کر حضرت میر محمد ہمدانی (م ۸۵۳ھ) جنہوں نے حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کے مشن کی تکمیل کی یہ تو مشہور اولیاء کرام ہیں ان کے دوش بدوش ایسے عالم و فاضل لوگ بھی آئے جن کے اولین نمونے میر علی بخاری م بزمانہ بادشاہ اور محدث میر رضی الدین (م ۹۵۶ھ) جیسے صد با علماء ربانی تھے جو اپنے اپنے وطن کو خیر آباد کہہ کر کشمیر میں روشنی پھیلانے آئے۔ اس کے بعد خود خاک کشمیر سے پیدا ہوئے والے بے شمار اولیاء اللہ رشی مشائخ عارفین علماء راسخین اور فضلاء مکملین بھی تھے۔ مثلاً حضرت نور الدین ریشی (م ۸۴۲ھ) حضرت شیخ بہاؤ الدین (م ۸۴۳ھ) حضرت بابا ہروی ریشی (م ۹۷۷ھ)، حضرت سلطان العارفین مجدد م شیخ حمزہ رحمۃ اللہ علیہ (م ۹۸۴ھ)،

حضرت شیخ بابا مسعود نوردی (م قریب ۱۰۰۰ھ)، ابو الفقراء حضرت بابا نصیب الدین غازی (م ۱۰۰۰ھ) اور حضرت خواجہ احمد تارہ علی (م ۱۲۷۸ھ) وغیرہ حضرات سالکین میں سے اور علماء میں سے علامہ خوش خوان (م قریب ۸۲۵ھ) استاذ العلماء حافظ ملا بصیر (م ۹۳۶ھ)، شہیدان اصلائے کلمۃ الحق مولانا فیروز گنائی اور مولانا الماس گنائی (م ۹۷۳ھ)، علامہ بابا داؤد خاکی (م ۹۹۳ھ) جامع الکملات مولانا شیخ یعقوب صرغی مفسر و محدث (م ۱۰۰۳ھ) استاذ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی، ملا جوہر تاج محمد (م ۱۰۲۶ھ)، مولانا حسین جہار محدث (م ۱۰۵۲ھ) ملا شکر ف گنائی محدث (شاگرد حضرت علامہ ابن حجر مکی) محدث حضرت خواجہ حیدر چرخ بن فیروز (م ۱۰۵۷ھ)، ملا محمد اشرف چرخ (م ۱۱۳۳ھ) ملا عزایت اللہ شامل محدث (م ۱۱۲۵ھ)، مولانا مفتی امان اللہ شہید (م ۱۱۳۵ھ) ملا محسن فانی مصنف دیستان مذاہب (م ۱۰۸۲ھ) ملا ابوالوفاء مفتی (م ۱۱۷۶ھ)، مولانا میر سید سعید اندرابی محدث (م ۱۲۸۲ھ)، محدث محمد امین ولی الہی (م ۱۱۸۷ھ)، شیخ الاسلام مفتی قوام الدین (م ۱۲۱۹ھ) فخر ابوالعظین مولانا نسر بابا صاحب (م ۱۶۲۱ھ) شیخ طیب بن احمد بن مصطفیٰ رفیقی (م ۱۲۶۶ھ)، قاضی ہامد الدین مفتی (م ۱۲۹۳ھ) اور میر واعظ مولانا محمد تکیا (م ۱۳۰۸ھ) وغیرہ۔

ان سبھی حضرات کے کمالات علم و عمل کے تذکروں سے کشمیر کی تاریخی کتابیں لبریز ہیں۔

محدث جلیل مولانا نور شاہ کشمیریؒ:..... ماضی قریب میں کشمیر نے ایسی عظیم الشان ہستی کو جنم دیا جس کا ثانی ملنا مشکل ہے وہ تھے محدث جلیل علامہ محمد نور شاہ کشمیریؒ حضرت موصوف ایک ایسا آئینہ تھے جس میں زمانہ سلف کے علماء ربانی اور عرفائے حقانی کا عکس جمیل یکجا جلوہ گر تھا۔ اہل علم متفق ہیں کہ آپ کے انتقال کے بعد ایسا ہمہ صفت موصوف عالم دین ابھی تک دیکھنے میں نہیں آیا۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی

ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خاموش ہے

آپ نے ایک طرف علم تفسیر و حدیث اور فقہ میں دوسری طرف فلسفہ منطق اور ادبیات عربی میں فرضیہ قدیم و جدید علوم میں وہ کمالات حاصل کئے تھے جن کو دیکھ کر دنیا دنگ رہ گئی۔ ذہانت یوں تو کشمیر کے اوسط درجہ کے انسان کے لئے ایک خدا داد نعمت ہے۔ مگر شیخ الحدیث علامہ نور شاہ کی ذہانت آپ کے دل و دماغ کی ایک ایسی روشنی تھی اور ایک قسم کا ایسا قلبی نور تھا جس کو ذہانت کے بدلے فطری اور پیدائشی کرامت کہنا چاہئے اس کے ساتھ ساتھ قدرت کا دوسرا بڑا عطیہ آپ کی تحمید و اعتقالات قوت حافظہ تھی کہ جو بات ایک بار کان میں پڑی یا نظر سے گزری اس کا بھول جانا گویا ناممکن ہو گیا ان کمالات کو چکانے والی صفت آپ کا شوق مطالعہ اور اخذ و حصول علم کا عشق تھا اور سونے

پر سہا کہ آپ کا تقویٰ اور دلالت تھی جو آپ کو اپنے اساتذہ کرام حضرت مولینا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۲ھ) اور شیخ الہند حضرت مولینا محمود الحسن دیوبندی (م ۱۳۲۶ھ) سے ورثہ ملی تھی۔ یہی وہ اوصاف حمیدہ تھے جن کی بدولت آپ لولاب کے ایک گم نام گاؤں ورلو سے چل کر دارالعلوم کے شیخ الحدیث کی مسند پر جلوہ افروز ہو گئے اور شرق و غرب سے گوہر علم کے تلاشی حضرت پیغمبر رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو سمجھنے کے لئے لمبی لمبی مسافتیں طے کر کے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے لگے اور آپ کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو وحی آسمان کی صحیح ترین تعبیر یقین کر کے کانٹوں پر ہی نہیں بلکہ اپنے دل و دماغ کے صفحات پر لکھ لکھ کر کے جانے لگے۔

ولی راوی می شناسد کے اصول کے مطابق ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے تبحر علمی کا اندازہ کرانے کے لئے برصغیر کے جید عالم اور مفسر قرآن حضرت مولینا اشرف علی تھانوی (م ۱۳۲۶ھ) نے ایک بار فرمایا تھا کہ اسلام کی حقانیت کی دیگر دلائل میں ایک دلیل یہ بھی ہے کہ مولینا انور شاہ مسلمان ہیں شاعر مشرق علامہ اقبالؒ (م ۱۹۳۸ھ) نے فرمایا کہ اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

شیخ الاسلام مولینا سید حسین احمد مدنی (م ۱۳۷۷ھ) نے حضرت شاہ صاحب کی رحلت کے موقع پر ایک تعزیتے جلسے میں بر ملا فرمایا کہ میں ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو ایک لاکھ حدیث یاد ہیں اور ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو صحیحین حفظ یاد ہیں لیکن ایسا عالم کہ کتب خانہ کا کتب خانہ جس کے سینے میں محفوظ ہو سوائے حضرت مولینا انور شاہ کے کوئی نہیں دیکھا۔

الغرض حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بارے میں زمانہ حاضرہ کے جید علماء محدثین کے ان افکار و آراء کا مطالعہ کر کے انسانی ذہن پر ایک ایسا عظیم علمی اور دینی پیکر ابھرتا ہے جس کی مثال موجودہ نسل انسانی کو مل سکے گی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی مقام کا تعین اور ان کی ہمدانی کی نشاندہی کے لئے علوم دینی کے جس ادراک اور فہم رسا کی ضرورت ہے، وہ عصر جدید کے بہت ہی کم ارباب علم کے حصے میں آسکتی ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی ذات سرزمین ہندوستان کے لئے اور پورے عالم اسلام کے لئے موجب افتخار تھی لیکن اہل کشمیر کو حق پہنچا ہے کہ وہ آپ کے وجود پر زیادہ سے زیادہ جذبہ فخر و مباہات کا احساس کریں اور کشمیر کی آئندہ نسل کا تو یہ فرض ہے کہ وہ آپ کی ذات کو اپنی علمی جد و جہد میں نمونہ بنا کر ترقی کی منازل طے کریں۔ مجھے یقین ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی کشمیر کے گہوارہ روحانیت کا تذکرہ کیا جائے گا وہاں اسلام کے اولیاء کرام اور اصفیاء عظام کی صف میں روادی کشمیر کے جن علماء

مالین کا ذکر خیر آئے گا ان میں حضرت شاہ صاحب کی یاد جیل سر عنوان رہے گی کشمیر کے علماء و عرفاء کا جو تذکرہ شاہ صاحب کے حالات سے خالی ہو گا وہ تذکرہ یقیناً نامکمل سمجھا جائے گا۔

علم و فضل کے اس بحر بیکراں کے بارے میں خود میری اپنی معلومات محدود ہیں جس کا مجھے انوس ہے چونکہ حضرت شاہ صاحب کا زمانہ ہمارے زمانہ سے مسبق تھا اور ہم براہ راست ان کے یوش سے بہرہ یاب نہ ہوئے۔ لیکن آپ کی ذات کے ساتھ یہ تعلق میرے لئے موجب مسرت رہا ہے کہ میرے والد مرحوم الحاج سید احمد اللہ صاحب براہ راست آپ کے شاگرد تھے اور اس چشمہ فیض سے بقدر قسمت سیراب ہوئے تھے ہم لوگ اپنے بچپن میں جب کبھی اپنے والد ماجد کی زبان سے حضرت شاہ صاحب کے اوصاف جمیلہ سنتے تھے تو اپنے دل میں موصوف کی ذات کے ساتھ ایک نادرہ تعلق و محبت کا جذبہ ابھرتا ہوا محسوس ہوتا تھا اور اب جب ہم آپ کی ذات ستودہ صفات کو مفصل تاریخی حقائق کے پس منظر میں دیکھتے ہیں تو وہ جذبہ اور بھی گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

اہل بصیرت کے لئے ان سخت مشکلات کا اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں جو صبر آزما تحقیق و تجسس (RESEARCH) کی رہ نوردی میں ایک سوانح نگار کو حضرت علامہ کشمیری مرحوم کی کتاب زندگی من وعین پیش کرنے میں پیش آسکتی ہیں۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ آپ کے انتقال پر قریباً نصف صدی کا زمانہ گزر گیا ہو اور کشمیر میں جن لوگوں نے حضرت موصوف کو دیکھا تھا وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ بایں ہمہ مشکلات ہمارے ایک فاضل دوست مکرم عبدالرحمن صاحب کوندو نے ہمت مردانہ سے کام لیکر آپ کی حیات و کارناموں پر ایک تحقیقی کتاب لکھنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ کوندو صاحب کی یہ مبارک کوشش اہل علم کے ہاں تحسین و تشکر کی مستحق ہے۔

مؤلف موصوف نے اپنی اس کتاب میں ایک حصہ متفرق اہل قلم سے حاصل کردہ مضامین و مقالات کے لئے مخصوص کیا ہے آپ نے مجھ سے بھی حیات انوریہ پر لکھنے والوں کے زمرے میں شرف شمولیت حاصل کرنے کی خواہش کی تھی۔ یوں تو اپنی سیاسی اور سماجی زندگی کے کثرت مشاغل نے میرے لئے ایسے نازک اور صبر طلب موضوع پر قلم اٹھانا ناممکن بنا دیا ہے۔ اور شاہ صاحب جیسی ہمہ پہلو ہستی پر کوئی مفصل مقالہ لکھنے کے لئے جس یکسوئی اور جن شواہد کی ضرورت ہے وہ بھی مفقود ہیں۔ اس کے باوجود عزیزانور کوندو صاحب کی نیک خواہش کے احترام میں یہ چند سطور سپرد قلم طاس کی گئی ہیں۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

تحریر سرینگر ۱۲ جولائی ۱۹۷۷ء

سید میر قاسم

حضرت شاہ صاحب کی ظرافت طبع

باوجودیکہ حضرت شاہ صاحب متانت اور سنجیدگی کا پھاڑ تھے لیکن آپ کی لطیف و نفیس طبیعت میں ظرافت و مزاح کا عنصر بھی موجود تھا اور درس و تدریس کے دوران کبھی کبھی علمی رموز و دقائق ظریفانہ انداز میں بھی بیان فرمایا کرتے تھے لیکن یہ ظریفانہ مخاطب شرعی حدود و قیود اور آداب مجلس تدریس کی نازک سرحدات سے کبھی متجاوز ہونے نہ پاتا۔ آپ مزاج میں عامیانہ پن سے ہمیشہ گریز فرماتے ابتذال اور لاعینی بات کرنے اور سننے سے سخت احتراز کرتے۔

زیر نظر کتاب کے کئی مقالات میں حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ کرام نے اپنے اپنے الفاظ میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ کس طرح شاہ صاحب کے تلامذہ کرام نے اپنے اپنے الفاظ میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ کس طرح حضرت شاہ صاحب کی مجالس درس میں ظرافت سے زندگی پیدا ہو جاتی تھی اور کبھی کبھی اس انداز میں بھی آپ کس طرح علوم و معارف کے دقائق بیان فرمایا کرتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب کے ایک ذہین ترین شاگرد خلد آشیاء مولینا مناظر احسن گیلانی کا ایک بسیط مقالہ حضرت شاہ صاحب کی درسی خصوصیات کے عنوان سے حیات النور میں شائع ہوا ہے جو تقریباً ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے قلت گنجائش کی وجہ سے یہاں ہم اس بے بہا مضمون کے صرف حسب ذیل اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں۔

بظاہر مجلسوں اور صحبتوں میں الہی پر سکینت و وقار کی خاموشی طاری رہتی لیکن حلقہ درس میں طبیعت و مزاج کا جبلی رجحان ان کا نمایاں ہو جاتا اس وقت ان کی زبان بابرک پر معصومانہ انداز میں بڑے پُر کیف فقرے جاری ہوتے۔ اس سلسلہ میں فرمایا کرتے جی ہاں ظرافت کی یہ مدد ہاں بھی کافی وسیع ہے۔ بڑے صاحب کے یاں بھی اس کا تماشا پیش ہوگا۔ پھر مثلاً ان حدیثوں کا ذکر فرماتے جن میں آیا ہے کہ قیامت کے دن بعض گنہگاروں کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے گا کہ ان ہی سے ان کے گناہوں کا اعتراف کرا کے حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا کہ ہر وہ گناہ جس کا اس نے اقرار کیا ہے اس کے مقابلہ میں اسے نیکی کا اجر دیا جائے۔ اقرار کرنے والا گنہگار اس غم کو سن کر فرشتوں سے کہے گا کہ ٹھہر و میرے گناہوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ جب ہر گناہ کے

①... حضرت شاہ صاحب کے شاگردوں میں مولینا گیلانی صاحب مرحوم کو ایک خاص مقام حاصل ہے، موصوف کی علمی شہرت تصنیف و مہارت کمال زید و ورع اور علوم کی جامعیت سے ایک دنیا واقف ہے۔ آپ درجنوں عالمانہ کتابوں کی مصنف اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں اسلامیات اور شعبہ عربی کے سربراہ رہے ہیں۔

بلکہ میں مجھے نیکی کا اجر دیا جائے گا تو ان گناہوں کو بھی گن لواز کما قال۔

صحیح مسلم ہی کی مشہور حدیث جس میں جنت کے داخل ہونے والے سب سے کمتر درجہ کے آدمی کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جہنم سے نکلنے کے بعد اپنے سامنے ایک درخت کو پائے چار عرض کریگا کہ اے اللہ اس درخت کی چھاؤں کے نیچے پناہ لینے کی اجازت دی جائے۔ حق سبحانہ و تعالیٰ اس سے اقرار لیں گے کہ اس سے زیادہ تو اپنے مطالبہ کو تو آگے نہ بڑ جائے گا۔ قسم کھا کر اقرار کریگا کہ بس اس سے زیادہ میں کبھی اور کچھ نہ چاہوں گا۔ اجازت دے دی جائے گی یوں ہی ایک درخت کے بعد اس سے زیادہ گھنا اور بہتر درخت اس کے سامنے آئے گا اور اپنے معاہدہ کو توڑ کر اس کے نیچے جانے کی اجازت چاہے گا۔ تا آنکہ بالآخر سرکتے ہوئے وہ جنت کے دروازے پر پہنچ کر جنت میں داخل ہو جانے کی اجازت چاہے گا۔ اس وقت حق سبحانہ و تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ:

ما بصر فنی منک۔ تجھ سے میرا پیچھا آخر کون چیز چھڑائے گی؟

ایک فرمائش کے بعد اس سے زیادہ بہتر فرمائش کرتا ہی چلا جاتا ہے اور اسی کی ساتھ ارشاد ہوگا:۔
”کیا تو اس پر راضی ہو جائے گا کہ تجھے ساری دنیا اور اس دنیا کے مانند دوسری دنیا دے دی جائے گی۔؟
جب وہ غریب گنہگار عرض کرے گا:۔

یا رب استہزاء منی وانت رب العالمین

اے پروردگار! کیا آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں حالانکہ آپ سارے جہانوں کے مالک ہیں؟
حدیث کے راوی صحابی ابن مسعود رضی اللہ عنہما جب اس روایت کو بیان کرتے تو ہنسنے لگتے اور کہتے کہ رسول اللہ ﷺ بھی یوں ہی اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے ہنستے تھے جب آپ سے ہنسنے کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا تھا کہ:۔

”اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے یہ سن کر کہ سارے جہانوں کے مالک ہو کر مجھ غریب سے مذاق کرتے ہیں۔“

گنہگار کے اس فقرے پر خود اللہ تعالیٰ کو ہنسی آجائے گی۔ اور اس کے بعد اس غریب بندے سے ارحم الراحمین فرمائیں گے کہ ”میرے بندے میں تجھ سے مذاق نہیں کرتا لیکن جو میرے حق میں آتا ہے وہ کرتا ہوں۔
اس حدیث پر پہنچنے کے بعد شاہ صاحب کے جذبات چھپانے کے باوجود چھلک کر باہر آجاتے تھے اور اس قسم کی عام حدیثوں کو ”مذہب طرافت“ میں شریک فرما کر آگے بڑھ جاتے۔

اسی سلسلہ میں کبھی کبھی ان پر خاص جذبہ طاری ہوتا طلبہ کی طرف مخاطب ہو کر فرماتے تو تم مجھے ہو کہ میں کوئی بڑا کام کر رہا ہوں۔ حالانکہ جانتے ہو کہ میری حیثیت بھی وہی ہے جو دوسرے

کے منیر خان ۱ کی ہے۔ منیر خان بھی چکی پیٹتے ہیں اور میں مدقن ہوں۔ دقیق (آٹا) پیٹتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ۲۔

دورۂ اختتام کی حد پر جب پہنچتا تو اس وقت اپنے خاص انداز میں فرماتے کہ اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ میں مرغیوں کا ڈر پہ کھولوں گا۔ یہ مرغی جو ہمارے ارد گرد جمع ہیں ڈر بے سے نکلیں گے۔ دیکھتا ہوں کہ بلند یوں پر چڑھ چڑھ کر بازوؤں کو پھڑپھڑاتے ہوئے کون بانگ دیتا ہے۔ کس کی آواز کتنی اونچی ہوتی ہے۔ اس قسم کے لطیفوں میں وہ سب کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔ جو کہنا چاہتے تھے ۳۔

آج کل مولینا گیلانی صاحب لکھتے ہیں کہ:- شاید ہی کوئی دن ایام درس کے اس طویل عہد میں ایسا گزرا ہو جس میں دلوں کے انہماک و انشراح کا یہ موقعہ اول یا آخر یا وسط میں نہ نکل آتا ہو ۴۔

درس و تدریس کے دوران علمی رنگ کا مزاج فرمانے کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مولینا طیب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ۔ عصر مغرت کے درمیان ایک دن بخاری شریف کا درس زور و شور سے ہو رہا تھا۔ احقر بھی اس سال بخاری میں تھا اور شریک درس بھی تھا اچانک کتاب بند کر دی اور فرمانے لگے کہ جب بھائی شمس الدین ہی رخصت ہو گئے تو اب درس کا کیا لطف رہا۔ جاؤ تم بھی گھر کا راستہ لو۔ ہم سب حیران ہوئے کہ کون بھائی شمس الدین اور وہ آئے کب تھے؟ اور رخصت کب ہو گئے؟۔ ہماری حیرانی کو دیکھ کر سورج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو غروب ہو رہا تھا، فرمایا کہ جاہلین ادیکھتے نہیں وہ بھائی شمس الدین جا رہے ہیں۔

اب کیا اندھڑے میں سبق پڑھو گے؟ کیا وہ لطف کا سبق ہوگا۔ ایک بار پچھلی صف میں سے کسی طالب علم نے سوال کیا مگر مہمل انداز سے فرمایا کہ جاہل تھے معلوم نہیں کہ میں اسناد متصل کرنا بھی جانتا ہوں جانتا ہے کس طرح اسناد متصل ہوگی؟ میں اس اپنے پاس والے کو تھپڑ ماروں گا وہ اپنے پاس والے کو مارے گا۔ وہ اپنے پاس والے کو رسید کریگا۔ یہاں تک کہ تھپڑ کا یہ فعلی سلسلہ سند تجھ تک پہنچ جائے گا۔

یہ تہدید بھی تھی اور حکیمانہ رنگ سے فنی اصطلاحات میں ایک مزاح بھی تھا جس سے طلبہ کی تخلیط (نشاط میں لانا) مقصود تھا۔ (حیات انور ص ۲۴)

۱۔ مدرسہ کے ایک بوڑھے ان چڑھ ملازم منیر خان تھے اور مسجد کے احاطہ کی طرف دروازے کے پاس ایک جمونیزے میں مقیم تھے عموماً درس کے تعمیری کاموں کے لئے چکی میں چرنا پسا کرتے تھے۔ ۲۔ ملاحظہ ہو حیات انور ص ۷۰-۷۱۔ ۳۔ ملاحظہ ہو حیات انور ص ۷۲-۷۳۔ ۴۔ ایضاً ص ۷۵۔

یہ ذہن تھا یا مینارہ حفظ و ضبط و استحضار؟

(مرتبہ کونندو)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحب کو غیر معمولی قوت حافظہ اور محیر العقول استحضار سے سرفراز فرمایا تھا۔ جو ایک مرتبہ دیکھ لیا یا سن لیا تھا وہ ضائع ہونے سے محفوظ و مامون ہو گیا۔ آپ کا علم اتنا وسیع اور قوت حافظہ ایسی تیز اور خارق عادت تھی کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اسی لئے ان کے اکابر معاصرین ان کی غیر معمولی قوت حافظہ کو خدا داد کرامت قرار دیتے تھے اور آج تک بھی ان کا حافظہ زبان زد خلایق ہے ایک ایک کتاب کے اگر پانچ پانچ یا دس دس حواشی بھی ہوتے تو وہ حضرت کو یاد ہوتے تھے۔ حوالہ ہائے کتب صحیحہ بقید جلد و صفحات آپ کو ایک ہی دفعہ کے مطالعہ سے محفوظ ہو جاتے تھے اور جس وقت کسی اہم علمی مسئلہ پر تقریر فرماتے تو بے شمار کتابوں کے حوالے بلا تکلف دیتے چلے جاتے تھے احادیث کا تمام ذخیرہ اور ان کی صحت و عدم صحت کے متعلق طویل و عریض بحثیں رواۃ کے مدارج و مراتب اس طرح محفوظ تھے کہ طلبہ حدیث اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے وجود سے ایک مکمل لائبریری کا کام لیتے اور ایسے سوالات کا جواب منٹوں میں حاصل کر لیتے جن کی تحقیق و جستجو کے لئے ایک پوری عمر درکار ہے پھر ہر جواب میں جامعیت اس قدر ہوتی تھی کہ اس موضوع پر کسی کتاب کو خواہ وہ مطبوعہ ہو یا قلمی، دیکھنے کی ضرورت باقی نہ رہتی تھی۔ مشہور و معروف کتب خانوں کی اکثر محفوظات (قلمی کتابوں) آپ کی نظر سے گزر چکی تھیں اور اس طرح محفوظ تھیں کہ گویا آج ہی ان کا مطالعہ کیا ہے۔ آخر عمر میں بھی جبکہ دیگر قوائے جسمانی اضمحلال پذیر ہو رہے تھے۔ بفضل ایزدی حضرت شاہ صاحب کا حافظہ بدستور قابل رشک تھا۔

مولینا سراج احمد رشیدی کا بیان:..... مولینا سراج احمد صاحب رشیدی مرحوم (استاد سنن ابی داؤد) کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب فرماتے تھے کہ ایک شخص نے کعبۃ اللہ کے پردوں کو پکڑ کر دعا کی کہ خداوند تعالیٰ! مجھے ابن حجر^۱ کا سا علم حدیث عطا فرما۔ اس کی دعا قبول کی گئی۔ مولینا رشیدی کہتے تھے کہ میں سمجھا کہ شاہ صاحب کسی دوسرے کا واقعہ بیان فرماتے ہیں اس وقت یہ خیال نہ گزرا

۱..... حافظ ابن حجر مسند علم حدیث اور حفظ حدیث میں یکتائے زمانہ تھے۔ حضرت شاہ صاحب حافظ ابن حجر کے بے حد مداح تھے۔ حضرت کے اکابرین نے انہیں حفظ و حدیث میں حافظ ابن حجر عسقلانی ہی سے تشبیہ دی ہے چنانچہ علامہ عثمانی نے تقریر تعزیت میں فرمایا کہ آج حافظ ابن حجر کا انتقال ہو رہا ہے۔ الخ کوندہ

کہ یہ ان کی اپنی ہی حکایت ہے۔ کچھ دیر بعد سمجھا کہ یہ واقعہ حضرت شاہ صاحبؒ ہی کا ہے۔
حضرت شاہ صاحب کے متعدد تلامذہ کا بیان ہے کہ درس و تدریس کے دوران جب بھی حسب ضرورت کتاب کھولتے تو عموماً وہی صفحہ کھلتا جس پر وہ حدیث ہوتی جس کا آپ کو حوالہ دینا ہوتا تھا، اگر اصل صفحہ نہ بھی کھلتا تو وہ زیادہ دو چار صفحے پہلے ہوتا یا دو چار صفحے بعد اور انہیں تقریباً چالیس پچاس ہزار عربی کے اشعار زبانی یاد تھے۔ جب کبھی تشریح کے طور پر وہ کوئی شعر بطور حوالہ پڑھنا چاہتے تو صرف اس ایک شعر کو پڑھنے پر اکتفا نہ کرتے جس کا حوالہ دینا چاہتے تھے۔ بلکہ پوری کی پوری نظم پڑھ ڈالتے۔ سالم نظم میں میں میں پچیس پچیس اشعار ہوتے تھے اور آپ نہایت روانی کے ساتھ ان کو پڑھتے چلے جاتے تھے۔

قرن اولی کے مسلمانوں کے حافظہ کے بارے میں کتب تاریخ و سیر میں کچھ حیرت انگیز واقعات پڑھنے میں تو آ جاتے ہیں۔ مثلاً حضرت قتادہؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت اسمعیؓ وغیرہ کی غیر معمولی قوت حافظہ کی اکثر جگہ تعریف کی گئی ہے۔ مگر میرے خیال میں یہ تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں کتابیں نایاب تھیں۔ اس لئے لوگوں کو اپنے حافظہ پر ہی بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ اس کا قدرتی اور لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حافظہ میں غیر معلولی جلا پیدا ہو جاتی تھی۔ لیکن آج کل کتابوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ کڑوڑوں کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ علم سینہ اور دماغ کے بجائے کتابوں میں منتقل ہو کر رہ گیا ہے۔ ان حالات میں اس انفرادیت کے ساتھ اس قسم کا حافظہ واقعی اللہ تعالیٰ کی بے شمار عنایات اور نشانیوں میں سے ایک نشانی تصور کیا جاسکتا ہے۔ سچ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی قوت حافظہ ان منکرین حدیث کا جواب تھی جو محدثین کے حافظہ کو اپنے کمزور حافظے پر قیاس کر کے ان پر اعتماد نہ کر کے ذخیرہ حدیث کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔

بہر حال حافظہ اور اختصار کے لحاظ سے بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات ستورہ صفات آیات من ایات اللہ تھی اگر انہیں اپنے وقت کا امام زہری کہا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کا حافظہ اتنا عمدہ تھا کہ جو بات ایک دفعہ ان کے کان میں پڑ گئی وہ کسی طرح نہ بھولتے تھے۔ اس لئے وہ جب مدینہ منورہ کے بازاروں سے گزرتے تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے کہ مبادا بازار کے خرافات ان کے دماغ پر نقش نہ ہو جائیں۔

مولانا محمد ادریس صاحب سکھر وڑوی کا فرمانا بجا ہے کہ دراصل حضرت شاہ صاحب کا حفظ و ذکاؤ حق تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص مہبت تھی۔ صدیوں ہی میں کوئی ہستی ایسی پیدا ہوتی

ہے۔ ہزاروں صفحات کی کتاب ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد پھر ہاتھ میں نہیں اٹھاتے تھے۔ اور سالہا سال کے بعد جب بھی اس کتاب میں کسی مسئلہ کا حوالہ دینا چاہتے تو چند منٹ میں اس مسئلہ پر انکی رکھ کر فرما دیتے تھے کہ یہ ہے۔ نہ اس کی کوئی یادداشت کہیں لکھی ہوتی اور نہ کہیں نوٹ ہوتا اس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی کچھ مدت پہلے یہ کتاب نظر سے گزری ہے اور مختصر ہے اور کتاب کے دائیں بائیں صفحات خیال مبارک میں موجود ہیں۔ مناظرہ و مباحثہ کی کسی مہم میں حضرت شاہ صاحب کی معیت ایک ضخیم کتب خانہ کی معیت کا کام کرتی تھی۔ ہر فن میں جامعیت اور پورا اقتدار شاہ صاحب کو حق تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا اور حفظ و ذکا کا حصہ وافر عطا کیا تھا ❶۔

زیر نظر کتاب کے کئی مقالات میں حضرت شاہ صاحبؒ کے غیر معمولی حافظہ کے متعلق متعدد واقعات کا ذکر موجود ہے ان میں سے چند واقعات یہاں موضوع کی مناسبت کی وجہ سے اختصار کے ساتھ ضبط تحریر میں لائے گئے اور ان کے علاوہ کچھ واقعات بھی ذیل میں درج کئے گئے۔ جن کا ذکر پیش نظر کتاب میں نہیں ہے۔

مولینا محمد ادریس کاندھلوی کا بیان:..... حضرت مولینا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

حضرت شاہ صاحب درس میں جب مسائل خلافیہ پر کلام فرماتے تو جابجا شیخ ابن ہمام کی تحقیقات کو مع نقض اور ابرام کے ذکر فرماتے ایک مرتبہ بطور تحدیث بالعمہ فرمایا کہ میں نے تمام فتح القدیر (جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے) کا تقریباً چھبیس روز میں مطالعہ کیا اور چھبیس سال گزر گئے اور مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی جو مضمون بیان کروں گا اگر تم اس کی مراجعت اصل سے مقابلہ کرو گے تو ان شاء اللہ بہت کم تفاوت پاؤ گے۔

مولینا ادریس صاحبؒ نے مزید لکھا ہے کہ:

حالانکہ فتح القدیر نہایت دقیق اور غامض کتاب ہے جو فقہ اور اصول فقہ کے دقائق اور غوامض پر خصوصاً اور اصول حدیث کے مشکلات پر عموماً مشتمل ہے۔ یعنی دقیق کتاب کا چھبیس روز میں مطالعہ غیر معمولی فہم اور خدا داد نور فراست کی دلیل ہے اور پھر مدۃ العمر اس کا بلا مراجعت استحصار قوت حافظہ کے کمال کی دلیل ہے ❷۔

جزئیات فقہ نہ صرف فقہ حنفی کی بلکہ ائمہ اربعہ اور دوسرے ائمہ کی بھی بہت زیادہ آپ کو محفوظ تھیں۔

کمال حافظ کی وجہ سے صحاح ستہ کے علاوہ دیگر کتب مبسوطہ حدیث مطبوعہ قلمی آپ کو ادھر تھیں۔
حضرت شیخ الاسلام مولینا مدنی نے فرمایا ہے کہ مجھ سے حضرت شاہ صاحب فرماتے تھے کہ جب میں کسی کتاب کا سرسری نظر سے مطالعہ کرتا ہوں اور اس کے مباحث کو محفوظ رکھنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا۔ پھر بھی پندرہ سال تک اس کے مضامین مجھے محفوظ رہ جاتے ہیں ❶۔

سرعت مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ مسند احمد (مطبوعہ مصر) کے روزانہ دو سو صفحات کا مطالعہ فرمایا اس طرح کہ پوری دقت نظر اور کامل غور و فکر کے ساتھ اس کی اسانید اور مشکلات کو حل کرتے جاتے تھے۔
حافظ کے بارے میں کشمیر کا واقعہ:..... حضرت شاہ صاحبؒ کے وسعت مطالعہ اور قوت حافظہ پر مندرجہ ذیل واقعہ سے بھی روشنی پڑتی ہے۔

کشمیر میں ایک دفعہ علماء کے درمیان اختلاف ہوا اور ہر ایک کا جواب دوسرے کے مخالف رہا۔ اس دوران میں حضرت شاہ صاحبؒ بھی کشمیر تشریف لائے۔ فریقین شاہ صاحب سے ملاقات کرنے کے لئے حاضر ہوئے اور دونوں نے مختلف فیہ مسئلہ کو آپ کے سامنے پیش کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے مولینا محمد یوسف بنوری کو حکم دیا کہ اس کا جواب لکھو۔ اس فتویٰ پر ایک فریق نے فتاویٰ عمادیہ کے ایک قلمی نسخہ سے اپنے استدلال میں ایک عبارت پیش کی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے مولینا محمد یوسف صاحب سے فرمایا کہ میں نے فتاویٰ عمادیہ کے منظوم کا دارالعلوم کے کتب خانہ میں مطالعہ کیا ہے اس میں یہ عبارت ہرگز موجود نہیں یہ لوگ تعریف کر رہے ہیں یا تدلیس اس پر حاضرین متحیر ہوئے اور مستدلین مبہوت ہو کر رہ گئے ❷۔

مولینا منظور نعمانی کے واقعات:..... حضرت مولینا منظور صاحب نعمانی اپنے مقالہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے حافظہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ:

”ایک دفعہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ترمذی شریف کی ایک عبارت کا میں نے حوالہ دیا اور عرض کیا کہ اس عبارت میں یہ اشکال ہے بہت غور کیا لیکن حل نہ ہو سکا۔“

فرمایا۔ ”مولوی صاحب آپ کو یاد نہیں رہا مجھے خوب یاد ہے جس سال آپ دورہ ❸ میں تھے اس موقع پر میں نے بتایا تھا کہ یہاں ترمذی کے اکثر نسخوں میں ایک غلطی واقع ہو گئی ہے لیکن لوگ سرسری طور پر گزر جاتے ہیں اور انہیں پتہ نہیں چلتا۔ ورنہ جو اشکال آپ کو پیش آیا سب کو پیش آتا

چاہئے۔ پھر فرمایا صحیح عبارت اس طرح ہے:

بس سارا اشکال جس نے چکر میں ڈال رکھا تھا ایک منٹ میں رفع ہو گیا اللہ اکبر یہ بات بھی یاد رہتی تھی کہ فلاں سال اس موقع پر سبق میں یہ بات بتلائی تھی۔

ایک واقعہ اور سنیئے اسورۃ نساء کے سولہویں اور سترہویں رکوع کی آیتیں چوری اودھوکہ بازی کے ایک خاص واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں اس واقعہ کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ مجھے طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک خاص مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں یہ معلوم کرنے کی ضرورت پڑی کہ کس سن میں یہ واقعہ پیش آیا اور یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں جو تفسیریں مجھے ایسی ملیں جن میں آیات سے متعلق روایات کو جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ میں نے ان سب کو دیکھ ڈالا مگر واقعہ کا زمانہ اور سن مجھے کہیں سے معلوم نہ ہو سکا۔ عاجز آ کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے فلاں واقعہ کے سن وقوع کی تلاش ہے۔ کتابوں میں دیکھا مگر مجھے نہیں ملا۔

فرمایا! کون کونسی کتابیں آپ نے دیکھیں؟ میں نے تفسیر ابن جریر اور تفسیر ابن کثیر و معالم وغیرہ چند تفسیروں کے نام لئے، فرمایا: ”درود منشور میں نہیں دیکھا؟“ میں نے عرض کیا کہ در منشور کا نسخہ اس وقت کتب خانہ میں موجود نہیں تھا کہیں عاریت میں گیا ہوا ہے۔ اس لئے اس کو تو نہیں دیکھ سکا۔ فرمایا، جاؤ اس کو دیکھ لو اس میں مذکور ہے۔

چنانچہ تلاش کر کے در منشور کو دیکھا تو ابن سعد کی ایک روایت میں یہ صریح الفاظ موجود تھے۔

”وكان ذلك في شهر ربيع سنة اربع“

کہ یہ واقعہ ماہ ربيع ۴ھ میں پیش آیا

گویا جو چیز بھی کسی کتاب میں کبھی حضرت نے دیکھی تھی وہ حافظہ کے خزانہ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی تھی ❶۔

مولینا لالکپوری کا بیان:..... مولینا محمد صاحب انوری لالکپوری مقدمہ بہادپور کی پیروی کے سلسلہ میں شب و روز ۱۹ یوم تک حضرت کے ساتھ رہے اور حضرت شاہ صاحبؒ نے ان کو مختار مقدمہ بہادپور دیا تھا۔ نیز حضرت کے عدالتی بیان میں جس قدر حوالہ جات کتب کی ضرورت پیش آتی تھی وہ بھی مولینا موصوف ہی نکال کر پیش کرتے تھے، جن کو حضرت خود پڑھ کر حج صاحب کو سناتے تھے ❷۔

اس سلسلہ میں مرحوم مولینا لالکپوری حضرت شاہ صاحبؒ کے حافظہ کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

❶..... ملاحظہ ہو پیش نظر کتاب میں مولینا نعمانی صاحب کا مقالہ ❶..... ملاحظہ ہو نطق انور حصہ اول ص ۲۴۔

”حضرت کا حافظہ اس وقت قابل دید و شنید تھا، جب حوالہ دیتے کتاب کھولتے ہی فوراً انگلی مبارک عبارت پر ہوتی۔ حج صاحب! لکھئے عبارت یہ ہے بعض دفعہ احقر کو فرماتے کہ عبارت نکال کر دے تاکہ دکھاؤں بعض دفعہ منی بھی ارشاد فرماتے الخ ①۔

فقہ حنفی کی کتاب نور الایضاح کا واقعہ:..... امام العصر حضرت کشمیری کی حیرت انگیز قوت حافظہ سے متعلق مشہور واقعہ ہے کہ ممدوح نے مصر کے کسی کتب خانہ میں فقہ حنفی کی کتاب نور الایضاح کا مطالعہ کیا اور اسی مطالعہ کی بنیاد پر ہندوستان آ کر اسے طبع کرایا ②۔

لنگڑے اور لو لے کا واقعہ:..... حضرت شاہ صاحبؒ نے خود ایک بار فرمایا ہے کہ:-
”میں نے اپنے وطن کشمیر میں سنا تھا اور اس وقت میں چار برس کا تھا کہ دو آدمی اس مسئلہ میں گفتگو کر رہے تھے کہ عذاب بدن کو ہوتا ہے یا روح کو، آخر ان کی رائے یہ قرار پائی کہ عذاب دونوں کو ہوتا ہے۔ انہوں نے اس کی ایک مثال بھی دی۔ ایک نے کہا کہ جسم اور روح کا ساتھ ایسا ہے جیسے ایک مرتبہ اندھے اور لو لے کا ہوا تھا کہ وہ ایک باغ میں پھل توڑنے کے لئے گئے۔ اندھا پھلوں کے دیکھنے سے عاجز اور لولا ان کو توڑنے سے معذور۔ آخر ان دونوں نے باہم مشورہ کیا کہ اور لولا اندھے کے کاندھے پر چڑھ بیٹھا اندھا اس کو لے کر درختوں کی طرف چلا۔ لولا پھلوں کو دیکھتا اور ان کو توڑ لیتا“ ③۔

بس یہی حالت بدن کی روح کے ساتھ ہے۔ بدل بغیر روح کے جماد محض ہے جس کو حرکت نہیں اور روح بغیر بدن کے کچھ کرنے سے عاجز ہے لہذا یہ ایک دوسرے کے محتاج ہیں جب یہ دونوں کسب میں شریک ہیں تو اجر و ثواب میں بھی دونوں شریک ہوں گے اور سزا و عذاب میں بھی ایک دوسرے کے شریک رہیں گے۔ پینتیس برس کے بعد میں نے یہ واقعہ علامہ قرطبی کے یہاں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے دیکھا اور بالکل ویسا ہی جیسا کہ ان دونوں نے کہا تھا ④۔

علامہ عثمانی کا واقعہ:..... مولینا محمد ادریس صاحب سکھر وڑوی کا بیان ہے کہ:-

①..... ملاحظہ ہو حیات انور ص ۳۲۲۔ ②..... یہ واقعہ مشہور تو ہے لیکن غالب اس کی شہرت ملحد ہے۔ کسی قابل اعتماد ذریعہ سے نہیں سنا گیا قابل قبول بھی نہیں ہے (حضرت مولینا محمد منظور نعمانی)۔ ③..... اتنے میں اگر باغبان آگیا تو وہ دونوں ہی کو گرفتار کریگا اور دونوں کو سزا کا مستحق قرار دے گا۔ ④..... ملاحظہ ہو فیض الباری علی صحیح البخاری مطبوعہ دارالماہمون قاہرہ ۱۲۵ھ جلد ۳ ص ۱۱۵

حضرت مولینا شبیر احمد عثمانی جس زمانہ میں قرآن پاک کے فوائد تحریر فرما رہے تھے، یہ وہ زمانہ ہے جبکہ دارالعلوم دیوبند چھوڑ کر مقام ڈابھیل (سورت) میں حضرت شاہ صاحب اور مولینا شبیر احمد صاحب وغیرہ تشریف لے گئے تھے اور اسی مقام ڈابھیل میں فوائد قرآن پاک کی تکمیل ہوئی۔

حضرت مولینا شبیر احمد صاحب کی عادت تھی کبھی کبھی فوائد کے متعلق مزید تسکین خاطر و توثیق کے پیش نظر فوائد کے متعلق لکھا ہوا حضرت شاہ صاحب کو سنا دیا کرتے تھے اور اگر کوئی اشکال ہوتا تو دریافت بھی فرمایا کرتے تھے۔

جس دن حضرت شاہ صاحب کی وفات کا تاریخ ڈابھیل پہنچا تو حضرت شبیر احمد صاحب پر بے مبری اور غم کے آثار زیادہ نمایاں تھے، بے ساختہ چیخیں اور دھاڑے مار مار کر رو رہے تھے اور فرما رہے تھے آہ! ہمارے لئے موجب تسکین و طمانیت کون ہے کس کے پاس جا کر اب تسکین خاطر کریں گے کس سے اپنے علمی اشکالات حل کرائیں گے؟ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو غم و رنج کا پہاڑ مولینا شبیر احمد صاحب پر گرا ہے وہ غم و رنج کسی دوسرے کو نہیں۔

بہر حال بعد وفات ہی یہ واقعہ بیان فرمایا کہ جب میں فوائد (فوائد التزیل) لکھتے لکھتے ان آیات پر پہنچا جو حضرت داؤد علیہ السلام کے قصہ میں ہیں۔

”وہل اتاک نبؤ الخصم اذا تسوروا المحراب اذ دخلوا علی داء و دلفزع منهم قالوا لا تخف الخ (ص آیت ۲۱-۲۵)

حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے اوقات کی تقسیم یوں کر رکھی تھی ایک دن لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنا ایک دن اپنے اہل و عیال کے لئے، ایک دن اللہ کی عبادت کرنا۔ جس دن اللہ کی عبادت کرتے، مکان بند کر دیا جاتا اور دربان پہرہ دیتے تھے تاکہ عبادت الہی میں کسی قسم کی کھنڈت نہ ہو۔ عبادت کے دن ہی یہ واقعہ پیش آیا کہ جب ان انتظامات کے ساتھ عبادت میں مشغول تھے کہ ناگاہ کئی شخص دیوار پھاند کر ان کے پاس آکھڑے ہوئے۔ داؤد علیہ السلام جو اپنی قوت و شوکت کے یہ ماجرا دیکھ کر گھبرا اٹھے کہ یہ آدمی ہیں یا اور کوئی مخلوق؟ آدمی ہیں تو نادقت آنے کی ان حالات میں جرأت کیسے ہوئی؟ دربانوں نے کیوں نہیں روکا۔ اگر دروازے سے نہیں آئے تو اتنی اونچی دیوار پھاند کر آنے کی کیا سہیل کی ہوگی؟ غرض اچانک یہ عجیب و غریب واقعہ دیکھ کر خیال دوسری طرف ہٹ گیا اور عبادت میں جیسی یکسوئی کے ساتھ مشغول تھے قائم نہ رہ سکی۔ ان آیات کی تفسیر میں عام مفسرین متاخرین نے اسرائیلیات سے کچھ ایسے واقعات لکھے ہیں جو ایک نبی کی شان نہیں بلکہ ایک اچھے آدمی کے متعلق بھی مناسب نہیں خیال کئے جاتے۔ چہ جائیکہ داؤد علیہ السلام جیسے نبی کے متعلق ان باتوں کا تصور کیا جاسکے۔

مفسرین متاخرین یہ لکھتے ہیں کہ داؤد علیہ السلام کی نانوے بیہاں تھیں۔ اس کے باوجود داؤد علیہ السلام نے ایک پڑوسی کی بیوی کو نکاح میں لیا، اس پر متنبہ کرنا مقصود ہے اور اس کے حاصل کرنے کے جو طریقے واقعات لکھے ہیں وہ ایک صحیح طریق پر چلنے والے انسان کے لئے نامناسب اور صحیح سمجھنے والے کے لئے ناقابل تسلیم۔ ان آیات میں داؤد علیہ السلام کو ان کے اس فعل پر متنبہ کرنا ہے۔ محققین مفسرین اور ائمہ حدیث ان متاخرین کے درج ذیل آیات واقعات کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ یہ اسرائیلیات میں بیان کردہ ہیں جن کی کوئی سند نہیں اور نہ ہی یہ قصے تسلیم کے قابل ہیں اور کوئی بات محققین کے یہاں ایسی نہیں ملتی جس سے یہ اشکال حل ہو سکے کہ آخر ان انتظامات کے باوجود کہ دربان مقرر میں مکان بند ہے، کوئی راہ اندر آنے کی نہیں، اچانک دیوار پھانسی کر چند آدمی کیوں آئے اور اس قصے میں غرض کیا ہے؟ مولانا شبیر احمد عثمانی نے فرمایا کہ میں پندرہ دن ان آیات کے متعلق تفتیش و تحقیق میں سرگرداں اور پریشان رہا۔ جہاں تک امکان میں تھا، قدیم و جدید تفسرین اور شرح حدیث کو چھان مارا اور کوئی بات ایسی قابل تسکین نہ ملی جس سے یہ خلش دور ہوتی کہ بالآخر یہ ایسا کیوں ہوا کہ جس سے داؤد علیہ السلام کی عبادت میں رخنہ اندازی ہوئی اور عبادت میں یک سوئی نہ رہ سکی۔ حضرت شاہ صاحب اس وقت بیمار تھے۔ بیماری کا خیال کر کے حضرت شاہ صاحب کے پاس جاتے ہوئے ہچکچاتا تھا، جب دیکھا کہ کوئی صورت تسلی و اطمینان کی نہیں اور ان آیات کے تحت لکھوں تو کیا لکھوں؟ کام لکھا ہوا ہے، ناچار حضرت شاہ صاحب سے عرض کیا کہ مجھے پندرہ دن تفسیروں کے اوراق گردانتے ہوئے ہو گئے مگر ان آیات کا کوئی حل نہیں ملا۔ شاہ صاحب نے فرمایا بے شک ان آیات میں اشکال ہے، البتہ میری نظر سے ایک حدیث گزری ہے جو مستدرک حاکم میں ہے۔ ضعف ہی کی حالت میں مستدرک اٹھائی اور دو چار ہی منٹ میں کچھ ورق الٹ پلٹ کر انگلی رکھ کر ایک حدیث بتلائی اور فرمایا کہ اس حدیث میں ان آیات کے متعلق حل نکلتا ہے۔ میں نے حدیث پڑھی، پیچھے سے کچھ ورق دیکھے کہ دیکھوں داؤد علیہ السلام کے متعلق کوئی باب ہو، کچھ نہ ملا اور نہ حدیث کو دیکھ کر کوئی بات سمجھ میں آئی۔ حضرت شاہ صاحب تو صرف اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گئے کہ یہ حدیث ہے اور اس میں ان آیات کے متعلق جو اشکال ہے اس کا حل ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس کتاب کو لے جاؤں۔ فرمایا لے جائیے اور دیکھ لیجئے میں کتاب لیکر اپنی جگہ آیا اور غور کیا تو مطلب کو پالیا۔ حدیث کا مضمون یہ ہے جس کو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے فوائد میں نقل کیا ہے۔

ہمارے نزدیک اس قصہ میں اصل بات وہ ہے جو حضرت ابن عباس سے منقول ہے یعنی داؤد علیہ السلام کو یہ ابتلاء ایک طرح کے اعجاب کی بناء پر پیش آیا، صورت یہ ہوئی کہ داؤد علیہ السلام نے بارگاہ ایزدی میں

عرض کیا کہ ”اے پروردگار ارات دن میں کوئی ساعت ایسی نہیں جس میں داؤد کے گھرانے کا کوئی نہ کوئی فرد حیری عبادت (یعنی نماز یا تسبیح و تحمید) میں مشغول نہ رہتا ہو۔“ یہ اس لیے کہا کہ انہوں نے روز و شب کے ۲۴ گھنٹے اپنے گھر والوں پر نوبت بہ نوبت تقسیم کر رکھے تھے، تاکہ ان کا عبادت خانہ کسی وقت عبادت سے خالی نہ رہنے پائے اور بھی کچھ اس قسم کی چیزیں عرض کیں (شاید اپنے حسن انتظام و غیرہ کے متعلق ہوں گی) اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناپسند ہوئی ارشاد ہوا کہ داؤد! یہ سب کچھ ہماری توفیق سے ہے اگر میری مدد نہ ہو تو اس چیز پر قدرت نہیں پاسکتا (ہزار کوشش کر کے نہیں جماسکتا) قسم ہے اپنے جلال کی میں تجھ کو ایک روز حیرے نفس کے سپرد کردوں گا! (یعنی اپنی مدد ہٹالوں گا، دیکھیں اس وقت تو کہاں تک اپنی عبادت میں مشغول رہ سکتا اور اپنا انتظام قائم رکھ سکتا ہے) داؤد علیہ السلام نے عرض کیا اے پروردگار مجھے اس دن کی خبر کر دیجئے پس اسی دن فتنہ میں مبتلا ہو گئے۔

(الخروج هذا الاثر الحاكم في المسند وقال صحيح الاسناد واقربه المذهب في التلخيص)

یہ روایت بتلاتی ہے کہ فتنہ کی نوعیت صرف اسی قدر ہونی چاہئے کہ جس وقت داؤد علیہ السلام عبادت میں ہوں باوجود پوری کوشش کے مشغول نہ رہ سکیں اور اپنا انتظام قائم نہ رکھ سکیں۔ چنانچہ آپ پڑھ چکے کہ کس بے قاعدہ اور غیر معمولی طریقے سے چند اشخاص نے اچانک عبادت خانہ میں داخل ہو کر حضرت داؤد علیہ السلام کو گھبرا دیا اور ان کے مشغول خاص سے ہٹا کر اپنے جھگڑے کی طرف متوجہ کر لیا۔ بڑے پہرے اور انتظامات ان کو داؤد علیہ السلام کے پاس پہنچنے سے نہ روک سکے تب داؤد علیہ السلام کو خیال ہوا کہ اللہ نے میرے اس دعوے کی وجہ سے اس فتنہ میں مبتلا کیا۔

اس سے آگے مولینا شبیر احمد صاحب نے لفظ فتنہ کی تفسیر میں مزید کچھ لکھا ہے جو ان آیات کے فوائد دیکھنے سے متعلق ہے۔ مولینا موصوف نے جب حضرت شاہ صاحب کی بتلائی ہوئی حدیث سے یہ فوائد لکھ لئے تو حضرت شاہ صاحب کو سنائے جس کی حضرت شاہ صاحب نے تصویب کی اور فرمایا حدیث کا یہی مضمون ہے اور ان آیات کے درج ذیل یہی مناسب ہے۔

مولینا شبیر احمد صاحب نے حضرت شاہ صاحب کے حفظ و ذکاوت کی دو چیزوں کی داد دی اور فرمایا کہ اس حفظ کا کیا ٹھکانا کہ اتنی بڑی ضخیم کتاب سے ایک دو منٹ میں چند ورق ادھر ادھر کر کے حدیث پر انگلی رکھ کر بتلا دی، گویا ابھی حال ہی میں دیکھی ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کب دیکھی ہوگی۔ حضرت شاہ صاحب کی عادت تھی، اپنی کتاب ہاتھ میں اٹھائی اول سے آخر تک دیکھتے رہے جب تک ختم نہ کر لیتے چھوڑتے نہیں تھے۔

مستدرک غالباً تین چار سال پہلے زمانہ قیام دارالعلوم میں دیکھی تھی اور فرمایا کہ کذاوت اور سرعت انتقال دینی پر غور کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کتاب دیکھتے دیکھتے جب حدیث سامنے آتی ہے تو فکر کس سرعت سے اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق آیات میں مفید طلب ہوگی (جس کی تفسیر میں حضرت مولینا شبیر احمد صاحب عیسیٰ عالم کو چند روزہ دل سرگردان و پریشان رہنا پڑا)۔

مولینا طیب صاحب کا بیان:..... مولینا طیب صاحب کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی غیر معمولی قوت حافظہ سے حفاظ سلف کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ انہیں غیر متداول بلکہ غیر معروف کتب کی عبارتیں بھی اس درجہ مختصر رہتی تھیں کہ وقت پڑنے پر بے تکلف پیش کر دیا کرتے تھے اور علماء حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے تھے۔

اس سلسلے میں اپنے مقالہ نور الانور میں مولینا موصوف نے دو واقعات کا خصوصی طور ذکر کیا ہے۔ پہلا واقعہ طویل ہونے کی وجہ سے ہم اپنے الفاظ میں مختصر کر کے اس طرح عرض کرتے ہیں کہ مولینا طیب صاحب کو اپنی ایک تصنیف میں ابوالحسن کذاب کی سوانح حیات کی ضرورت تھی۔ انہیں جب اس بارے میں کہیں معلومات نہیں ملی تو عاجز آ کر حضرت شاہ صاحب سے ماخذ دریافت کئے۔ حضرت شاہ صاحب نے متعدد کتابوں کے حوالے دے دئے کہ ان میں ابوالحسن کذاب کے حالات مل جائیں گے۔ مولینا طیب صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میں! کہاں کہاں تلاش کرنا پھروں گا آپ خود ہی کچھ فرمادیں میں آپ ہی کا حوالہ دیکر اسے جزو کتاب بناؤں گا۔ اس پر حضرت شاہ صاحب نے برجستہ ابوالحسن کذاب کے سن ولادت سے لیکر سن وفات تک کے اس سلسلے کے اجمالی حالات ترتیب وار بیان فرمائے اور اس کے کذب و زور کے متعدد واقعات سنائے۔

مولینا طیب صاحب کا بیان ہے کہ مجھے خیال ہوا کہ شاید حضرت شاہ صاحب نے ابھی حال ہی میں یہ حالات مطالعہ کئے ہیں۔ چنانچہ جب میں نے حضرت سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا نہیں مولوی صاحب! قریباً تیس سال کا عرصہ ہوا، جب مصر جانا ہوا تھا وہاں کے ایک کتب خانہ میں اتفاق سے اسی ابوالحسن کے حالات پر ایک کتاب ہاتھ میں آگئی روآوری میں اس کا بھی مطالعہ کیا اور اب آپ کے دریافت کرنے پر من و عن متحضر ہو گئے۔

جہاں تک دوسرے واقعہ کا تعلق ہے اسے ہم قارئین کی دلچسپی کے لئے ذیل میں من و عن درج کرتے ہیں چنانچہ مولینا طیب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

①..... ملاحظہ ہو حیات النور ۳۳۷ تا ۳۵۲ مقالہ مولینا محمد ادریس صاحب سکھر وڑوی۔ ②..... ملاحظہ ہو رجحان نظر کتب میں مولینا طیب صاحب کا مقالہ و مکاتیب طیب جلد اول ص ۳۵۔

تحریک خلافت کے دور میں جب عبارت شرعیہ کا مسئلہ چھڑا تو مولوی سبحان اللہ خان صاحب مورکھپوری نے اس مسئلہ میں اپنے بعض نقاط نظر کی تائید میں بعض سلف کی عبارت پیش کی جو ان کے نقطہ نظر کی تو موید تھی مگر مسلک جمہور کے خلاف تھی۔ یہ عبارت وہ لے کر خود دیوبند تشریف لائے اور مجمع علماء میں اسے پیش کیا۔ تمام اکابر دارالعلوم حضرت شاہ صاحب کے کمرہ میں جمع تھے جہاں یہ تھی کہ نہ اس عبارت کو رد ہی کر سکتے تھے کہ وہ سلف میں سے ایک بڑی شخصیت کی عبارت تھی اور نہ اسے قبول ہی کر سکتے تھے کہ مسلک جمہور کے صراحتاً خلاف تھی۔ یہ عبارت اتنی واضح اور صاف تھی کہ اسے کسی تاویل و توجیہ سے بھی مسلک جمہور کے مطابق نہیں کیا جاسکتا تھا۔

حضرت شاہ صاحب استیجاب کے لئے تشریف لے گئے ہوئے تھے وضو کر کے واپس ہوئے تو اکابر نے عبارت اور مسلک کے تعارض کا تذکرہ کیا اور یہ کہ ان دونوں باتوں میں تطبیق و توفیق بھی نہیں پڑتی۔ حضرت ممدوح حسب عادت حسبن اللہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے اور عبارت کو ذرا غور سے دیکھ کر فرمایا کہ اس عبارت میں جعل اور تصرف کیا گیا ہے اور دو سطروں کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے درمیان کی ایک سطر چھوڑ دی گئی ہے۔ اسی وقت کتب خانہ سے کتاب منگائی گئی، دیکھا گیا تو واقعی اصل عبارت میں سے پوری ایک سطر درمیان سے حذف ہوئی تھی۔ جوں ہی اس ساقط کردہ سطر کو عبارت میں شامل کیا گیا عبارت کا مطلب مسلک جمہور کے موافق ہو گیا اور سب کا تحیر رفع ہو گیا۔

(ملاحظہ ہو حیات انور ۲۲۹-۲۳۰)



حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ

مرتبہ گونددہ

علامہ جلیل حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردوں کا حلقہ اتنا وسیع ہے کہ آج تک کوئی شخص یہ اندازہ ہی نہ کر سکا کہ اس منبع علم و فضل سے کتنے طالبان علم دین مستفیض ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند میں حضرت نے لگ بھگ اٹھارہ سال تک درس و تدریس کے کام جاری رکھا اور ایک محتاط اندازہ کے مطابق دو ہزار کے قریب تشنگان علم ان سے بلا واسطہ مستفید ہوئے۔ بعد ازاں کئی سال تک جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں درس و تدریس کا کام کو جاری رکھا اور یہاں بھی ایک کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ اسی طرح بارہ مولہ کشمیر کے مدرسہ فیض عام اور دہلی کے مدرسہ امینیہ میں بھی بے شمار طالبان علم کو سرفراز فرمایا۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ کی ذات گرامی جو بلا مبالغہ ”آیت من آیات اللہ“ تھی کو یہ خصوصیت و امتیاز بھی حاصل تھا کہ آپ کے حلقہ تلامذہ میں جن سعادت مند ان اڑی کو شامل رہنے کا موقع ملا وہ اپنے وقت کے بہترین رجال علم و عمل سمجھے گئے اور انہوں نے دین و شریعت سے لیکر ادب و سیاست تک کے میدان میں عوام و خواص کی نمایاں اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ حضرت کے ارشد تلامذہ کی ایک بڑی تعداد انکی زندگی میں دین و سیاست، علم و ادب اور ملی رہنمائی کی مسندوں پر جلوہ فرما تھی اور حضرت کے انتقال کے بعد برصغیر ہند و پاک اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں اشاعت و تبلیغ علوم اسلامیہ کی خدمت کا بڑا حصہ ان ہی کے شاگردوں سے انجام پایا۔ آج بھی خدائے رحیم و کریم کے فضل سے حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردوں کی کمی نہیں ہے۔ اور انہیں علم و فیض اور دینی زندگی کے ایک معیار کی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن و حدیث کی تفسیر و تشریح احیاء و اسلام اور امانت کفر کی جو خدمت جس بھی صاحب سے پوری ہو رہی ہے وہ بالواسطہ یا بلا واسطہ حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردوں میں سے ہے۔ متعدد حضرات ایسے بھی ہیں جو گمنامی کے گوشوں میں چھپ کر خاموش طریقے سے دینی خدمات انجام دے رہے ہیں اس علم و فن کے بحر ذخار سے فیض یافتہ چند ممتاز شاگرد ایسے بھی ہیں جو پورے عالم اسلام میں نہ صرف معروف و مقبول ہیں بلکہ ان کی بقاء سے دنیا و اسلام کا دل و دماغ معطر اور پر کیف بنا ہوا ہے۔

ذیل میں ہم حضرت مرحوم کے شاگردوں کی ایک مختصر اور نا تمام فہرست پیش کرتے ہیں اس فہرست میں خوف طوالت سے صرف ان حضرات علماء کے اسماء گرامی درج کئے گئے۔ جن کی

خدمات نے نمایاں شہرت حاصل کی ہے۔

۱۔ حضرت مولینا فخر الدین احمد شیخ الحدیث، مرکز علوم اسلامیہ دارالعلوم دیوبند (دورہ حدیث شریف آپ نے اگرچہ حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ سے پڑھا ہے لیکن حضرت شاہ صاحب قدس سرہ سے بھی اتنا علمی استفادہ کیا ہے کہ آپ کے تلامذہ کی صف میں سب سے اول نمبر پر آپ کا شمار کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ حکیم الاسلام حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم مہتمم دارالعلوم دیوبند
۳۔ مجاہد ملت حضرت مولینا حفظ الرحمن صاحب سابق جنرل سکریٹری جمعیتہ العلماء ہند دہلی۔
۴۔ شیخ الادب حضرت مولینا محمد اعجاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند۔
۵۔ شیخ الحدیث حضرت مولینا حبیب الرحمن صاحب میونداتھ بھجن ضلع اعظم گڑھ یوپی۔
۶۔ حضرت مولینا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی ناظم اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی۔
۷۔ حضرت مولینا بدر عالم صاحب مرحوم مہاجر مدنی مولف فیض الباری نزیل مدینہ منورہ
۸۔ حضرت مولینا مناظر احسن صاحب گیلانی سابق صدر شعبہ دینیات حیدرآباد عثمانیہ یونیورسٹی
و مولف سوانح قاسمی

۹۔ حضرت مولینا محمد بن موسیٰ میاں سملکی قدس سرہ العزیز افریقہ بانی مجلس علمی ڈابھیل
۱۰۔ حضرت مولینا محمد ادریس صاحب کاندھلوی سابق شیخ الحدیث و صدر جامعہ اشرفیہ لاہور
(پاکستان)

۱۱۔ حضرت مولینا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سابق مفتی دارالعلوم دیوبند و مفتی اعظم پاکستان و شیخ الحدیث دارالعلوم کراچی

۱۲۔ حضرت مولینا محمد صدیق صاحب مرحوم نجیب آباد مولف انوار الحمود
۱۳۔ حضرت مولینا قاضی سجاد حسین صاحب صدر المدرسین، مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی۔

۱۴۔ حضرت مولینا پروفیسر سعید احمد صاحب اکبر آبادی دامت برکاتہم سابق صدر شعبہ دینیات (سنی) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایڈیٹر ماہنامہ برہان دہلی

۱۵۔ حضرت مولینا سید محمد یوسف صاحب بنوری سابق شیخ الحدیث دارالعلوم اسلامیہ نیوٹاون کراچی پاکستان مولف و مصنف ”تھقبہ العنبر“ (م ۱۹۷۷ء)

۱۶۔ حضرت مولینا محمد ادریس صاحب سکھر ڈوی، سابق مدرس جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سورت۔
۱۷۔ حضرت مولینا محمد میاں صاحب دیوبند ناظم جمعیتہ علماء ہند دہلی (م ۱۹۷۵ء)

- ۱۸۔ حضرت مولینا محمد چراغ صاحب گوجرانوالہ
 - ۱۹۔ حضرت مولینا حسان اللہ خان صاحب تاجور لاہور
 - ۲۰۔ حضرت مولینا سید امین الحق صاحب مردانی
 - ۲۱۔ حضرت مولینا غلام مرشد صاحب مفسر و محدث حال خطیب شاہی مسجد لاہور۔
 - ۲۲۔ حضرت مولینا محمد نعیم صاحب لدھیانوی
 - ۲۳۔ حضرت مولینا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی مجلس احرار کے قائد اعظم
 - ۲۴۔ حضرت مولینا حمید الدین صاحب فیض آبادی شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ کلکتہ
 - ۲۵۔ حضرت مولینا مفتی محمود احمد صاحب نانوتوی مفتی مدھیہ بھارت (مہو کینٹ) رکن مجلس شوری دارالعلوم دیوبند
 - ۲۶۔ حضرت مولینا حامد الانصاری صاحب غازی سابق مدیر "مدینہ" بجنور پور پٹی رکن مجلس شوری دارالعلوم دیوبند
 - ۲۷۔ حضرت مولینا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ
 - ۲۸۔ حضرت مولینا سلطان محمود صاحب سرحدی سابق صدر مدرس مدرسہ فتح پوری دہلی
 - ۲۹۔ حضرت مولینا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی سنبھلی (مراوا آباد)
 - ۳۰۔ حضرت مولینا نور الدین صاحب بہاری مشہور کانگریسی رہنما
 - ۳۱۔ حضرت مولینا محمد ادریس صاحب میرٹھی
 - ۳۲۔ حضرت مولینا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی
 - ۳۳۔ حضرت مولینا محمد صاحب انوری لاکھپور ری مرحوم سابق مہتمم مدرسہ تعلیم الاسلام سنت پورہ
- لاکھ پور پاکستان
- ۳۴۔ حضرت مولینا غلام غوث صاحب سرحدی ناظم جمعیت علماء (پاکستان)
 - ۳۵۔ حضرت مولینا عبدالرحمن صاحب کامل پوری محدث، حضور ضلع کیملیہ (پاکستان)
 - ۳۶۔ حضرت مولینا شائق احمد صاحب مدیر عصر جدید (کراچی)
 - ۳۷۔ حضرت مولینا قاری اصغر علی صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند
 - ۳۸۔ حضرت مولینا عبدالحق صاحب نافع سابق استاد دارالعلوم دیوبند
 - ۳۹۔ حضرت مولینا عبد الوہاب صاحب مہتمم مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری چانگام
 - ۴۰۔ حضرت مولینا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری چانگام

- ۴۱۔ حضرت مولانا فیض اللہ صاحب مفتی مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری چانگام
- ۴۲۔ حضرت مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی مرحوم سابق ناظم دارالصنائع دارالعلوم دیوبند
- ۴۳۔ حضرت مولانا عبداللہ خان صاحب بجنوری
- ۴۴۔ حضرت مولانا سید اختر حسین صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند
- ۴۵۔ حضرت مولانا یعقوب الرحمن صاحب عثمانی سابق ناظم جمعیتہ الطالبہ دارالعلوم دیوبند
- ۴۶۔ حضرت مولانا احمد نور صاحب سابق استاذ دارالعلوم دیوبند و مدرسہ شاہی مرآۃ آباد وغیرہ
- ۴۷۔ حضرت مولانا فیوض الرحمن صاحب دیوبند پروفیسر اور منتقل کالج لاہور
- ۴۸۔ حضرت مولانا عبدالکھان صاحب ہزاروی جامع مسجد صدر راولپنڈی
- ۴۹۔ حضرت مولانا اسماعیل یوسف گارڈی جوہانسبرگ (ٹرانسوال) جنوبی افریقہ
- ۵۰۔ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری
- ۵۱۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سرگودھا
- ۵۲۔ حضرت مولانا جمیل الدین صاحب میرٹھی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل
- ۵۳۔ حضرت مولانا ایوب صاحب اعظمی شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت
- ۵۴۔ حضرت مولانا احمد اشرف صاحب جامعہ اشرفیہ راند پور ضلع سورت
- ۵۵۔ حضرت مولانا محمد عرفان صاحب ہزاروی خلافت کمیٹی صوبہ سرحد کے روح رواج اور علی برادران کے دست راست
- ۵۶۔ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب بہاری سابق صدر جمعیت علماء ہمدانی
- ۵۷۔ حضرت مولانا سید ثناء احمد صاحب انوری لہریہ سرائے ضلع درجنگ
- ۵۸۔ حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمی استاذ دارالعلوم دیوبند
- ۵۹۔ حضرت مولانا حکیم سید محفوظ علی صاحب مرحوم دیوبند (حضرت شاہ صاحب کے برادر نہتی)
- ۶۰۔ حضرت مولانا حکیم محبوب الرحمن صاحب بجنور
- ۶۱۔ حضرت مولانا سید احمد رضا صاحب مؤلف انوار الباری مکتبہ ناشر العلوم بجنور یوپی
- ۶۲۔ حضرت مولانا محمد امین صاحب استاذ حدیث دارالعلوم مئو اعظم گڑھ
- ۶۳۔ حضرت مولانا ریاست علی صاحب جبل پور
- ۶۴۔ حضرت مولانا آل حسن رضوی دیوبند مقیم میرٹھ
- ۶۵۔ حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مدرسہ مظہر العلوم کرنپور ضلع بجنور

- ۶۶۔ حضرت مولینا ابوالاحمد عبداللہ صاحب لدھیانوی دارالعلوم نعمانیہ گوجرانوالہ
- ۶۷۔ حضرت مولینا ظہور احمد صاحب دیوبندی سابق استاذ دارالعلوم دیوبند
- ۶۸۔ حضرت مولینا محمد جلیل کیرانوی استاذ دارالعلوم دیوبند
- ۶۹۔ شیخ الفیر حضرت مولینا غلام اللہ خان صاحب راولپنڈی پاکستان
- ۷۰۔ حضرت مولینا انوار الحسن صاحب شیرکوٹی مرحوم
- ۷۱۔ حضرت مولینا حشمت علی صاحب سہارنپوری
- ۷۲۔ حضرت مولینا عبدالوہید صاحب پرتاپ گڑھ (یوپی)
- ۷۳۔ حضرت مولینا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم (بی ایس سی ایم بی بی ایس) سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- ۷۴۔ حضرت مولینا حکیم سعد اللہ صاحب ناظم دارالعلوم مٹواتھہ بھجن ضلع اعظم گڑھ
- ۷۵۔ حضرت مولینا محمد صادق صاحب صدر مدرس بڑودہ گجرات
- ۷۶۔ حضرت مولینا نعمت اللہ صاحب انوری ضلع بیر بھوم
- ۷۷۔ حضرت مولینا مفتی اسماعیل محمود بسم اللہ صاحب مرحوم سابق مفتی و مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت
- ۷۸۔ حضرت مولینا محمود احمد صاحب ضلع دربھنگہ (بہار)
- ۷۹۔ حضرت مولینا حکیم عبدالاول صاحب اجڑاڑہ ضلع میرٹھ
- ۸۰۔ حضرت مولینا افتخار علی صاحب خیرنگر بازار میرٹھ
- ۸۱۔ حضرت مولینا اسماعیل کاکھیوی صاحب مرحوم جوہانسرگ (جنوبی افریقہ)
- ۸۲۔ حضرت مولینا صالح ابن محمد منگیر جوہانسرگ (جنوبی افریقہ)
- ۸۳۔ حضرت مولینا ایم آئی نانا صاحب جوہانسرگ (جنوبی افریقہ)
- ۸۴۔ حضرت مولینا ابوالوفاء صاحب شاہ جہاں پوری مشہور و معروف خطیب و مناظر
- ۸۵۔ حضرت مولینا ڈاکٹر مصطفیٰ حسن صاحب علوی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی و ممبر مجلس شوری دارالعلوم دیوبند
- ۸۶۔ حضرت مولینا موسیٰ بھام جی صاحب (افریقہ)
- ۸۷۔ حضرت مولینا مفتی ابراہیم صاحب سجالوی (افریقہ)
- ۸۸۔ حضرت مولینا ڈی ای بیرا صاحب (افریقہ)

- ۸۹۔ حضرت مولینا حکیم عبدالجلیل صاحب دہلوی پروفیسر جامعہ ملیہ قریب باغ دہلی
- ۹۰۔ حضرت مولینا عبدالقیوم صاحب آروی سید پور ضلع رگپور (بگلہ دیش)
- ۹۱۔ حضرت مولینا لطف اللہ صاحب پشاور
- ۹۲۔ حضرت مولینا عبدالحی مدنی حضرت حقانی چوک آرام باغ کراچی
- ۹۳۔ حضرت مولینا عبدالقیوم صاحب خطیب جامع مسجد ہری پور ہزارہ
- ۹۴۔ حضرت مولینا مظفر الدین صاحب مراد آبادی
- ۹۵۔ حضرت مولینا حبیب اللہ صاحب سلطان پوری استاد ندوۃ العلماء لکھنؤ
- ۹۶۔ حضرت مولینا عبدالصمد صاحب بنگلور
- ۹۷۔ حضرت مولینا فتح الدین صاحب بہاری
- ۹۸۔ حضرت مولینا محمد حسین صاحب (برما)
- ۹۹۔ حضرت مولینا حبیب الرحمن صاحب مکی خطیب جامع مسجد چانگام
- ۱۰۰۔ حضرت مولینا احمد علی صاحب گجراتی (ایم اے) گوجرانوالہ
- ۱۰۱۔ حضرت مولینا محمد یوسف شاہ صاحب مرحوم سابق میر واعظ کشمیر مترجم قرآن شریف (بزبان کشمیری) و مصنف ”تنویر المصاریح“
- ۱۰۲۔ حضرت مولینا سید میرک شاہ صاحب اندرابی مرحوم سابق پروفیسر اور نیشنل کالج لاہور و سابق استاذ دارالعلوم دیوبند وغیرہ۔
- ۱۰۳۔ حضرت مولینا عبدالکبیر صاحب مرحوم سابق پرنسپل مدرسۃ العلوم حضرت بل سرینگر کشمیر
- ۱۰۴۔ حضرت مولینا سید محمد یوسف شاہ صاحب وترہ ہیلی مرحوم سابق پرنسپل نور اسلام اور نیشنل کالج ”سرینگر کشمیر“
- ۱۰۵۔ حضرت مولینا سید عنایت اللہ شاہ بخاری مرحوم ساکن کریزی تحریک حریت کشمیر کے اولین مجاہد اور مسلم کانفرنس کے سرکردہ رکن
- ۱۰۶۔ حضرت مولینا عبدالقدوس صاحب ساکن ون گام بڈ گام حال مفتی اعظم مظفر آباد
- ۱۰۷۔ حضرت مولینا سیف اللہ شاہ صاحب مرحوم (برادر اصغر حضرت شاہ صاحب) لولاب کشمیر
- ۱۰۸۔ حضرت مولینا غلام مصطفیٰ صاحب مسعودی کشمیری (سابق ایم ایل اے)
- ۱۰۹۔ حضرت مولینا مفتی محمد اسرائیل صاحب مرحوم سابق مفتی اعظم ضلع مظفر آباد
- ۱۱۰۔ حضرت مولینا سید احمد اللہ صاحب مرحوم مشہور مفتی دین و مبلغ اسلام علاقہ دوڑو شاہ آباد

خوف طوالت اور قلت گنجائش کی وجہ سے ہم نے صرف ایک سو دس تلامذہ کرام کے اسماء گرامی پر مشتمل فہرست درج کرنے پر ہی اکتفا کیا ورنہ میسر شدہ معلومات کی روشنی میں یہ فہرست کافی طویل ہو جاتی اور اگر ہر اسم گرامی کے ساتھ حالات زندگی، دینی خدمات اور تصانیف و تراجم کا تذکرہ بھی کیا جاتا تو یہ فہرست خود ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کر لیتی۔

جن حضرات علماء کے اسماء گرامی ہم نے یہاں درج کئے ان میں چند ایسے صاحب منہج علم و عمل بھی ہیں جن کو حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے دائرہ علم (Encyclopaedia) سے تعبیر کیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے سعادتمند شاگردوں میں اگرچہ بیشتر داعی اجل کو لبیک فرما چکے تاہم کارہائے نمایاں کی انجام دہی کی وجہ سے وہ بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں

الناس موتی و اهل العلم اخیاء

جو حضرات اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں ان کے حق میں ہم بسجود و حمیم اللہ رحمة واسعة اور جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل و کرم سے بقید حیات ہیں ان کے حق میں ماسوائے مد ظلہم العالی دامت فیوضہم زید مجدہم باریک اللہ فی علمہم و عملہم وغیرہ کے کیا دعاء کر سکتے ہیں۔



اکابر و معاصرین کے ساتھ

حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ

مرتبہ گویندو

(۱)..... شیخ الہند حضرت مولینا محمود الحسن صاحب دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز قرآن و حدیث اور فقہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے سب سے بڑے استاذ تھے لیکن وہ اس کے باوجود مسائل مشکلہ شاہ صاحب سے دریافت فرمایا کرتے تھے کہ تمہاری اس مسئلہ میں کیا رائے ہے؟ اور کبھی کبھی شفقت و محبت کے جوش میں آپ شاہ صاحب کو ”علامہ“ کے وقیع خطاب سے بھی سرفراز فرماتے تھے کہ کہو علامہ! اس مسئلہ میں سلف کا کوئی قول یاد ہے؟ چنانچہ اپنے استاذ مکرم کے استثناء پر حضرت شاہ صاحب نہایت مؤدبانہ اور مناسب جواب دیتے تھے اور اس پر حضرت شیخ الہند اطمینان اور مسرت کا اظہار فرماتے تھے۔

(۲)..... حضرت شیخ الہندؒ کو اپنے اس شاگرد رشید کے علم و فضل اور اصابت رائے پر کتنا اعتماد تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مولینا ظہیر احسن شوق نیویؒ نے جب آثار السنن کے کچھ حصے تالیف فرما کر حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں ملاحظہ کے لئے ارسال کئے تو حضرت موصوف نے اس کی تصحیح کے لئے حضرت شاہ صاحب کو منتخب فرمایا۔ چنانچہ اس سلسلے میں خود حضرت شاہ صاحبؒ کا بیان ہے کہ۔

”جس زمانہ میں مولینا ظہیر احسن صاحب نیوی رحمۃ اللہ علیہ آثار السنن تالیف فرما رہے تھے۔ انہوں نے اس کے کچھ اجزاء حضرت استاذؒ (یعنی حضرت شیخ الہندؒ) کی خدمت میں اس غرض سے بھیجے کہ وہ ملاحظہ فرما کر مشورے دیں اور جو اضافے فرمائے جاسکیں وہ اضافے فرمادیں“

حضرت استاذؒ نے ملاحظہ فرما کر وہ اجزاء واپس فرمادیئے اور انکو میرا پتہ لکھ دیا کہ آپ اس مقصد کے لئے اس پتہ پر خط و کتابت فرمائیں، میں اس زمانے میں اپنے وطن (کشمیر) میں رہتا تھا۔ الخ ۱

(۳)..... جنید زمن حضرت شیخ الہندؒ قدس سرہ حضرت شاہ صاحبؒ کے شفیق استاد تھے اور اس

کے باوجود آپ کا بہت زیادہ احترام فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب کے ایک قابل فخر شاگرد اور دارالعلوم کے مہتمم اعلیٰ حضرت مولینا طیب صاحب کا بیان ہے کہ ”حضرت شیخ الہند استاد ہونے کے باوجود تو قیر کے کلمات ان کے بارہ میں استعمال فرماتے تھے“ ❶

(۴)..... چونکہ حضرت شاہ صاحب کو مجرد رہنا ہی پسند تھا اور آپ شادی کے لئے بالکل آمادہ نہیں تھے لیکن اکابرین دیوبند خصوصاً ان کے استاذ مکرم حضرت شیخ الہند دیوبند میں ان کے مستقل قیام کی تجاوز سوچا کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ہی حضرت شاہ صاحب کو ابتداءً اللہ سے نکاح کرنے کی تاکید فرمائی۔ چنانچہ اپنے شفیق و محترم استاد کے اصرار پر حضرت شاہ صاحب نے شادی کے لئے رضامندی ظاہر فرمادی اور اس طرح سے حضرت شیخ الہند کی تاکید اور مولینا حبیب الرحمن صاحب عثمانی کے حسن انتخاب سے ۱۳۳۶ھ میں گنگوہ ضلع سہارنپور کے ایک اعلیٰ اور معزز خاندان میں آپ کی شادی ہو گئی۔

(۵)..... حضرت شیخ الہند کے دل میں شاہ صاحب کی طالب علمی کے زمانہ سے ہی آپ کا کس قدر حسن ظن تھا۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے حضرت شاہ صاحب کی سند فراغت پر ایک نگاہ ڈالنا کافی ہوگا۔ دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے پر فضلا، دیوبند کو جو سند دی جاتی اس میں اساتذہ اپنے شاگرد کی نسبت اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہیں حضرت شیخ الہند نے حضرت شاہ صاحب کو جو سند فضیلت اور سند اجازت عنایت فرمائی تھی اس میں اپنے تاثرات کو یوں تحریر فرمایا تھا کہ خداوند تعالیٰ نے مولینا انور شاہ میں علم، عمل، سیرت، صورت، ورع، زہد، رائے صائب اور ذہن ثاقب کو جمع کر دیا ہے ❷۔

اللہ اللہ! ایک سطر میں حضرت شیخ الہند جیسی ہستی کے قلم سے ایسے آٹھ اوصاف کا اعتراف ہے جن کا ایک ذات میں اجتماع صاحب اوصاف کی شخصیت کو اپنے وقت کی بے نظیر شخصیت بنا ڈالنے کی ضمانت ہے۔

(۶)..... اور یہی وجہ تھی کہ ۱۳۳۳ھ میں حضرت شیخ الہند حج بیت اللہ کے لئے دیوبند سے روانہ ہوئے تو دیگر سینئر اساتذہ کے موجود ہوتے ہوئے بھی موصوف نے اپنی جانشینی کے فخر و امتیاز سے حضرت شاہ صاحب کو ہی مشرف فرمایا اور اس طرح سے حضرت شاہ صاحب ۱۳۳۳ھ سے ۱۳۳۵ھ تک دارالعلوم میں بحیثیت صدر مدرس و جانشین حضرت شیخ الہند درس حدیث دیتے رہے اور بقول مولینا طیب صاحب شیخ الہند کی ہجرت کے بعد ”علمی پیاسوں“ کو یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ علم کے ایک بحرِ خار سے محروم ہو گئے ہیں بلکہ انہیں معلوم ہوا کہ اگر سمندر سامنے نہیں رہا ہے تو

اس سمندر سے نکلا ہوا ایک عظیم الشان دریا ان کے سامنے ہے جو اپنی بعض امتیازی خصوصیات کے ساتھ بدل الغلط نہیں بلکہ بالکل صحیح ہے۔ جس سے بلا تامل علوم کے پیاسے سیراب ہونے لگے اور آب حیات سے قدیم و جدید سیرابی میں انہیں کوئی زیادہ فرق محسوس نہ ہوا ①۔

اس واقعہ کو مولینا محمد میاں صاحب مرحوم کے الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ (دارالعلوم کی چاب نشینی ایک) ایسا قبا تھا جو بلا کسی قطع و برید کے حضرت شاہ صاحب کے قامت موزوں پر راست آکر کر رہا تھا ②۔

(۷)..... ۱۳۳۹ھ میں جب حضرت شیخ الہند انتقال کر گئے تو ہر طرف قیامت پھانسی، لوگ چیخیں اور دھاڑیں مار مار کر اظہار غم کرتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ انکی آنکھیں اشک بار تھیں۔

مولینا لاکپوری اس واقعہ کے متعلق ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ جوں ہی ریل گاڑی بعد مغرب اسٹیشن دیوبند پہنچی سب کی بے ساختہ چیخیں نکل گئیں، نہایت ادب کے ساتھ تابوت شریف باہر لایا گیا۔ اسٹیشن سے مدرسہ تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے لوگ تابوت اٹھائے ہوئے تھے اور روتے ہوئے حضرت شیخ الہند کے در دولت کی طرف آرہے تھے۔ حضرت شاہ صاحب بھی ساتھ ہی ساتھ روتے ہوئے تشریف لارہے تھے۔ خود فرماتے ہیں ولسم ار مثل الیوم کم کان باکیا یعنی اس دن کتنے لوگ رو رہے تھے ایسا نظارہ میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔

پھر ایک دن تعزیتی جلسہ ہوا۔ حضرت مولینا حافظ محمد احمد صاحب کی صدارت تھی سبھی اکابر نے مرثیے پڑھے۔

حضرت شاہ صاحب بھی کھڑے ہوئے، آنسو جاری تھے، دو قصیدے ایک عربی جو فضل الخطاب کے آخر میں لگا ہوا ہے پہلے وہ پڑھلے

قفا نیک من ذکرى مزار فندمعا

مصیفا ومشتائم مرأى وسمعا

قد احتفہ الا لطاف عطفاً وعطفہ

وبورک فیہ مربعا ثم مربعا ③

پھر فارسی کا طویل قصیدہ پڑھا حاضرین وقف گریہ و بکا تھے۔ (مرثیہ کے چند شعر ذیل ہیں)

بگذر از یاد گل و گلبن کہ نیچم یاد نیست

①..... حیات النور ص ۲۰۹۔ ②..... حیات النور ص ۲۷۶۔ ③..... ملاحظہ ہو فصل الخطاب فی مسکن ام الکتاب ص ۱۰۳۔

در زمین و آسمان جز نام حق آباد نیست
بر روان رہ روان ہم رجمے بفرستہ باش
شرح حال خود نمودن شکوہ تقدیر نیست
نالہ بر سنت نمودن نوحہ و فریاد نیست

پھر فرمایا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بھی سنت کے مطابق حزن و مال کا اظہار کیا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی مرثیہ پڑھا ہے۔ اس لئے آنسو بہانا یا غم کا اظہار کرنا بدعت نہیں ہے۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے ❶۔
(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند مئی ۱۹۶۵ء ص ۱۶)

(۸)..... مولینا لاکپوری کا بیان ہے کہ درس میں اکثر حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ وہ جانبازی (یعنی جہاد حریت میں) جو حضرت شیخ الہند نے دکھائی ہے وہ تو کوئی کیا دکھائے گا۔
(۹)..... حضرت مولینا محمد انوری صاحب لاکپوری اپنے ایک فاضلانہ مقالہ میں حضرت شیخ الہند اور حضرت شاہ صاحب کے باہمی تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں یوں رقمطراز ہیں۔

شوال ۱۳۳۵ھ میں جب احقر دورہ حدیث میں شامل ہونے کی غرض سے دارالعلوم دیوبند میں حاضر ہوا تو سامان دارالعلوم کے حجرہ میں رکھتے ہی حضرت شیخ الہند کی زیارت کے لئے حضرت کے آستانہ پر حاضر ہوا۔ دیکھا کہ علماء و صلحاء کا عظیم اجتماع ہے، گرمی کا وقت ہے، ایک بزرگ چھت کے پتکھے کا رسہ کھینچ رہے ہیں اور نرم نرم مترنم آواز میں فرما رہے ہیں۔ بھائی بیٹھ جاؤ حضرت کے ارد گرد بھینٹ نہ کرو۔ وہ بزرگ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ تھے، بعد عصر حضرت شیخ الہند کی سہ دری کے سامنے چار پائی بچھائی جاتی چاروں طرف کرسیاں رکھی جاتیں، چار پائیاں بچھ جاتیں، علماء و صلحاء و طلبہ دارالعلوم بقصد زیارت جمع ہو جاتے۔ حضرت شاہ صاحب بھی بدے پاؤں آکر دور بیٹھ جاتے، حضرت کو جب نظر پڑتی تو اپنے پاس والی کرسی پر بٹھاتے حضرت شیخ الہند جب مسائل بیان فرمانے لگتے۔ سبحان اللہ! علم و معارف کا بحر، خامو جیس مارنے لگتا۔ کبھی کسی مسئلہ پر فرماتے، بھئی اس کے متعلق مولوی انور شاہ صاحب سے پوچھنا چاہئے، کیوں شاہ صاحب! یہ مسئلہ یوں ہی ہے؟ عرض کرتے ہاں حضرت فلاں محقق نے یوں ہی لکھا ہے۔

❶..... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے۔ حضرت ابراہیم صاحبزادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر آپ نے فرمایا کہ اے بھراؤ! یا ابراہیم محزون و نون اور آنسو جاری تھے۔ (کوندو)

(۱۰)..... مولینا لالکپوری نے مزید لکھا ہے کہ!

ہاں سے جب حضرت شیخ الہند واپس تشریف لائے تو نصاریٰ سے ترک سوالات کا مسئلہ زیر غور تھا۔ قرار پایا کہ حضرت شاہ صاحب سے یہ مسئلہ تحریر کرایا جائے حضرت نے فتویٰ لکھا اور حضرت شیخ الہند کی خدمت مبارکہ میں حاضر ہو کر نہایت ادب سے بیٹھ کر سنایا۔ احقر نے دیکھا کہ صرف دس سطور تھیں لیکن ایسا جامع مانع کہ حضرت شیخ الہند نہایت محظوظ ہوئے احقر کے والد ماجد مرحوم چونکہ اس روز زیارت کی غرض سے حاضر ہوئے تھے اس لئے احقر بھی وہاں حاضر تھا۔ مولینا احمد اللہ پانی پتی، حضرت مولینا حسین احمد صاحب مدنی، بس یہ حضرات حاضر تھے۔

مولینا لالکپوری کی زبان سے یہ بھی سن لیجئے۔

(۱۱)..... جس روز احقر دیوبند حاضر ہوا تو حضرت شیخ الہند کی دعوت مع خدام و زائرین حضرت شاہ صاحب کے ہاں تھی۔ بعد نماز مغرب تین صد سے زائد مہمان حضرت کی معیت میں نودہ کی چھت پر تشریف فرما ہوئے۔ عجیب انوار و برکات کا نزول ہو رہا تھا۔ حضرت شاہ صاحب وجد کے عالم میں تھے کھانے سے فراغت کے بعد حضرت دیر تک تشریف فرما رہے۔

ایک دفعہ! حضرت شیخ الہند کی خدمت میں حاضر تھا، دن کے دس بجے ہوں گے، بارش ہو رہی تھی، فرمانے لگے، بھائی مولوی محمد حسن صاحب! شاہ صاحب کے ہاں چلنا ہے آج انہوں نے ہمیں مہمانوں سمیت مدعو کیا ہے۔ حکیم صاحب فرمانے لگے، حضرت بارش تو ہو رہی ہے، کھانا یہیں منگایا جائے گا۔ فرمایا نہیں بھائی میرے ایک مخلص نے دعوت دی ہے۔ وہیں جاؤں گا۔ چنانچہ بارش ہی میں چل دیئے۔ راستے میں سامنے سے شاہ صاحب تشریف لارہے تھے، عرض بھی کیا کہ کھانا در دولت پر پہنچا دیا جائے گا۔ فرمایا کچھ تکلیف نہیں۔ آپ کے گھر پر کھانا کھائیں گے۔

(۱۲)..... مولینا لالکپوری مرحوم ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ!

احقر ایک دفعہ ہوشیار پور میں (فارسی زبان کے مشہور شاعر اور نظام حیدر آباد کے استاذ) مولینا گرامی سے ملنے گیا۔ (۱۹۲۵ء میں احقر ۶ ماہ ہوشیار پور میں ایک عربی مدرسہ میں مدرس بھی تھا) گرامی کہنے لگے کہ آپ نے حدیث مولینا محمود الحسن صاحب سے پڑھی یا مولینا انور شاہ صاحب سے؟ میں نے عرض کیا حدیث تو شاہ صاحب مدظلہ ہی سے پڑھی ہے، ہاں بیعت حضرت شیخ الہند کے دست مبارک پر کی ہوئی ہے۔ خوش ہوئے، دیر تک باتیں کرتے رہے پھر فرمانے لگے کہ میں نے شاہ صاحب کی شان میں بہت سے اشعار کہے ہیں ایک شعر یہ ہے۔

چہ فصاحت چہ بلاغت چہ معانی چہ بیان
جلوہ فرماست در آغوش زبان انور

اسی شعر کو گرامی صاحب جہوم جہوم کر بار بار پڑھتے گئے اور حضرت شیخ الہندؒ کا مرثیہ بھی سنایا
جس میں یہ دو شعر بھی تھے۔

ماتم عاشق دل زندہ تماشا دارد
خفر از خویش شد و مرگ تمنا می کرد
از کجا تا کجا ماتم شیخ الہندؒ است
نالہ بر خورد بگو شمع کہ مسیحائی کرو

(حیات انور ص ۳۰۸، ۳۱۰)



حضرت تھانویؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ

(مرتبہ کوئٹہ)

زعیم احرار حضرت مولینا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ کا بیان ہے کہ حکیم الامت حضرت مولینا محمد اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے ایک بار فرمایا کہ!

ایک عیسائی فلسفی نے اسلام کی حقانیت کی یہ دلیل دی ہے کہ غزالی جیسا محقق اور مفکر مذہب اسلام کو سچا مذہب مانتا ہے اس زمانہ میں میرے نزدیک اسلام کی حقانیت کی بہت سی دلیلوں میں سے ایک دلیل حضرت مولینا محمد انور شاہ کا مسلمان ہونا ہے۔ اگر اسلام میں کوئی کجی ہوتی تو مولینا انور شاہ یقیناً اسلام ترک کر دیتے ①۔

مولینا محمد صاحب انوری لاکھپوری رقمطراز ہیں کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے تھے کہ ”حضرت شاہ صاحبؒ سے میں نے اس قدر استفادہ کیا ہے کہ میرے قلب میں ان کا احترام اسی طرح ہے جیسا کہ اپنے اساتذہ کا گویا میں نے ان کی باقاعدہ شاگردی نہیں کی“ ②۔
مولینا طیب صاحب اپنے مقالہ میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ ”حضرت تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے تھے کہ جب مولوی انور شاہ میرے پاس آکر بیٹھتے ہیں تو میرا قلب ان کی علمی عظمت کا دباؤ محسوس کرتا ہے۔“ ③۔

حضرت عارف تھانویؒ خود ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ!

”مولینا انور شاہ صاحبؒ نے ایک صاحب ④ سے فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اردو کی کتابوں میں علوم نہیں ہیں اس لئے میں کسی اردو تصنیف کو دیکھنا بیکار سمجھتا تھا۔ لیکن جب سے تفسیر بیان القرآن دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ معلوم ہوا کہ اردو کی تصانیف میں بھی اب علوم موجود ہیں اور اس وقت سے مجھے اردو کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا اور جو بے وقعتی اردو کی کتابوں کی میرے خیال میں پہلے تھی وہ جاتی رہی“ ⑤۔

مولینا لاکھپوری فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی یہ رائے سن کر حضرت تھانویؒ کو بہت

① ملاحظہ ہو حیات النور ص ۲۰۔ ② ملاحظہ ہو حیات النور ص ۳۰۸۔ ③ ملاحظہ ہو حیات النور ص ۲۲۹۔
④ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگرد مولینا طیب صاحب تھے (کوئٹہ)۔ ⑤ ملاحظہ الاصلاحات البومیہ من الاصلاحات القومیہ طبع کراچی ج ۱ ص ۱۱۱۔

مسرت ہوئی اور فرمایا کہ ایک عالی قدر اہل علم نے تصدیق فرمادی ۵۔

حضرت تھانویؒ جب دیوبند تشریف لاتے تو حضرت شاہ صاحب کے درس میں اہتمام سے بیٹھتے تھے اور بذریعہ خطوط بھی آپ سے استفادہ فرماتے رہتے۔ بعض جوابات کافی طویل بھی ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت تھانویؒ تھانہ بھون سے دیوبند تشریف لائے۔ اس وقت کے مہتمم مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ نے ان سے عرض کیا کہ حضرت آپ مدرسہ کے سرپرست ہیں اور اپنے مدرسہ کے شیخ الحدیث کا درس بھی سنیں۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ درس میں جا کر بیٹھے اور پھر مجلس میں آکر فرمایا کہ ”شاہ صاحب کے ایک ایک جملہ پر ایک ایک رسالہ تصنیف ہو سکتا ہے۔“ (ملاحظہ ہو حیات انور ص ۲۳۹)

حضرت مولانا تھانویؒ حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات کے بارے میں کیا احساسات رکھتے تھے اس کی وضاحت کے لئے ذیل میں ہم حضرت تھانویؒ قدس سرہ کے ایک مکتوب گرامی کا پہلا اور آخری حصہ درج کرتے ہیں۔

مکتوب کی عبارت یہ ہے:-

”ازنا کارہ آوارہ اشرف علیٰ فقی من بخدمت بابرکت جامع الفصائل العلمیہ والعملیہ
حضرت مولانا نور شاہ صاحب دامت انوارہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تحقیق سابق کے متعلق ضرورت کمرہ تکلیف دینا پڑی امید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔ ایک حادثہ خود مجھ کو پیش آیا اور اس کے متعلق ہدایا کا تذکرہ تکلیف دیتا ہوں۔ (۱)۔
(دقال خاتمہ) اس میں روایت و دہایت سے کچھ حکم فرمائیں ۵۔

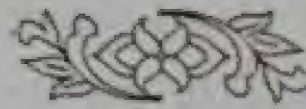
مجدد ملت حضرت تھانویؒ قدس اللہ سرہ العزیز کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں حضرت موصوف علیہ الرحمۃ چھوٹی بڑی ۶۶۶ کتابوں کے مولف و مصنف ہیں جن میں تفسیر ”بیان القرآن“ سرفہرست ہے۔ اس مرد مومن نے شرک و بدعت کے استحصال کے لئے اور حقیقی اسلام اور احسان و تصوف کا روشن چہرہ دکھانے کے لئے اپنی عمر صرف فرمادی۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ شدہ افاضل حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مریدوں میں شامل ہوتے تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے بزرگوں میں سے حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ (مصنف سیرۃ النبیؐ)۔

۱۔ ملاحظہ ہو حیات انور ص ۳۱۸۔ ۵۔ ملاحظہ ہو لفظہ العبر من ہدی الشیخ الانور ص ۲۹۰ حیات انور

حضرت مولینا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ خاص رہے ہیں۔ حضرت سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم کا تعلق حضرت تھانوی کے ساتھ آخر میں فنا فی الشیخ کے درجہ کو پہنچ گیا تھا۔ حضرت شاہ صاحب کے دل میں عارف باللہ حضرت تھانویؒ کی کتنی قدر و منزلت تھی اس کا اندازہ مولینا منظور نعمانی صاحب کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے۔

مولینا منظور نعمانی کا بیان ہے کہ درس ہی میں ایک دفعہ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ: ”ہم یہاں آئے (یعنی کشمیر سے ہندوستان) تو دین حضرت گنگوہیؒ کے یہاں دیکھا۔ اس کے بعد حضرت استاذ (یعنی حضرت شیخ الہندؒ) اور حضرت رائے پوری (یعنی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری) کے یہاں دیکھا اور اب جو کوئی دیکھنا چاہے وہ حضرت مولینا اشرف علی صاحبؒ کے یہاں جا کر دیکھے۔“ ۱



۱۔ یعنی قطب الارشاد حضرت رشید احمد صاحب گنگوہیؒ۔

۲۔ ملاحظہ ہو زیر نظر کتاب میں مولینا نعمانی صاحب کا مقالہ۔

شاہ صاحب اور علامہ سید سلیمان ندوی

مرتبہ کونندو

ریس المسکین، سیرت خاتم النبیین کے فقید المثال ترجمان اور وکیل اسلام حضرت مولانا علامہ سید سلیمان صاحب ندویؒ کی ذات ستودہ صفات اور محدث کشمیری حضرت شاہ صاحبؒ جیسے جہاں علم کی بلند و بالا شخصیت سے اہل کمال ہی کما حقہ واقف ہیں۔
رحماء بینہم کے یہ عملی مصداق ایک دوسرے کی علمی و عملی صلاحیتوں اور کمالات کے مرتبہ شناس اور ایک دوسرے سے بہت متاثر تھے۔ سچ ہے۔

”قدر زر زر گر بداند، قدر جوہر جوہری“

مولانا علی میاں نے ایک بار فرمایا ہے کہ ”میں نے اپنی عمر میں دو فانی العلم دیکھے ایک علامہ کشمیری دوسرے علامہ سید سلیمان ندوی۔ مرحوم رشید احمد صدیقی نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کی دو خصوصیتوں کا ذکر کیا ہے۔ خلوص علم و احترام علم اور یہی دو عناصر ہیں جن سے حضرت شاہ صاحب کی شخصیت بھی عبارت ہے۔ انہوں نے علم کو پیشہ نہیں بنے دیا بلکہ اس کا وقار بڑھایا۔
حضرت شاہ صاحبؒ کے چند جلیل القدر تلامذہ کو علامہ ندوی مرحوم دائرہ علم سے تعبیر فرماتے تھے۔ فارغین کرام اسی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت مولانا مرحوم کی رائے جس کے شاگردوں کے متعلق یہ تھی ان کے استاد (یعنی حضرت شاہ صاحبؒ) کا مقام آپ کے دل میں کیا ہو سکتا تھا؟
حضرت شاہ صاحب کی رحلت پر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے موقر جریدہ ”معارف“ کے شذرات میں نہایت شاندار الفاظ میں شاہ صاحبؒ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ حضرت سید صاحب کی یہ تاریخی تحریر ذیل میں من و عن درج کی جا رہی ہے۔

دین و دانش کی دنیا کا مہر انور ۳ صفر ۱۳۵۲ھ (۲۹ مئی ۱۹۳۳ء) کی صبح کو دیوبند کی خاک میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا یعنی مولانا انور شاہ صاحب جانشین شیخ الہند و صدر المدرسین دیوبند نے دو برس کی علالت اور ضعف و نقاہت کے بعد ۵۹ برس کی عمر میں وفات پائی۔ مرحوم کا وطن گو کشمیر تھا مگر تعلیم سے فراغت کے بعد ایک مدت تک مدینہ منورہ میں اقامت فرمائی پھر واپس آ کر استاذ کی خواہش اور اصرار سے دارالعلوم کی صدارت کی ذمہ داری قبول فرمائی۔ اور جس کو حضرت شیخ کے زمانہ جنگ میں ہجرت کے بعد سے ۱۹۲۹ء تک اسی طرح انجام دیا کہ چین سے لیکر روم تک ان

کے فیضان کا سیلاب موجیں لیتا رہا اور ہند اور بیرون ہند کے سینکڑوں تشنگانِ علم نے اس سے اپنی پیاس بجھائی۔

مرحوم کم خن لیکن وسیع النظر عالم تھے۔ ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قدر خزانوں سے معمور ہوتی ہے۔ وہ وسعتِ نظر، قوتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے۔ علومِ حدیث کے حافظ و نکتہ شناس، علومِ ادب میں بلند پای معقولات میں ماہر، شعرو خن سے بہرہ مند اور زہد تقویٰ میں کامل تھے۔

اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے کہ مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قال اللہ اور قال الرسول کا نعرہ بلند رکھا۔

(ماہنامہ معارفِ اعظم گڑھ جولائی ۱۹۳۳ء، ربیع الاول ۱۳۵۲ھ)



علامہ سید رشید رضا مصریؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ

لہ کوندو

علامہ سید رشید رضا:..... علامہ سید رشید رضا اس صدی کے ربیع اول میں مصر کے مشہور و معروف فاضل اور اپنے وقت کے ممتاز عالم دین تھے آپ ملت اسلامیہ کے بااخلاص رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے اور الازھر قاہرہ کے مصلح مفتی محمد عبدہ کے نہ صرف شاگرد بلکہ جانشین بھی تھے۔ آپ کا سیاسی مسلک وہی تھا جو حضرت سید جمال الدین افغانی کی تحریک آزادی اور دعوت وحدت اسلامی (پان اسلام ازم) کے ان دوسرے حامیوں کا تھا جو ہندوستان، ایران اور شرق اوسط میں پھیلے ہوئے تھے حضرت شیخ الہند مولینا محمود الحسنؒ اور عالم اسلام کے کئی دیگر اکابر کی طرح علامہ رشید رضا بھی انگریزی سامراج کے اقتدار سے مصر اور ہندوستان کی آزادی کو پورے مشرق اور ایشیاء کی نجات کا وسیلہ سمجھتے تھے۔

علامہ موصوف اپنے وقت کے مفسر محدث اور ادیب و محرم تھے علوم حاضرہ کی روشنی میں اور ضروریات وقت کے لحاظ سے آپ نے قرآن شریف کی جو تفسیر لکھی ہے وہ آپ کا دینی و سیاسی کارنامہ ہے۔ اس تفسیر اور بین الاقوامی اسلامی سیاست پر اپنے خیالات اور آراء کی اشاعت کے لئے المنار کے نام سے آپ نے ایک ماہوار رسالہ جاری کر رکھا تھا۔ ”المنار“ ہندوستان، ایران، ترکی، افغانستان اور مصر وغیرہ ممالک میں اونچے درجے کے قارئین کا ایک خاص دائرہ اثر رکھتا تھا۔

ہندوستان کے ساتھ تعلق:..... ۱۹۱۲ء اور ۱۳۳۰ھ میں آپ ہندوستان آئے اس سے کچھ مدت قبل کے ایک واقعہ کی وجہ سے آپ کا ہندوستان کے ساتھ تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ عربی زبان کے ایک مشہور ادیب مسٹر جرجی زیدان (جو شام کے باشندے اور مذہباً عیسائی تھے اور قاہرہ سے ”الہلال“ کے نام کا ماہوار جریدہ شائع کرتے تھے۔ قلم کے دھنی تھے لیکن اسلام کے خلاف بغض اور تعصب کی وجہ سے اکثر تہذیب و تمدن اسلام پر بے جا تنقید کے عادی تھے) نے پانچ جلدوں میں ”تمدن اسلامی“ نام کی ایک کتاب لکھی جس میں اس نے اسلام کی تصویر کو سبک کر کے پیش کیا۔ اس کتاب کے خلاف مسلمانوں نے ہر جگہ احتجاج کیا اور مسٹر جرجی زیدان کی تحریرات کی تردید میں مضامین لکھے۔ ہندوستانی علماء میں سے مولینا شبلی نعمانی نے محققانہ تردیدیں لکھ کر مصر کے جرائد میں شائع کرائیں ان تحریرات کی وجہ سے مولینا شبلیؒ اور علامہ رشید رضا

موصوف میں موانست اور خط و کتابت شروع ہوئی جو دونوں میں دوستی کی بنیاد بنی۔

جلسہ ندوۃ العلماء کی صدارت اپریل ۱۹۱۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں جلسہ دستار بندی منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ (اس کے دو سال قبل ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم دیوبند بھی جلسہ دستار بندی کی ایک تاریخ ساز تقریب منعقد کر چکا تھا۔ مولینا شبلی نے علامہ رشید رضا کو ندوۃ العلماء کے اس خاص جلسے کی صدارت کرنے کی دعوت دی جس کو قبول کر کے آپ ۲۲ مارچ ۱۹۱۲ء کو ہندوستان آ گئے اور لکھنؤ جانے سے پہلے بمبئی، لاہور، دہلی اور علی گڑھ میں گھوم پھر کر انہوں نے ہندوستان کے مسلم اکابر کے ساتھ ملت اسلامیہ کے مسائل پر تبادلہ خیال کیا اور ۱۲ اپریل کو لکھنؤ پہنچ کر ندوۃ العلماء کے جلسے کی صدارت فرمائی۔

(یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ لکھنؤ کے جلسہ میں آپ کی صدارتی تقریر کا اردو ترجمہ مولینا ابوالکلام آزاد نے کیا تھا۔ جس طرح شاہ صاحب حضرت شیخ الہند کے خازن العلوم تھے اسی طرح اس زمانہ میں مولینا آزاد مولینا شبلی کے ذہن رسا کے ترجمان تصور ہوتے تھے۔)

حکیم محمد اجمل خان کا توجہ دلانا:..... ابتداء میں علامہ رشید رضا نے ہند کے جن شہروں اور اداروں میں جانے کا جو پروگرام بنایا تھا۔ کسی مصلحت سے دارالعلوم دیوبند کو دیکھنا اس میں شامل نہ رکھا گیا تھا۔ لیکن جب آپ دہلی میں تھے تو مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان مرحوم نے ان کو بتایا کہ اگر آپ دیوبند کو دیکھے بغیر واپس تشریف لے گئے تو آپ کا دورہ ہندوستان نامکمل اور ناقص رہے گا۔

حکیم صاحب کی زبان سے دارالعلوم کے اساتذہ خاص کو مولینا محمود الحسن کے اوصاف سن کر علامہ رضا نے دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے کا تہیہ کر لیا اور ۹ اپریل ۱۹۱۲ء کی تاریخ مقرر کر کے اطلاع بھی دے دی۔ لیکن نہ جانے کیا بات مانع ہوئی کہ آپ ۹ اپریل کو دیوبند نہ آ سکے۔ بعد ازاں ۱۵ اپریل کا دن مقرر کیا گیا۔ چنانچہ ۱۴ اپریل کو علیگڑھ سے آپ کے ایک میزبان نواب وقار الملک نے بزرگان دیوبند کو تار دے کر مطلع کیا کہ علامہ رشید رضا ۱۵ اپریل کی صبح کو دیوبند پہنچ رہے ہیں۔ اور جب آپ کی گاڑی دیوبند کے ریلوے سٹیشن پر وارد ہوئی تو اساتذہ و طلباء دارالعلوم نے آپ کی شان کے شایان استقبال کیا۔

دارالعلوم میں جلسہ:..... دارالعلوم کی طرف سے مہمان عزیز کے اعزاز میں اساتذہ اور طلبہ نے نو درہ ہال میں خیر مقدم کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔ حضرت شیخ الہند بھی بحیثیت صدر المدین رونق جلسہ تھے۔ لیکن آپ نے بذات خود کچھ فرمانے کے بدلے یہ طے کیا کہ علامہ رشید

رضا کو اھلا و مھلا مرحبا کہنے کا فرض آپ کی طرف سے اور دیگر اساتذہ اور طلباء کی طرف سے اور ادارہ اہتمام کی طرف سے حضرت شاہ صاحب انجام دیں۔

دیوبند کی حقیقت علامہ کی نظر میں: دیوبند میں حدیث اور ائمہ اربعہ کی فقہ کے درمیان تطبیق اور ترجیح اور روایت و درایت کی متوازی تعلیم کا جو ولی الہی طریقہ برتا جاتا ہے۔ اس کا لازمی رواج نہیں ہے۔ وہاں حدیث کے متن اور سلسلہ سند سے زیادہ کسی چیز کے ساتھ بہت کم اکتما کیا جاتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر علامہ رشید رضا نے ہندوستان پہنچ کر جب یہ سنا کہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہند اور آپ کے فیض یافتہ اساتذہ علم حدیث صحیح البخاری اور ہدایہ کو پہلو بہ پہلو رکھ کر تطبیق کے ساتھ درس دیتے ہیں تو آپ کسی قدر متعجب سے ہو گئے۔ چنانچہ جب آپ دارالعلوم پہنچے تو ابتدائی بات چیت کے دوران آپ نے دارالعلوم کے کسی استاد سے دریافت کیا کہ یہاں درس حدیث کا طرز کیا ہے؟ انہیں بتلایا گیا کہ پہلے قاری متن حدیث پڑھتا ہے اور استاد اس حدیث کے متعلق تمام مباحث علمیہ اور حقائق و نکات بیان کرتا ہے۔ پھر اگر حدیث احکام سے متعلق ہوتی ہے تو استاد ائمہ متبوعین کے مذاہب و دلائل بیان کرتا ہے اور اگر امام اعظم کا مذہب بظاہر اس حدیث کے مخالف دکھائی دیتا ہے تو استاد توفیق، تطبیق یا ترجیح رائج کے اصول پر تقریر کرتا ہے اور حنفی مسلک کو مؤید و مدلل کرتا ہے۔ یہ بات علامہ کو بہت عجیب معلوم ہوئی اور پوچھنے لگے کہ کیا ہر حدیث میں ایسا ہی ہوتا ہے؟ مخاطب نے کہا ہاں جو حدیثیں احکام سے تعلق رکھتی ہیں ان میں ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ اس پر علامہ نے کہا: کیا حدیث حنفی ہوگئی ہے؟ اور کیا سارا ذخیرہ روایات حدیث صرف فقہ حنفی ہی کی حمایت کے لئے ہے؟

شاہ صاحب کی تقریر: علامہ کے استفسار و جواب کا معاملہ تو یہاں ہی ختم ہو گیا اور دارالعلوم کے اکابر کی قرار داد و صوابد کے مطابق حضرت شاہ صاحب کا ارادہ یہی تھا کہ جب مدرسہ کی طرف سے مہمان کی خدمت میں رسمی سپاسنامہ پڑھا جا چکے تو آپ ترحیب ضیف کے بعد دارالعلوم کے قیام کا پس منظر اور اس کے مقاصد اور ضرورت پر مختصری روشنی ڈال دیں گے تاکہ مہمان کو اپنے خیالات کے اظہار میں سہولت ہو جائے (گویا آپ کا ارادہ پندرہ یا بیس منٹ سے زیادہ بولنے کا نہ تھا) مگر جب آپ جلسہ گاہ کی طرف آرہے تھے تو کسی نے علامہ رشید رضا کے مصرعہ صدر الفاظ آپ کو سنا دیئے اور سنتے ہی آپ نے پہلا ارادہ منسوخ کر کے دارالعلوم دیوبند کے طریقہ تعلیم اور اسکی خصوصیات پر مکمل تبصرہ کرنے کا تہیہ کر لیا اور قلیل سے وقفہ میں جلسہ گاہ میں بیٹھے بیٹھے دارالعلوم کے

اسی مذکورہ بالا طرز درس حدیث پر اپنے ذہن میں مضمون مرتب فرمایا اور پھر وہ مشہور و معروف محققانہ و محدثانہ تقریر نہایت فصیح و بلیغ عربی میں ارشاد فرمائی جس کو سن کر علامہ اور تمام شرکاء اجلاس (علماء و طلبہ) حیران رہ گئے۔ اس تقریر میں آپ نے دارالعلوم دیوبند کے طریقہ تعلیم حدیث نبویؐ کی وضاحت کی اور فقہاء و محدثین کے اصول استنباط تحقیق مناظر تنقیح مناظر اور تخریج مناظر کی وضاحت و تشریح احادیث و احکام سے فرمائی اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے لے کر اپنے اساتذہ دارالعلوم تک کے فضائل و مناقب اور طرز و طریق خدمت علم و دین پر روشنی ڈالی۔ علامہ آپ کی تقریر کے مضمون قوت و دلائل اور تقریر کی فصاحت و بلاغت سے نہایت متاثر ہوئے و دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ علامہ رشید رضا جھوم رہے تھے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر بار بار داد دیتے اور بے ساختہ فرماتے تھے: ماریت مثل هذا الساذج الجلیل۔ (میں نے اس جیسا جلیل القدر عالم نہیں دیکھا) علامہ موصوف خود بذات شافعی المذہب ہونے کی وجہ سے دوران تقریر موقع بموقع سوالات بھی کرتے رہے۔ جن کے جوابات ناظر حضرت شاہ صاحب نہایت انبساط و شرح صدر کے ساتھ دیتے گئے۔ حضرت شاہ صاحب کی اس تقریر نے علامہ کی غلط فہمیاں دور کر دیں اور آپ کو اندازہ ہو گیا کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے اساتذہ کا علمی تعلیمی اور تدریسی رتبہ بہت بلند ہے۔

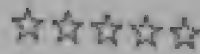
علامہ مصریؒ کی جوابی تقریر:..... چنانچہ حضرت شاہ صاحب کی تقریر کے بعد علامہ مصریؒ نے جو بصیرت افروز اور فاضلانہ جوابی تقریر فرمائی اس میں آپ نے بزرگان دیوبند کے کمالات کا اعتراف کیا اور مسرت کا اظہار فرمایا۔ نیز فرمایا۔

حضرات علماء کرام! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں اس مدرسہ کو نہ دیکھتا تو میں ہندوستان سے نہایت غمگین جاتا۔ ہندوستان میں آکر اس مدرسہ کی نسبت جو کچھ میں نے اب تک سنا تھا اسے بہت زیادہ پایا۔ استاذ (مولانا انور شاہ صاحب) نے جو اصول میرے سامنے بیان کئے اور جو مسلک اپنے مشائخ کا مجھے بتا دیا ہے۔ میں اسکو پسند کرتا ہوں اور اس سے متفق ہوں فقہ حنفی بلاشبہ کافی ودانی ہے۔ (رواۃ دارالعلوم، ص ۱۳۳۰ھ)

المنار میں بھی تذکرہ:..... علامہ موصوف نے مصر پہنچ کر یہ سب حالات اپنے رسالہ "المنار" میں شائع کئے اور اس میں یہ بھی اضافہ کیا کہ میں نے ازہر الہند دیوبند میں وہ نبضت و یدبہ علمیہ جدیدہ دیکھی ہے جس سے نفع عظیم کی توقع ہے۔ مدرسہ دیوبند دیکھ کر جس قدر میرے دل کو مسرت و پائیز حاصل ہوئی وہ کسی اور چیز سے نہیں ہوئی مجھ سے بہت سے لوگوں نے دارالعلوم کے فضائل و آثار بیان کئے تھے اور کچھ لوگوں نے علماء دیوبند کی طرف جمود و تعصب کو بھی منسوب کیا تھا

مگر میں نے ان حضرات کو ایسی تنقید سے بہت بلند پایا اور میں نے حضرت شاہ صاحب جیسا جلیل القدر عالم تو کوئی دیکھا ہی نہیں۔

شاہ صاحبؒ کی تقریر کا متن حضرت شاہ صاحب کی اصل عربی کی تقریر کا متن دارالعلوم دیوبند کی روداد ۱۹۱۴ء ۱۳۳۰ھ سے اخذ کر کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے اور اس تقریر کے بیشتر حصے کا اردو ترجمہ گذشتہ صفحات میں مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب کے مضمون میں زیر عنوان وہ دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث کی اہم خصوصیت "ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔



المحاضرة المرتجلة

للشيخ محمد انور شاه الكشميري

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى. يقدم الخویدم فی الحضرة السامية تحية الاسلام حياكم الله تعالى انا اسئلكم فحائل الكرم والاعتناء بحالنا واحسن بنهضة اسلامية عظمت عليكم وعلينا وانا احوج اليكم منكم الينا هؤلاء اساتذتي واكابرى وذخائرى عند الله فى يومى وغدى امرونى بان امثل لكم شكر اعداء الخير وتشريفكم ايانا بالقدوم المبارك احسن الله اليكم والينا ورفع درجاتكم فى الدين والدنيا والآخرة آمين وبه نستعين.

مولينا ان حديثنا حديث ذو شجون والشىء بالشىء يذكر ان بلادنا هذه على الشقة بعيدة ومسافة شاسعة من بلاد السلام كالعراق والشام ومصر فكانت شعائر الاسلام فيها على وهى وصنائير العلم على خفاء الاماشاء الله ومن شاء وقليل ما هم وان وصابتنا هذه عصابة على طريقة قديمة ليست بحديثة اسنادنا فى الدين متصل بالصدر الكبير والبدر المنير دالامام الشهير الشيخ الاجل ولى الله بن عبد الرحيم الفاروقى الدهلوى وحال الشيخ اظهر من ان يذكر فقد شرقت تصانيفه وغربت لكن بعض احوال الشيخ يحتاج الى اخبار شغافية

وواقعات تلفیقها من مشائخنا كان من امر الشيخ رحمة الله انه اتقن العلوم
 الدينية ومبادئها اولا على والده العلامة الشيخ الهمام عبدالرحيم ثم رحل الى
 الحرمين زادهما الله شرفا وتكريما واستفاد من علمائها وفقهاءهما والازم
 الشيخ اباطاهر الكردي في الحديث واجتهد فيه حتى صار الطرد والعكس في
 الباب وكان الشيخ ابوطاهر يقول تلقن اللفاظ منا وتلقنا المعنى منه يريد بذلك
 تبين ملاحظ الحديث وتعيين مراد الشارع ثم رجع الشيخ ولي الله الى بلاده
 واشتغل باصلاح ما افسد الناس من سنة النبي الكريم صلى الله عليه وسلم
 وكان الله اودع في صدره نورا ينظر به عواقب الامور فتفرس انه ستقوم الحراب
 بين الحق والباطل فاستعد رحمه الله للدفاع عن الدين والذنب عنه فما اعد
 لذلك ان ترجم القرآن العزيز باللسان الفارسية سماه فتح الرحمن جودة عن
 الاسرائيليات باسرها اراد بذلك تمهيد التوحيد ثم شرح الموطا وسماه
 المسوي على طريقة فقهاء الحديث مع تحقق المناط وتنقيح وتحريجه اريد
 بذلك ما اصطلح عليه علماء الاصول لتحقيق المناط ان يصدر حكم من
 الشارح في صورة جزئية ثم يثبت ويحقق ذلك في سائر الجزئيات من نوع تلك
 الصورة مثاله تقويم جزاء الصيد فتعرف القيمة في جزئي هو تحقيق المناط
 وليس ذلك بقياس فلذا يشترك فيه الخاص والعام ولا يحتاج الى الاحتياط
 وتنقيح المناط ان يصدر حكم من الشارع في صورة فذا جمعت هناك امور
 واتفقت بعض تلك الامور مناظ ذلك الحكم وبعضها لا دخل لها فيه فتعرف
 الامر الذي هو العلة تنقيح المناط مثاله ما في الحديث عن ابي هريرة قال اني
 ارجل النبي صلى الله عليه وسلم فقال هلكت قال ما شانك قال وقعت على
 امرأتي في رمضان قال فهل تجد ماتعت رقبة قال لا قال فهل تستطيع ان تصوم
 شهرين متتابعين قال لا قال فهل تستطيع ان تطعم ستين مسكينا قال لا الحديث .
 فنسج ابو حنيفة والشافعي مناظ وجوب الكفارة كون ذلك الفعل مفطرا كان
 جماعا كما في هذه الصورة او اكلا او شربا بعد ان يكون عمدا فكونه جماعا في
 هذه الواقعة امرا اتفاقي كسائر الاتفاقيات وذهب احمد الى ان المناط هو كونه
 جماعا فلا يعدى الحكم الى الاكل والشرب والحنج بحديث اخر عن ابي

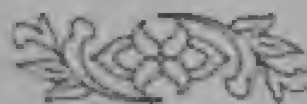
هريرة ايضا قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من افطروا من رمضان
 في غير رخصة رخصها الله لم يقض عنه صيام الدهر حملة على الاكل والشرب
 عامدا وقال لا يقضى عنه صيام الدهر وتخريج المناط ان يصدر حكم من الشارع
 في صورة تجتمع هناك امور يصلح كل منها للعلية فيرجح المجتهد امرا من بين
 تلك الامور العلية ويجعله مناطا مثاله حديث النهي عن الربو في الاشياء الستة
 اجتمع هناك امور القدر الجنية والطعم والتمنية والاقتيات والادخار فذهب
 ابو حنيفة الى ان مناط الحكم هو الوصف الاول والشافعي الى انه الثاني ومالك
 الى انه الثالث على ما ادى اليه اجتهادهم فالفرق بين تنقيح للمناط وتخريجه ان
 في الاول اجتمعت امور لا تدخل لها مع المناط فتقح المجتهد المناط وفي الثاني
 اجتمعت امور كل منها صالح لان يكون مناطا فرجح المجتهد احدها لان يكون
 مناطا وتنقيح المناط وتخريجه وظيفة المجتهد يزاحم فيه بعضهم بعضا ومن
 الامثلة فيه ايضا حديث مفتاح الصلوة الطهور وتحريمها التكبير وتحليلها
 التسليم فذهب اكثر الائمة ان ركنية صيغة التكبير والتسليم وخرج ابو حنيفة
 المناط فيه كون الاول ذكرا مشعرا بالتعظيم وكون الثاني خروجا بصنع
 المصلي وقال بفرضية هذين لكن ثبت مواظبة النبي صلى الله عليه وسلم على
 صيغته التكبير وصيغة التسليم فليكونا واجبين. وقد التزم الشيخ ابن الهمام
 وجوب صيغة التكبير والمشهور انه سنة وقد تحقق فيهما الذكر المشعر
 بالتعظيم والخروج بصنع المصلي كتحقق الكلي في الجزئي فليكونا فرضين
 على هذا لقياس امثلة كثيرة فهذا امارعاه الشيخ ولي الله في شرح المؤطا
 واختار فيه ايضا فقها جامعوا قد حقق الشيخ ايضا في كتابه الانصاف في بيان
 سبب الاختلاف وعقد لجيد في مسائل الاجتهاد والتقليد ان الحق في موضع
 الاجتهاد متعنا وحكاة عن الائمة الاربعة وارتضاه واريده بموضع الاجتهاد ان لا
 يكون هناك كتاب ولا سنة متواترة فالحق هناك متعدد اذا كان هناك قاطع فليس
 بموضع اجتهاد والحق هناك واحد وهو الموافق لذلك القاطع فمن وافقه وافق
 الحق ومن خالفه خالف الحق وصنف الشيخ في حكم التشريع والعقائد الحقة
 تصانيف صارت لكل ات نبراسا ومقياسا منها حجة الله البالغة والتفهيمات

الالهية والخير الكثير وغير ذلك ثم تبعه على ذلك اولاده واخفاؤه فمن اولاده
 الشيخ الاجل والصمد الاكمل الشيخ عبدالعزيز ثم الشيخ رفيع الدين ثم
 الشيخ القادر ثم خلف الشيخ عبدالعزيز حفيده مفيد العصر مسنده الشهور في
 الافاق الشيخ محمد اسحاق وابن اخيه محي السنة العلامة الجليل الشيخ
 محمد اسمعيل وكان الشيخ عبدالعزيز تنلو الحمد لله الذي وهب لي على
 الكبر اسماعيل اسحاق نفع الله بهما هذه البلاد دارس الشيخ محمد اسحق
 حديث النبي صلى الله عليه وسلم فصار رحله الاقطار وصنف الشيخ محمد
 اسمعيل كتابا في الفرق من السنة والبدعة الظلماء فاحي السنة حين كانت
 اميت ومات شهيدا وقد تلمذ على الشيخ محمد اسحق شيخ مشايخنا الشيخ
 عبدالغني صار مدار الرواية في عصره وارحل اخرا المالى المدينة الطيبة وصار
 سند تلك البلاد وكثير الاخذ عنه هناك وتلمذ على الشيخ عبدالغني شمس
 الاسلام والمسلمين العارف الحافظ المحقق الشيخ محمد قاسم مؤسس هذه
 المدرسة العالية وبانيها والفقيه الحافظ المجتهد الولي الشيخ رشيد احمد
 صنف الشيخ محمد قاسم كتابا المعارف الحقائق وكتب في الرد على
 المخالفين من الماديين والدهريين فنفع الله به كثيرا وقد كنت انشأت هذه
 الاشعار في عنقبة قفايا صاحبتى على الديار فمن تاب الشحى هوى ازديار الخ
 وكثرت الفتيا وازرحمت المسائل على الشيخ رشيد احمد هين التمس الحق
 بالباطل فاخاب فيها بالصواب وكان فقيها مجتهدا فاخذنا ذلك اماما في
 الاصول وهذا اماما في الفروع وتنفع لنا منها علم متفح مبيض ثم لما استولت
 الاجالب على هذه البلاد رقامت الحرب بين الحق والباطل اسس الشيخ
 محمد قاسم هذه المدرسة العالية فنفع الله بها كثيرا جزاء الله خيرا الجزاء
 وغاية المدرسة درس الحديث وفقه الحديث وكان يرى المبادئ ضرورية
 والضرورى يقدر بقدر الضرورة حتى ان الشيخ رشيد احمد خطر الفيلسوف
 وحجر عنها في بعض السنين في هذه المدرسة فهذا اسنادنا وطريقة مشايخنا
 في الحديث وفقه الحديث طريقة معتدلة مثلى يتوسطون بين الاطراف اريد
 بذلك ان لائحة الاربعة اصولا اربعة اكثرية وذلك ان الاقام ما لكياتسى بعمل

اهل المدينة بل قدیر حجة علی الحديث للمرفوع والشافعی یأخذ بأصح ما فی الباب واحمد یأخذ بالأصح والصحیح والحسن والضعیف اذا كان ضعفه یسیرا ویجوز هذا وذلك وعلى هذا اوضح مسنده وابو حنیفة یأخذ بهذه الاقسام وینزل الاحادیث علی محمل فلذا كثرت التاویلات عند الحنیفة وكثرت الجروح علی الرواة عند الشافعی والشافعی أول من ابطل الاحتجاج بالمرسل الا اذا اعتضد وامام الصنعة ذلك الامام الهمام البخاری قد اخذ اصل مالك والشافعی وركب بينهما فباتی بأصح ما فی الباب ویراعی مساعدة عمل السلف فلقد الم یات بحديث یعارض حديثا فی كتابه ولم یخرج فی الكسوف الاحديث الزکوعین مشا منه علی اصله واعتمد مسلم علی ثقة الرواة فاخرج حديث ثلاث ركوعات وحديث اربع ركوعات بل حديث خمس ركوعات ایضا موقوفا علی امیر المؤمنین علی رضی الله عنه فا البخاری قد انتقی واتبع مسلم القاعدة فمشانحنا یتوسطون فی مثل هذا الا یأخذون باتشدد ولا بالتساهل ویوجهون الاحادیث المتعارضة بتوجيهات یکاد یقبلها من یسمعها مثاله حديث القلتین فقد رواه یزید بن زریع وکامل بن طلحة و ابراهیم الحجاج وهذبة بن خالد ووکیع و یحیی بن حسان بلفظ اذا بالغ الماء القلتین او ثلاثا لم یعمل الخبث فیقال فیہ ان هذا لیس یحدید فقد قال القلتین او ثلاثا بالتويع فهو تقرب واحالة علی خلوص اثر النجاسة من جانب الی جانب وذلك اصلی مذهب انی حنیفة وصاحبه صرح به الشیخ ان الهمام والشیخ ابن بخیم وقد سلمت الاحادیث المتعارضة لحديث القلتین کحديث النهی عن البول فی لماء الراکد وحديث النهی عن ادخال اليد فی الاناء اذ استیقظ وحديث ولوع الکلب فی الاناء ومثاله ایضا احادیث القراءة خلف الامام فانهم لما استدلوا علی ترک القراءة خلف الامام فی الصلوة بقوله تعالی واذا قرأ القرآن فاستمعوا واتصوا علیکم ترحمون وبقوله صلی الله علیه وسلم واذا قرأ فانصتوا بحديث من کان له امام فقرأة الامام له قرأة. اولوا الحديث لا تفعلوا الايام القرآن فانه لاصلوة لمن لم یقرأ بها وذلك انه لم یصح فی شان نزول الایة شی من الروایات فالعبرة لعموم اللفظ وایضا فقد رواه البیهقی فی کتاب القراءة عن الامام احمد انه اجمع العلماء علی

ان هذه الآية في القراءة في الصلوة وحديث واذا قرئ فانصتو حديث صحيح
صححه احمد حنبل ثم صاحبه ابو بكر الاثرم ثم مسلم في باب الشاهد من
حديث ابي موسى الاشعري واحال به على حديث ابي هريرة ثم صححه ابن
خزيمة والحافظ الا جعفر بن جرير الطبري والحافظ ابو عمرو بن عبد البر
والحافظ ابن حزم الاندلسي الظاهري ثم الحافظ زكي الدين عبد العظيم
المندري ثم خاتم الحفاظ الحافظ ابن حجر السقلاني في الفتح وهذا امن حيث
الاستاد وامام عمل السلف والائمة فقد عمل به جماعات من الصحابة
ومالك واحمد وابو حنيفة والحديث اذا كان رواه ثقات ثم ساعده العمل عمل
السلف فهو صحيح ولا ريب لا يقدح فيه قدح ولا يؤثر فيه جرح وحديث من
كان له امام فقراءة الامام له قراءة حكاه الشيخ ابن الهمام عن مسند احمد بن
منيع وصححه فان سنده على شرط الشيخين ولم نقف الى الآن على علة فيه
واسناده اخبرنا اسحق بن يوسف الازرق قال حدثنا سفيان وشريك عن موسى
بن ابي عائشة عن عبيد الله بن شداد عن جابر بن عبد الله قال قال رسول الله
صلى الله عليه وسلم الحديث وقد ساعده الموقوف عند الترمذي والمرسل
عند اخرين فاذا هو صحيح توجه شيخ مشايخنا الشيخ رشيد احمد حديث
عبادة من طريق محمد بن اسحق وسياقه لعلكم تقرؤن خلف اما مكتم قالوا نعم
يا رسول الله نهذه هذا قال فلا تفعلوا الحديث فقال هذا دليل الاباحة لا دليل
الوجوب والهم كانوا يقرؤن بغير امر منه صلى الله عليه وسلم ولد اسأل بقوله
لعلكم تقرؤن خلف امامكم فلما قالوا نعم قال فلا تفعلوا الا بآم القرآن فانها
سورة متعينة من بين سائر القرآن لا غيرها من السور فعمل النبي صلى الله عليه
وسلم اباحتها خلف الامام بكونها متعينة من بين السور لا صلوة بدونها
وظهر عدم كون الصلوة بدونها في حق الامام المنفرد والى ذلك في الاباحة في
حق المقتدى ومسئلة الاباحة والكراهة مختلف فيها عند الحنفية وان اتفقوا
على عدم الوجوب وقالوا في مسئلة رفع اليدين وجهر امين انه قد صح رفع
والجهر عن النبي صلى الله عليه وسلم وعن الصحابة وقد صح ترك الرفع
باسناد صحيح عند ابي داود والاحفاء وقد صح ترك الرفع عن امير المؤمنين

عمر و امیر المؤمنین علی و کذا اصح الاختفاء یامین عن جماعة من الصحابة
والسلف الصالح فلیکن کلا الامرین سنة وانما یبقی الشان فی الترجیح
هذا والله الموفق للسداد فی المبدأ والمعاد ثم تلمذ علی الشیخ محمد قاسم
شیخنا العدل الحجة مسند وقته الشیخ محمود حسن متع الله المسلمین بطول
بقائه وهو شیخ المدرسة الآن وعلیه المدار فی الاسناد فی هذه البلاد وهو علی
طریقة مشائخه ساعده التوفیق الالهی فی التوفیق بین المتعارضات وحل
المشکلات مثاله ما قال لی مرة ان تعدد الركوع فی الکسوف قد ثبت عن النبی
صلی الله علیه وسلم لامر اختص به ولكن ارشد الامة الی وحدة الركوع فقال
صَلُّوا کاحدی صلوة صلیتموها من المکتوبة فراجعته وقلت ان السادة
الشافعية یحملون التشبه علی عدد الراكعتین لاعلی وحدة الركوع فقال ان
هذا هو جعل البديهی نظریاً فانه اذا کان النبی صلی الله علیه وسلم قد صلی
الکسوف بتعدد الركوع بنفسه علی اعین الناس وروس الامتها وکان بشرع
تعدد الركوع للامة فلم ترک الاحالة علی ما شاهدوه وعدل الی التشبه بالصحیح
ما ذلک الا ان التعدد کان لغرض وارشد الامة الی المعروف فی الصلوة والله
الموفق والمعین واخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین.



حضرت شاہ صاحب اور علامہ اقبال

(مرتبہ کو سند)

ترجمان الحقائق علامہ اقبال مرحوم نہ صرف حضرت شاہ صاحب کی علمی بصیرت، وقت نظر، وسعت معلومات اور علوم و فنون میں جامعیت کے معترف و قدردان تھے بلکہ آپ حضرت شاہ صاحب کی نگاہ التفات کے خواستگاروں میں سے تھے اور اس بحرِ خار سے برابر فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ اس علمی تعلق کا اعتراف علامہ مرحوم نے خود کیا ہے اور حضرت شاہ صاحب نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارے کئے ہیں۔ آپ کے تلمیذ ارشد مولانا محمد انور لاکھپوری مرحوم کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب خود فرماتے تھے کہ جتنا استفادہ مجھ سے ڈاکٹر اقبال نے کیا ہے کسی مولوی نے نہیں کیا۔ خود علامہ مرحوم کو علوم قرآن و حدیث پر کافی دسترس حاصل بھی، انہوں نے عربی اور فارسی مولانا میر حسن سیالکوٹی مرحوم سے باقاعدہ پڑھی تھی۔ اس لئے انہیں شاہ صاحب سے استفادہ کرنے میں کوئی مشکل درپیش نہ تھی۔

علامہ اقبال اور حضرت شاہ صاحب کے تعلقات کا باضابطہ آغاز اکتوبر ۱۹۱۲ء سے ہوتا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی راوی ہیں کہ:-

ہندوستان میں سیاسی طور سے ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک کا زمانہ بڑے ابتلاء کا زمانہ تھا۔ چنانچہ جمعیۃ العلماء ہند نے تجویز کیا کہ ایک عام جلسہ ان سیاسی حالات کے تحت کیا جائے اس کے روح رواں (پنجاب کے) ہر دل عزیز لیڈر مولانا عبدالقادر قسوری وکیل (لاہور) تھے۔ اور یہ عظیم الشان جلسہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں لاہور کے بریڈ لاہان میں منعقد ہوا۔ راقم نے اتنے علماء دین کا مجمع پھر نہیں دیکھا اور نہ آج تک پھر ایسا جلسہ ہوا ہے۔ اس جلسے کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس جلسہ کے افتتاح پر قرأت مولانا طاہر دیوبندی نے کی تھی اور صدر جلسہ مولانا آزادی تجویز کی تائید میں کئی علماء نے تقریریں کی تھیں مگر وہ تقریر جو مرحوم مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا فاضل خان پوری نے کی تھی وہ ایک شاہکار تھی۔ خطبہ صدارت کو مولانا ابوالکلام آزاد نے خود اور کچھ حصہ کو مولانا عبدالرزاق بلخ آبادی اور کچھ حصہ کو مولانا عبدالحلیم انصاری نے پڑھا تھا۔ اسی جلسہ میں

اول مرتبہ میں نے خود علامہ اقبال اور علامہ انور شاہ کشمیری کا تعارف کرایا تھا ①۔ اس کے بعد اقبال اور مولینا انور شاہ کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ اقبال کی شدید خواہش تھی کہ لاہور میں کسی مستند عالم کو مستقل قیام کی دعوت دی جائے تاکہ علامہ خود اور اہل لاہور اس سے استفادہ کر سکیں کیونکہ اقبال کے نزدیک لاہور میں ایک تنفس بھی ضروریات اسلامی سے آگاہ نہیں تھا اور پنجاب عملی طور پر بانجھ تھا۔ چنانچہ اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”یہاں لاہور میں ضروریات اسلامی سے ایک تنفس بھی آگاہ نہیں۔ یہاں انجمن اور کالج اور فکر مناصب کے سوا اور کچھ نہیں، پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے۔ صوفیاء کی دوکانیں ہیں مگر وہاں سیرت اسلامی کی متاع نہیں بنتی۔“

ایسے میں علامہ اقبال کی نظر انتخاب برصغیر ہندوپاک کی دو (عظیم المرتبت) شخصیات پر پڑی جنہیں لاہور میں مستقل قیام کی دعوت دی جاسکے۔ ایک استاد کل اور علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد مولینا سید سلیمان ندوی اور دوسرے دنیائے اسلام کے جید ترین محدث وقت مولینا محمد انور شاہ کشمیری۔ لیکن بد قسمتی سے دونوں بزرگ لاہور نہ آ سکے۔ یہ ۲۱ جنوری ۱۹۲۲ء کی بات ہے جب اقبال نے مولینا انور شاہ کے قیام کے انتظامات کر لئے تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مزید لکھتے ہیں کہ: ایک مرتبہ علامہ انور شاہ صاحب لاہور میں اتفاق سے تشریف لے آئے اور راقم کے مکان کے قریب تکیہ سادھوان (اندرون موچی دروازہ رنگ محل لاہور) میں پیر عبدالغفار ② شاہ صاحب (المتوفی ۱۳۴۰ھ) کے مہمان تھے۔ اس وقت ادھر آپ کی موجودگی میں لاہور میں علامہ اقبال نے ہر دو انجمنوں سے معاملہ فہمی بھی کر لی تھی کہ اگر آپ یہاں تشریف لے آئیں تو آپ خطیب بادشاہی مسجد اور ادھر اسلامیہ کالج میں علوم دین اسلام کے سربراہ ہوں گے ③۔

مارچ ۱۹۲۸ء میں جب مولینا انور شاہ انجمن خدام الدین لاہور کے اجلاس میں شرکت کے لئے لاہور آئے تو اقبال نے انہیں یہ خط لکھا:

۱۳ مارچ ۱۹۲۵ء

مخدوم و مکرم حضرت قبلہ مولینا!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

①..... ملاحظہ ہو ماہنامہ دارالعلوم دیوبند مارچ ۱۹۷۵ء ص ۱۸۔ ②..... خاندان مسعودی میں پیر عبدالغفار شاہ صاحب ایک خدا دوست بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب نویں پشت پر حضرت شاہ صاحب کے سلسلہ نسب کے ساتھ جاتا ہے۔ ③..... ملاحظہ ہو ماہنامہ دارالعلوم مارچ ۱۹۷۵ء مضمون جناب قاضی افضل حق قریشی۔

مجھے ماسٹر عبداللہ سے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تشریف لائے ہیں اور ایک روز قیام فرمائیں گے۔ میں اسے اپنی بڑی سعادت تصور کروں گا اگر آپ کل شام اپنے دیرینہ مخلص کے ہاں کھانا کھائیں، جناب کی وساطت سے حضرت مولوی حبیب الرحمن صاحب قبلہ عثمانی حضرت مولوی شبیر احمد صاحب اور جناب مفتی عزیز الرحمن کی خدمت میں بھی یہی التماس ہے، مجھے امید ہے کہ جناب اس عریضے کو شرف قبولیت بخشیں گے۔ آپ کو قیام گاہ سے لانے کے لئے سواری یہاں سے بھیج دی جائے گی۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اس ملاقات کی تفصیل اس طرح لکھتے ہیں:

”مارچ ۱۹۲۵ء میں لاہور میں انجمن خدام الدین کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا اس انجمن کے روح رواں مولوی احمد علی تھے جس میں خصوصیت سے علماء دیوبند محمد انور شاہ صاحب، مولینا حبیب الرحمن صاحب عثمانی، مولینا شبیر احمد عثمانی اور مفتی عزیز الرحمن وغیرہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے ہاں ایک خاص دعوت رات کے وقت کی تھی جس میں ان تمام علماء کرام نے شرکت کی تھی۔ ان میں مرحوم مولینا سید عطاء واللہ شاہ بخاری اور مولوی حبیب الرحمن لدھیانوی بھی مدعو تھے۔ اور علامہ اقبال کے سامنے اس وقت محض یہ مد نظر تھا کہ کسی طرح علامہ انور شاہ صاحب کو ان سے استفادہ کرنے کے لئے مستقل طور پر یہاں بلایا جائے“ ۱۔

۱۹۲۶ء میں جب حضرت شاہ صاحب بطور احتجاج دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوئے تو علامہ اقبال مرحوم کو اس سے خوشی محسوس ہوئی۔ خوشی اس لئے ہوئی کیونکہ آپ کو خیال تھا کہ شاید اب مولینا قیام لاہور پر راضی ہو سکیں گے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب نے اپنے رفقاء خصوصاً مولینا محمد بن موسیٰ سملکی کے اصرار پر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کو اپنے فیوض برکات کا مرکز بنایا بہر حال اس سلسلے میں مولینا سعید احمد صاحب اکبر آبادی رقمطراز ہیں:

دارالعلوم دیوبند میں اختلاف کے باعث جب جعفر الاستاذ نے اپنے عہدہ صدر الاساتذہ سے استعفیٰ دیا اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چند روز بعد (میں) ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمانے لگے کہ آپ کا اور دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو، میں بحر حال استعفیٰ کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں، میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا: کیا آپ کو دارالعلوم دیوبند کے نقصان کا کچھ ملال نہیں؟ فرمایا کیوں نہیں! مگر دارالعلوم کو تو صدر المدرسین اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ

خالی نہ رہے گی۔ لیکن اسلام کے لئے جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں اس کو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے۔ جس میں زندگی کے سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی سیاسی، معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے، مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کے لئے میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور شخص اس وقت عالم اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم ذمہ داری کا حامل ہو سکے، پھر فرمایا، یہ مسائل کیا ہیں؟ اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے؟ میں ایک عرصہ سے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں، یہ سب مسائل میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کروں گا اور ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے؟ یہ شاہ صاحب بتائیں گے اس طرح ہم دونوں کے اشتراک و تعاون سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آجائے گی ۱۔

بہر حال جب حضرت شاہ صاحب نے دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی اختیار کی تو اقبال مرحوم نے انہیں ایک تفصیلی تار دیا اور انہیں لاہور آنے کے لئے اصرار کیا۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالرشید صاحب ارشد، مولانا عبدالنہان ہزاروی کی زبانی یوں رقمطراز ہیں:-

”جب حضرت شاہ صاحب نے دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دیدیا، میں ان دنوں لاہور آسٹریا یا جامع مسجد میں خطیب تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیوبند ایک تفصیلی تار دیا جس میں شاہ صاحب سے درخواست کی گئی تھی کہ اب آپ لاہور تشریف لے آئیں اور یہاں قیام فرمائیں۔ جوابی تار تھا جس کا کوئی جواب نہیں آیا، جس پر ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو دیوبند بھیجا کہ تم جا کر زبانی عرض کرو، میں گیا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کو وہ تار اس وقت دیا گیا جب ڈاکٹر صاحب والوں نے اصرار کر کے وہاں تشریف لے جانے پر رضامند کر لیا تھا۔ میں ملا تو فرمایا افسوس کہ آپ کا پیغام بعد میں ملا اور میں ڈاکٹر صاحب والوں سے وعدہ کر چکا ہوں“ ۲۔

بہر حال حضرت شاہ صاحب اگر چہ لاہور نہ جاسکے لیکن اس کے باوجود علامہ اقبال مرحوم ان سے برابر استفادہ کرتے رہے۔ اس سلسلے میں مولانا قاری محمد طیب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

”علامہ اقبال مرحوم کے خیالات کی بہت حد تک اصلاح حضرت ممدوح کے ارشادات سے ہوئی۔ اس کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات و شبہات سے پر آتے تھے اور

۱۔ ملاحظہ ہو حیات انور ص ۱۶۵، ۱۶۶ یا زیر نظر کتاب میں مولانا سید احمد صاحب اکبر آبادی کا مقالہ۔

۲۔ ملاحظہ ہو ماہنامہ دارالعلوم دیوبند مارچ ۱۹۷۷ء ص ۲۰۔

حضرت ان کے شافی جوابات لکھتے جس سے ان کے قلب کی راہِ فنی چلی گئی۔^۱
لیکن بد قسمتی سے علم و علم کے ان دوسرے داروں کی خط و کتابت نامعلوم و جوابات کی بنا پر محفوظ نہ رہ سکی۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حضرت شاہ صاحب کا ایک منظوم رسالہ ”ضرب الخاتم علی حدود العالم“ حدود عالم کی بحث پر ہے چار سوا شععار پر مشتمل یہ رسالہ حجم میں تو بہت مختصر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں علم کا ایک سمندر موجود ہے۔

اور جب یہ رسالہ شائع ہوا تو حضرت شاہ صاحب نے اس کا ایک نسخہ اقبال مرحوم کو بھیج دیا۔ اس بارے میں مولینا سعید احمد اکبر آبادی کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس ذوق اور جس استعداد کے بزرگ تھے اس کے اعتبار سے ان کے لئے کوئی تحفہ اس چند ورق رسالہ سے زیادہ قیمتی ہو نہیں سکتا تھا۔ بڑے خوش ہوئے اور پورا رسالہ بڑی توجہ اور غور و فکر کے ساتھ پڑھا۔ میں اس زمانہ میں سلسلہ طالب علمی لاہور میں مقیم تھا اور گا ہے گا ہے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی علمی و ادبی مجلس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ ایک صحبت میں ایک مرتبہ فرمایا کہ میں تو مولینا انور شاہ صاحب کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ اور قال الرسول سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی ان کو اس درجہ درک و بصیرت اور اس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے حدود عالم پر اس رسالہ میں انہوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وہ رسالہ میرے حوالہ کیا اور فرمایا کہ اس میں چار شعرا ایسے ہیں جن کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ان پر نشان لگا دیا ہے آپ اب دیوبند جائیں تو یہ نسخہ ساتھ لیتے جائیں اور شاہ صاحب سے ان اشعار کا مطلب دریافت کرتے آئیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کی تعمیل کی۔ دیوبند آ کر وہ رسالہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر کے ڈاکٹر صاحب کا پیغام پہنچایا۔ لیکن حضرت الاستاذ نے مجھ کو ان اشعار کا مطلب سمجھانے کے بجائے یہی مناسب خیال فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کو فارسی میں ایک طویل خط لکھیں اور اسی میں ان اشعار کا مطلب بھی تحریر فرمادیں۔ یہ خط میں ہی دستی لے کر لاہور آیا اور ڈاکٹر صاحب کو پہنچا دیا۔^۲

اسی طرح مسئلہ زمان و مکان ایک عرصہ تک علامہ اقبال کے مطالعہ کا محور رہا ہے کیونکہ فلسفہ میں علامہ اقبال کو اس سے کافی دلچسپی تھی اس سلسلہ میں مزید معلومات اور ذاتی آراء حاصل کرنے کے

لئے جہاں دیگر محققین کے ساتھ ان کی خط و کتابت جاری تھی وہاں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں نہ صرف خطوط ارسال کئے بلکہ کئی بار حضرت شاہ صاحب سے بالمشافہ بھی ملے اور فلسفہ کے رموز و دقائق پر حضرت شاہ صاحب کے ارشادات سن کر مستفید ہوئے۔

ایک بار اسی مسئلہ زمان و مکان پر حضرت شاہ صاحب اور ڈاکٹر اقبال کے درمیان گفتگو شروع ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اثبات باری پر نیوٹن کی اور نیوٹن پر لکھی ہوئی عمدہ کتابیں ہیں اس پر حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: میں نے اس کی پندرہ تصانیف دیکھی ہیں۔ لیکن میں نے اپنی کتابوں ”ضرب الخاتم“ اور ”مرقاۃ الطائر“ میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اسکو نیوٹن نہیں پہنچ سکا۔ اسی طرح ایک بار حضرت شاہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو علامہ عراقی کا ایک قلمی فارسی رسالہ دیا جس کا نام ”غایۃ البیان فی تحقیق الزمان والمکان“ ہے۔ پھر شاہ صاحب نے کہا: نیوٹن نے جو کچھ لکھا ہے علامہ عراقی سے لیا ہے۔ اس کی اپنی تحقیق نہیں ہے، ڈاکٹر صاحب یہ سن کر حیران رہ گئے۔ یورپ کے اخباروں تک میں بیان دیئے۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ایک جلسہ کیا گیا تھا جس کی صدارت ڈاکٹر اقبال نے کی تھی، اس جلسہ میں ڈاکٹر صاحب نے یہ قصہ سنایا۔ جلسہ میں کلکتہ سے آئے ہوئے پروفیسروں کے علاوہ حیدر آباد سے حضرت مولینا حبیب الرحمن صاحب خان شیردائی بھی تشریف لائے تھے، ڈاکٹر اقبال نے جلسہ میں یہ قصہ سنایا تو حاضرین کی خیرت کی انتہا نہ رہی“ ①۔

۱۹۲۸ء میں اقبال مرحوم اور نیشنل کانفرنس لاہور کے شعبہ عربی و فارسی کے صدارتی خطبے حکمائے اسلام کے عمیق تر مطالعے کی دعوت میں لکھتے ہیں:-

”لیکن جدید ریاضیات کے اہم ترین تصورات میں سے ایک تصور کا یہ مختصر حوالہ بالا میرے ذہن کو عراقی کی تصنیف ”غایۃ الامکان فی درایۃ المکان“ کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ مشہور حدیث لا تسبوا الدھر لان الدھر هو اللہ میں دھر (بمعنی TIME) کا جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق مولینا انور شاہ صاحب سے جو دنیا کے اسلام کے جدید ترین محدثین وقت میں سے ہیں ان سے میری خط و کتابت ہوئی۔ اس مراسلت کے دوران میں مولینا موصوف نے مجھے اس مخطوطے کی طرف رجوع کرایا اور بعد ازاں میری درخواست پر ازراہ عنایت مجھے اس کی ایک نقل ارسال کی“ ②

اقبال مرحوم نے اپنے معرکہ الآراء اور چھ انگریزی خطبات ”The reconstrution

"of Religious thought in Islam" کے سلسلے میں حضرت شاہ صاحب سے ختم نبوت قتل مرتد اور مسئلہ زمان و مکان کے بارے میں خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔

اسی طرح قادیانیت کے خلاف ڈاکٹر صاحب کا جو فاضلانہ مقالہ ہے وہ دراصل نتیجہ ہے حضرت شاہ صاحب کی فیض صحبت کا۔ جب علامہ مرحوم نے یہ مقالہ تحریر فرمایا تو اسے انگریزی اخبارات نے بھی شائع کیا جس سے پورے پنجاب میں ایک تلاطم کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔

بہاولپور کے معرکہ الآراء مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں حضرت شاہ صاحب ۱۹۲۲ء کو بہاولپور پہنچے ۲۵ اگست کو ان کا بیان شروع ہوا جو متواتر پانچ روز تک جاری رہا۔ مولینا محمد انوری لاہپوری کا بیان ہے کہ اس سفر کے دوران حضرت شاہ صاحب نے لاہور میں بھی دو روز قیام فرمایا آسٹریلیئن بلڈنگ کی مسجد میں بعد نماز فجر وعظ فرمایا علماء و فضلاء عوام و خواص بالخصوص ڈاکٹر محمد اقبال اور ان کے ساتھی اہتمام سے حاضر ہوتے تھے۔ الخ ۵

اس لئے اغلب ہے کہ متذکرہ صدر ملاقات (یعنی اگست ۱۹۳۲ء) ہی کو علامہ اقبال اور علامہ انور شاہ کی آخری ملاقات رہی۔

حضرت شاہ صاحب کی رحلت پر اقبال مرحوم کو کتنا صدمہ ہوا ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ کیونکہ صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبال اگر اپنے وقت میں کسی عالم دین سے متاثر ہوئے تھے۔ وہ حضرت شاہ صاحب کی ہی ذات گرامی تھی۔

بہر حال علامہ اقبال نے مولینا مرحوم کو جن الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے واقعی آپ زر سے لکھنے کے قابل ہیں فرماتے ہیں: "اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے" چنان لاہور پاکستان بحوالہ دارالعلوم مارچ ۱۹۷۵ء مقدمہ انوار الباری ج ۲ ص ۲۳۵۔

دل کو روؤں کہ یا جگر کو میر میری دونوں سے آشنائی ہے

علامہ اقبال روح اسلام کی جہاں گیریت اور اپنے فلسفہ کی آفاقیت کے باوجود کشمیر اور کشمیریت کے لئے ایک خاص جذبہ اپنے قلب کے نہاں خانہ میں محفوظ پاتے تھے جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا تھا۔ حضرت شاہ صاحب کی ذات سے آپ کے لئے بے نظیر علم و عمل اور عبقریت کے علاوہ کشمیریت کی وجہ سے بھی علامہ کو محبت تھی۔ حضرت شاہ صاحب کے انتقال کے بعد علامہ کی خود اپنی بقیہ زندگی کے جو چار پانچ سال ہیں، وہ بیماریوں اور جسمانی عوارضات کی نذر ہوئے ہیں اور اس دور میں موصوف نے اپنے احساسات کو اکثر چار پائی پر لیٹے لیٹے لکھا ہے یا لکھوا دیا ہے۔ اسی زمانہ

کے کوئی ۱۹ قطعات ہیں جو ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض کے عنوان کے تحت ارمغان حجاز میں شامل کئے گئے ہیں۔ پہلا قطعہ صاف صاف حضرت شاہ صاحب کی جدائی میں رنج و غم اور حسرت کے آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے جذبات کا آئینہ دار ہے شاعر حضرت شاہ صاحب کے مقام پیدا کش لولاب کو بھی اپنی سوگواری میں شریک بنا کر ”اے وادی لولاب، اے وادی لولاب“ کی تکرار کر رہا ہے۔ اس نظم سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کی نگاہ میں حضرت شاہ صاحب منبر و محراب کے حقیقی وارث نواہائے جگر سوز کے لئے نواز، فغان سحری سے دلوں کو بیدار کر دینے والے درویش اور ایک عظیم الشان کشمیری تھے۔ اس لئے علامہ اپنے ان خیالات کو جو کشمیر کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں ان انیس قطعات میں ظاہر کئے گئے ہیں حضرت شاہ صاحب کا فیضان قرار دیکر کہتا ہے ”ملازادہ ضیغم لولابی کشمیر کا بیاض“ ان قطعات میں بعض دیگر شخصیات مثلاً میر واعظ مولینا محمد شریف شاہ مولینا میرک شاہ اندرابی اور شیخ ویرہمن وغیرہ کی طرف بھی تلمیحات ہیں (قطعہ ۱۱، ۹) جو ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۸ء علامہ کی وفات تک) کشمیر کی سیاست کے پس منظر میں موجود تھے ان میں سے ہر ایک پر علامہ کی نظر تھی لیکن جو بلند امیدیں موصوف نے حضرت شاہ صاحب کی ذات سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ رسمی سیاست سے وراء الواراء تھیں۔ اس پس منظر میں ”اے وادی لولاب“ کا قطعہ پڑھ لیجئے تاکہ اقبال اور انور شاہ کے باہمی تعلقات کا کچھ اندازہ ہو جائے۔

اے وادی لولاب!

- ۱۔ پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغان سحر تیر فضاؤں میں ہیں بے تاب
اے وادی لولاب!
- ۲۔ گر صاحب ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب
دین بندہ مؤمن کے لئے موت ہے یا خواب
اے وادی لولاب!
- ۳۔ ہیں ساز پہ موقوف نواہائے جگر سوز
ڈھیلے ہوں اگر تار تو بیکار ہے مضرب
اے وادی لولاب!

۴۔ ملا کی نظر نور فراست سے ہے خالی

بے سوز ہے میخانہ صوفی کی مئے ناب

اے وادی! لولاب!

۵۔ بیدار ہوں دل جس کی فغان سحری سے

اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

اے وادی! لولاب!

☆☆☆☆☆

شاہ صاحبؒ اور مولینا مفتی محمد کفایت اللہؒ

(مرتبہ کوندو)

محدث کشمیری حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت علامہ مولینا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کے باہمی تعلقات کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ہر دو حضرات حضرت شیخ الہند مولینا محمود الحسن صاحبؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے دونوں از ہر ہند دارالعلوم دیوبند سے امتیازی نشان کے ساتھ فارغ التحصیل ہوئے تھے اور دونوں ہی فقہ اسلامی کی حنفی شاخ کے ان ماہرین میں سے تھے جو امام اعظمؒ کے اجتہادات کے لئے قرآن وحدیث اور تعامل صحابہ کرامؓ سے سندات پیش کرنے کا خاص ملکہ رکھتے تھے نیز دونوں جمعیتہ العلماء ہند کے ممتاز مقتدر رہنما تھے اور وطنی سیاست میں بقدر وسعت حصہ لیتے تھے۔ اسی لئے دونوں ایک دوسرے کی علمی صلاحیتوں کے قدردان اور معترف تھے۔

حضرت شاہ صاحب کے فرزند اکبر مولینا محمد ازہر شاہ صاحب قیصران دونوں حضرات کے باہمی تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

(۱) حضرت علامہ نور شاہ کشمیری نے اگر عالم الدین والدینا کہہ کر مفتی صاحب کو خراج تحسین ادا کیا اور مختلف مواقع پر ان کے متعلق مدح و تعریف کے وہ کلمات کہے جو اپنے معاصرین میں سے کسی شخص کے متعلق ان کی زبان پر نہیں آئے تو حضرت مفتی صاحب نے بھی حضرت شاہ صاحب کی رفاقت ودوستی کا حق ادا کیا۔ ہمیشہ ان کے احترام میں اپنی آنکھیں بچھائیں ہمیشہ ذاتی معاملات میں انہیں خیر خواہانہ مشوروں سے مستفید فرمایا گیا۔

(۲) دیوبند میں ملتان سے کھلا ہوا حضرت مفتی صاحب کا ایک کارڈ آیا کہ میں کل شام جیل سے رہا کر دیا گیا ہوں۔ آج دہلی روانہ ہو رہا ہوں پرسوں صبح دہلی پہنچوں گا۔ یہ دو سطر ہیں حضرت شاہ صاحب کے لئے ایک پیغام مسرت ثابت ہوئیں۔ وسیع علمی مشاغل اور بے حد سنجیدگی و وقار کے باوجود مسکراہٹ ان کے چہرہ پر کھیل گئی فرط مسرت سے غنجہ نورس کی طرح کھل کھل گئے تیسرے دن دہلی تشریف لے گئے اور امینہ کے دروازہ پر علم و فضل کے یہ دوسرا یہ دار پر تپاک طریقے پر ایک دوسرے سے ملے۔ الخ

(مفتی اعظم کی یاد۔ از مولینا حفیظ الرحمن واصف ۱۵۷)

حضرت شاہ صاحب اور حضرت مفتی صاحب کے تعلقات آخر عمر تک نہایت استوار تھے اور اکثر و بیشتر حضرت مفتی صاحب علمی تحقیقات حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش فرماتے رہتے تھے۔ جب حضرت شیخ الہند کے اصرار اور دوسرے اکابرین دیوبند کی تجویز پر حضرت شاہ صاحب دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس پر مامور ہوئے تو بھی ان دونوں کے تعلقات پہلے کی طرح قائم رہے اور جب زندگی کی آخری حصہ میں یعنی وفات سے ۸ سال پہلے حضرت شاہ صاحب نے دارالعلوم دیوبند سے انتظامی معاملات پر اختلاف کر کے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کو اپنے فیوض و برکات کا مرکز بنایا تو اس دوران بھی علم و فضل اور ورع و تقویٰ کے ان دوسرا یہ داروں کے باہمی تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ زندگی کے ان آخری سالوں میں حضرت شاہ صاحب کا معمول تھا کہ ڈابھیل سے دیوبند آتے جاتے مدرسہ امینہ میں حضرت مفتی صاحب کے پاس ایک دو دن قیام فرماتے تھے اور علمی دقائق کو حل کرنے میں باہم تبادلہ خیالات بھی فرماتے تھے۔

مولینا کفایت اللہ مرحوم رسالہ ”روض الراحین“ (جو مدرسہ امینہ دہلی کی مختصر تاریخ ہے) کے آخر پر حضرت شاہ صاحب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

نبیہ فائق الاقران یدعی ☆ بانور شاہ موموق الحسود

بزرگ مرتبہ ہمسروں پر فائق جن کو انور شاہ کہہ کر پکارا جاتا ہے حاسدوں کے محبوب ہیں۔

فہذا الحبر غارس ذالنجیل ☆ واول موقظ القوم الرقود

کیونکہ یہ علامہ اس درخت کے لگانے والے ہیں اور سوئی قوم کو اول اول جگانے والے

حضرت شاہ صاحب کی شہرہ آفاق تصنیف الکفار الملحدین فی ضروریات الدین کے اختتام پر اکابر علماء کی جو تقریظات ہیں ان میں مولینا مفتی محمد کفایت اللہ کی بھی فاضلانہ تقریظ شامل ہے۔ کتاب مذکور پر تبصر فرماتے ہوئے حضرت مفتی صاحب نے اپنے رفیق محترم کو ”عمدہ زمانہ“ صدر

الافاضل“ اور ”فخر الاماثل“ جیسے القاب سے نوازا ہے۔ پوری تقریظ عربی فصاحت و بلاغت کا قابل قدر آئینہ ہے۔ اس لئے قارئین کرام کی تفریح طبع کے لئے من و عن پیش خدمت ہے:

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا بَعَثَ بِالْحَقِّ دَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِآذِنِهِ وَسِرَاجًا مُبِيرًا وَخَتَمَ بِهِ النُّبُوَّةَ وَالرِّسَالَةَ فَجَاءَ خَاتَمُ النَّبِيِّينَ وَالْمُرْسَلِينَ بِشِيرًا وَنَذِيرًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَاصْحَابِهِ وَسَلَّمَ صَلَواتُ مَتَوَالِيَةٍ وَسَلَامًا كَثِيرًا. أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّهُ قَدْ كَانَ يَخْتَلِجُ فِي صُدُورِ بَعْضِ النَّاسِ تَسْجِيلُ الْعُلَمَاءِ بِكُفْرِ الطَّائِفَةِ الْقَادِيَانِيَةِ الْقَابِلَةِ بِنُبُوَّةِ مُحَدِّثِهَا (مرزا غلام احمد القادياني) وبكُفْرِ الْفِرْقَةِ الْاِحْمَدِيَةِ الْقَائِلَةِ بِأَنَّ مَرْزَا غِلَامَ حَمْدِ الْمَذْكُورِ كَانَ مَسِيحًا مُوَعِدًا وَمُهْدِيًا مُنْتَظَرًا وَمَجْدِدَ جَلِيلًا وَوَلِيًّا نَبِيلًا وَأَنَّهُ لَمْ يَدَّعِ النُّبُوَّةَ وَالرِّسَالَةَ وَإِنْ سَمَّى نَفْسَهُ نَبِيًّا وَرَسُولًا وَادَّعَى الْوَحْيَ وَالْإِلَهَامَ وَسَرَى بَيْنَ وَحْيِهِ وَوَحْيِ الْأَنْبِيَاءِ ظَنًّا مِنْهُ أَنَّهُمْ مُتَاوَلُونَ وَتَوَقَّفَ فِي تَكْفِيرِ امْتِثَالِهِمُ السَّلَفَ الصَّالِحِينَ فَقَامَ الْعَلَامَةُ عُمْدَةُ زَمَانِهِ وَرَحْلَةُ أَوَائِهِ صَدْرُ الْافَاضِلِ وَفَخْرُ الْاِمَائِلِ الْمَوْلَى الْمَقْدَامِ وَالْخَيْرُ الْهَمَامِ مَوْلَانَا مُحَمَّدُ انور شاہ صَدْرُ الْاِسَائِدَةِ بَدَارُ الْعُلُومِ الْدَيُوبَنْدِيَةِ مَشْمُرًا عَنْ سَاقِ التَّحْقِيقِ وَرَافِعًا لِوَاءِ التَّدْقِيقِ فَكَشَفَ عَنِ الْمَرَامِ وَمَحَا الظَّلَامَ، نَحَى السُّرُوحَ وَجَلَّى الْأَمْرَ فِي عَجَالَةٍ سَمَاهَا "إِكْفَارُ الْمَلْحَدِينَ" نَفْسٌ فِيهَا دُرٌّ وَجُودٌ غَرَّرَ فَلَمْ يَتْرَكْ مَسَاغًا لِيُشْكَّ وَالْاِخْتِلَاجُ تَرَى سَطُورَهَا كَانَتْهَا لِلْاِيْقَانِ فَجَاجَ، جَزَاءُ اللَّهِ غَنًا وَعَنْ سَائِرِ الْمُسْلِمِينَ وَقَطَعَ بِمَا اِيْدَى ذَابِرِ الْمَلْحَدِينَ وَنَقَى بِهِ لَوْنَ الدِّينِ السَّمِينِ وَأَنَاحَ كَيْدَ الْخَائِنِينَ الظَّالِمِينَ. مُحَمَّدٌ كَفَايَتُ اللَّهِ عَفَى عَنْهُ رَبُّهُ وَكَفَاهُ.

۴ ربيع الاول ۱۳۴۳ھ

حضرت مفتی صاحب مرحوم کے دل میں حضرت شاہ صاحب کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ اس کا اظہار تو حضرت موصوف نے عمر بھر بار بار کیا ہے۔ خصوصاً حضرت شاہ صاحب کی وفات حسرت آیات پر سہ روزہ الجیمہ (جون ۱۹۳۳ء) میں حضرت مفتی صاحب نے خود اپنے قلم سے تعزیتی اداریہ سپرد قلم فرمایا ہے جس میں اپنے درد دل کا اظہار کرنے کے علاوہ حضرت شاہ صاحب کی علمی عظمت کو نمایاں کیا ہے۔ افادیت

عام کے لئے اس ادارہ کے اقتباس کو ذیل میں درج کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔
 آہ قدرت کے زبردست ہاتھ نے حضرت مولانا علامہ الفاضل الکامل، اکمل العلماء، افضل
 الفضلاء، الخیر المہتمم، البحر المطمئن رحلت العصر قدوة الدہر، استاذ الاساتذہ، رئیس الجہانہ محدث
 وحید، مفسر فرید، بیگانہ، ماہر علوم العقلیہ والعقلیہ مولانا انور شاہ قدس سرہ کو آغوش رحمت میں کھینچ لیا اور ہم
 سے ظاہری طور پر ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات بلاشبہ وقت حاضر کے کامل
 ترین عالم ربانی کی وفات ہے جن کی نظیر مستقبل میں متوقع نہیں طبقہ علماء میں حضرت شاہ صاحب کا
 تبحر، کمال فضل، ورع و تقویٰ اور جامعیت و استغنا مسلم تھا۔ موافق و مخالف ان کے سامنے تسلیم
 و اختیار سے گردن جھکا دیتا تھا ❶۔

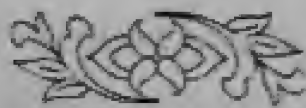
حضرت شاہ صاحب کے تلمیذ رشید مرحوم مولانا لالپور ری حضرت شاہ صاحب اور حضرت مفتی
 صاحب موصوف کے باہمی تعلقات کو بیان فرماتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:
 ”حضرت مفتی صاحب سے ہمارے شاہ صاحب قدس سرہ کو بہت تعلق اور شغف تھا
 بہادپور کے مقدمہ پر جب حضرت تشریف لے گئے، احقر بھی ہمراہ تھا، لاہور پہنچ کر فرمایا
 مولانا کفایت اللہ صاحب ملتان جیل میں ہیں ان سے ملکر آگے جانے کا خیال ہے۔
 چنانچہ ملتان کا ٹکٹ لیا گیا اسٹیشن پر خدا کا مجمع استقبال کے لئے موجود تھا۔ شہر میں تشریف
 لے جاتے ہی تقاضہ فرمایا کہ ہمیں سنٹرل جیل مولانا سے ملاقات کرنا ہے۔ مجلس احرار
 کے کارکنوں نے اجازت حاصل کرنے کا انتظام کیا، احقر کو بھی ساتھ لیا، جیل تشریف
 لے گئے۔ حضرت مفتی صاحب کو جب معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب ملاقات کے
 لئے تشریف لائے، معانقہ مصافحہ ہوا۔ دیر تک آنسو بہاتے رہے، بار بار حضرت سے
 خیریت دریافت کرتے تھے۔ بڑی ہی مسرت کا اظہار فرمایا، احقر سے بار بار پیار
 فرماتے۔ پھر مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی، مولانا قاری عبدالرحمن مرحوم،
 مولانا احمد سعید صاحب دہلوی، مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی، مولانا داؤد غزنوی، مظہر
 علی اظہر، چودہری افضل حق صاحبان یہ سب حضرات بھی چونکہ اس جیل میں نظر بند تھے ا
 س لئے حضرت شاہ صاحب کی زیارت کے لئے جمع ہو گئے۔ عجیب مجلس تھی، مولانا داؤد
 صاحب غزنوی نے حضرت مفتی صاحب مرحوم کی وساطت سے حضرت شاہ صاحب
 سے عرض کیا کہ وہ مفردات القرآن علامہ راغب اصبہانی کا اردو ترجمہ کرنا چاہتے ہیں،

حضرت بہت خوش ہوئے اور مولینا کے دریافت کرنے پر بہت سی کتب کے نام نوٹ کر دئیے جن سے امداد لی جاسکے، زمانہ جیل میں علمی و دینی خدمات تحریری کے متعلق سب حضرات سے فردا فردا بھی گفتگو فرماتے رہے۔ ڈیڑھ گھنٹہ ملاقات رہی، آخر میں فرمایا کہ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو حکومت نے جب جیل بھیجا تو آپ سے دریافت کیا گیا کہ شاگردوں میں کون صاحب زیادہ محبوب ہیں؟ آپ نے حافظ ابن تیمیہ کا نام لیا، ان کو بھی ساتھ ہی نظر بند کر دیا گیا۔ پوچھا گیا کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہئے آپ نے کاغذ قلم اور دوات طلب کی یہ سامان دے دیا گیا۔ آپ نے لکھ لکھ کر سب کاغذات پر کر دے اس کے بعد جیل کی دیواروں پر لکھنا شروع کر دیا یہ حضرت مولینا کفایت اللہ مرحوم اور حضرت مولینا احمد سعید صاحب دہلوی کی طرف اشارہ تھا۔ کہ حضرت مفتی صاحب کے ساتھ ان کے محبوب شاگرد کو بھی نظر بند کر دیا گیا۔

حضرت مفتی صاحب جمعیت علماء ہند کی مجلس منتظمہ کا کوئی اجلاس کامیاب نہیں سمجھتے تھے جس میں حضرت شاہ صاحب کی شمولیت نہ ہو۔ اکثر مشاورت کے لئے خود دیوبند تشریف لاتے یا حضرت کو تار و پیکر دہلی بلاتے۔ رسالہ فضل الخطاب فی مسئلۃ ام الکتاب جب مطبع قاسمی والوں نے جلد طبع کر کے نہ دیا کو کاپیاں احقر اور مولینا محمد ادریس صاحب سکروادی کے ہاتھ حضرت مفتی صاحب کے پاس دہلی بھیجیں تاکہ اپنی نگرانی میں طبع کراویں ۱۔

حضرت شاہ صاحب اور حضرت مفتی صاحب رحمہما اللہ کے انتقال سے وہ نقصان ہوا جس کی حلانی مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ ان کی وفات سے تدریس حدیث و تفسیر تفہیم فقہ اور ارشاد و تلقین ہی یتیم نہیں ہوئے بلکہ سیاست و فتویٰ اور معاشرت و اصلاح کے دو عظیم الشان حکیم بھی ہم سے رخصت ہوئے۔

”خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را“



حضرت شاہ صاحب اور علامہ عثمانی

(مرتبہ کونمو)

مفسر قرآن شارح صحیح مسلم اور مملکت پاکستان کے اولین شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ حضرت شاہ صاحب کے رفیق خاص تھے باوجودیکہ وہ خود جید عالم و فاضل تھے لیکن بایں ہمہ حضرت شاہ صاحب سے انہوں نے کافی استفادہ کیا ہے جس کے وہ خود معترف ہیں۔ چنانچہ حضرت موصوف نے حضرت شاہ صاحب کی امالی فیض الباری علی صحیح البخاری پر جو تقریر تحریر فرمائی ہے اس میں آپ حضرت شاہ صاحب کی عظمت، علم حدیث اور علم فقہ میں ان کے علوم مرتبہ کا ذکر جمیل فرمانے کے بعد یوں رقمطراز ہیں:

میں نہ ان کے تلامذہ میں سے ہوں اور نہ میران کے ہم سبقوں میں شمار ہے۔ بس مجھے ان کی صحبتوں اور مجلسوں میں ان کے ساتھ مشکلات فن اور دقیق مسائل میں مذاکرہ سے ایک زمانہ دراز تک استفادہ کا موقع ملتا رہا ہے جو کہ میری کتاب فتح الملہم بشرح صحیح مسلم کا مطالعہ کریگا اس پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی۔ (مقدمہ فیض الباری ۷۸)

بطور نمونہ اس سلسلے میں ہم ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔ علامہ عثمانی نے فتح الملہم بشرح صحیح مسلم میں ایک موقع پر حضرت محدث کشمیری کا ذکر خیر ان الفاظ میں کیا ہے:

سألت الشيخ العلامة النقي النقي الذي لم تر العيون مثله ولم يرهو مثل نفسه ولو كان في سالف الزمان لكان له شأن في طبقة اهل العلم عظيم وهو سيدنا مولينا الانور الكشميري ثم الديوبندي اطل الله بقائه عن تفسير اوائل سورة النجم وتحقيق رؤية النبي صلى الله عليه وسلم ربه فقرر الشيخ تقريراً حسناً بليغاً جامعاً لاشئنا الروايات وأطواف الكلام منها على اغرار القرآن فالتمست منه ان يقيده بالكتابه لعدم الفائدة فاستجاب الملتمس و علي الله اجره مع وجود الشواغل الكثيرة.

میں نے خدا ترس، پاک طینت شیخ العلامة (انور شاہ) جن کا مثل ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا ہے اگر وہ گزشتہ زمانے میں ہوتے تو اہل علم کے طبقہ میں ان کا بڑا مرتبہ ہوتا، وہ ہمارے سردار مولانا انور شاہ کشمیری ثم دیوبندی ہیں اللہ تعالیٰ انہیں تادیر قائم رکھے۔ میں نے

ان سے سورۃ النجم کی ابتدائی آیتوں کی تفسیر اور رسالت مآب ﷺ کے دیدار الہی کی تحقیق کے متعلق درخواست کی تھی، جس کو انہوں نے شرف قبولیت بخشا اور نہایت نفیس اور فصیح و بلیغ تقریر کی۔ جس میں متفرق روایات اور بحث کے تمام گوشوں کو سمیٹ لیا ہے اور قرآن مجید کی گہرائیوں پر تنبیہ فرمائی ہے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس کو قلمبند فرمائیں تاکہ اس سے فائدہ عام ہو جائے انہوں نے گونا گوں مشغلوں کے باوجود میری یہ بات بھی مان لی۔ اللہ تعالیٰ اس کا اجر دے ①۔

حضرت شیخ الہند کی ہجرت و اسارت اور آپ کے انتقال کے بعد صحیح بخاری اور جامع ترمذی کی تدریس حضرت شاہ صاحب کے لئے اور صحیح مسلم کی مولینا عثمانی کے لئے مخصوص تھی تمام اہل علم کا عقیدہ رہا ہے کہ اگر مولینا انور شاہ اپنے زمانہ کے بخاری تھے تو مولینا شبیر احمد عثمانی اپنے زمانہ کے مسلم تھے۔ حضرت شاہ صاحب کے تلمیذ خاص مرحوم مولینا محمد ادریس کاندھلوی کا بیان ہے کہ:

”حضرت شاہ صاحب معلم کے بحرہ خارج تھے مگر زبان میں کچھ لکنت تھی اور مولینا عثمانی نہایت فصیح اللسان تھے گویا کہ حضرت شاہ صاحب شان موسوی کا ایک پر تو تھے اور مولینا عثمانی شان ہاروی کا ایک عکس تھے جیسا کہ حدیث میں علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔ حضرت ہارون فصیح اللسان تھے اور حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے وزیر اور مشیر تھے۔ اسی طرح حضرت مولینا عثمانی علم میں حضرت شاہ صاحب کے وزیر اور قائم مقام تھے“ ②۔

حضرت شاہ صاحب کی کتاب ”کشف المستر عن صلوة الوتر“ کے متعلق علامہ عثمانی تحریر فرماتے ہیں کہ:

حضرت شاہ صاحب کی کتاب ”کشف المستر عن صلوة الوتر“ کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ اس نے مسئلہ مذکور پر جتنی احادیث جمع کی جاسکیں جمع کیں اور ان کا مطالعہ کیا، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی تصانیف کو سمجھنے کے لئے کافی مطالعہ اور گہری نظر کی ضرورت ہے ③۔

جن دنوں حضرت شاہ صاحب جامعہ اسلامیہ ذابھیل میں دینی خدمات انجام دے رہے تھے اس دوران مولینا عثمانی نے حضرت شاہ صاحب سے کافی استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب کی امالی کے ایک بڑے امانتدار مؤلف انوار الباری مولینا سید احمد رضا صاحب کا بیان ہے کہ:

① ملاحظہ ہو فتح الملہم شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۳۵۔ ② ملاحظہ ہو حیات انور ص ۱۱۵، مضمون مولینا کاندھلوی

③ ملاحظہ ہو سیرت انور ص ۵۵۲، حیات انور ص ۱۸۶

”راقم الحروف نے اپنے سولہ سالہ قیام مجلس علمی ڈابھیل کے عرصہ میں یہ اندازہ کیا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے علوم و کمالات سے سب سے زیادہ استفادہ حضرت علامہ عثمانی نے کیا تھا وہ حضرت سے تمام مشکلات میں رجوع فرماتے اور پھر کتابوں کا مطالعات دن فرماتے تھے۔ آپ نے قرآن مجید کے (تفسیری) فوائد اور فتح المہم میں حضرت شاہ صاحب کے افادات بہ کثرت لئے ہیں“ ①۔

حضرت شاہ صاحب سے اتنا استفادہ کرنے کے بعد ہی ایک بار مولینا مفتی محمود احمد صاحب سے حضرت شاہ صاحب نے فرمایا!

”تمہیں ایک خوش خبری سنانا ہوں کہ مولینا شبیر احمد صاحب کو علم حدیث سے مناسبت ہوگئی ہے“ ②۔

اسی مختصر جملہ سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی علمی تحقیق کا مرتبہ کس قدر بلند تھا کہ حضرت مولینا عثمانی جیسی جامع معقول و منقول شخصیت کے لئے یہ الفاظ فرمانا جو دارالعلوم دیوبند میں حضرت شاہ صاحب ہی کے زمانہ میں مسلم شریف کا درس دیا کرتے تھے اور کتاب الایمان کی درسی تقاریر میں تو ان کی غیر معمولی شہرت تھی۔

مولینا محمد ادریس صاحب سکھو وڑوی تحریر فرماتے ہیں کہ جس دن حضرت شاہ صاحب کی وفات کا تاریخ ڈابھیل پہنچا تو حضرت مولینا شبیر احمد صاحب پر بے صبر اور غم کے آثار زیادہ نمایاں تھے۔ بے ساختہ چیخیں اور دھاڑے مار مار کر رو رہے تھے اور فرما رہے تھے۔ آہ ہمارے لئے موجب تسکین و طمانیت کون ہے کس کے پاس جا کر اب تسکین خاطر کریں گے کس سے اپنی علمی اشکالات حل کرائیں گے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو رنج و غم کا پہاڑ مولینا شبیر احمد صاحب پر گرا ہے وہ رنج و غم کسی دوسرے کو نہیں ③۔

حضرت شاہ صاحب کی رحلت پر تقریر تعزیت میں علامہ عثمانی نے اپنے شفیق محترم اور رفیق خاص کو جن الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا ہے اس سے نہ صرف قارئین کرام کو حضرت شاہ صاحب

①۔ ملاحظہ ہو مقدمہ انوار الباری حصہ دوم ص ۳۹ و نطق انور ص ۹۔ ②۔ ملاحظہ ہو نطق انور جلد اول ص ۹۔

③۔ ملاحظہ ہو حیات انور ص ۳۷ مضمون مولینا سکھو وڑوی

نوٹ: مولف نطق انور نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ دوران تقریر طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے مولینا عثمانی نے یہ بھی فرمایا کہ ”حضرت شاہ صاحب کی وفات سے تم لوگ یتیم نہیں ہوئے بلکہ ہم جیسے بچے چھالے والے یتیم ہو گئے ہیں کیونکہ تمہارے لئے خدا کے فضل سے ہم بھی کافی ہیں“ گوئید

کی قدر و منزلت کا اندازہ لگانے میں سہولت ہوگی بلکہ حضرت شاہ صاحب اور مولینا عثمانی کے باہمی تعلقات کو بھی بیان کرنا ہمارے لئے آسان ہوگا۔

چنانچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

”مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ تقی الدین ابن دقین العید اور سلطان العلماء حضرت شیخ عز الدین بن عبدالسلام کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا تھا کہ ہاں دیکھا ہے کیونکہ صرف زمانہ کا تقدم و تاخر ہے ورنہ اگر حضرت شاہ صاحب بھی چھٹی یا ساتویں صدی میں ہوتے تو اسی طرح آپ کے مناقب و حامد بھی اوراق تاریخ کا گرانقدر سرمایہ ہوتے میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجر الشیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا آج انتقال ہو رہا ہے“ ①

حضرت شاہ صاحب کے بڑے صاحبزادے مولینا ازہر صاحب نے اپنی ایک تازہ تصنیف میں مولینا عثمانی کا ذکر خیر کرنے کے بعد ایک جگہ حضرت موصوف کی زبان سے نکلے ہوئے چند فلسفیانہ جملے بھی نقل کئے ہیں جو واقعی آپ ذر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

”سکون و راحت انسانی زندگی کے سب سے بڑے دشمن ہیں، ممکن ہے کہ سانپ انسان کا سب سے بڑا دشمن ہوتے ہوئے بھی کسی وقت انسان سے اچھا سلوک کرے اور اسے کاٹ لینے سے رک جائے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ زہر انسان پر اثر نہ کرے اور انسان زہر کھا لینے کے بعد بھی زندہ رہے مگر ایسا نہیں ہو سکتا کہ جو قوم اور جو طبقہ تن آسانیاں اور راحت پسندی کا خوگر ہو جائے اور جہد و کشمکش سے جان چھانے لگے اسے قدرت عزت کی کوئی زندگی اور زندگی کی کوئی لمحہ بھی عنایت فرمادے عیش طلبی اور انسانی زندگی کا باہم کوئی تعلق نہیں۔ زندگی میں عیش کا تصور و تلاش انسان کے لئے ایک لاعلاج مرض ہے۔ اور عیش و راحت کی موجودگی انسانیت کے ناموس و عزت کے لئے موت کا پیغام ہے۔“ ②



① ملاحظہ ہو حیات انور ص ۴۱، سیرت انور ص ۴۸، مقدمہ انوار الباری وغیرہ۔ ② ملاحظہ ہو ”یادگار زمانہ“ ج ۱ ص ۱۳۔

حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مولینا بخاریؒ

مولینا ازہر شاہ صاحب قیصر کے قلم سے

مولینا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ۱۹۱۹ء سے لیکر ۱۹۳۷ء تک کشمیر سے راس بکاری تک ہر صوبہ ہر شہر اور ہر ہستی میں چھٹا اور چلا تا روتا رلاتا ہوتا اور گرجتا برستا رہا۔ شاید ہی کوئی شہر ہو جس کی فضاؤں میں بخاریؒ کی تقریروں کی روحانی ایک پوشیدہ قوت بن کر جاگزیں نہ ہو۔ ہندوستان کے مسلمان بخاریؒ کو بھول جائیں مگر یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں جب کوئی مسلمان کسی پریشانی سے رویا ہے تو عطاء اللہ شاہ کے آنسوؤں نے اس کا ساتھ دیا ہے، جب بھی کسی مظلوم نے اسے آواز دی ہے تو وہ سینہ تان کر اس کی حمایت میں سامنے آ گیا ہے، گجرات، ملتان، دہلی، علی پور (بنگال) لاہور، امرتسر کی جیلیں اس کی یادگار ہیں۔ آج نہ سہی ایک وقت ضرور آئے گا جب آنے والی نسلیں ان جیلوں کو بخاریؒ کی قیام گاہ کی حیثیت سے آثار قدیمہ میں شامل کر دیں گی۔

آج تاج محل مغل آرٹ کا ایک نشان اور ہندوستان کی عظمت کا ایک باوقار نمونہ ہے، وقت مجبور کرے گا کہ امرتسر اور ملتان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے مکانات کو اپنی تاریخ حریت کی یادگار کے طور پر محفوظ کیا جائے

لاہور کے ایک جلسہ میں پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کرنے والے ایک مصنف کے خلاف احتجاج کیا جا رہا تھا۔ لاکھوں مجمع بخاریؒ نے کہا: وہ دیکھو سامنے خد-بجہ الکبریٰ کھڑی شکایت کر رہی ہیں کہ میرے شوہر نادر کی توہین کی گئی اور مسلمانوں میں سے ایک بھی نہ بولا وہ سنو فاطمہ زہراؑ فرماتی ہیں کہ میرے ابا جان کی بے عزتی کی گئی اور ان کی امت نے کچھ نہ کیا تو لاکھوں کے اس مجمع کی چیخیں نکل گئیں اور سینکڑوں مسلمان عورتوں نے اپنے شیر خوار بچوں کو شاہ کے سامنے پھینک دیا کہ ہم اپنے جگر گوشوں کو ناموس رسولؐ پر قربان کرتی ہیں کوئی اور بھی اگر ایسا جاود بیان خطیب ہو تو مجھے بتاؤ۔

آپؒ نے سنا ہوگا کہ ۱۹۲۰ء یا ۱۹۳۲ء میں گاندھی جی نے میرے والد مرحوم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی مگر انہوں نے یہ کہہ کر نال دیا کہ میں گوشہ نشین فقیر لیڈروں سے ملنے کا سلیقہ نہیں رکھتا۔ نظام حیدر آباد نے انہیں گھیر گھاڑ کر اپنے یہاں بلایا۔ کہتے ہیں کہ نظام ترجمہ قرآن کے سلسلے میں ابا جی سے کوئی علمی خدمت لینا چاہتے تھے اور اس کام کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے

لئے تیار تھے۔ مگر اباجی نے کہا کہ میں پیسہ لیکر قرآن کی کوئی خدمت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا آپ اس کام سے مجھے معذور سمجھیں۔ آپ ان افکار و آراء سے اس نتیجے پر پہنچ سکیں گے کہ اباجی جیسے غیر دنیا دار آدمی کا کسی کی دنیا داری سے مرعوب ہونا واقعی مشکل تھا مگر حضرت شاہ صاحب، مولینا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کے سوجان سے دیوانے تھے۔ ہر وقت ان ہی کا حال پوچھتے رہتے تھے۔ کتاب سے فراغت ہوئی، چار پائی پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ سادہ چائے آئی اس کا دور چلا۔ سامنے میرے ماموں جناب حکیم سید محفوظ علی صاحب یا مولینا حفظ الرحمن صاحب، مولینا محمد ادریس صاحب، مولینا عتیق الرحمن صاحب عثمانی ہوئے اور اباجی نے سلسلہ کلام شروع کر دیا۔

”کیوں مولوی صاحب! ہم عطاء اللہ شاہ کو اگر سب کاموں سے ہٹا کر صرف تردید قادیانیت پر لگا دیں تو کیسا رہے گا؟“ مولوی صاحب! یہ صاحب واقعی مخلص ہیں بہت محنتی اور بہت زیادہ بہادر۔ انہوں نے پنجاب میں چند تقریریں کر کے قادیانیت کے خلاف ایک عام جذبہ ناراضگی پیدا کر دیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے اسی طرح محنت سے کام کیا تو قادیانیت ان شاء اللہ ختم ہو جائے گی۔“

جن دنوں انجمن خدام الدین کے جلسہ میں اباجی نے شاہ جی کے ہاتھ پر بیعت کی ان دنوں شاید اخبار ”انقلاب“ لاہور میں ایک نظم نکلی تھی جسے اس زمانہ کے مشہور اخبار ”سیاست“ (لاہور) نے بھی خوب مزے لے لے کر چھاپا تھا، اس کے پہلے چند اشعار میں تو نمک کے محصول کے سلسلہ میں اباجی کے ایک مشہور فتویٰ کا مذاق اڑایا تھا۔ اور اس فتویٰ کا اس زمانہ میں اس وجہ سے بہت چرچا ہو گیا تھا کیونکہ گاندھی جی نے اس فتوے کو سامنے رکھ کر نمک سازی کی اپنی مشہور تحریک شروع کی تھی۔

اس نظم میں اباجی کی بیعت کا ذکر یوں کیا گیا تھا۔

کی ہے اک شاگرد کی استاد نے بیعت قبول
بڑھ گیا ہے مہر سے کس درجہ رتبہ ماہ کا
انقلاب آسمان دیکھو کہ اک ادنیٰ مرید
پیر انور شاہ جیسا ہے عطاء اللہ کا

اور بادی النظر میں یہ بات واقعی حیرت انگیز تھی کہ اباجی، شاہ جی کی بیعت کریں، مگر یہاں ”میاں عاشق و معشوق رمزیت“ کا معاملہ تھا کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا کہ مرشد نے مرید میں کیا جوہر دیکھے اور کیوں اس کے ہاتھ پر بیعت کی، ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ شاہ جی کا نام آیا اور اباجی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی کسی نے شاہ جی کی تعریف کی تو خوش ہو گئے اور کسی نے شاہ جی کو برا کہا تو بگڑ گئے۔

اباجی کو اخبار پڑھنے کی کبھی عادت نہ تھی مگر صرف شاہ جی کی خبریں معلوم کرنے کے لئے اخبار پڑھنے والوں سے جب خیال آ جاتا تو پوچھتے کہ بھائی شاہ جی کی کوئی خبر ہے؟ کہیں تقریر کی ہے یا نہیں؟ کہاں ہیں؟ ادھر دیوبند کی طرف تو آنے کی خبر نہیں؟“

اللہ اللہ محبت و شفقت کا کیا عالم تھا، ایک دفعہ اس طرح مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ کہ آج اخبار میں شاہ جی کی کوئی خبر تھی کہ نہیں؟ میں نے جھنجھلا کر کہا کوئی نہیں؟ فرمایا کہ ”الجمعیۃ بھی دیکھا تھا یا نہیں؟“ میں نے کہا دیکھا تھا۔ اس میں بھی کوئی خبر نہیں تھی، ارشاد ہوا اور زمیندار؟ میں اس کھوکھلے سے تنک آ گیا تھا لپک کر بولا کہ جی اس میں خبر تھی کہ شاہ جی گرفتار ہو گئے؟ میری آنکھوں کے سامنے سالہا سال پہلے کا نقشہ جوں کا توں موجود ہے، اس طرح کہ گویا یہ واقعہ آج ہی ہوا ہے، اباجی چار پائی پر اپنے کھر درے بستر پر لیٹے ہوئے تھے یہ سنتے ہی اٹھ بیٹھے، گھبرا کر پوچھا کہ گرفتار ہو گئے! کہاں گرفتار ہو گئے؟ بھائی کیا معاملہ ہوا ذرا تفصیل سے سناؤ۔ ان کے گھبرا کر اٹھ بیٹھنے اور اس طرح سوالات کرنے سے مجھے احساس ہوا کہ میرا یہ جھوٹ اباجی کے لئے بدرجہ عافیت تکلیف دہ ہوگا۔ یہاں تو محض دفع الوقتی کے لئے جھوٹ بولا تھا۔ مگر اب یہ جھوٹ جان لے کر رہیگا۔ پریشان ہوا کہ آخر کیا کروں اور دل نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ اس شاندار جھوٹ کو واپس لے لینے میں ہی عافیت ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو ویسے ہی مذاق میں کہہ رہا تھا۔ شاہ جی کہیں گرفتار نہیں ہوئے۔ ۱۴ مئی کو دہلی میں جلسہ ہے۔ شاہ جی اس جلسہ کی شرکت کے لئے دہلی آنے والے ہیں۔

بے ساختہ فرمانے لگے کہ نعوذ باللہ جھوٹ کسی ضرورت اور حاجت سے بولا جاتا ہے، آپ کچھ عجیب طرح کے آدمی معلوم ہوتے ہیں، بظاہر یہ جھوٹ بولنے میں آپ کا کوئی نفع نہیں تھا۔ مگر آپ نے بے ساختہ جھوٹ بولا گویا آپ ضرورۃً نہیں بلکہ عادتاً جھوٹ بولتے ہیں حق تعالیٰ آپ کو ہدایت فرمائے آپ کو نیک عمل کی توفیق دے، آپ کا حال تو ہمارے نزدیک بہت افسوسناک ہوتا جا رہا ہے۔

قادیانیت کے سلسلہ میں شاہ جی نے جتنا کام کیا وہ سب اباجی کے اشارہ و ارشاد پر کیا۔ شاہ جی کی تقریریں پسند کی جاتیں تو اباجی کا سیروں خون بڑھتا وہ تردید قادیانیت کے لئے لمبے لمبے دورے کرتے تو اباجی کی نگاہ ان کے ہر قدم پر رہتی۔ ڈابھیل کی مسجد مدرسہ میں اباجی کا معمول تھا کہ جمعہ کو تقریر فرمایا کرتے۔ ایسی تقریر جس میں صرف مغز ہی مغز ہوتا تھا۔ الفاظ بالکل نہیں نہ کوئی ابتداء ہوتی تھی اور نہ انتہا تقریر ختم کر چکے۔ مجمع اٹھ گیا، خود منبر سے اتر آئے مگر کوئی بات پھر ذہن میں آگئی تو دوبارہ پھر منبر پر جا بیٹھتے اور تقریر شروع فرمادی۔ ایک دفعہ خطبہ مسنونہ کے بعد صرف یہی مضمون بیان ہوا کہ پنجاب میں ایک صاحب ہمیں مل گئے ہیں۔ صاحب توفیق، صاحب

صلاحیت، صاحب سواد، خوب کام کرتے ہیں، مولویوں کی طرح نہ خواہش زر میں جتنا ہیں اور نہ خواہش شہرت میں بس بے چارہ محض اللہ کے لئے کام کئے جاتے ہیں ہم نے قادیانیت کے متعلق انہیں توجہ دلائی کہ یہ فتنہ عظیم اسلام کو جز سمیت اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ کر بیٹھا ہے۔ آپ کیوں نہ اس فتنہ کے خلاف کچھ کام کر گزریں آپ کا وہ کام دین میں آپ کے لئے نفع رساں ہوگا اور دنیا میں اس سے اہل دین کو فائدہ پہنچے گا۔ یہ کہہ کر پھر شاہ جی کا نام لیا فرمایا کہ بڑوں بڑوں سے جو کام نہ ہوا، وہ اس غریب نے کر دکھایا۔ (طلباء کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) ”آپ تو مدرسہ کی روٹیاں کھا کر ہر وقت بحث و مباحثہ میں لگے رہتے ہیں دین کی کوئی محبت آپ حضرات کے دل میں نہیں، عطاء اللہ شاہ اگر یہاں آگئے تو آپ ان سے ملے وہ عجیب آدمی ہیں۔

میرے خیال میں اباجی کے ان ہی الفاظ کو سامنے رکھ کر حفیظ جالندھری نے ایک دفعہ کہا تھا کہ دور اول کے مجاہدین اسلام کے گرد وہ سے ایک سپاہی راستہ بھول کر اس زمانہ میں آگلا ہے۔ وہی سادگی مشقت پسندی، یکسر علم، اخلاص اور للہیت جو ان میں تھی وہ عطاء اللہ شاہ میں بھی ہے۔ بہر حال جن بزرگوں کے یہ قصے ہیں وہ بزرگ اب مدت ہوئی نظروں سے ایک جلوہ بے قرار کی طرح اوجھل ہو گئے وہ بزرگ اپنے اپنے وقت پر علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے مگر آج تو خاک مزار کے سوا ان کا کوئی نشان نہیں ملتا، پہلے کبھی اباجی کی مجلس میں حقائق دین کی گریں کھلتیں اور فکر و نظر کے لئے نئے سانچے تیار ہوتے تھے جن پر ان کی نظر پڑ جاتی تھی وہی کام کا آدمی بن جاتا تھا جو قدموں میں آکر بیٹھتا تھا وہی کچھ لے کر جاتا تھا مگر آج ان کے مزار پر خاموشی اور سکون کے سوا اور کیا ہے۔

۷۳ سال کی عمر پوری کر کے عطاء اللہ شاہ صاحب نے ۲۱ اگست کی شام کو جان جان آفرین کے سپرد کی۔ اور ۲۲ کو بعد ظہر تقریر و خطابت کے اس بادشاہ کو منوشی کے نیچے دبا دیا گیا، شاہ کی موت پر ایک تاریخ ختم ہو گئی ایک عہد گزر گیا ایک دور پورا ہو گیا، ایک چمن اجڑ گیا ایک بہار لٹ گئی، تقریر و خطابت کی رونق ختم ہو گئی جرأت و شجاعت کا شیرازہ بکھر گیا اور خلوص و دیانت پر افسردگی چھا گئی اب نہ کبھی شاہ صاحب نظر آئیں گے، نہ ان کی تقریریں سننے کا موقع ملے گا، لیکن جب بادل گرے گا، بجلی چمکے گی، موسلا دھار بارش ہوگی، طوفان اور سیلاب آئیں گے جب کبھی صبح ہوگی اور جب کبھی شام آئے گی۔ جب کبھی پھول کھلیں گے اور کلیاں مسکرائیں گی۔ جب کبھی باد صبا پھولوں اور کلیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی چمن سے گزرے گی۔ جب کبھی کوئی قرآن پڑھے گا اور جب کوئی رات کی آخری اور حتمی ساعتوں میں لاکھوں اور ہزاروں کے مجمع کے سامنے تقریر

کرے گا، جب کوئی جرم حق گوئی کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتوں سے گزرے گا، جب کوئی مرد حق اللہ اور اس کے رسول کی عظمت کے لئے اپنے جسم و جان کا نذرانہ وقت کے کسی ظالم اور قاہر کے سامنے پیش کرے گا مجھے اس وقت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ضرور یاد آئیں گے کہ ان سب چیزوں میں مجھے عطاء اللہ شاہ بخاری کی شہادت ملے گی۔ عطاء اللہ شاہ کی کچھ ادھوری سی نقل سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ۳۷ سالہ مجاہدانہ زندگی اسکے خلوص و دیانت اس کی تقریر و شعلہ بیانی، اس کی حسین جوانی اس کے پروقار بڑھاپے کو اس کے لاکھوں عقیدت مندوں کی طرف سے ہزاروں سلام۔

رحمة الله رحمة واسعة وغفر له الله مغفرة كاملة

☆☆☆☆☆☆

حضرت شاہ صاحب اور علامہ علی حنبلی مصری

(مرتبہ کوندو)

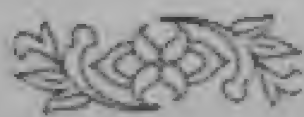
علامہ محدث علی حنبلی مصری جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے مشہور حافظ تھے، مصر سے سورت و راندیر آئے اور وہاں سے دہلی مولوی عبدالوہاب صاحب مشہور اہل حدیث عالم کے پاس پہنچے، اوقات نماز کے متعلق ان سے مناظرہ ہو گیا اور مولوی عبدالوہاب صاحب نے طیش میں آکر ان کو اپنے یہاں سے نکلوا دیا۔ راندیر میں حضرت مولینا مفتی سید مہدی حسن صاحب نے محدث مصری کو مشورہ دیا تھا کہ آپ دیوبند کا دارالعلوم بھی ضرور دیکھیں۔ دہلی میں بھی کچھ لوگوں نے دیوبند کا مشورہ دیا مگر مایوس و پریشان تھے۔ کہنے لگے جب اہل حدیث نے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیا حالانکہ ان کا مذہب حنبلیہ سے قریب تر ہے، تو احناف کا مرکز ہے، وہاں خدا جانے کیا سلوک ہوگا، مگر لوگوں نے اطمینان دلایا۔ چنانچہ فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو لیکن دیوبند جانا ہی پڑے گا۔ قبل ظہر دیوبند پہنچے۔ ظہر کی نماز دارالعلوم کی مسجد میں پڑھی۔ حضرت مولینا حبیب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم مہمانوں کا بہت تفقہ کیا کرتے تھے اور نمازوں میں بھی دیکھا کرتے تھے کہ کوئی نیا آدمی باہر کا مدرسہ کا مہمان ہو تو اس کے حسب حال قیام و طعام وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے علامہ علی کو نووارد دیکھ کر ان کا بھی خیر مقدم کیا، مہمان خانہ میں ٹھہرایا خاطر مدارات کی اور عرب طلبہ کو جو اس وقت دارالعلوم میں پڑھتے تھے بلوا کر علامہ سے ملوایا تا کہ زیادہ مانوس و منبسط ہو جائیں۔ علامہ پر ان چیزوں کا بڑا اثر ہوا۔ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ علمائے دیوبند تو بڑے مہمان نواز اور کریم النفس ہیں، یہ لوگ صحابہ کرام کے قدم بقدم چلنے والے اور قبیح سنت معلوم ہوتے ہیں۔ مولوی محمد یحییٰ عینی (مستعلم دارالعلوم) نے کہا کہ یہ لوگ علوم

دفنوں میں بھی فائق الاقران ہیں۔ علامہ نے کہا یہ بات تو میں ماننے کو تیار نہیں کیونکہ ”ہم اعجم“ یعنی یہ بے چارے تو عجیب ہیں۔ عصر کی نماز کے بعد چند عرب طلبہ علامہ موصوف کو مزارات اکابر کی طرف لے گئے۔ ایک صاحب نے علامہ کو القاسم کا وہ نمبر دیا جس میں حضرت شاہ صاحب کا عربی قصیدہ (مرثیہ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہ) شائع ہوا تھا۔ علامہ نے چالیس آیات کا فصیح و بلیغ مرثیہ مذکورہ پڑھ کر فوراً کہا کہ ”انسی تبست من اعتقادی“ یعنی میں نے اپنے خیال سے رجوع کر لیا، اس قصیدہ سے زمانہ قبل از اسلام کے شعراء کی فصاحت و بلاغت مبک رہی ہے۔ نہایت بلیغ کلام ہے اور جس صاحب کا یہ کلام ہے میں اس عالم کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب سے سرسری ملاقات ہوئی اور اگلے دن صبح کے وقت محدث مصری نے حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کا درس صحیح مسلم سنا اور اثناء درس میں کچھ اعتراضات کئے۔ حضرت مولینا عثمانی نے مہمان کی رعایت سے پورا درس عربی میں دیا۔ اور علامہ مصری کے جوابات بھی عربی میں دیتے رہے۔ علامہ متاثر ہوئے اور مولوی محمد یحییٰ یمنی سے فرمایا کہ یہ شخص بہت بڑا عالم دین ہے۔ اگرچہ بعض مسائل میں میری تسلی نہ ہو سکی۔ اس کے بعد بخاری شریف کے درس میں پہنچے۔ حضرت شاہ صاحب نے بھی پورا درس آپ کی رعایت سے عربی میں دیا۔ علامہ وہاں بھی اثناء درس میں سوالات کرتے اور شاہ صاحب جوابات دیتے رہے۔ درس کے بعد علامہ نے کہا کہ میں نے عرب ممالک کا سفر کیا اور علماء زمانہ سے ملا خود بھی میں نے مصر میں کئی سال حدیث کا درس دیا، ہر جگہ کے علماء سے حدیثی مباحث کئے ہیں مگر میں نے اب تک اس شان کا کوئی محدث عالم نہیں دیکھا، میں نے ان کو ہر طرح بند کرنے کی سعی کی لیکن ان کے استحضار علوم، حقیقت، حفظ و اتقان، ذکاوت اور وسعت نظر سے حیران رہ گیا۔ (مولینا حکیم اعظم علی صاحب بجنوری مرحوم نے یہ اضافہ بھی کیا کہ علامہ نے یہ بھی فرمایا: ”میں نے شاہ صاحب کے علاوہ اس درجہ کا کوئی عالم نہیں دیکھا جو امام بخاری حافظ ابن حجر، علامہ ابن تیمیہ، ابن حزم اور شوکانی وغیرہم کے نظروں پر تنقیدی نظیر محاکمہ کر سکتا ہو اور ان حضرات کی جلالت قدر کا پورا لحاظ رکھ کر بحث و تحقیق کا حق ادا کر سکے۔

علامہ نے دارالعلوم میں تین ہفتے قیام کیا اور حضرت شاہ صاحب سے برابر استفادہ کرتے رہے اور سند حدیث بھی حضرت سے حاصل کی۔ علامہ علیؒ یہاں تک کہنے لگے۔ لو حلفت انہ اعلم من ابی حنیفۃ لما حنشت۔ اگر میں قسم کھا لیتا کہ شاہ صاحب ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ علم رکھتے ہیں تو میں احانث نہ ہوتا۔ حضرت شاہ صاحب کو پتہ چلا تو سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا ہمیں امام کے مدراک اجتہاد تک قطعاً رسائی نہیں ہے۔

دیوبند سے علامہ کے واپس مصر ہونے پر درگاہ نودرہ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا، حضرت شاہ صاحبؒ نے عربی میں تقریر فرمائی۔ علامہ نے بھی جوابی تقریر فرمائی، حضرات دیوبند کے مکارم اخلاق، مہمان نوازی، تقویٰ و طہارت، بالخصوص علوم نبویؐ کی اشاعت و خدمت پر اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا اور کہا کہ اگر میں دارالعلوم دیوبند میں حاضر نہ ہوتا ان فیوض و برکات سے محروم جاتا جو مجھے یہاں حاضری پر نصیب ہوئے فرمایا، میں چونکہ حنبلی مذہب سے تعلق رکھتا ہوں اور حدیث لا تشد والرحال الا الی ثلاث مساجد (نماز کی فضیلت کے حصول کے لئے تین مساجد کے علاوہ سفر نہ کرو) کے پیش نظر مجھے خوف تھا کہ اگر قیامت میں سوال ہوا کہ تم نے یہ سفر کیوں کیا تو میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن اب بفضلہ تعالیٰ امید قوی ہے کہ یہ میرا سفر عبادت میں گنا جائے گا کہ میں نے ایسی مقدس درگاہ کی زیارت کی اور مولینا محمد انور شاہ جیسے محدث اور بزرگان دین کے علوم سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل کیا۔ واپسی پر راندیر میں مولینا مہدی حسن صاحب سے پھر ملاقات ہوئی۔ دیوبند کے تمام واقعات و حالات سنائے۔ فرمانے لگے کہ مجھے حیرت ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اتنے بڑے عالم اور امام وقت ہو کر بھی امام ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں مفتی صاحب نے فرمایا کہ اس سے ہی آپ امام صاحبؒ کے علوم کا اندازہ کریں۔

مصر پہنچ کر علامہ نے وہاں کے رسائل میں اپنا سفر نامہ شائع کیا اور علماء دیوبند کے کمالات علمی و عملی پر بھی ایک طویل مقالہ لکھا۔



حضرت شاہ صاحب اور مولینا آزاد

(مرتبہ گویندو)

۱۹۱۸ء کے بعد جب کہ شیخ الہند حضرت مولینا محمود الحسنؒ ابھی مالہ میں نظر بند تھے اور مولینا آزاد علی برادران اور دیگر مجاہدین حریت ہندوستان کے جیل خانوں میں اسارت کے دن گزار رہے تھے۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں پنجاب میں امرتسر کے جلسہ نوالہ باغ کے قتل عام اور لاہور کے مارشل لاء وغیرہ کے واقعات نے ملک بھر میں زلزلہ ڈالکر ہر حساس دل کو سر بکف ہو جانے پر اکسایا جس سے کانگریس میں نئی جان پڑی اور اس کی اعانت کے لئے مجلس خلافت اور جمعیت العلماء ہند جیسی تنظیمیں معرض وجود میں آئیں جنہوں نے مسلمانان ہند خاصکر مسلمانوں کے علماء کو جدوجہد آزادی کی صف اول میں لاکھڑا کیا۔ مجلس خلافت سے بھی زیادہ جس تنظیم نے ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے ذہین ترین عنصر کو ایک دوسرے سے متعارف و معاون کرانے میں موثر حصہ ادا کیا وہ جمعیت العلماء ہند کا پلیٹ فارم تھا۔ اس تنظیم کے پہلے صدر مولینا عبدالباری فرنگی محلی تھے۔ اس کا دوسرا اجلاس جولاءِ لاہور میں منعقد ہوا اس کی صدارت مولینا ابوالکلام آزاد نے کی اسی طرح جمعیت کا ایک اور اجلاس کلکتہ میں ہوا اور اس کی صدارت مولینا سید سلیمان ندویؒ نے کی اور تمام حریت نواز علماء کی طرح حضرت مولینا انور شاہ صاحب کشمیری بھی جمعیت العلماء ہند کی صف اول کے رہنما تھے۔ اور جمعیت العلماء جو اپنے طریق کار کو کتاب اللہ اور سنت رسول کے منہاج کے مطابق رکھنے کی مدعی تھی اس کو قدم قدم پر حضرت شاہ صاحب کے فیوض سے استفادہ کرنا پڑتا تھا۔ اور ۱۹۲۷ء میں تو جمعیت العلماء کے پشاور والے اجلاس میں جب آزادی کاٹل اور انگریزی راج کے خاتمہ کو جمعیت نے اپنا نصب العین قرار دیا تو اس وقت جمعیت کے سالانہ اجلاس کے صدر حضرت شاہ صاحب ہی تھے۔ اور اس اجلاس میں حضرت شاہ صاحب نے وہ تاریخی خطبہ صدارت ارشاد فرمایا جو جمعیت العلماء کے خطبات میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کی تازگی آج بھی مفکرین و مدبرین سے خراج تحسین وصول کرتی ہے۔

یہ تمہیدی کلمات عرض کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب اور مولینا آزاد جمعیت العلماء ہند جیسی عظیم الشان تنظیم کے ساتھ اس کے ابتدائی دور سے وابستہ چلے آتے تھے اور اس دور ۱۹۰۱ء میں معلوم آپ علمی رموز و دقائق کی کن کن گتھیا کو بھی سلجھاتے ہوں گے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق مولینا آزاد مرحوم کیا رائے رکھتے تھے اور آپ کی بے پناہ علمی صلاحیتوں کے کس قدر معترف اور قدردان تھے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ کلکتہ میں مولینا آزاد نے جو دینی مدرسہ قائم کیا تھا اس میں اونچے علوم کے شائقین کا جب ہجوم ہو گیا تو درس حدیث دینے کے لئے مولینا آزاد حضرت شاہ صاحب کو بلانے پر مصر ہوئے۔ چنانچہ آپ نے براہ راست حضرت شیخ الہندؒ سے یہ مطالبہ کیا کہ کلکتہ کے مدرسہ کے لئے مولینا انور شاہؒ کی خدمات عطا کی جائیں، مگر مولینا آزاد اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ اس کی وضاحت حضرت مولینا مدنی کی کتاب ”نقش حیات“ کے حسب ذیل اقتباس سے ہو جاتی ہے:

”حضرت (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ کے قیام دہلی کے زمانہ میں مولینا عبداللہ مصری جو کہ دراصل الہ آباد کے باشندے ہیں، اور مصر میں عرصہ تک ایام طالب علمی میں اقامت کرنے کی وجہ سے مصری مشہور ہو گئے ہیں۔ جناب مولینا ابوالکلام صاحب کے بھیجے ہوئے کلکتہ سے تشریف لائے اور مولینا موصوف کا خط لائے جس میں یہ مطالبہ تھا کہ چونکہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے طلباء نے ترک موالات کی تحریک پر مدرسہ عالیہ سے علیحدگی کر لی ہے اور چاہتے ہیں کہ کلکتہ میں ایک آزاد اور نیشنل مدرسہ عالیہ قائم کر دیا جائے۔ خلافت کمیٹی کے اراکین اس کی سرپرستی کریں اس لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا مدرسہ جو کہ علم حدیث کی کتابیں پڑھا سکے جلد بھیج دیا جائے تاکہ وہ اوپر کے طلبہ کو پڑھا سکے اور مشہور و معروف ہو، خلافت کمیٹی اس کی کفالت کرے گی، ضرورت ہے کہ مولینا انور شاہ صاحب کو یہاں بھیج دیجئے، حضرت نے کہا کہ شاہ صاحب (مرحوم) تو دارالعلوم دیوبند چھوڑ نہیں سکتے مگر ہم دوسرا شخص دیں گے جو کہ تمام کتب حدیث کی تعلیم دے سکتا ہو اور اس کو تجربہ اور شہرت حاصل ہو۔ الخ“ ①

مرد مجاہد مولینا مدنی مرحوم کے متذکرہ صدر بیان سے بیک وقت دواہم باتوں کا انکشاف ہوا ہے ایک یہ کہ مولینا آزاد مدرسہ عالیہ کلکتہ ② کے لئے حضرت شاہ صاحب کو سب پر ترجیح دیتے تھے۔ لہذا اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولینا آزاد حضرت شاہ صاحب کی علمی صلاحیتوں کے معترف اور جوہروں کے شناسا تھے۔

دوم اس سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۱۵ء میں سفر حجاز پر روانہ ہونے کے وقت جس طرح حضرت شاہ صاحب کو اپنی جانشینی کے لئے منتخب کیا تھا ۱۹۲۰ء میں اپنی وفات سے قبل بھی اسی طرح اپنی جانشینی کے قابل صرف آپ ہی کی ذات کو یقین کرتے تھے۔ اسی

①..... ملاحظہ ہو نقش حیات جلد دوم ۱۶۱، ۱۶۲۔ ②..... یہ مدرسہ کلکتہ کی قاضی مسجد میں قائم ہو گیا تھا۔ اور مولینا عبدالرزاق بیچ آبادی اس کے ناظم بنائے گئے تھے۔

لئے تو حضرت ممدوح نے فرمایا کہ "شاہ صاحب تو دارالعلوم دیوبند چھوڑ نہیں سکتے۔" اللہ اللہ! ایک طرف امام الہند حضرت مولینا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کا مطالبہ اور دوسری طرف حضرت شیخ الہند مولینا محمود الحسن قدس اللہ سرہ کا انتخاب جانشینی۔ سچ ہے۔

"انما یعرف ذا الفضل من الناس ذو وہ"

مولینا آزاد کو حضرت شاہ صاحب سے جو تعلق ابتداء میں علمی قدر دانی کی شکل میں تھا وہ روز بروز بڑھتا گیا اور شاہ صاحب کی زندگی کے آخری ایام میں اس تعلق نے ایک قسم کی عقیدت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ ایسے اکابر علماء اور دونوں بزرگوں کے عقیدہ تمند اور مرتبہ دان دہلی میں کل تک زندہ تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے کہ آخری زمانہ میں ایک بار حضرت شاہ صاحب مدرسہ امینیہ دہلی میں مولینا مفتی کفایت اللہ صاحب کے مہمان کے طور پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مولینا آزاد شوق ملاقات میں وارد مدرسہ ہوتے ہیں اور بے تکلف آپ کے سامنے مودبانہ دو زانو ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحب اس ہیئت کدائی کو کب گوارا کرتے؟ تاہم اس واقعہ سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مولینا آزاد کی حقیقت بین نگاہوں نے حضرت شاہ صاحب کی علمی عبقریت ہی نہیں بلکہ آپ کی روحانیت فضیلت کا بھی پورا پورا اندازہ کر لیا تھا اور اپنے غیر معمولی طرز عمل سے اس کا اعتراف کر رہے تھے۔

مولینا سید احمد صاحب بجنوری کے بیان کے مطابق آخری دور میں حضرت شاہ صاحب جب کبھی دیوبند سے ڈابھیل اور ڈابھیل سے دیوبند آتے جاتے تو آپ کا معمول تھا کہ دہلی میں اپنے اور لین رفیق ارخولجہ تاش مولینا کفایت اللہ صاحب سے مدرسہ امینیہ دہلی (کشمیری گیٹ) میں ملاقات کرتے اور ان مواقع پر مولینا کفایت اللہ صاحب مولینا آزاد کو بھی آگاہ کر دیتے تھے اور مولینا یک دم امینیہ چلے آتے اور حضرت شاہ صاحب سے ملتے اور اس صحبت پر ملاء اعلیٰ کے فرشتے بھی رشک کرتے۔ حضرت شاہ صاحب کا مطالعہ چونکہ بہت وسیع تھا، لہذا مولینا آزاد ان سے نواہر کے حوالے بھی پوچھتے تھے ①۔

اور چونکہ امام الہند مولینا ابوالکلام آزاد اپنی تحریرات میں متعدد بار یہ شعر نقل کرتے آئے ہیں کہ

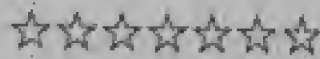
ہیچکے ذوق طلب از جستجو بازم نداشت

دانہ می چیدم دران روزے کہ خرمن داشت

جب حضرت موصوف کا یہ حال تھا کہ بے پناہ علم و فضل کے مالک ہوتے ہوئے بھی اپنے سے

کمتر درجے کے علماء سے بھی استفادہ کرنے کی جستجو میں رہتے تھے تو حضرت شاہ صاحب جیسے بحر بیکراں سے مولینا آزاد جیسے فانی العلم کا استفادہ کرنا کوئی ناممکن امر نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگرد رشید مولینا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی مدظلہ العالی نے دونوں بزرگوں کے تعلقات پر یہ کہہ کر روشنی ڈالی ہے کہ مولینا ابوالکلام آزاد حضرت شاہ صاحبؒ کی وسعت علم اور خداقت فن حدیث کے پوری طرح معترف و مقرر تھے۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ حال تھا کہ جب مولینا آزادی کی تفسیر قرآن (ترجمان القرآن) شائع ہوئی تو حضرت شاہ صاحبؒ نے بحیثیت مجموعی ان کے اس علمی کارنامہ کی تعریف کی۔



حضرت شاہ صاحبؒ اور مولینا مدنیؒ

(مرتبہ کونندو)

شیخ الاسلام حضرت مولینا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت شاہ صاحبؒ کے ظاہری و باطنی کمالات تبحر علمی، بے نظیر قوت حافظہ اور روحانی بلند مدارج کے ہمیشہ معترف رہے۔ مولینا مدنیؒ کی آثار باقیہ خود نوشت سوانح عمری یعنی ”نقش حیات“ اور آپ کے مکتوبات میں ان اعترافات کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔ بطور مشتمل نمونہ از خردوارے ہم اس سلسلے میں ان دو کتابوں اور دیگر مآخذ سے موصوف کے ان جذبات کو ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جو شاہ صاحبؒ کے متعلق آپ کے قلب میں موجزن تھے۔

(۱)..... حضرت شاہ صاحبؒ کی رحلت پر جلسہ تعزیت میں تقریر کرتے ہوئے مولینا مدنیؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

”میں نے ہندوستان، حجاز، عراق اور شام وغیرہ ممالک اسلامیہ کے علماء و فضلاء سے ملاقات کی اور مسائل علمیہ میں ان سے گفتگو کی لیکن تبحر علمی و وسعت معلومات اور علوم نقلیہ (یعنی قرآن پاک اور حدیث رسول اکرمؐ) اور علوم عقلیہ (یعنی فلسفہ، تاریخ اور ہیئت وغیرہ) کے احاطہ میں شاہ صاحبؒ کا کوئی نظیر نہیں پایا“ ۱۔

مولینا محمد انوری لاکھپوری مرحوم کے بیان کے مطابق حضرت مولینا مدنیؒ نے یہ بھی فرمایا کہ:-

”میں ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو ایک لاکھ حدیثیں یاد ہیں اور ایسے

حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو صحیحین حفظ یاد ہیں لیکن ایسا عالم دین کہ کتب خانہ کا سب خانہ ہی جس کے سینے میں محفوظ ہو، سوائے حضرت مولانا نور شاہ کے میں نے کوئی بھی نہیں دیکھا۔^①

(۲) جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی (مرحوم) نے اپنے مکتوبات کی اشاعت کی مجبوریاں واضح کرتے ہوئے مولینامدنی رقمطراز ہیں کہ:-

”آپ کو معلوم ہے کہ مجھ میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حافظہ اور تبحر نہیں۔ نہ حضرت عبید اللہ صاحب مرحوم اور مولانا کفایت اللہ صاحب مرحوم کی ذکاوت ہے۔ نہ مولانا شبیر احمد صاحب کی حسن تحریر و تقریر اور عاملیت ہے۔ نہ ان حضرات کا تبحر اور وسعت علمی ہے، پھر ان حضرات کے مکتوبات کا شائع نہ ہونا اور میرے مکتوبات کی اشاعت کس قدر بے شرمی اور انانیت کی بات ہے۔“^②

(۳) ایک اور موقع پر مولینا سید حسین احمد مدنی تحریر فرماتے ہیں کہ:

”امارت کے لئے بہت سے اہل اور لائق اشخاص موجود ہیں مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا نور شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب (عثمانی) وغیرہ میں ان حضرات کے دست مبارک پر بیعت امارت کرنے کے لئے تیار ہوں۔“^③

حضرت شاہ صاحب اور مولینامدنی رحمہما اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ عرض کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ یہ دونوں صاحب بیک وقت دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے۔ لیکن شاہ صاحب جس طرح عمر میں مولینامدنی سے دو تین سال بڑے تھے اسی طرح مدارج تعلیم میں بھی آگے تھے، دورہ حدیث سے شاہ صاحب نے ۱۳۱۴ء میں اور مولینامدنی نے ۱۳۱۵ء میں فراغت حاصل کی۔

بہر کیف دونوں صاحبوں کو حضرت شیخ الہند سے شرف تلمذ حاصل تھا اور دونوں کی ذات سے حضرت موصوف علیہ الرحمۃ کو اونچی امیدیں وابستہ تھیں۔ چنانچہ ۱۳۱۵ء میں سفر حجاز کے وقت آپ نے اگر شاہ صاحب کو دارالعلوم دیوبند کی صدارت کے مسند کا مشکل مقام سپرد کیا تو مولینامدنی کو انتظام و آرائش کے اس سفر میں مالٹا تک اپنا شریک کار بنایا۔

ان دونوں عظیم الشان ہستیوں کے طرز تدبیر کے متعلق جو تجزیہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ نے رقم فرمایا ہے اس موضوع پر حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے۔

① ماہنامہ ”دارالعلوم“ دیوبند جولائی ۱۹۶۴ء۔ ② مکتوبات شیخ الاسلام (از مولانا غلام الدین صاحب اصلاقی)

جلد ۲۴۲ مکتوب ۸۵۔ ③ ایضاً جلد اول ۱۲۶۔

آپ فرماتے ہیں کہ:

”حضرت شاہ صاحب کا انداز درس حدیث حافظانہ، داعیانہ محدثانہ اور تبصرانہ تھا جبکہ مولینا مدنی کے درس کا انداز عالمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہدانہ اسپرٹ ہے بھرپور اور جذبات عمل سے زیادہ سے زیادہ لبریز ہوتا تھا“ ①۔

ان اکابر حضرات کے متعلق مولینا ازہر شاہ صاحب کے یہ جملے بھی قابل ملاحظہ ہیں۔
 ”مولینا عبید اللہ سندھی اپنے استاد (حضرت شیخ الہند) کے سیاسی کاموں کے راز دار ٹھہرے، مولینا انور شاہ کاشمیری کو استاذ نے اپنے علمی منصب پر دارالعلوم میں فائز کیا، مولینا شبیر احمد عثمانی حضرت شیخ الہند کی زبان تھے، مولینا حسین احمد مدنی ان کے دست و بازو اور مولینا آزاد کا قلم ان کا قلم تھا۔“ ②

ہر گلے راز رنگ و بوئے دیگر است

☆☆☆☆☆

حضرت شاہ صاحب اور مولینا عبید اللہ سندھی

از کونندہ

حضرت شیخ الہند مولینا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ پہلی عالمگیر جنگ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے زمانہ میں اس تمنا سے بے تاب ہو رہے تھے کہ انجام کار یہ ہنگامہ کوئی ایسی شکل اختیار کر جائے جس کے نتیجہ میں ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک انگریزی امپریل ازم سے نجات حاصل کر لیں اور ہندوستان کی چھینی ہوئی آزادی و خود مختاری ایک بار پھر واپس مل جائے۔ ۱۹۱۴ء سے ہی آپ نے ارادہ کیا کہ آپ عالمگیر جنگ کے نتائج سے آزادی ہند کا مقصد حاصل کرنے کی کوئی سہیل نکالیں۔ اس سلسلہ میں چونکہ انگریزوں کے خلاف شریک جنگ طاقتوں خاص کر ترکی اور جرمنی سے رابطہ پیدا کرنا ضروری تھا جس کے ذرائع مفقود تھے۔ اس لئے آپ کی نظر کابل کی طرف اٹھنے لگی اور آپ کے ذہن میں یہ تجویز پرورش پانے لگی کہ اگر ایک طرف افغانستان کو انگریزوں کے خلاف لڑنے پر آمادہ کر لیا جائے اور دوسری طرف صوبہ سرحد کے آزاد قبائل علاقوں میں حضرت سید احمد شہید کی تحریک کے بچے ہوئے مجاہدین کے ذریعہ صوبہ سرحد کے عوام اور نیم آزاد جنگجو قبائل

①..... مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول ۵ (مقدمہ از حکیم الاسلام مولینا طیب صاحب)۔ ②..... ”یادگار زمانہ“ میں یہ لوگ ۲۰۰۔

کو آمادہ جہاد کر لیا جائے تو شاید جس وقت انگریز پر اتحادیوں کا دباؤ بڑھ رہا ہو اس وقت ہندوستان کے شمال مغرب کی طرف سے ایک اچھا سا بھرپور حملہ ہندوستان کو برطانوی امپریل ازم کے پنجے سے چھڑالینے میں کارگر ثابت ہو سکے گا۔

حصول آزادی کا یہی منصوبہ تھا جس کو بروئے کار لانے کے لئے حضرت شیخ الہند نے مولینا عبید اللہ سندھی کو کابل، مولینا منصور انصاری کو قبائلی علاقوں میں بھیجا اور خود ترکی حکومت سے براہ راست تعلقات پیدا کرنے کے لئے حرمین و حجاز کا سفر کیا اور دارالعلوم کی تعلیمات کی صدارت کا کام جو آپ کا اولین اور دوامی فریضہ تھا اس کے لئے اس موقع پر آپ کی نظر انتخاب اپنے تلمیذ خاص اور محرم اسرار مولانا محمد انور شاہ کشمیری پر پڑی جن کو آپ اپنے علوم اور فیضان کا خازن بنا چکے تھے اور جو آپ کی تدریسی خصوصیات کو فانی الشیخ کی حد تک اپنے سینے میں سمیٹ چکے تھے۔

اس پس منظر کو بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ مولینا عبید اللہ سندھی اور حضرت شاہ صاحب حضرت شیخ الہند کے فیض یافتہ علماء میں سے نہایت ممتاز اور غیر معمولی دل و دماغ سمجھنے والی دو شخصیتیں تھیں اور دونوں کے فطری رجحانات کو دیکھتے ہوئے مشفق استاد نے دونوں کو دو مختلف کاموں کی انجام دہی کے لئے ترتیب دے کر تیار کیا تھا۔ جہاں مولینا سندھی کے انقلابی ذوق و شوق کو دیکھ کر انہیں سیاسی انقلاب کے میدان کا شہسوار بنادیا تھا وہاں شاہ صاحب کے مخصوص رجحانات کو پیش نظر رکھ کر انہیں تدریسی و تعلیمی مرشد و مربی بننے کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ دہلی کے امینہ اور بارہمولہ کے فیض عام کے تجربوں کے بعد دارالعلوم دیوبند میں اونچے درجہ کے مدرسین میں شامل کر کے ان کی بے نظیر قابلیتوں کو جانچ لیا تھا اور دارالعلوم میں اب اپنی جانشینی کے قابل بنانے کے لئے ان میں علم و عمل کے شعلے اس حد تک فروزاں کر دیئے تھے کہ جب استاد نے اس شاگرد کو نازک وقت میں اپنی مسند حوالہ کر دی تو کسی کو اس پر حیرت نہ ہوئی۔ اس طرح حضرت شاہ صاحب اور مولینا سندھی اگرچہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں تھے۔ مگر اپنے مربی کی اسکیم کے مطابق اپنے پھول اور پھل کے لحاظ سے دو مختلف قسم کی ہستیاں بن کر تیار ہو گئے تھے۔ چونکہ دونوں بے حد ذہین تھے۔ اس لئے طالب علمی کے زمانہ میں بھی اور فراغت کے بعد بھی دونوں کے درمیان ذہنی قرب تھا۔ اپنی ملکوئی فطرت کی وجہ سے دنیا سے بے نیازی اور بلند مقاصد کے لئے ہمہ تن فدایت و محویت دونوں کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سے بکھڑا فر نصیب ہوئی تھی۔ متاثر زندگی سے آزاد رہ کر مقاصد عالیہ کے لئے ہمہ تن وقف ہو جانا بھی ایک ایسا مشترک وصف تھا جو دونوں نے اپنا رکھا تھا (مولینا سندھی تو آخر عمر تک بے خانگی اور تجرد پر کاربند رہے البتہ حضرت شاہ

صاحب آگے چل کر اپنے اساتذہ اور بزرگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر تجرد سے اس وقت دستبردار ہوئے جب آپ کی عمر قریباً ۴۴ سال کو پہنچ چکی تھی۔

یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ان دو فاضل ہستیوں کے درمیان اونچے درجہ کے مسائل کبھی کبھی زیر بحث آجائیں اور کہیں کہیں رائے کا اختلاف بھی ہو جائے اور ایسا ہو ہی جایا کرتا تھا۔ خاص کر مابعد الطبیعات کی دنیا کے مسائل کی فلسفیانہ موشگافیوں میں کبھی دونوں کے درمیان بحث و تکرار کا سلسلہ ہوتا تھا۔ آخر ایسے دو بڑے عبقری عالموں سے یہ توقع کون رکھ سکتا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر ہر کتے میں ایک دوسرے سے متفق رہیں گے بتایا جاتا ہے کہ دونوں کے درمیان ہجو قسم کی علمی مباحثات کے دوران کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ کشمکش ہو جاتی تھی جو بحث و مباحثہ میں ایک فطری بات ہے مگر مخلصین بحث کے بعد ہمیشہ اس قسم کی تیزی کے لئے ایک دوسرے سے معافی خواہ ہو جایا کرتے ہیں۔ لیکن جب ۱۹۱۵ء میں مولینا سندھی ناگاہ کا بل چلے گئے تو اغلباً جاتے وقت آپ شاہ صاحب سے مل بھی نہ پائے اور شاہ صاحب کو یہ خیال ستانے لگا کہ اگر اس طویل جدائی کے وقت باہمی درشت کلامی کی ایک دوسرے سے معافی مانگ لی ہوتی جو بحث و مباحثہ کے دوران سرزد ہو جایا کرتی تھی تو یہ امر متقین کے شیوہ کریمانہ کے مطابق رہتا۔ برسوں تک یہ احساس حضرت شاہ صاحب کے قلب نازک کے لئے بے چینی کا موجب رہا۔ اس مدت میں مولینا سندھی کا بل سے واپس آجانے کے بدلے اور بھی آگے دور تک بڑھتے ہی چلے گئے۔ کبھی ماسکو اور لینن گراڈ میں، کبھی برلن میں اور کبھی قسطنطنیہ اور انگورہ میں جہاں ان تک چٹھی پہنچنے کے امکانات بھی کالعدم ہو گئے تھے۔

اسی دوران مولینا سندھی کی زندگی میں ایک ایسا مرحلہ بھی آیا جب آپ آزادی وطن کے عشق میں بے تاب اور اضطراب سے اس مرض کے نئے نئے علاج سوچتے ہوئے مارکس ازم کو بھی ہندوستان کی مشکلات کا حل اور غلامی کی بیڑیوں سے نجات کا ایک راستہ سمجھ کر اس پر غور کرنے لگے لیکن چونکہ آپ کے ذہن کی ساخت وہ تھی جس کی آبیاری حضرت شیخ الہندؒ نے قرآن و سنت کے آب حیات سے کی تھی اور جس کا سانچہ حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے تیار کردہ خمیر سے بنایا گیا تھا اس لئے آپ لاطوک و لاکھیا کی حد تک تو مارکس ازم کو مفید سمجھنے پر آمادہ ہو سکتے تھے لیکن مارکس ازم کے تیسرے ”لا“ یعنی لا الہ کو کسی طرح بھی قبول نہیں کر سکتے تھے اور لا اللہ سے دستبرداری آپ کے لئے ناممکنات حیات میں سے تھی، اس لئے آخر کار مارکس ازم کو ایک طرف رکھ کر آپ نے نہ صرف ہندوستانی عوام کی بلکہ دنیا بھر کے بنی نوع انسان کی تمام قسم کی غلامیوں کی نجات کو لا الہ

الا اللہ محمد رسول اللہ میں تلاش کرنا شروع کیا اور اس مقصد کے لئے جب حضرت شاہ ولی اللہ کے فلسفہ انقلاب کو اٹھا کر سامنے رکھا تو آپ کی آنکھیں کھل گئیں اور آپ کو محسوس ہوا کہ جس چیز کو میں زمانہ جدید کی نعرہ بازیوں میں تلاش کر رہا تھا وہ اپنے ہی خزانے میں موجود ہے۔ چنانچہ آپ نے حضرت شاہ ولی اللہ کی تمام تصنیفات بالخصوص حجۃ اللہ البالغہ تہمیدات و فیوض الحرمین وغیرہ کا مطالعہ شروع کیا اور لیٹن کے روس اور کمال اتاترک کے ترکی کو پس پشت پھینک کر آپ واپس آ کر مکہ معظمہ میں مقیم ہو گئے اور ولی الہی فلسفہ انقلاب پر تحقیقات کرنا شروع کر دی۔ اس لئے مطالعہ کے بعد آپ نے سیاست کے کچھ جدید نظریات مرتب کئے جن کی تفصیلات میں جانا اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ یہاں صرف اس حقیقت کا اظہار مطلوب ہے کہ جس زمانہ میں مولینا سندھی مکہ معظمہ میں بیٹھ کر ولی الہی نظریات پر مبنی انقلاب کے پروگرام کی نوک پلک درست کر رہے تھے اور ابھی ہندوستان میں آپ کی واپسی پر پابندیاں عائد تھیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے آنے جانے والے حاجیوں کے ذریعہ آپ کے ساتھ رابطہ پیدا کیا اور پہلی فرصت میں خط لکھ کر مولینا سندھیؒ کے ساتھ سینہ صفائی کی اور ان سے معذرت طلب کی۔

واقعی یہ احتیاط اور یہ حوصلہ حضرت شاہ صاحبؒ جیسے عالم ربانی اور محدث بے نظیر کو ہی نصیب ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مولینا سید حسین احمد مدنیؒ اپنی خود نوشت سوانح عمری ”نقش حیات“ جلد دوم ص ۱۴۴ کے حاشیہ پر یوں رقمطراز ہیں:-

”حضرت مولینا انور شاہ صاحب مرحوم نے مولینا سندھیؒ کے نام مکہ معظمہ کے قیام کے زمانے میں پیغام بھیجا تھا کہ قیام دیوبند کے زمانہ میں غلط فہمی کی وجہ سے آپ کے لئے تکلیف کا باعث بنا تھا۔ اب میرے دل میں آپ سے کوئی رنج نہیں ہے۔ امید ہے کہ آپ بھی معاف فرمائیں گے۔“

ممکن ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اور مولینا سندھیؒ کی یہ مراسلت اور بھی آگے بڑھی ہو لیکن اس کی تفصیلات ہمیں معلوم نہیں ہیں۔

بحر حال مولینا سندھیؒ نے قریباً بارہ سال مکہ مکرمہ میں گزارے اور وطن واپسی پر اگر وہ شاہ صاحب کو بقید حیات پاتے تو نہ جانے دونوں کے تعاون سے ملت کی کتنی انگلیں پوری ہوتیں۔

۲۵ سال کی طویل جلا وطنی کے بعد مولینا سندھیؒ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس تشریف لائے، تو دیوبند کی مجالس علمیہ میں اور دوسرے مواقع پر ہمیشہ نہایت وقیع الفاظ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا ذکر فرماتے تھے اور حضرت موصوف کے متعلقین کے ساتھ بھی اپنے گہرے اور مشفقانہ تعلق کا

چنانچہ حضرت شاہ صاحب کے بڑے فرزند مولانا ازہر شاہ صاحب اپنی کتاب "یادگار زمانہ" میں یہ لوگ تحریر فرماتے ہیں کہ:

۱۹۳۹ء میں جب مولانا (سندھی) کی واپسی کی تحریک اٹھی تو دیوبند مولینا سے اپنے قدیم تعلقات کی بنا پر خاص طور پر اپنے اس گم شدہ فرزند کی بازیابی کا خواہشمند تھا اور ہم سب کی خواہش تھی کہ جس مرد مجاہد کے عزم و حوصلہ کی بہت سی داستانیں ہم نے اپنے ماحول میں سنی ہیں، اسے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیں، آخر ایک دن شام کو معلوم ہوا کہ مولانا دہلی سے بغیر کسی اطلاع کے دیوبند پہنچے اور لوگوں نے انہیں اس حالت میں پایا کہ وہ اسٹیشن سے مدرسہ میں پہنچ کر مدرسہ کی مسجد میں شکرانہ کی دو نفلیں پڑھ رہے تھے، دیوبند آنے کی اطلاع آپ نے پہلے سے اس لئے نہیں دی تھی کیونکہ یہاں وہ اپنے استقبال اور شان و شوکت کو پسند نہیں فرماتے تھے، دوسرے دن مولانا صبح کے وقت راقم الحروف کے گھر پر تشریف لائے، (میں نے) دیکھا کہ ایک بوڑھا انسان سب سے آگے ہے اور اس کے پیچھے پچاس ساٹھ آدمیوں کا جھوم ہے میں نے مولینا کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لئے پہچان نہیں سکا، مولینا نے میری حیرت کو ختم کرنے کے لئے پیش قدمی فرمائی اور ارشاد ہوا عبید اللہ سندھی! اور پھر مجھے سینہ سے لگا لیا، پیشانی پر بوسہ دیا، مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ میرے رفیق درس اور رفیق فکر مولینا انور شاہ کشمیری کی نشانی ہیں۔

میری والدہ محترمہ مولینا سے اس وقت سے نیاز رکھتی تھیں جب مولینا دیوبند تشریف فرما تھے، والدہ نے چائے کا انتظام کیا، چائے کے وقت مولینا شبیر احمد عثمانی اور کئی اور بزرگ بھی موجود تھے، مولینا بڑی بے تکلفی اور سادگی سے چائے پیتے جاتے تھے۔ اسی مجلس میں انہوں نے بڑی شفقت سے مجھ سے فرمایا کہ مکہ مکرمہ میں اردو کے ایک رسالہ میں تمہارا مضمون ہم نے پڑھا تم ہمارے ساتھ رہو، ہم تمہیں کام کرنے کا ڈھنگ بتا دیں گے۔ میں نے برجستہ جواب دیا کہ حضرت! یہ جھگڑا میرے بس کا نہیں، آپ خانہ بدوش آدمی ہیں ۲۵ سال کے بعد اب گھر واپس آئے ہیں کابل، روس، ترکی اور حجاز کی زمین ناپتے رہے فقر و فاقہ میں آپ کی بسر ہوتی ہے، اپنا عیش و آرام آپ نے تہج کر دیا ہے، میں غریب ان مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے حوصلہ کہاں سے لاؤں گا۔ مولینا اس پر ہنس دیئے۔

اللہ اللہ! عجیب لوگ تھے جو خود کو مٹا کر قوم کو بنا گئے جنہوں نے اپنی ساری زندگی، زندگی کی ساری راحتیں، زندگی کے سارے دلوں کی زندگی کا سارا عیش اپنے مقصد پر قربان کر دیا۔

شاہ صاحب اور ہندوستان کے علماء اہلحدیث

انہ کو سند
مولینا ثناء اللہ صاحب امرتسری:..... حضرت مولینا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری کے متعلق گزشتہ صفحات میں ایک جگہ ہم نے مفصل طور پر حاشیہ میں عرض کیا کہ موصوف کے والد ماجد کشمیری تھے اور بعد ازاں وہ امرتسر میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ایک دنیا جانتی ہے کہ حضرت شاہ صاحب اپنے زمانے میں فقہ حنفی کے اولین علمبردار تھے اور مولینا ثناء اللہ صاحب کو "سردار اہل حدیث" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اس کے باوجود مولینا ثناء اللہ صاحب حضرت شاہ صاحب کے قدر دان اور علمی عظمت کے معترف تھے۔ دونوں عمر بھر مختلف المشرق ہوئے کے باوجود اسلام کی حفاظت اور دفاع کے محاذوں پر سرگرمی کے ساتھ ایک دوسرے کو تعاون دیتے رہے۔ ذاتی تعلقات کا یہ عالم تھا کہ مولینا ثناء اللہ صاحب جب دیوبند جاتے تھے تو حضرت شاہ صاحب کے ہاں قیام فرماتے اور جب کبھی حضرت شاہ صاحب امرتسر آتے تو اکثر مولینا موصوف کے ہاں قیام فرماتے تھے اور علماء اہل حدیث احناف کی نسبت زیادہ تعداد میں حضرت شاہ صاحب کی مجالس میں شریک ہوا کرتے تھے اور اس کا خصوصی اہتمام رکھتے تھے اور اس طرح سے علمی رموز و دقائق خاص کر تبلیغ اسلام اور رد قادیانیت پر باہم تبادلہ خیالات فرماتے تھے۔

حضرت مولینا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے حضرت شاہ صاحب کے وصال پر اپنے اخبار "اہلحدیث" میں ایک طویل مقالہ بھی سپرد قلم کیا اور اس میں اپنے درد دل کا اظہار کیا اور حضرت کے ذاتی مناقب اور علمی فضائل بیان کئے اور محبت بھرے الفاظ میں متعدد دلائل قاتلوں کا ذکر کیا اور یہ کہ "بے نظیر عالم دین رخصت ہو گیا" ❶

مولینا میر سیالکوٹی و دیگر اکابر علماء اہلحدیث:..... مولینا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی مرحوم مولینا محمد اسماعیل صاحب گوجرانوالہ، مولینا عبدالنواب ملتانی، مولینا داؤد غزنوی لاہوری، مولینا غلام نبی صاحب مبارکی کشمیری اور دیگر اکابر علماء اہل حدیث کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً مولینا میر سیالکوٹی صاحب موصوف نے قادیان کے پہلے بے نظیر اجتماع میں جب حضرت شاہ صاحب کی تقریر سنی تو فرمایا کہ "اگر مجسم علم کسی کو دیکھنا ہو تو مولینا انور شاہ کو دیکھ لے"۔ مولینا عبدالنواب ملتانی (تمیز مولینا عبدالجبار غزنوی) نے علماء اہل حدیث کے مجمع میں حضرت شاہ صاحب کے علمی کمالات اور بزرگی کا برملا اعتراف کیا ہے اور اسی طرح مولوی محمد اسماعیل صاحب گوجرانوالہ نے اسی مجمع میں کہا ہے کہ "مولینا انور شاہ تو حافظ حدیث ہیں"۔ وغیر ذلک۔

حضرت شاہ صاحبؒ اپنے وطن میں

از: جناب سید نبیہ احمد اندرابی شہید۔ الحاج سید مبارک شاہ فطرت گیلانی

تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت مولینا انور شاہ صاحبؒ کو زندگی کا بڑا حصہ اپنے وطن عزیز یعنی کشمیر سے باہر بسر ہوا۔ دہلی کے امینیہ دیوبند کے دارالعلوم اور ڈابھیل گجرات کے مدرسہ جامعہ اسلامیہ علم کے اس بحرناپیدا کنار سے سیراب ہوتے رہے خود خطہ کشمیر کی قسمت میں اس بارانِ رحمت کے محدود قطرات ہی لکھے گئے تھے، سوانح مرتب کرتے ہوئے ہم نے بہت چاہا کہ آپ کے کشمیری فیض یافتہ علماء و فضلاء کے قلم و زبان سے آپ کی شخصیت کے بعض پہلو روشنی میں لائے جائیں لیکن اس راستے میں مشکلات کے ناقابل عبور پہاڑ حائل پائے۔ بارہ مولہ کا مدرسہ فیض عام جو آپ نے آج سے ستر یا اسی سال قبل قائم کیا تھا اس کا ایک بھی تعلیم یافتہ آج اس دنیا میں موجود نہیں ملتا جن لوگوں نے کشمیر سے دیوبند جا کر آپ کی شاگردی کا امتیازی شرف حاصل کیا تھا مثلاً مولینا سید میرک شاہ اندرابی، میر واعظ مولینا محمد یوسف شاہؒ، مولینا غلام مصطفیٰ شاہ مسعودی، مولینا سید عنایت اللہ شاہ بخاری، مولینا عبدالکبیر رینہ اور مولینا سید محمد یوسف شاہ وترہیلی وغیرہم یہ سب لوگ اس دنیائے فانی سے ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے ہیں۔ مشکل سے ہم کو دو بوڑھے عمر رسیدہ علم دوست بزرگ جناب سید نبیہ احمد صاحب اندرابی ❶ اور الحاج سید مبارک شاہ فطرت

❶..... محترم سید نبیہ احمد اندرابی حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک فاضل اجل شاگرد مرحوم مولینا سید میرک شاہ صاحب اندرابی کے فرزند ہیں مدرسہ عالیہ امدادیہ مراد آباد سے درس نظامی کی تکمیل کر کے محکمہ تعلیم میں تعینات ہوئے تھے اور اب وظیفہ حسن خدمت حاصل کرنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں۔

مولینا میرک شاہ صاحب مرحوم کا تذکرہ چند سطروں میں یہاں کیا جائے تو بے محل نہ ہوگا۔ مرحوم صفر ۱۳۰۶ھ میں کشمیر میں پیدا ہوئے اپنے وطن میں علوم عربیہ و فارسیہ کی ابتدائی تعلیم حاصل کر کے ان کے دل میں علوم دین کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا اشتیاق بڑھ گیا خوش قسمتی سے اسی دوران حضرت شاہ صاحبؒ کچھ مدت کے لئے دیوبند سے کشمیر تشریف لائے تو میرک صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے انہیں دیوبند آنے کا مشورہ دیا، چنانچہ دیوبند جانے پر حضرت شاہ صاحبؒ کی شفقت ان کے شامل حال رہی، دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ وقت وہاں مدرسہ بھی رہے اور دارالافتاء میں بھی خدمت انجام دیں۔ مولوی فاضل کے امتحان میں شامل ہوئے تو یونیورسٹی بھر میں ہلکی پوزیشن حاصل کی، دارالعلوم دیوبند کے علاوہ سرائے میرا عظیم گزہ، سندھ، کراچی اور لاہور وغیرہ متعدد شہروں میں تشکیلات علوم کی پیاس بجھائی، تقسیم ملک سے پہلے اور نکل کالچ لاہور میں ایک ممتاز پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ آخر میں سوہ سندھ کے ایک مشہور مدرسہ میں درس حدیث کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ (بقیہ حاشیہ کے صفحہ ۱۷)

گیلانی صاحب کو قیام کشمیر کے مواقع پر دیکھا گیا اور آپ کی مجالس وعظ و تذکیر میں بھی شامل ہوئے ہیں۔ دونوں صاحبوں نے اپنی قوت حافظہ کے بھروسہ پر پچاس پچاس سال پرانے واقعات کے بارے میں جو کچھ عطا کیا ہے وہ ہر یہ ناظرین ہے۔ کوندو

☆☆☆☆☆

حضرت شاہ صاحب کا قیام سرینگر

جناب سیدنا نبی احمد اندرانی شہید

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين
وخاتم النبيين وعلى اله الطيبين واصحابه الطاهرين.

میں کیا اور میری بساط کیا؟ حضرت فخر المجد ثین رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات کے کسی گوشہ پر کچھ روشنی ڈال سکوں۔ تاہم میں نے عزیز محترم عبدالرحمن صاحب کوندو کی فرمائش پر مندرجہ بالا عنوان کے تحت چند واقعات پیش کرنے کی کوشش کی ہے اگرچہ ان سطور کی بنیاد صحیح واقعات پر ہے مگر پھر بھی ناظرین کرام کی خدمت میں اپنی فروگزاشتوں سے درگزر کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔

مجھے تو حضرت شاہ صاحب سے براہ راست شرف تلمذ بھی حاصل نہیں ہے البتہ میرے والد ماجد حضرت الاستاذ مولانا سید میرک شاہ صاحب اندرانی علیہ الرحمۃ حضرت شاہ صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور ان ہی کی بدولت ہمارے میر محلہ ملارڈ کو یہ شرف نصیب ہوا تھا کہ حضرت فخر المجد ثین رحمۃ اللہ علیہ اس میں تقریباً بیس پچیس روز تک قیام پذیر رہے تھے۔

میری عمر اس وقت چھوٹی تھی مگر اس کے باوجود شعوری طور پر حضرت کی صحبت سراپا عظمت سے

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ سے آگے) آپ کی تصانیف میں موطا امام مالک کا حاشیہ محیط الدائرہ کا حاشیہ فلسفہ کی اہل ترین کتاب اسفار اربعہ کی ایک جلد کا اردو ترجمہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ آزادی کے سلسلے میں خاص کر ۱۹۳۱ء کی انقلابی تحریک میں انہوں نے سرگرم رہنمائی کا رتا سے انجام دیے ہیں لیکن بعد میں سیاست سے کنارہ کشی کر کے دوبارہ علمی زندگی میں قدم رکھا اور آخری عمر تک اسی ماحول سے وابستہ رہے۔ بالآخر ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۹۳ھ کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔ رحمۃ اللہ رحمۃ وسعہ (کوندو)

جناب فطرت کا کشمیری کو علم و ادب اور شعر و سخن کا ذوق ورثے میں ملا ہے اور ترکستان اور تھکن وغیرہ ممالک کی سیاحت نے ان کے اس شوق و ذوق کو اور بھی ابھارا ہے۔ فارسی زبان میں اکثر ان کا کلام ہے لیکن کبھی کبھی اردو اور کشمیری میں بھی سخن سراہوئے ہیں جناب یونہی رشتی سے منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات کے پاس کر کے ریاست کے محکمہ تعلیم میں تعینات ہوئے تھے اور ا۔ وظیفہ حسن خدمت پانے کے بعد ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ (کوندو)

دور رہنا اپنے لئے باعث نقصان و حرمان ہی سمجھ لیتا تھا یہی وجہ ہے کہ آپ کی معیت کی سعادت اکثر و بیشتر اوقات میں نصیب ہوتی تھی۔

حضرت شیخ کی قیام گاہ:..... حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے والد ماجد علیہ الرحمۃ کے مہمان تھے۔ ہمارا ایک مکان سڑک کے کنارے واقع تھا اور وہی مہمان خانہ بھی تھا۔ حضرت اسی مکان میں رونق افروز رہتے تھے ہمارے ایک بزرگ حضرت مولانا سید احمد سعید صاحب اندرابی رحمۃ اللہ علیہ کا مکان سڑک سے کچھ فاصلہ پر واقع تھا۔ حضرت شاہ صاحب اس مکان میں بھی کافی وقت گزارتے تھے اور خانقاہ اندرابیہ میں ہجگاہ نماز ادا فرماتے تھے۔ درس حدیث درس تصوف اور مواعظ حسنہ کی کچھ مبارک مجلسیں کبھی اس خانقاہ میں ہوتی تھی اور کبھی دونوں قیام گاہوں میں۔

مصاحبین اور مجالس کی برکات:..... میرے محلہ میں ان دنوں بڑی بڑی صاحب علم و فضل ہستیاں موجود تھیں۔ جو حضرت شاہ صاحب کے ساتھ بے پناہ محبت و عقیدت رکھتی تھیں اور حضرت شاہ صاحب بھی ان حضرات سے کافی انس و محبت فرماتے تھے۔ ابتدائی ملاقاتوں میں ہی باہمی گہرے روابط قائم ہو گئے تھے۔ سچ ہے ”انما یعرف ذا الفضل من الناس ذو وہ“ واقعی ایک فاضل اجل اور جامع کمالات ہستی کو ان صاحب فضل ہستیوں نے بہت اچھی طرح پہچانا تھا اور ان ایام میں یہاں کی یادگار مجلسیں بلا مبالغہ ایسی تھیں کہ رات دن علوم و معارف کے دریائے جہت سے بلکہ نعمت خداوندی کا نزول ہوتا تھا کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا تھا جو علمی و دینی مذاکرات سے خالی ہوتا۔ آج جب وہ دن یاد آتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے اور جگر پھٹا جاتا ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بارگاہ عالم پناہ خداوندی (جل جلالہ) درگاہ فیض پناہ محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور درس گاہ اکابر دین متین کے فیوض و برکات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر لہرا رہا ہے۔ آہ وہ مبارک مجلسیں اب خواب میں بھی نصیب نہیں ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت شاہ صاحب کے درجات کو بلند فرمائے اور انہیں کروٹ کروٹ جنت الفردوس نصیب کرے۔ یہ سب کچھ ان کی صحبت سراپا رحمت کا صدقہ تھا تمام اہل مجلس بزبان حال کمال خلوص کے ساتھ پکارتے رہتے تھے

احب الصالحین ولست منهم

لعل اللہ یسر قنسی صلاحاً

یعنی میں تو صالح بزرگوں سے محبت کرتا ہوں حالانکہ خود ان میں سے نہیں ہوں ہاں مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صلحاء رحمۃ اللہ علیہم کے صدقے مجھے بھی صلاحیت پارسائی اور پرہیزگاری کی دولت سے مالا مال فرمائے گا۔

صاحب کی تقریر شروع ہوئی میر واعظ صاحب موصوف سامعین کی جماعت کے ساتھ قبلے کی جانب تشریف لائے اور حضرت شاہ صاحب کی تقریر کمال اشتیاق سے سنی۔

خانقاہ معلیٰ میں تقریر:..... خانقاہ معلیٰ میں حضرت کی تقریر دوسری منزل ”سلطان خانہ“ پر ہوئی۔ غالباً اسی مجلس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے مرزائیوں کے دو فرقوں (لاہوری اور قادیانی پارٹیوں) کے متعلق سوال کیا گیا۔ حضرت موصوفؒ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں بس لعین ❶ اور لعین ❷ کا فرق ہے۔ دوران تقریر میں مشہور مرزائی (اور پھر بہائی) مولوی عبداللہ وکیل صاحب کھڑے ہوئے اور کچھ پوچھنا چاہا مگر ان پر ایسا رعب طاری ہوا تھا کہ وہ تمہیدی الفاظ کو بھی صحیح رنگ میں ادا نہیں کر سکے چنانچہ یوں گویا ہوئے کہ ”جناب میں فرماتا ہوں۔“ چونکہ میں فرماتا ہوں کہ الفاظ بدحواسی کے عالم میں زبان پر جاری ہوئے اور یہ الفاظ ایسے وقت میں ایک سائل کے لئے آداب مجلس اور تہذیب کلام کے لحاظ سے عوام کی نظروں میں بے محل اور ناموزوں تھے اس لئے تمام سامعین اور حاضرین نے وکیل صاحب کا مذاق اڑایا اور وہ کھسیانے ہو کر ایسے بیٹھ گئے کہ دوبارہ اٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ حالانکہ شاہ صاحب کی طرف کسی کو بھی سوال پیش کرنے کی ممانعت نہیں تھی۔ ہم نے ان ہی ایام میں سنا ہے کہ وکیل صاحب مذکور نے اپنی پارٹی کے خاص لوگوں سے کہا تھا کہ اس شخص کے علم کے سامنے سرنگوں ہو کر سجدہ کرتا چاہئے تھا۔

خانقاہ نقشبندیہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر:..... خانقاہ نقشبندیہ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے طویل تقریر ارشاد فرمائی معترضین نے بہت سے سوالات کئے اور حضرت موصوفؒ نے دلائل و براہین کی روشنی میں مسکت جواب دیئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی تقریروں میں چند علمی اور تحقیقی باتیں بھی بیان فرمادیں۔ علم دوست حضرات کی ضیافت طبع کے لئے مختصر الفاظ میں کچھ باتیں لکھی جاتی ہیں۔

مسلك امام ابو حنيفہؒ کی اصلی بنیادیں اور مآخذ:..... حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت امام العالمؒ کا یہ ارشاد بروایات صحیحہ و ثابۃ مشہور جلیل القدر محدث حضرت امام تقیؒ نے کتاب المدخل میں نقل کیا ہے:

ما جاء عن النبي صلى الله عليه وسلم فعلى الرأس والعين وما جاء
عن الصحابة نختار منهم وما جاء عن التابعين فهم رجال ونحن

رجال و ملی روایۃ زاحمنہم۔

یعنی جو کچھ (دین کے بارے میں) ہم تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے وہ ہمیں برسرو چشم تسلیم ہے۔ ہم اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ جو کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہم تک پہنچا ہے ہم ان سے اس بارے میں اپنے لئے واضح اور راجح راہ عمل اختیار کریں گے اور جو کچھ حضرات تابعین رحمہم اللہ سے ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ وہ بزرگان دین بھی تابعی ہونے کا شرف رکھتے ہیں اور ہم بھی الحمد للہ اس شرف سے مشرف ہیں۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ ہم ان (تابعین کرام) سے (راجح و مرجوح کے پرکھنے اور صحت روایات وغیرہ اصول دین کے سلسلے میں بشرط ضرورت اور بقدر حاجت) مزاحمت بھی کریں گے۔ مزاحمت بھی کریں گے۔ (کیونکہ شرف تابعیت کی وجہ سے علمی و دینی معلومات میں ہمارے اندر یہ اہلیت بھی موجود ہے)۔

قرأت خلف الامام کے متعلق تحقیق..... حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ قرأت خلف الامام پر پوچھتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس مسئلے میں سب سے مقدم اور مافوق یہ ارشاد الہی ہے **وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهُ وَاَنْصِتُوْا**۔ یعنی جب قرآن مجید پڑھا جائے تو اس کے سننے کے لئے خاموش رہو تو قیام اور امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا قال احمد اجتمعت الامة على انها نزلت في الصلوة یعنی حضرت امام احمد بن حنبلؒ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ یہ آیت کریمہ نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس پر ساری امت کا اتفاق ہے آپ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت عارف کامل مولانا جلال الدین رومیؒ کا یہ شعر بھی پیش کیا۔

انصتوا گوش کن خاموش باش

چوں زبان حق نکشی گوش باش

یعنی ارشاد الہی انصتوا (قرآن سننے کے لئے خاموشی اختیار کر) پر گوش و ہوش سے متوجہ ہو کر خاموش رہو۔ اگر تم زبان حق نہیں بننے (کہ پیش امام بن کر قرآن پڑھتے) تو (مقتدی بن کر) کان ہی نہ سننے جاؤ۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس شعر میں زبان حق سے مراد امام اور گوش سے مراد مقتدی ہے۔ امام کا مقتدیوں پر مقدم ہونا اور مقتدیوں کا صف بصف امام کے پیچھے کھڑا ہونا اس میں یہی خاص بات ہے کہ نماز میں امام ہی قرآن عزیز پڑھے اور مقتدی امام کی قرأت کو خاموش ہو کر سننے رہیں آپ نے علامہ ابن القدامہؒ حنبلی کی کتاب المغنی کے حوالہ سے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا یہ

①..... حضرت امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) کی روایات میں سند احمد کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے جس میں تین ہزار حدیثیں نقل کی گئی ہیں (کوئٹہ علی عنہ)

قول نقل فرمایا: قال احمد ما سمعنا احدا يقول صلى خلف الامام ولم يقرأ بفاتحة الكتاب لا تجوز صلوٰتہ یعنی ہم نے کسی (اہل علم) کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ جو شخص امام کی اقتداء میں نماز پڑھتا ہے اور سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا ہے اس کی نماز جائز نہیں۔ مطلب یہی ہے کہ امام کے پیچھے نماز پڑھنے والے پر قرأت واجب ہی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اکثر ائمہ جہری نمازوں میں وجوب قرأت خلف الامام بلکہ جواز کے بھی قائل نہیں ہیں۔

چنانچہ حضرت امام احمد حنبل فرماتے ہیں:

هذا النبي صلى الله عليه وسلم (ارشادہ یعنی ہے) وهذا مالك من المدينة وهذا سفيان من الكوفة وهذا الاوزاعي من الشام وهذا ليث بن سعد من مصر ما قالوا الرجل صلى خلف رجل ولم يقرأ خلفه لا تجوز صلوٰتہ یعنی حضرت امام کا ارشاد ہے کہ یہ ہیں حضرت نبی اکرم ﷺ اور یہ ہیں مدینہ طیبہ کے امام مالکؒ اور یہ ہیں کوفہ کے امام سفیانؒ اور یہ ہیں شام کے امام اوزاعیؒ اور یہ ہیں مصر کے لیث بن سعدؒ ان میں سے کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں کہ جو شخص کسی امام کا مقتدی ہو اور اقتداء کی حالت میں قرأت نہ پڑھے تو اس کی نماز جائز نہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت امام شافعیؒ کی ”کتاب الامم اور“ کتاب الامام“ میں وجوب قرأت کا کوئی ذکر نہیں ہاں متاخرین شافعیہ کا کہنا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ عمر شریف کے آخری دو سال میں وجوب کے قائل ہو گئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ حدیث میں وارد ہے من ادرك الركوع فليدرك الركعة یعنی امام کے ساتھ صرف رکوع پانے والا رکعت کو بھی پالیتا ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ اگر مقتدی کے لئے قرأت واجب ہوتی تو وہ صرف رکوع میں امام کے ساتھ بغیر قرأت کے شامل ہو کر کیسے اور کس طرح رکعت پالیتا۔

حضرت امام بخاری عنظر اللہ مرقدہ کا ذکر جمیل:..... حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ امام الحدیث اگر اپنے دست مبارک بلند کریں تو باعتبار حدیث دالی کے عرش مجید تک پہنچا سکتے ہیں آپ حضرت امام العالم امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بواسطہ دلا

①..... قال النسبی صلی اللہ علیہ وسلم من كان امام فقرا الامام قرا له یعنی جو شخص امام کی اقتداء کرتا ہے تو امام ہی کی قرأت مقتدی کی بھی قرأت ہے (صرف منفرد تھا نماز پڑھنے والے پر ہی قرأت پڑھنا لازم ہے) وقال صلی اللہ علیہ وسلم من صلی رکعة لم یقرأ فیہا بأمر القرآن فلم یصل ان یکم (راء الامام یعنی جس) منفرد شخص نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں ام القرآن (سورۃ فاتحہ) نہیں پڑھی اس نے نماز نہیں پڑھی (کیونکہ قرأت نہیں پڑھی) ہاں اگر امام کے پیچھے ہو تو قرأت نہ پڑھے۔ معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے قرأت پڑھنا نہیں چاہئے۔

واسطہ شاگردوں مثل عبد اللہ بن مبارک و کعب بن الجراح، ابو بکر بن شیبہ، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی اور یحییٰ بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہم کے شاگرد ہیں حضرت امام بخاریؒ نے جزء القراءة کے نام سے ایک رسالہ تالیف فرمایا ہے جس کا اکثر حصہ قرأت خلف الامام کے مسئلہ پر حاوی ہے۔ میرے استاد الاساتذہ زبدۃ المحدثین حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ میں اس کا جواب باصواب لکھا ہے اور مضامین رسالہ پر محدثانہ کلام فرمایا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے علامہ قاضی شوکانی علیہ الرحمۃ پر جرح فرمائی کہ انہوں نے چند کتابوں کی عبارات میں ادھر ادھر ہیر پھیر کر کے بخیال خود احادیث پر تنقید کی ہے اور حضرت امام اعظمؒ کی موید احادیث کو نظر انداز کر کے متعصبانہ روش اختیار کی ہے۔ قاضی مرحوم ادنیٰ تحقیقات کے آدمی تھے، میں فخر یہ نہیں بلکہ اپنی وسعت معلومات و تحقیقات کی بنا پر کہتا ہوں کہ میری علمی تحقیقات ان کی تحقیقات سے بدرجہا بڑھ چڑھ کر ہیں۔ میں نے ان کے اکثر وجوہ استدلال کے ایسے جوابات دیئے ہیں کہ قاضی صاحبؒ کی بات ہی نہیں بلکہ ان کے فرشتوں کو بھی ان کی اطلاع نہیں ہوگی۔“

بہر حال یہ شاہ صاحبؒ کی تقریروں کی خاص باتیں ہیں جو محض اہل علم کی ضیافت طبع کے لئے درج کی گئی ہیں ورنہ ان مسائل پر کسی قسم کا تبصرہ کرنا یا اس کو زیر بحث لانا ہرگز میرا مدعا نہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا روحانی شعور بھی بہت تیز تھا۔ خانقاہ اندرابیہ میں پہلی مرتبہ (غالباً عصر کی نماز پڑھائی۔ نماز پڑھا کر دعاء کے لئے قوم کی طرف منہ کیا مگر پیٹھ ذرا جنوب کی طرف مائل تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد پوری طرح قوم کی طرف منہ کر کے پشت بقبلہ ہو کر بیٹھ گئے۔ دعاء سے فارغ ہوئے تو حاضرین سے دریافت فرمایا کہ ادھر جنوب کی طرف کون بزرگ مدفون ہیں۔ حاضرین نے عرض کیا کہ یسید السادات شیخ وسید میر محمد میرک اندرابی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پر انوار ہے، اس کے بعد کبھی اس طرف پیٹھ کر کے نہیں بیٹھے۔

حضرت مجدد دوم شیخ حمزہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرقد مبارک کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے بڑا مجمع ساتھ تھا، جن میں اہل علم و فضل بھی شامل تھے۔ جوں ہی بالائی ڈیوڑھی میں قدم رکھا فوراً جوتے اتار دیئے۔ آپ کی تقلید میں تمام مجمع نے بھی جوتے اتار دیئے۔

ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ بصیرت قلبی اور روحانی کمالات سے بھی مالا مال تھے۔

① حضرت یحییٰ بن ابراہیمؒ حضرت امام اعظمؒ کے شاگرد رشید تھے اور حضرت امام بخاریؒ عطر اللہ مرقدہ کے زمانہ تک زندہ رہے اور ان کی شاگردی اختیار کی۔ یہ وہی یحییٰ بن ابراہیم ہیں جن کے طفیل سے حضرت امام بخاریؒ کو اکثر ملامت کا انکار حاصل ہوا ہے۔ ملامت امام بخاریؒ محمد ثنین کرام میں مشہور ہیں اور امام بخاریؒ ان کی بدولت مخصوص فضائل کے حامل ہیں (تذکرہ الحفاظ حقیقۃ اللہ)۔

جھیل ڈل کی سیر اور مثنوی کا درس:۔۔۔ حضرت کے قیام سرینگر کے دوران ایک دن سرینگر کی مشہور لمبی چوڑی جھیل (ڈل) کی سیر کا پروگرام بنا۔ بڑے بڑے اہل علم و فضل خصوصاً بزرگان میر محلہ مارہ ساتھ تھے۔ جھیل کے وسط میں پانی کی لہروں خود رو آبی نباتات، آس پاس اور دور و نزدیک اگاتی ہوئی گونا گوں سبزیوں، سرسبز و شاداب پودوں اور مشر و غیر مشر درختوں، جھیل کی چاروں طرف نظر آنے والی کچھ برف پوش، کچھ تنگی، اور کچھ سرسبز پہاڑیوں، مغل باغات کی تعمیرات کے ماحول میں نظر فریب آبشاروں اور قدرت کے دلکش ودل رہا نظاروں کے ساتھ ساتھ جاذب نظر صنایعوں کی بے مثال کشش اور بحیثیت مجموعی ان تمام مناظر قدرت کے عارفانہ مطالعہ سے آنکھوں میں نور اور دلوں میں سرور پیدا ہو رہا تھا کہ ایک بزرگ نے کمال متانت کے ساتھ باوقار سریلی آواز میں مثنوی کے دو تین اشعار پڑھے۔ پہلا شعر یہ تھا

بشنواز نے چوں حکایت می کند
واز جدا بیما شکایت می کند

اسی شعر کی تشریح میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے زبان کھولی اور مسلسل تین چار گھنٹے تک در افشانی فرماتے رہے۔ حاضرین ہمہ تن گوش بن کر سنتے رہے اور حضرت اقدس (شاہ صاحب) درس دیتے رہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ درس کیا تھا؟ صاف معلوم ہوتا تھا کہ دین حق اور معرفت الہیہ کے دریا بہہ رہے ہیں۔ حاضرین میں اکثر علماء اور مشائخ کرام تھے جو اس قدر محفوظ ہو رہے تھے کہ گویا علوم دین اور معارف راہ یقین کی بدولت ان کے قلوب اسرار الہی (جل مجدہ) و انوار محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معمور، معرفت کے شراب طہور سے متلذذ و مخمور اور عوارف انوریہ سے سرور ہو رہے تھے۔ میں ان دنوں ایک معمولی نگاہ پر حال کا تھا تاہم یہی سمجھ رہا تھا کہ علم و عرفان کا ایک بڑا شیریں چشمہ اہل پڑا ہے۔ واقعی حضرت شاہ صاحب عارف کامل حضرت مولائے روم قدس سرہ سے بھی روحانیہ مکمل فیضیاب تھے۔

علامۃ المسلمین کے ساتھ حسن ظن:۔۔۔ ایک دن صبح سویرے منہ اندھیرے کہیں تشریف لے گئے۔ کئی آدمی ساتھ تھے۔ خصوصاً ایک شخص خوبہ محمد اکبر اگو بھی بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھ کر واپس (پیدل) تشریف لا رہے تھے۔ راستے میں نقض وضو کیا اور محمد اکبر اگو مرحوم کے ہمراہ ایک مسجد کے طہارت خانہ میں گئے۔ استنجاء کے بعد وضو کیا اور مسجد میں تحیۃ المسجد والوضوء کے لئے داخل ہوئے۔ اب چاشت کا وقت بھی ہو گیا تھا۔ آس پاس کے لوگ حسب عادت سوکراٹھے تھے اور مسجد میں فجر کی نماز (قضاء) پڑھ رہے تھے۔ جب حضرت شاہ صاحب محمد اکبر مرحوم

مے ہمراہ میر محلہ کی طرف چل پڑے تو ان سے فرمایا۔ "یہ لوگ بڑے صالح ہیں کہ کافی تعداد میں نماز چاشت پڑھنے کے لئے مسجد میں آتے ہیں۔" یہ عام مسلمانوں کے ساتھ ان کا حسن گمان تھا۔

حضرت شاہ صاحب کی اردو تصانیف..... چونکہ میرا موضوع حضرت شاہ صاحب کا قیام سرینگر تک محدود ہے۔ میں نے اسی موضوع کے تحت کچھ عرض کیا ہے۔ اگرچہ کچھ مزید معلومات بھی فراہم کر سکتا تھا۔ مگر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنی یادداشت اور حضرت کی تقریروں سے ضروری باتیں عرض کر کے حضرت شاہ صاحب کے کترین خدام میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کروں۔ اللہ تعالیٰ عزیز دوست عبدالرحمن صاحب کو نند کو جزائے نیک دے کہ انہوں نے یہ موقع فراہم کیا۔ جو خوش قسمت حضرات حضرت شاہ صاحب کی صحبت یا برکت سے فیضیاب ہو چکے ہیں وہ یہی یقین رکھتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب اپنے علمی و عملی کمالات میں انفرادیت رکھتے تھے۔ آپ کے شیوخ اساتذہ کو بھی آپ پر بڑا فخر اور ناز تھا۔ قوت حافظہ معارف علم حدیث میں آپ کو لاثانی مقام حاصل تھا۔ آپ کی اکثر تصانیف عربی زبان میں اور کچھ فارسی زبان میں طبع ہو کر تشنگان علوم کو برابر سیراب کر رہی ہیں۔ ان تصانیف پر اہل علم حضرت تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں، میں اس پر اتنا ضرور اضافہ کرتا ہوں کہ حضرت کے تین مندرجہ ذیل رسائل اردو زبان میں میرے پاس موجود ہیں:

۱۔ خطبہ صدارت جمعیت علماء ہند دہلی (سال ار سن محفوظ نہیں)

۲۔ دعوت حفظ ایمان ۱

۳۔ دعوت حفظ ایمان ۲

دعوت حفظ ایمان کے رسالے مرزا قادیانی اور ان کے چیلے چانٹوں کی تردید میں لکھے گئے ہیں۔ میر غالب خیال ہے کہ دعوت حفظ ایمان کے کچھ مزید نمبرات بھی شائع ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ حضرت شاہ صاحبؒ مرزائی تحریک کی سرکوبی کو جزا ایمان یقین کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نے یہ سلسلہ سادہ لوح مسلمانوں کی ایمانی دولت کو مرزائی کفریات و واہیات سے بچانے کے لئے شروع فرمایا تھا۔ میں اس پر اپنی اس ناچیز تحریر کو ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت شاہ صاحبؒ کے درجات کو بلند فرمائے اور بزرگان دین کے صدقے مجھ نامہ سیاہ و سراپا گناہ کی مغفرت فرمائے۔

سبحان اللہ رب العزۃ عما یصفون و سلام علی المرسلین والحمد
للہ رب العالمین۔

حضرت شاہ صاحب کی نظر عنایت

از جناب سید مبارک شاہ گیلانی فطرت

شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیریؒ شہر کے چند اہل علم اور فضلاء کی دعوت پر ایک مذہبی تقریر ارشاد فرمانے کے لئے سرینگر تشریف لے آئے تھے۔ اور غالباً یہ ۱۹۲۵ء تھا۔ آپ اپنے آبائی مسکن موضع ورنو (لولاب) سے تشریف لا کر خانقاہ معلیٰ کے سلطان خانہ کے بالائی حصے میں فروکش ہوئے۔ لوگ بکثرت حاضر تھے۔ آپ نے ایک جم غفیر کو مذہب حنفیہ کے اصول و فروع سے آگاہ فرمایا۔ شہر کے علماء و فضلاء نے آپ کی تقریر دلپذیر سے حظ وافر حاصل کیا۔ اس موقع میں حضرت نے خاص طور پر قادیانی عقائد کی تردید فرمائی اور اکثر تعلیم یافتہ حاضرین نے آپ کی اس تقریر کو قلمبند بھی کیا۔

میرے برادر مرحوم مبلغ اسلام سید یاسین گیلانی آپ کے خاص خاص معتقدین میں امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ راقم الحروف ان دنوں عربی معلم تھا، کتاب علم کا بے حد شوقین تھا۔ حضرت شاہ صاحب جب خانقاہ معلیٰ کی مجلس تقریر سے فارغ ہوئے تو سر سید یاسین صاحب گیلانی کی دعوت قبول فرما کر ہمارے فقیر خانہ (خانقائے معلیٰ) میں تشریف لے آئے، مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے ہمارے مکان کا کوئی کمرہ خانہ نہ تھا۔

بہر حال آپ کی نظر انور اتفاقاً مجھ حقیر پر پڑی اور میرے برادر محترم یاسین صاحب سے فرمانے لگے کہ یہ عزیز آپ کا کیا لگتا ہے؟ آپ نے عرض کی کہ حضرت یہ میرا برادر خورد ہے ہم اپنے والد ماجد کے صرف دو ہی فرزند ہیں۔ میرا یہ بھائی ذہین تو ہے مگر شوخ طبع اور شعر و شاعری کا دلدادہ ہے، میں چاہتا تھا کہ یہ اپنی توجہ زیادہ سے زیادہ مذہبی تبلیغ کی طرف متوجہ کرے۔

حضرت نے فرمایا کہ شعر حسن برا تو نہیں ہے۔ الشعراء تلامذہ الرحمن..... ان فی الشعر لحکمة۔ اچھا اس کا نام کیا ہے؟ آپ نے عرض کی کہ حضرت! یہ تو نام کا مبارک ہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت مولیدانے نہایت ہی مشفقانہ انداز میں فرمایا کہ ان شاء اللہ المستعان کام کا بھی مبارک ہوگا۔ ہاں اس کو کسی عرصہ کے لئے ورنو (لولاب) بھیج دیجئے۔ گو میں عدیم القریٰ ہوں۔ لیکن علماء دیوبند میں سے میرے ایک ساتھی عزیز الرحمن صاحب ایک صوفی منش بزرگ ہیں۔ کسی مدت کے لئے ان کی صحبت میں رہ کر آپ کا بھائی ضرور محفوظ ہوگا۔ اور اگر فرصت ملی تو میں اپنے

برادر صغیر مولوی سیف اللہ شاہ کے ساتھ اس کو بھی پڑھاؤں گا۔ یقیناً یہ تو مولینا کا فرمان واجب الاذعان تھا کہ مجھ میں حضور انور سے استفادہ کا شوق دائمگیر دل دو مانع ہوا اور میں آپ کی واپسی کے چند ہی دنوں کے بعد ورنو (لولاب) روانہ ہوا۔

میں سیدھے مولینا کے کاشانہ علم و ادب میں داخل ہوا۔ میرے ساتھ آپ کے بھائی حکیم عبداللہ شاہ صاحب تھے۔ جو بسم اللہ شاہ کے عرف سے معروف تھے۔ آپ نے میرے لئے سفارش کی۔ حضرت مولینا مرحوم نے فرمایا کہ یہ سفارش کے بغیر ہی میرے منظور نظر ہیں۔ بات تو صرف اتنی ہے کہ میں مصروف ہوں۔

بہر حال حضرت نے اپنے دوسرے بھائی مرحوم سلیمان شاہ صاحب سے فرمایا کہ آپ اسے مولینا عزیز الرحمن سے ملائیے اور ان کو تاکید کیجئے کہ فی الحال سیف اللہ شاہ اور مبارک شاہ کو مشکوٰۃ شریف کا درس دیں۔

دوسرے دن ہم دونوں اکٹھے مولینا عزیز الرحمن صاحب کے گھر پر حاضر ہوئے۔ جو موضع کاری میں سکونت پذیر تھے۔ جونہی میری نظر آپ کے نورانی چہرے پر پڑی۔ میں آپ کا شیفتہ ہوا۔ آپ پر لے درجہ کے متقی اور زاہد تھے۔ اپنے ہاتھ سے اپنی زمین میں مکئی بوتے اور کاشت کا کام خود کر لیتے تھے۔ اسی پیداوار سے آپ کی غذا احلال تھی، آپ ایک بھینس بھی پالتے تھے، اس کے دودھ وغیرہ کے ساتھ مکئی کی روٹی تناول فرماتے تھے۔ آپ نے شاہ صاحب کا فرمان بسر و چشم قبول کیا اور ہم دونوں (سیف اللہ شاہ مرحوم اور راقم الحروف) ان سے درس حدیث مع اسناد حاصل کرتے رہے۔ میں نمبر دار وہ رحیم میر ورنو ولد کریم میر مرحوم کے گھر میں سکونت پذیر ہوا۔ یہ نہایت ہی فاضل اور علم دوست آدمی تھا۔

بہر حال میں روزانہ مولینا عزیز الرحمن صاحب دیوبند سے درس حدیث لے لیتا تھا۔ شام کو حضرت شاہ صاحب کی صحبت میں رہ کر تذکرۃ العلماء کے حظ وافر سے محفوظ رہتا تھا۔

غالباً دو مہینے یہی سلسلہ جاری رہا بعد میں حضرت شاہ صاحب کو دیوبند سے اچانک بلاوا آیا اور وہ دیوبند تشریف لے گئے۔ اور پھر میں بھی آپ کی غیر حاضری میں وہاں پر مطمئن نہ رہ سکا اور چونکہ اسی اثناء میں مولینا عزیز الرحمن کی صحت بھی خراب ہوئی۔ اس لئے میں واپس اپنے گھر کو

سرینگر روانہ ہوا۔

از در شاہ چگویم بچہ سامان رستم
ہمہ ذوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رستم

بہر کیف یہی وجہ ہے کہ مجھے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی کے ساتھ بے انتہا عقیدت ہے۔

”شام از زندگی خویش کہ کارے کردم“

حضرت ممدوح ہی سے راقم کو ایک لائیکل مسئلہ طے ہوا میں طالب علمی کی وجہ سے اور العلم حجاب الکبر کے بموجب استمداد من ارواح الانبیاء والاولیاء کے بارے میں مشتبہ عقیدہ کا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ بچہ! ہر عمل کا دار و مدار نیت پر ہے۔ انما الاعمال بالنیات اگر عقیدہ یا حقیقتاً انبیاء والولیاء سے استمداد کیا جائے تو کفر ہے خبردار اس بارے میں نیت کو صاف و پاک کیا جائے ورنہ ع

’چو کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی‘

اور آپ خاندان نبوی سے نسبت کے مدعی ہیں لہذا آپ سے زیادہ احتیاط مطلوب ہے۔ اس کے علاوہ حضرت کی صحبت میں ہمارے حنفی عقائد کے بہت سے پیچیدہ مسائل بھی حل ہوئے۔ صلوات اللہ وسلام علی النبی عرض کرنے کے وقت سرینگر میں لوگ دونوں ہاتھ دعا کے طور پر اٹھاتے تھے ہم نے آپ سے عرض کیا کہ صلوٰۃ وسلام کے وقت ہم اپنے ہاتھوں کو نماز کی طرح ادب سے باندھیں گے یا بصورت دعا دونوں ہاتھ پھیلائیں گے؟ حضرت نے جواباً فرمایا ادب سے ہاتھ باندھو تو عین ادب ہے پھر مولینا رومی کا یہ شعر زبان پر آیا۔

کہ دم از عقل سوائے کہ بگو ایمان چیست
عقل در گوش دلم گفت کہ ایمان ادب امت

خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ادب کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال ہے دہی است

اور اگر کوئی دعا کی نیت سے ہاتھ اٹھائے تو الصلوٰۃ علی النبی دعاء یعنی سرور کائنات ﷺ پر درود پڑھنا دعا ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے ان صلواتک سکن لہم آپ ﷺ کی صلوٰۃ یعنی دعاء مومنوں کے لئے طمانیت قلب ہے۔

اسی طرح آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ کشمیر میں حضرت سید عبدالرحمن بلبل نے سب سے پہلے اسلام پھیلا یا وہ خود حنفی المذہب تھے آپ کے بعد جناب امیر کبیر سیر سید علی ہمدانی نے بھی اس ملک میں حنفی عقیدت ہی کی تعلیم فرمائی۔ حالانکہ وہ خود شافعی المسلک تھے۔ کیونکہ جب کسی

جماعت نے اپنا ایک مذہب مقرر کیا تو پھر اس میں دوسرا مذہب جو نسا فتنہ و فسادات کا باعث ہے۔ اور قرآن عزیز بھی اس سے منع کرتا ہے۔ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔

غرض احقر نے آپ کی صحبت میں تمام مذہبی شکوک رفع کئے ہیں اس کو تاہ مضمون میں ان کا اندراج طول کلام ہوگا۔ الکلام ما قل ودل۔

حضرت شاہ صاحب کے متعلق یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ آپ حضرت بابا مسعود ضروریؒ کی اولاد مجاز میں سے ہیں۔ الناس معادن کمعادن الذهب والفضة۔ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ لوگوں میں کانیں ہیں جس طرح کے سونے اور چاندی کی کانیں ہیں۔ اس حدیث شریف کی رو سے آپ اپنے جد بزرگوار کی علمی کان کے ایک امانتدار تھے۔ شیخ علی متقی محدث ایک آریہ کریم کے اقتباس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ صلاحیۃ الاب تورث للولد ولو طغی۔ یعنی باپ کی بزرگی اولاد کو ورثہ میں ملتی ہے۔ اگرچہ وہ (بالفرض) نافرمان ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی دلیل وجہوت یہ ہے کہ وکان ابوہما صالحا یہ واقعہ حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت خضرؑ کی ملاقات کے سلسلے میں قرآن کریم میں مذکور ہے۔

غرض حضرت بابا مسعود ضروریؒ اس قسم کے متقی، عارف اور صوفی صافی تھے کہ حضرت میر سید میرک اندرابیؒ نے اپنی صاحبزادی کا عقد ان سے ہاندھا۔ حالانکہ شیخ مسعود آل صوری نہیں تھے۔ مگر آل معنوی ضرور تھے۔ کیونکہ کمل نقی الہی۔ باوجود اس کے حضرت شاہ صاحب کی فتویٰ شعاری کا یہ مقام تھا کہ اس مضمون کے ماتحت کسی اخبار نویس نے آپ کے اسم گرامی کے ساتھ سید لکھا یہ ہمارے ہی وقت کا واقعہ ہے کہ حضرت نے اس بارے میں ایک بیان اخباروں میں بھیجا کہ۔

”میں رسول اللہؐ کی اولاد کا غلام ہوں، محبت عترت ہوں، سید نہیں ہوں۔“

آپ ﷺ سے کوئی استفتاء کرتا تو ہرگز کوئی اجرت نہیں مانگتے اور نہ ہی لیتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ کے والد بزرگوار مولانا معظم شاہ صاحب کی خدمت میں اکثر لولاب کے لوگ استفتاء کے لئے آتے رہتے اور ہدیہ کے طور پر کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور ساتھ لے آتے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے کچھ سیب لائے۔ شاہ صاحب کی نظر جب اس شخص پر پڑی تو سخت رنجیدہ ہوئے۔ اپنے والد ماجد سے کمال ادب سے عرض کی کہ فتویٰ لکھنے کے عوض کوئی تحفہ نہ لیا کریں ہاں ہدیہ لینا کوئی ناجائز، امر نہیں۔ تہادو ابحابو احدیث صحیح ہے۔ ہدیہ دینے سے محبت بڑھتی ہے مگر فتویٰ لکھتے وقت ہدیہ قبول کرنا مشتبہ امر ہے ❶۔

❶۔ آج کل کے جو فتویٰ فروش مفتی اور حکم پرست نیم ملا فتویٰ لکھنے سے پہلے ہی مستغنی سے چکا کا اجرت فتویٰ حاصل کرتے ہیں ان کی ضمیر کی آنکھیں کھولنے کے لئے حضرت شاہ صاحب کا یہ ارشاد سرمہ بصیرت ہونا چاہئے۔ کوئو

آہ کایں قمری فردوس مکان آمدورفت
 بلبل آسا بگلستان جہاں آمدورفت
 آکاہ میں ماہ منور چہ شیعہ انور بود
 ہچو نور قمری آہ چاں آمدورفت
 پر تو مہر درخشان، بچمانے نمود
 صبح دیش بسر ما نور فشاں آمدورفت
 گرچہ خفاش صفت ماند ز نورش محروم
 ہچو خورشید ضیالیک عیان آمدورفت
 مرہم زخم جگر داروی درد دلبا
 چوں مسیحا بمریضان گمان آمدورفت
 فطرت ایں پیش رو زمرۂ اہل ایقان
 زین خرابات جہاں سوئی جناں آمدورفت
 ☆☆☆☆☆☆

نمونہ

ملفوظاتِ انور

- ۱۔ علم سے (صرف) معاش کا کام لینا اور اسی مقصد کے لئے اسے حاصل کرنا ایک بدترین مصیبت ہے ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو بازار سے ایک قیمتی مثال اس لئے خرید کر تا ہے کہ وہ اس سے اپنے جوتے صاف کیا کرے گا۔ (بحوالہ تاریخ دیوبند ۴۰۰)
- ۲۔ اشہد ان محمد رسول اللہ۔ کے وقت انگوٹھا چومنا بے اصل ہے، سو ایک اثر کے جسے حضرت ابو بکرؓ سے ملا علی قاریؒ نے موضوعات میں ذکر کیا ہے لیکن وہ منکر و ضعیف ہے۔ مولانا عبدالحیؒ نے السعایہ (حاشیہ شرح وقایہ) میں بسیط بحث کی ہے۔ (فیض الباری جلد ۲ ص ۶۶)
- ۳۔ میلاد کا قیام بدعت ہے۔ تاریخ ابن خلکان میں ہے کہ ملک اربل نے اسے رائج کیا ابن وحیہ نے میلاد کی کتاب لکھی تھی۔ سید یحییٰ اور ابن حجر قوسو السید کم سعد ابن

معاذ پر قیاس کر کے اجازت دیتے ہیں۔ مگر قیاس مع الفارق اور قیاس المحقق علی السوہوم ہے۔ (فیض الباری ج ۲ ص ۳۱۹)

۳۔ مولینا شمس تبریز خان صاحب آرومی رسالہ دارالعلوم (جولائی ۱۹۶۷ء) میں مقدمہ مشککات القرآن کے حوالہ سے رقمطراز ہیں:

”آپ کی (یعنی حضرت شاہ صاحب کی) رائے تھی کہ قرآن کا اسلوب تالیف و ترتیب کا نہیں بلکہ خطیبانہ اسلوب ہے جو سامعین کا لحاظ رکھتا ہے اور حسب موقع گفتگو کا رخ بدلتا رہتا ہے۔ کیونکہ عرب کا مزاج ایسا ہی تھا۔ آپ کا کہنا تھا کہ قرآن واقعات کی کتھونی اور حیات و ممات کا رجسٹر نہیں بننا چاہتا، بلکہ اس کا مقصد تذکیر و نصیحت اور عبرت و موعظت ہے اس لئے واقعات کا بھی اسی حد تک ذکر کرتا ہے اور اجمال و تفصیل سے کام لیتا ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ قرآنی بیانات کی تکرار قندمکر کا لطف دیتی ہے۔ اسی لئے قرآن خود اپنی تفسیر و تشریح بھی کرتا ہے۔ جس سے موضوع کی اصحیت بھی کھل جاتی ہے۔ جیسے نماز کا ذکر ۹۰۰ مرتبہ سے زیادہ آیا ہے۔ مولینا حمید الدین فراہی (صاحب نظام القرآن) کی طرح شاہ صاحب بھی ربط آیات اور قرآن مکمل منظم اور مربوط ہونے کے قائل تھے۔ فرماتے تھے کہ ہم اپنی کم نہی سے وہ ربط نہیں سمجھ پاتے، مگر فقہاء کے مرتب کلام کی طرح ہر بات کسی اصل اور قاعدے کے تحت ہوتی ہے۔ نسخ قرآن کے وہ قائل نہ تھے۔ سیوطی میں آیتوں اور شاہ ولی اللہ صاحب پانچ آیتوں میں (نسخ کے) قائل ہیں۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ بظاہر منسوخ آیتوں کا حکم بھی کسی نہ کسی طرح موجود ہے۔ وہ قرآن میں کسی زائد حرف کے بھی قائل نہ تھے۔ بلکہ ایسے حروف کو کسی مزید فائدہ پر مشتمل سمجھتے تھے۔“ (مقدمہ مشککات القرآن ج ۶ ص ۸۰)

۵۔ ”عالم برزخ یہی زمین و آسمان کے درمیان کی فضا ہے۔“ (بحوالہ حیات نور ص ۱۹)

۶۔ احادیث مقدسہ سے معلوم ہوتا ہے کہ روحمیں قیامت تک عالم برزخ میں رہیں گی۔ جنت یا دوزخ میں داخلہ قیامت کے روز حساب و کتاب کے بعد ہوگا۔ قیامت تک جنت یا دوزخ کے آرام یا تکلیف ان روحوں پر پہنچتے رہتے ہیں اور وہ ان اثرات کی راحت یا اذیت محسوس کرتی رہتی ہیں۔ (بحوالہ حیات نور ص ۱۹)

۷۔ (ایک دفعہ عقلی۔ سائل پر گفتگو کرتے ہوئے فرمانے لگے)

”ذرا ان منطقیوں کے حماقت ملاحظہ کیجئے کہ درخت ایک مرکب حقیقت ہے، جڑ، تناء،

شاخیں، برگ و بار سب ہی اس کے اجزاء ہیں فرق سمجھئے کہ کوئی ہلکا سا چاگر گیا تو منطقی کہہ دے گا کہ درخت باقی نہ رہا اس لئے کہ جز کا ارتقاع کل کے ارتقاع کو ملزم ہے۔ (دارالعلوم مکہ ۱۷۱۹ء ص ۱۲)

۸۔ حافظ ابن حجر سے فخر کی سنتوں کے بارے میں حدیث کی مراد سمجھنے میں سہو ہوا ہے، حالانکہ فخر کی سنتوں کے بارے میں ترمذی لکھتا ہے۔ ”من لم یصل رکعتی الفجر فلیصلها ما تطلع الشمس“ یہ حدیث مسند احمد اور دارقطنی میں پانچ طریقوں سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ تین سنن و بیہقی، دو صحیح سنن ابن حبان، دو مستدرک اور ایک طبقات ذہبی کی سنن کبریٰ اور طحاوی میں ہیں ان سب کا مدار حدیث قتادہ ہے۔ (العرف الشذی علی جامع الترمذی ص ۹۲، ۹۳ مطبع القاسمیہ)

۹۔ ”اگر آدمی صحیح بصیرت کے ساتھ احادیث میں غور و فکر کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ اکثر و بیشتر احادیث قرآن کے اجمال کا بیان اور اس کے اشارات کی توضیحات ہیں بلکہ کثرت سے ایسی احادیث ہیں جن میں تعبیرات قرآنی کے لطیف اشارے ملتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے مطالعہ کے لئے سیوطی کی درمنثور بہت مفید کتاب ہے۔“ (مقدمہ مشکاۃ القرآن از مولینا محمد یوسف صاحب بنوری ص ۱۴)

۱۰۔ کل امت کا اس پر اجماع ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں ناروا الفاظ کہنے والا کافر ہے۔ اور جو شخص اس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔ (اکفار الملحدین فی ضروریات الدین ص ۳۳)

۱۱۔ فلسفہ قدیم البعد عن الاسلام ہے۔ اور فلسفہ جدید اقرب الی الاسلام ہے۔ حق تعالیٰ کی مشیت ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جن عقلاء زمانہ نے اسلامی چیزیں معجزات و روحانیت وغیرہ کا انکار کیا تھا، ان ہی کے فلسفہ ریسرچ اور تحقیقات سے وہ سب چیزیں دنیا والوں کے لئے ثابت و مشاہد ہو جائیں۔

(چنانچہ روح اور روحانیت کا اقرار وہ کر چکے، خوارق و عادات بھی تسلیم ہو چکے جن سے معجزات اسلام کا استبعاد عقل ختم ہوا۔)

قرآن مجید میں ہے اہل جنت و اہل جہنم آپس میں ایک دوسرے کو دیکھیں گے پہچانیں گے اور باتیں کریں گے حالانکہ ان کے درمیان بہت غیر معمولی فاصلہ ہوگا۔ تو اب ٹیلیفون، سلی، تلفراف، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجادات نے اس کو بھی قریب عقل و مشاہد کیا ہے۔

اصوات و اعمال کا ریکارڈ مستبعد سمجھا جاتا تھا مگر گراموفون کی ایجاد نے اس سے بھی مانوس کر دیا کہ حق تعالیٰ نے زمین اور اس کے متعلقات میں بھی اخذ و ریکارڈ کا مادہ و ذریعہ فرما دیا تھا۔ جس کو ہم یورپ کی ان ایجادات سے پہلے عقل و مشاہدہ کی رو سے نہ سمجھ سکتے تھے۔

(نطق انور حصہ اول ص ۶۱۔ از مولانا سید احمد رضا صاحب بخنوری)

۱۲۔ آخرت میں اعمال کا ثمرہ جو ملے گا وہی عمل ہو گئے۔ ان کی ایک صورت ہے کہ عالم دنیا کی اور دوسری عالم آخرت کی، عمل ایک ہی ہے لیکن مکان کے اعتبار سے فرق ہے کہ وہی عمل وہاں جزاء کی صورت میں ہوگا۔ اور اس کی دلیل آیت قرآنی و وجہ دوا ماعملو حاضر ہے۔ جس کے ایک معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ بعینہ اپنے کئے ہوئے اعمال ہی کو آخرت میں موجود پائیں گے۔ اور یہ مفہوم دوسری آیات و احادیث سے بھی مؤید ہوتا ہے۔

(نطق انور حصہ اول ص ۹۰)

۱۳۔ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کا کشف ہے کہ ”محشر میں پیشی کے وقت وہی طرف اللہ اکبر، بائیں طرف سبحان اللہ، پچھلی طرف الحمد للہ اور سامنے سے لا الہ الا اللہ یہ چاروں کلمات رفیق ہوں گے۔

یہ ترتیب اس لئے ہے کہ اللہ اکبر اعلان کی چیز ہے، چنانچہ نعرہ بکبیر جہاد وغیرہ میں ہے اور یہ علم جہاد بھی داہنے ہاتھ میں ہوتا ہے لہذا وہی جانب مناسب ہے۔

سبحان اللہ تسبیح ہے نقائص و عیوب سے اور صفت سلبی ہے۔ لہذا اذ حال کی جگہ (بائیں طرف) مناسب ہے۔ الحمد للہ یہ آخر میں اور ہر کام کے پیچھے ہوا کرتا ہے، جیسے کھانے کے بعد، اور ترازو میں بھی آخر میں ہوگا۔ لہذا پیچھے ہونا مناسب ہے۔ اور لا الہ الا اللہ چونکہ ہادی اور رہنما ہے۔ اس کا سامنا ہونا مناسب ہے۔ (نطق انور حصہ اول ص ۹۲)

۱۴۔ حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کی وجہ علم زیادہ ہونا ملائکہ سے بتلایا جاتا ہے لیکن میرے نزدیک چونکہ حضرت آدم کی خلقت ہی میں عبدیت زیادہ تھی۔ بہ نسبت ملائکہ کے اس لئے وہ خلافت سے سرفراز ہوئے ہیں۔ کیونکہ خلافت عطا فرمانے کی بات اور اس پر ملائکہ کی طرف سے عرض و معروض پہلے ہی ہو چکی تھی، پھر جب یہ مکالمہ (یا مناظرہ) ختم ہو چکا تو حق تعالیٰ نے ایک کرشمہ بھی دکھایا کہ حضرت آدم کو علم عطا فرما کر ظاہر میں حجت بھی قائم فرمادی یعنی ارشاد خداوندی عطا و منصب خلافت پر ملائکہ نے بنی آدم کے ظاہری احوال سے ”منفق

دعا "وفساد فی الارض" کا اندازہ لگا کر جو بے محل سوال کر دیا تھا حق تعالیٰ نے صرف انہی اعلیٰ ممالک تعلمون فرمادیا اور فرشتے بھی اپنے بے محل سوال پر نادم ہو گئے، پھر بعد کے واقعات نے ظاہر کر دیا کہ حضرت آدمؑ نے ہر موقع پر جناب باری میں نہایت عاجزی، غایت تذلل اور تقضیر و اجتناب ہی کا اظہار کیا، اور کوئی بات بھی بجز عبودیت کے ظاہر نہ فرمائی، حالانکہ وہ بھی حجت و دلیل اور سوال و جواب کی راہ اختیار کر سکتے تھے، چنانچہ جب حضرت موسیٰ سے مناظرہ ہوا تو حضرت آدمؑ نے ایسی قوی حجت پیش فرمائی کہ حسب ارشاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے، ظاہر ہے کہ یہی دلیل وہ حق تعالیٰ کی جناب میں بھی پیش کر سکتے تھے، مگر وہاں ایک حرف بھی بطور عذر گناہ نہیں کہا، بلکہ اس کے برخلاف اپنی قصور ہی کا اعتراف فرما کر مدت دراز تک توبہ و استغفار، عجز و نیاز اور گریہ و زاری میں مصروف رہے، میرے نزدیک یہی عبودیت اور سراپا اطاعت و نیاز مندی کا وہ مقام تھا جس کی وجہ سے حضرت آدمؑ خصوصی فضیلت اور خلعت خلافت سے سرفراز ہوئے ہیں پھر اس کے بعد جو حق تعالیٰ نے حضرت آدمؑ علیہ السلام کے وصف علم کو اس موقع پر نمایاں کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کا وصف ظاہر تھا، جس کو سب معلوم کر سکتے تھے، اس لئے نہیں کہ وہ مدار فضیلت تھا، بخلاف وصف عبودیت کے کہ وہ مشہور و پوشیدہ وصف تھا، جس کو معلوم کرنا دشوار تھا۔ الخ (نطق نور حصہ اول ص ۱۶۶-۱۶۷)

۱۵۔ امام شافعیؒ چونکہ فقیہ النفس تھے اس لئے انہوں نے امام محمدؒ کی کما حقہ تعریف کی ہے۔ کبھی فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ دل اور نگاہ دونوں کو بھر دیتے ہیں (کیونکہ خوب صورت تھے اور علم بھی اچھا تھا) کبھی فرماتے ہیں کہ جب امام محمدؒ گفتگو کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وحی نازل ہو رہی ہے، ایک بار فرمایا کہ میں نے ان سے دو اونٹوں کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا۔ جہاں تک محدثین کی بات ہے تو ان میں جو لوگ فقیہ نہیں ہیں انکو امام محمدؒ کی قدر و منزلت معلوم نہیں اس لئے ان لوگوں سے امام محمدؒ کے بارے میں تعریفی کلمات منقول نہیں ہیں۔ محدثین کی ناپسندگی کی وجہ یہ ہے کہ امام محمدؒ پہلے شخص ہیں جس نے فقہ کو حدیث سے الگ کیا۔ ان سے پہلے تصنیف کا انداز یہ تھا کہ حدیث اور فقہ کو ایک ساتھ مخلوط کر کے ذکر کرتے تھے۔ بہر حال چونکہ انہوں نے محدثین کے انداز کے خلاف کیا اس لئے ان لوگوں نے اس بارے میں ان کو مطعون کیا حالانکہ آخر کار تمام مذاہب والوں کو ان کی اتباع کرنی پڑی اور سب نے انہیں کا طریقہ کار اختیار کیا۔ (فیض الباری ج ۱۵۲-۱۵۳)

۱۶۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے فرمایا کہ فلاسفہ میں سے کوئی بھی عالم کے قدیم ہونے کے قائل نہیں ہے، افلاطون بھی عالم کو حادث کہتا تھا۔ یہاں تک کہ رسوائے زمانہ ارسطو آیا اس نے عالم کے قدیم ہونے کا اعتقاد قائم کیا لیکن یہ اعتقاد بالکل غلط ہے۔ اس کا قائل کا فر ہے ۱۔ تمام آسمانی مذاہب بھی عالم کے حادث ہونے پر متفق ہیں۔ ہاں بعض صوفیاء کی طرف منسوب ہے کہ انہوں نے بعض چیزوں کو قدیم مانا ہے۔ مثلاً شیخ اکبر، علامہ شعرانی شافعی نے فرمایا ہے کہ یہ عبارتیں بعد کی ملائی ہوئی ہیں، میرا خیال یہ ہے کہ شیخ اکبر بعض مسائل میں منفرد ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فرعون کے ایمان کا اعتبار کر لیا ہے۔ اگر اس نے توبہ نہ کی ہوگی تو اس کو اس کے اعمال کی سزا ملے گی مگر شیخ اکبر کے نزدیک وہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رکھا جائیگا۔ بحر العلوم نے شیخ اکبر کی طرف بعض اشیاء کے قدیم ہونے کو منسوب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نسبت صحیح ہے لیکن دوانی نے ابن تیمیہ کی طرف عرش کے قدیم ہونے کی جو نسبت کی ہے یہ درست نہیں ہے۔ (فیض الباری ج ۱ ص ۱۶۶)

۱۷۔ جان لو کہ فلاسفہ میں کوئی حدوث ذاتی کا قائل نہیں تھا، ابن سینا نے آکر یہ اصطلاح ایجاد کی اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام اور فلسفہ کے درمیان بیچ کا راستہ نکال لے۔ فلاسفہ یونان افلاک اور عناصر کو شخصی طور پر قدیم مان رہے تھے اور موالید مثلثہ (جمادات حیوانات، نباتات) کو نوعی اعتبار سے قدیم مانتے تھے۔ میں نے اپنے رسالہ میں اس عقیدہ کے بطلان کو واضح کیا ہے۔ ابن رشد نے

تہافت التہافت نامی ایک کتاب لکھی ہے جس کے اندر امام غزالی پر اعتراضات کئے ہیں، میں نے غزالی پر کئے گئے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ایک رسالہ لکھا ہے مگر اب تک اس کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ میرے خیال میں ابن رشد ابن سینا سے زیادہ ماہر ہے اور ارسطو کا کلام ابن سینا سے زیادہ سمجھتا ہے۔ (فیض الباری ج ۱ ص ۱۶۶)



حضرت شاہ صاحبؒ کے عربی کلام کا نمونہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے ”اکسفار الملح الدین فی شنی من ضروریات الدین“ کے نام سے ایک رسالہ تصنیف فرمایا ہے جس میں مسائل اجماعیہ و قطعیہ کے منکرین اور ضروریات دین یعنی متواترات شرعیہ میں تاویلیں کرنے والوں کی تکفیر کا مسئلہ کافی اور دافی دلائل کے ساتھ نہایت شرح و بسط سے واضح فرمایا ہے۔ اس رسالہ میں حضرت ممدوحؒ نے ایک قطعہ انجاماز یہ بھی نظم فرمایا ہے جو ائمہ محمدیہؑ اور بالخصوص علماء کی خدمت میں بطور استدعاء کے ہے اس میں مرزا قادیانی علیہ ماعلیہ کی کفریات (جن کی وجہ سے وہ کافر قطعی قرار پایا) کی تردید میں دلائل دیئے گئے ہیں۔

حضرت موصوفؒ قدس سرہ کے ارشد تلمیذ حضرت مولانا سید محمد اور یس صاحب سکھر وڑوی مرحوم نے ان اشعار کا اردو ترجمہ بہ تکمیل حوالہ جات ضروری تشریح کے ساتھ۔

”صَدْعُ النِّقَابِ عَنْ جَسَاسَةِ الْفَنِّ جَاب“

نام کے رسالہ میں شائع کیا ہے۔ یہ رسالہ ۱۹۲۵ء میں مطبع قاسمی دیوبند سے ”اصل“ کی تمام تر خوبیوں کا برقرار رہنا ممکن نہیں اس لیے ہم حضرت موصوفؒ کی عربی نظم بھی ترجمے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ قارئین کرام کی خدمت میں مختصر حواشی کے ساتھ ہماری یہ پیش کش خیر نکاح بھی ہے اور بطور نمونہ کلام حضرت ممدوحؒ بھی۔

کوئٹہ عفی عنہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْآيَا عِبَادَ اللَّهِ قَوْمُوا وَقَوْمُوا خُطُوبًا أَلَمْتُ مَا لَهْنُ يَذَانُ

خبردار! خدا کے بند و تیار ہو جاؤ اور جو نا قابل برداشت مصائب ٹوٹ پڑے ہیں اُن کو درست کر دو۔

وَقَدْ كَانَ يَنْقُضُ الْهُدَى وَمَنَارُهُ وَذُخْرُوحِ خَيْرٌ مَّا لِذَاكَ تَذَانُ

بہت قریب ہے کہ ہدایت اور نشان ہدایت گر جائیں اور خیر دور ہو گئی ہے جو پھر نزدیک

ہونے کو نہیں ہے۔

۱۔ اس شعر میں حضرت شاہ صاحبؒ کی غرض اُمت مرحومہ اور بالخصوص جماعت علماء کو قادیانی فتنہ کی طرف توجہ دلانا ہے۔

۲۔ ہدایت اور نشان ہدایت گر جانے سے آیات قرآنی میں فتنہ قسطنطنیہ اور انبیاء علیہم السلام کی توجین و تذلیل کے جانے

کی طرف اشارہ ہے۔

يُسَبِّحُ رَسُوْلٌ مِّنْ اَوْلٰى الْعِزْمِ فِيْكُمْ نَكَاذُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تَنْفَطِرٰنِ

ایک اولوالعزم رسول تمہارے سامنے ذلیل کیا جا رہا ہے قریب ہے کہ آسمان اور زمین پھٹ پڑیں۔

وَطَهَّرَهُ مِّنْ اَهْلِ كُفْرٍ وَلِئِنَّ

جس رسول کو حق تعالیٰ نے کافروں کے ناپاک ہاتھوں سے پاک کیا اور محض دوزخ کے لئے بعض کفر جھوٹی موت کی خیال بند یوں کا چھوڑ دیا۔

وَحَارَبَ قَوْمَ رَبِّهِمْ وَنَبِيَّهُ

ایک قوم نے اپنے خدا اور نبی سے لڑائی باندھی۔ پس تم اللہ کی مدد پر کھڑے ہو جاؤ جو تمہارے قریب ہے۔

وَقَدْ عَیَّلَ صَبْرِيْ فِیْ نَبِيَّكَ حَذُوْدِهِ

خدا کی حدود توڑی جانے کی وجہ سے میرا صبر مغلوب ہو گیا، پس ہے کوئی اس جگہ ٹلانے والا یا میری آواز کا جواب دینے والا؟

وَاِذْ عَزَّ خَطْبُ جَنَّتْ مُسْتَصِرًا بِكُمْ

اور جب مصیبت حد سے بڑھ گئی تو میں تم سے مدد چاہنے آیا، پس اے قوم ہے کوئی فریاد رس جو میرے نزدیک ہو۔

لَعَصْرِيْ لَقَدْ نَهَيْتُ مَنْ كَانَ نَاعِيًا

قسم ہے مجھے کہ میں نے سوتے کو جگایا اور جس کے کان تھے اُس کو سنایا

وَنَادَيْتُ قَوْمًا فِیْ فَرِیْضَةِ رَبِّهِمْ

اور قوم کو اُس کے خدا کی فرض کی طرف بلایا پس ہے کو زمانہ میں جو میرا مددگار ہو؟

دَعُوْا كُلَّ اَمْرٍ وَاسْتَقِیْمُوْا لِمَا ذَهَبِ

وَقَدْ عَاذَ فَرَضُ الْعَيْنِ عِنْدَ عِبَانِ

سب کو چھوڑ دو اور جو فتنہ درپیش ہے اس کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اگر آنکھ کھول کر دیکھے تو ہر شخص پر فرض عین ہو گیا ہے۔

۱۔ رسول اولوالعزم سے مراد یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جن کی توہین و تذلیل میں مرزا قادیانی نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

۲۔ اس شعر میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے ہاتھوں سے ماسون دیکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

۳۔ قوم سے مراد یہاں مدحدہ اور شیطانی کی ایک مخصوص جماعت قادیانی گروہ ہے۔

۴۔ ان اشعار میں اس فتنہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ تمام فتنوں سے بڑھ کر یہ فتنہ ہے۔ اس کے اندر کی فکر ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔

فَشَانِي شَانَ الْأَنْبِيَاءِ مُكْفَرٌ وَمَنْ شَكَ قُلْ هَذَا لِأَوَّلِ ثَانٍ

انبیاء کی توہین کرنے والا کافر ہے۔ اور جو اس کے کفر میں شک کرے وہ پہلے کا دوسرا ہے۔
وَأَكْفَرُ مِنْهُ مَنْ تَنَبَّأَ كَذِبًا وَكَانَ انْتِهَتْ مَا آمَنَتْ بِمَكَانٍ

اور اس سے بھی بڑھ کر وہ شخص کافر ہے جس نے جھوٹا دعویٰ نبوت کیا، حالانکہ نبوت ختم ہو چکی تھی۔
وَمَنْ ذُبَعْنَهُ أَوْ تَأَوَّلَ قَوْلَهُ يَكْفُرُ قَطْعًا لَيْسَ فِيهِ تَوَانٌ

اور جس نے اس کے قول کی تاویل یا اس کی طرف داری کی وہ بھی یقیناً بلا توقف کافر کہا جائے گا۔
كَانِي بِكُمْ قَدْ قُلْتُمُوهُ لِمَ كُفِرْتُمْ نَهَاكُمْ نَقُولًا جَلِيلًا لِمَعَانٍ

عالم! تم مجھ سے پوچھو گے وہ کیوں کافر ہے؟ تو تم نے لو نکلیں اس کے کفر کی جو باتو توفیق کے لئے ظاہر ہیں۔

فَمَا قَوْلُكُمْ فِي مَنْ حَبَا مِنْكُمْ ذَلِكُمْ مُسِيلَمَةُ الْكَذَّابِ أَهْلُ هَوَانٍ
تمہارا اس شخص کے حق میں کیا عقیدہ ہے جس نے مسیلمہ کذاب (مدعی نبوت) کے حق میں ایسی مہربانی کی جو مسیلمہ ذلیل اور رسوا ہے۔

فَقَالَ لَهُ التَّائَوِيلُ أَوْ قَالَ لَمْ يَكُنْ نَبِيًّا هُوَ الْمَهْدِيُّ لَيْسَ بِجَانٍ
پس وہ کہنے لگا کہ مسیلمہ کے لئے بھی تاویل ہے یا کہا کہ مسیلمہ نبی نہ تھا وہ تو مہدی تھا مجرم نہیں ہے۔

وَأَهْلٌ تَمْفَرِّقُ يَسْتَطِيعُ مُكَابِرًا وَحَيْثُ ادَّعَى نَبَاتِنَا بَيَانٍ
اور کیا کوئی مذکور مسیلمہ اور اس جھوٹے نبی میں فرق کر سکتا ہے اور اگر کوئی مُذَّعِی فرق ہے تو بیان کرے۔

وَكَانَ عَلَى أَهْدَاثِهِ وَجْهٌ كُفْرُهُ تَنْوُوهَ مَشْهُودٌ كُلُّ آوَانٍ
مسیلمہ کے کفر کی وجہ پاؤں اور بہت سے مختصرات کے دعویٰ نبوت ہی مشہور وجہ ہر وقت ہوئی ہے۔

كَذَّابِي أَحَادِيثِ النَّبِيِّ وَبَعْدَهُ تَوَاتُرَ فِيمَا ذَانَهُ الثَّقَلَانِ
احادیث نبی ہیں اور اس کے بعد تمام حق و انس میں دعویٰ نبوت ہی اس کے کفر کی وجہ متواتر رہی۔

۱۔ اس شعر میں مرزا کے کفر کی وجوہات میں سے ایک وجہ کفر سمجھایا گیا ہے یعنی اس نے انبیاء علیہم السلام کی توہین و تذلیل کی ہے جو اس کے کفر کی علت اور سبب ہے اور اس کے کفر میں شک کرنے والی ایک دوسری جماعت (لاہوری) کے کفر کی بھی تصریح فرمائی ہے۔۔۔۔۔ کسی مُذَّعِی نبوت کے قول میں تاویل کرنا یا اس کے قائل تحسین کرنا بھی ویسا ہی کفر ہے جیسا کہ اس کلمہ کفر کا کہنا کفر ہے۔۔۔۔۔ اس شعر میں علامہ مرحوم کا مقصد اس امر کا سمجھانا ہے کہ آئندہ اشعار میں جھوٹے مذہبیان نبوت کے واقعات اور ان کے متعلق علماء امت کے فیصلہ جو عظیم کئے گئے ہیں وہ مرزا کے کفر کے اظہار ہیں جن سے مرزا کے لئے بھی فتویٰ لیا جائے۔

لَمَّا لَمْ تَكُنْ أَوْقَدْ وَجُوهَ لِكُفْرِهِ فَأَسِرُّهَا دَعْوَاهُ بَلْ كَ كَمَا نِي ۱

مسئلہ کے کفر کی وجوہ اور ہوں یا نہ ہوں مگر بڑی چلتی ہوئی مشہور وجہ دعویٰ نبوت ہے جیسے مانی (کذاب) کے کفر کی وجہ دعویٰ نبوت تھی۔

وَأَوَّلَ اجْتِمَاعٍ تَحْقِيقَ عِنْدَنَا لَفِيهِ بِإِكْفَارٍ وَسَبِي عَوَانِي ۲

اور سب سے پہلا اجتماع جو ہمارے علم میں ثابت ہوا ہے وہ مسئلہ کی تکفیر اور ان کی عورتوں کی اسیر کر لانے میں ہوا ہے۔

وَكَانَ مُقَرَّراً بِالنَّبُوءَةِ مُغْلَبًا لِخَيْرِ الْوَرْدِي فِي قَوْلِهِ وَأَذَان ۳

باوجود یہ کہ مسئلہ نبی خیر البشر کی نبوت کا اپنے قول اور اذان میں اعلان اور اقرار کرتا تھا۔

وَمَا قَوْلُكُمْ فِي الْعِيسَوِيَّةِ أَوْلُوا رَسُولًا لَا مُبَيِّنَ خَيْرًا كَيَان ۴

تمہارا کیا فتویٰ ہے فرقہ عیسویہ میں جو یہ کہتا ہے کہ نبی خیر الکائنات کی رسالت صرف اُمیوں ہی کے لئے ہے۔

وَهَلْ لَمْ مَالًا فِيهِ تَأْوِيلٌ مُلْحَدٍ وَمَنْ حَجَرَ التَّأْوِيلَ رَمَى لِسَان ۵

اور کون سی جگہ ہے جہاں ملحد تاویل نہ کر سکے اور کون ہے جو تاویل کرنے والے کی زبان ہانگنی بند کر دے۔

وَهَلْ فِي ضَرُورِيَّاتِ دِينٍ تَأْوِيلٌ يَتَخَرَّبُ فِيهَا إِلَّا كَكُفْرِ عِلَان ۶

اور کیا ضروریات دین میں تحریف کر کے تاویل کرنا صریح کفر نہیں ہے؟

وَمَنْ لَمْ يُكْفِرْ مُنْكَرِهَا فَإِنَّهُ يَجْرُ الْإِنْكَارَ يَسْتَوِيَان ۷

اور جو ضروریات دین کی تکفیر نہیں کرتا وہ انکار ضروریات کو اپنے سر لیتا ہے۔

۱۔ مانی کذاب مذہبی نبوت کی طرح مسئلہ کذاب کی تکفیر کا سبب بھی اذہانی نبوت ہوا ہے اور دونوں باتفاق امت دعویٰ نبوت کی بنا پر کافر قرار دیئے گئے اور قتل کئے گئے۔ ۲۔ مسئلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ میں مذہبی نبوت ہوا اور آج پنجاب کی وفات کے بعد سیدنا ابو بکر صدیق خلیفہ وقت نے مسئلہ پر چڑھائی کی اور نصرت و کامیابی کے ساتھ قتال کیا اور ان کی عورتوں کو اسیر کر کے لائے۔ ۳۔ مسئلہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ماننا تھا مگر یہ کہتا تھا کہ مجھے بھی نبوت میں شریک کیا گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے جو خط نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تھا اس میں لکھا تھا (رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کی خدمت میں یہ ہے کہ میں امر میں شریک کیا گیا ہوں یعنی مجھ کو نبوت میں خدا کی طرف سے شریک کیا گیا ہے)۔ ۴۔ عیسائی اسمبلی ایک شخص کا نام ہے جس کی طرف نسبت کر کے یہودیوں کی ایک جماعت کو عیسویہ کہا جاتا ہے اس شخص کا خیال تھا کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسول برحق ہیں مگر آپ کی بعثت اور رسالت صرف اُمیوں کی طرف ہوئی ہے۔ ہمارے لئے رسول بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

وَمَا الدِّينُ إِلَّا بَيْعَةٌ مَّعْنَوِيَّةٌ وَمَا هُوَ كَمَا لَا نَسَابَ فِي السَّرِيَانِ ۱
دین تو صرف ایک بیعت معنویہ ہے۔ وہ نبیوں کی طرح چلنے والا نہیں۔

فَبِأَنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ فَاتْلُهَا وَلَكِنْ بَيِّنَاتٍ مَّا مَعَانِي ۲
مشرکین بھی نبی کریم ﷺ کی تکذیب نہیں کرتے تھے۔ پڑھ لو وَلَكِنْ الظَّالِمِينَ ۱۔ الخ
مگر خدا نے مال اور انجام کے اعتبار سے اُن کو منکر قرار دیا۔

تَبَا أَن لَا يُمْتَرَى بِبَطَالَةٍ كَحَجَّامٍ سَابَاطٍ صَرِيحُ غَوَانِ ۳
ساباط کے رہنے والے حجام کی طرح ایک نازنینوں کے پچھاڑے ہوئے نے بیکاری سے
بچنے کی وجہ سے دعویٰ نبوت کیا۔

وَمَعْجَزَةٌ مَّنْكَوْحَةٌ فَلِكَيْتَ يُضَادِفُهَا فِي رُقِيَةِ الْكَرَوَانِ ۴
اور اس کا معجزہ ایک منکوحہ آسمانی ہے جن کو منتر اُطوق کری اُطوق کری ان النعمانۃ فی القری
کہہ کر پانے کی امید کرتا ہے۔

وَمَنْ لِّهُ الشَّيْطَانُ فِيهَا بَوْحِيهِ رِقَاءٌ وَوَصْلًا خِطْبَةً وَتَهَانِي ۵
اور اس منکوحہ کے قصہ میں شیطان نے مرد کو اپنی وحی سے آسائش اور منگنی اور وصل کی آواز دلائی۔
فَقَضَّحَهُ رَبُّ السَّمَاءِ بِحَوْلِهِ وَقَوَّيْتَهُ وَاللَّهُ فِيهِ كَفَانِي ۶
رَبُّ السَّمَوَاتِ نے اپنی طاقت و قوت سے اس کو خوب ہی رسوا کیا اور اس میں ہم کو اللہ کافی ہوا۔

۱۔۔۔۔۔ ان دو شعروں میں مرزا اور اُس کے ماننے والی جماعت کے کفر کی تیسری وجہ بیان کی گئی ہے۔ ختم نبوت و ختم رسالت اور ختم شریف کا مسئلہ ایک اجماعی اور قطعی اور ضروریات و متواترات فی الدین سے مانا گیا ہے جس کا منکر مَّا ذُلُّ قَطْعًا کافر ہے۔ ۲۔۔۔۔۔ اس شعر میں آیت کا اقتباس ہے۔ فَبِأَنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَكِنْ الظَّالِمِينَ بَيِّنَاتٍ مَّا مَعَانِي ۱۔ یعنی اے محمد! کفار تیری تکذیب نہیں کرتے لیکن وہ خدا کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ گو کفار مکہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا نہ کہا یا آپ کے مقولوں کو نہ جھٹلایا کیونکہ آپ کی راست بازی اور سچائی کو ہر ایک جانتا تھا لیکن انہوں نے خدا کی آیتوں سے تجھ کو کیا اور خدائی احکام کو بالآخر نہ مانا۔ اس لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے اُن پر کفر کا الزام ہوا اور انجام کار ان کو آیتوں کا منکر قرار دیا۔ مؤلف کی غرض اس میں مرزا کے کفر کی چوتھی وجہ بیان کرنی ہے کیونکہ اُس کی سب سے خدا کی آیتوں کا انکار لازم آتا ہے۔ ۳۔۔۔۔۔ ساباط ایک جگہ کا نام ہے، یہاں ایک حجام رہتا تھا جس کی عادت تھی کہ اپنی ماں کو چوراہے پر بٹھا کر اس کی حجامت بنایا کرتا تا کہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ہو کہ یہ بیکار ہے اور اس کے پاس کوئی حجامت بخوانے نہیں آتا، اسی طرح مرزا کو بھی سوچھی کہ مذہبی نبوت ہی بن جاوے۔ اس دامن میں آکر مخلوق خدا پھنس جائے گی۔ ۴۔۔۔۔۔ منکوحہ آسمانی سے محمدی پیغم کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس پر مرزا صاحب کی رال پک گئی تھی اور بہت سی تدبیریں کیں کہ کسی طرح یہ شکار ہاتھ آئے، کبھی اس کے والد کو خطوط لکھے اور کبھی معجزہ کی دھمکی دی، ہندوؤں الہامات میں نکاح کے مدعی رہے، اس کے بعد وعید کا بھی خوف دلایا، نکاح ہونے کو قضا، منہزم بھی ٹھہرایا۔ بہر حال آخر کار مرزا اس حسرت و آرزو کو اپنے ساتھ ہی لے گئے۔

اور کبھی نامرد کی طرح میدانِ خالی دیکھ کر ان ہی امور کو (جو دوسروں کے حوالہ سے نقل کرتا تھا) واقعی اور تحقیق بنالیتا ہے۔

وَيَنْبَغُ لِيْ اِنْشَاءِ ذَلِكَ كُفْرَهُ وَ يُغْرِبُ فِي عَيْسَى بِمَا هُوَ شَانِي
اور اس اثنا میں مرزا کفر اُگھاتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں بغض دلی کو ظاہر کرتا ہے۔
وَ كَانَ هُنَا شَيْءٌ لِتَحْرِيفِ عَهْدِهِمْ فَصَيَّرَهُ حَقًّا لِّحَيْثُ حَسَانَ
حال یہ ہے کہ نصاریٰ کے عہدِ قدیم و جدید کے مخزف ہونے کی وجہ سے ایک شے تھی جس کو
مرزائے اپنے بحثِ باطنی سے حق بنایا۔

وَقَدْ أَخَذُوا لِيْ مَالِكِ بْنِ نُؤَيْرَةَ بِصَاحِبِكُمْ لِلْمُصْطَفَى كَاذَابِي
صحابہ کرام علیہم السلام نے مالک بن نویرہ کو نبی کریم ﷺ کی شام میں لفظ صاحبکم ادنیٰ درجہ کا
لفظ کہنے پر گرفت کر کے قتل کیا۔

وَقِصَّةُ ذُبَاءِ رَأَى الْقَتْلَ عِنْدَهَا أَبُو يُوسُفَ الْقَاضِي وَلَاتِ أَوَانِ
امام ابو یوسفؒ نے ایک شخص کو یہ کہنے پر قتل کر دیئے جانے کا حکم دیا کہ مجھے کدو پسند نہیں اور
وہ وقت معافی کا نہ تھا۔

وَقَدْ عَمَلْتُ حُكْمَ الشَّرِيعَةِ فِيهِمْ حُكُومَةُ عَذْلِ لِلْأَمِيرِ أَمَانَ
امیر امان اللہ خان جلالت آب کی عادل حکومت نے اس مسئلہ میں حکمِ شریعت پر عمل کر کے فیصلہ کیا۔
فَحَطَّمْ فِي جَمِيعِ الْحُطَامِ وَ نَبَلَهَا وَ بَسَطَ الْمُنَى فِي حَاصِلَاتِ مَجَانِي
مرزا ابوڑھا ہو گیا دنیا کے کس و خاشاک جمع کرنے میں اور تمنا نہیں پوری کرنے میں چندہ
کی رقمیں جمع کر کے۔

وَ كُلُّ صَنِيعٍ آرَدَهَا فَعِنْدَهُ لِنَيْلِ الْمُنَى بِالطَّرْدِ وَالذُّوْرَانِ
اور جو تدبیر یا مکر ہے اُس کے یہاں اُلٹا سیدھا کر کے اپنے مطالب ہی حاصل کرنے میں ہے۔

۱۔ مالک بن نویرہ ایک شخص تھا جس نے حضرت نبی کریم ﷺ کی شان میں لفظ صاحبکم (جو ادنیٰ اور گھٹیا درجہ کے لوگوں کے حق میں استعمال کیا جاتا تھا) استعمال کیا۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اُس کے اس لفظ پر گرفت کی اور قتل کر دیا۔ امام ابو یوسفؒ ایک مرتبہ حدیث بیان فرما رہے تھے کہ حضرت نبی کریم ﷺ کدو کو پسند فرمایا کرتے تھے اور رخت سے کھایا کرتے تھے اس پر ایک شخص جماعت میں سے اُٹھا اور بہت اونچی آواز اور رخت لہجہ سے کہنے لگا کہ مجھے تو پسند نہیں۔ جس پر امام موصوف نے اُس کے قتل کا حکم دیا اور بالآخر اس نے توبہ کی جس سے اُس کی معافی ہوئی۔ اس شعر میں نعمت اللہ خان مرتد کے قتل کی طرف اشارہ ہے جس کے متعلق حکومت افغانستان کی طرف سے قتل کا فیصلہ دیا گیا تھا اور قرآن وحدیث کے مطابق اس فیصلہ کا نفاذ ہوا ہے۔ مرزائی جماعت نے بہت شور وغل مچا کر اس فیصلہ کو خلافِ تعلیم قرآن بنانے کی کوشش کی۔

أَهَذَا مَسِيحٍ أَوْ مِثْلٍ مَسِيحًا تَسْرِبِلُ سِرْبَالًا مِنَ الْقِطْرَانِ
کیا یہی ہے مسیح یا مثیل مسیح جس نے کریمین لیا گندہک کا۔

وَكُنَّا عَلَى مَاقَالٍ مَا جُوجُ أَصْلُهُ فَصَارَ مَسْحًا فَمَاعَصِرُ بَقْرَانِ
مرزا اپنی تحقیق کی بنا پر ما جوج کی نسل سے تھا۔ پھر بن بیٹھا مسیح پس ٹہرت لو اس جوڑ سے۔

نَعَمْ جَاءَ فِي الدَّجَالِ إِطْلَافُهُ كَذَا فَقَدْ أَذْرَكَهُ حَقَّةُ السَّرْعَانِ
ہاں دجال پر بھی مسیح کا اطلاق آیا ہے۔ پس مرزا کو غلطی لگی اوچھے پن سے جلد بازوں کی۔

أَلَمْ يَهْدِ لِلْقُرْآنِ يَحْفَظُهُ وَلَمْ يَحْجُ لِفَرَضِ صَدَّةِ الْحَرَمَانِ
کیا مرزا کو قرآن حفظ کرنے کی ہدایت نہ ہوئی۔ اور حج کا فرض ادا نہ کیا حرمین نے اسے روک دیا۔

فَيَسْرِقُ فِي الْفَاطِمَةِ بَاطِنِيَّةً وَقَرْمَطَةً وَحَى آتَاهُ كَذَابِي
پڑھتا ہے اپنے الفاظ میں فرقہ باطنیہ اور قمرطہ سے۔ یہ وحی ہے اس کی دوغلی یا کاذبانی۔

وَتَابِعَهُ مَنْ فِيهِ بَصْفٌ تَنْصُرُ وَمَنْ فِيهِ كُفْرٌ مُؤَدَّعٌ بِهَبَانِي
مرزا کی متابعت ایسے لوگوں نے کی جو پہلے سے نیم نصرانی تھے اور جن کی سرشت میں کفر و دلیعت رکھا تھا۔

وَكُفِّرَ مَنْ لَمْ يَعْتَرَفْ بِنَبْوَةِ لَهُ وَهُوَ فِي هَذَا لِأَوَّلِ جَانِ
اور مرزا نے اس شخص کی تکفیر کی جس نے اس کی نبوت کو نہ مانا اور حال یہ ہے کہ وہ خود اس میں اول مجرم ہے یا اول بھل پانے والا ہے۔

أَلَا فَاسْتَقِيمُوا وَاسْتَهَيِّمُوا لِدِينِكُمْ فَمَوْتُ عَلَيْهِ أَكْبَرُ الْخَيْرَانِ
خبردار درست ہو جاؤ اور اپنے دین پر سرگشت ہو جاؤ اور دین پر مرنائی بڑی زندگی ہے

وَعِنْدَ دُعَاءِ الرَّابِّ قُومُوا وَشَمُّرُوا حَنَانًا عَلَيْكُمْ فِيهِ أَثَرُ خَنَانِ
اور خدا کی آواز پر لبیک کہہ کر تیار ہو جاؤ اس میں خدا کی تم پر مہربانیوں پر مہربانی ہے۔

وَكُنْ رَاجِيًا أَنْ يَظْهَرَ الْحَقُّ وَأَرْتَقِبْ لِأَوْلَادِ بَغْيِي فِي السَّهْلِ يَمَانِي
اور حق کے غالب ہونے کی خدا سے امید رکھو اور برساتی کیتروں کے مٹ جانے کا بوقت

۱۔ یعنی احادیث میں مسیح کا لفظ دجال اور مسیح میں مشترک تھا جس اشتراک سے مرزا کو غلطی ہوئی۔ یعنی تھا تو وہ حقیقت میں مسیح دجال اور بن گیا مسیح بن مریم۔

نوٹ۔۔۔۔۔ پوری نظم کے ۷۳ اشعار ہیں جن میں صرف ۶۱ اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ پوری نظم کے لئے ملاحظہ ہو اکسفاؤ الملحدین ص ۸۶ ۹۰۔

طلوع (اشارہ) سبیل انتظار کرو۔

وَالْحَقُّ صَدُغًا صَدِيعٌ وَصَوْلَةٌ وَطَعْنٌ وَضَرْبٌ فَوْقَ كُلِّ بَنَانٍ

حق صبح صادق کی طرح ظاہر ہوتا ہے اور حق کے لئے صولت، نیزہ اور مار ہے ہر سرانگشت پر۔

وَالْأَجْرُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ لِنُصْرَةِ دِينِ الْحَقِّ كَمَا هَذَا

اور آخری پکار ہماری یہ ہے کہ حمد کی مستحق وہی ذات ہے جس نے دین حق کی حمایت میں ہم

کو ہدایت کی۔

وَصَلَّى عَلَى خَتَمِ النَّبِيِّينَ دَائِمًا وَسَلَّمْ مَا دَامَ اغْتَلَى الْقَمَرَانِ

اور خدا کی رحمتیں حضرت خاتم النبیین ﷺ پر نازل ہوتی رہیں جب تک چاند اور سورج

نکلند ہوتے رہیں۔



حضرت شاہ صاحبؒ کے فارسی کلام کا نمونہ

مُرِيع نَعْتِيهِ فَارَسِي

حضرت شاہ صاحبؒ اپنی تصنیف عقیدۃ الاسلام فی خبۃ عیسیٰ ﷺ کے آخر میں اپنا ایک نعتیہ قصیدہ فارسی زبان میں شامل فرمایا ہے جس سے حضرت نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت اور عربی کے علاوہ فارسی میں بھی ان کی قادرانگامی کا ثبوت ملتا ہے۔

بطور نمونہ کلام اور تبرکاً یہ نعت ہدیہ ناظرین ہے:

کوئندو عفی اللہ عنہ

دوش چوں از بے نوائی ہم نوائے دل شدم
از سفر و اماندہ آخر طالب منزل شدم
عہد ماضی یاد کردہ سوئے مستقبل شدم
کز چکا پوسو بسو شام غریباں در سید

دشت و گلگشت و بہارستان و خارستان ہم
پیش و پس بانگِ جرس از کارواں در قدم
فلک و ہم ہدم نفس اندر نفس را در ہم
دیدہ عبرت کشودم تخلصے نامہ پدید

تا سروشِ غیب از الطافِ قدم یاد کرد
ما من خیر الوریٰ بہر نجات ارشاد کرد
رحمتِ حق ہم چو من در ماندہ را امداد کرد
مقصد ہر طالبِ حق آلِ مراد ہر مرید

قبله ارض و سما بر آت نور کبریا شافع روز جزا و انکه خطیب انبیاء	سید و صدر علی شمس شحی بدر زجی صاحب جوش و لواطین خدا روز عقید
صاحب خلق عظیم و مظهر جود عمیم رحمه للعالمین خواندش خداوند کریم	آیت رحمت که شان اور رؤف ست و رحیم خلق و خلق و قول و فعل و هدی و سمیت او جمیم
دست او بیضا ضیا ابودتر ابداد صبا وقف امر عالمی برضحک آل رحمت لقا	جدا وقت عطا ابر سخا آب بقا عام اشهب از جمال طعش عبید سعید
دایغ مبراد چراغ سینه اهل کمال ثبت بر ایمان و نعمان و مالک بے خیل	شور عشقش در سر عما و سلمان و بلال واله آثار و سے معروف و شبلی با یزید
از حدیث و سے سر در حیطه احسن اثر سنت بیضائے و سے نور دل بر بصر	مسلم و مثل بخاری وقف بر وصل سیر اتقیاء را اُسوة اقدام و سے تقلید جمید
سید عالم رسول و عبد رب العالمین صادق و مصدوق و حقی غیب و مأمون و امین	آل زماں بوده نبی کا دم بد اندر ماء و طین در هر آل چیزے که آور دست از عدد و عید
مشر او بدره و معراج او سبع قباب کاندرا انجا نور حق بود و نهد دیگر حجاب	در مقام قرب حق بر مقدم او فتح باب دیدوب شنید آنچه بخودے کس نشنید و ندید
صبح حاش رفع ذکر ق شرح و صفش شرح صدر بمکانا زیر لوائش یوم عرض و نیست فخر	او امام انبیاء صاحب شفاعت روز حشر سید مخلوق و عبد خاص خلاق مجید
اخیر و خیر الوری خیر الزسل خیر العباد نقح از بهمت او خلق را زاد میعاد	قدوة اهل هدایت اُسوة اهل رشاد عالم از رشحات انفاس کریمش مستفید
انتخاب و فخر مکنون عالم ذات او مشرق صبح وجود ما سوا مشکاة او	برتر از آیات مجله انبیاء آیات او مستغیر از طعش او هر قریب و هر مجید

دین او دین خدا تلقین او اصل ہدی
نطق او وحی سا حقا نجوم ابتدا
صاحب اسرار او ناموس کبریا بر ملا!
علم او از اولین و آخرین اندر مزید

مولدش اُمّ القریٰ ملکش بشام آمد قریب
خاک رہ طیبہ از آثارِ وے بہتر ز طیب
شرق و غرب از شر دین مستطابش مستطیب
امتش خیر الامم بر امثال بودہ شہید

خاص کردش حق با عجاز کتاب مستطاب
حجت و فرقان و مخبر محکم و فصل خطاب
نجم نجمش در براعت ہست برتر ز آفتاب
حرف حرفا و شفا ہست و ہدی بہر رشید

الغرض از جملہ عالم مصطفیٰ و مجتبیٰ
خاتم دور نبوت تا قیامت بے ہرا
افضل نہ اکمل ز جملہ انبیاء نزد خدا
نعت اوصاف کمال او فزوں تر از عدید

تا صبا گلکش گیبہاں کدو می باشد مدام
بوئے گل بردوش وے گرد و بعلم صبح و شام
یاد بروے از خدائے وے درود و ہم سلام
نیز بر اصحاب ال و جملہ اخیار عبید

وز جناب وے رضا برا حقراں مستہام
خاصہ آں انور کہا فقر ہست از جملہ امام
مستغنیست است الغیاث اے سرور عالی مقام
در صلہ از بار گاہت در نشید ایں قصید



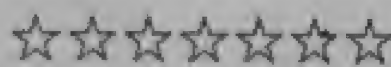
حضرت شاہ صاحبؒ کے اردو کلام کا نمونہ

دنیا کی بے ثباتی

عام طور پر حضرت شاہ صاحبؒ عربی زبان میں ہی مشقِ سخن فرماتے تھے اور کبھی کبھی فارسی میں بھی نعتیہ کلام وغیرہ لکھ کر دیا کرتے تھے۔ اردو زبان میں آپ کے رشحاتِ قلم چنداں مشہور نہیں ہیں۔ لیکن مشہور مصنف و مؤرخ مرحوم منشی محمد الدین فوق (جو حضرت شاہ صاحبؒ کے بے تکلف دوست اور محبتِ خاص تھے) نے اپنی کتاب تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم مطبوعہ لاہور جولائی ۱۹۳۳ء میں حضرت شاہ صاحبؒ کی ایک اردو نظم ”دنیا کی بے ثباتی“ کے بارے میں نقل کی ہے جو بجا ہی خود اردو زبان میں آپ کی قادر الکلامی اور روانی کا شاندار ثبوت ہے اس لئے حضرت موصوفؒ کی یہ نظم بھی بطور نمونہ کلامِ قارئینِ کرام کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کی جا رہی ہے:

سفر کی منزل ہے دارِ دنیا، ذرا تو اس کا خیال سا کر
سدا نہیں ہے یہ دیس تیرا، ضرور جانا ہے دنِ نبھا کر
کبھی تامل سے داہنے بائیں، آگے پیچھے کو دیکھ کر
کدھر کو جاتے ہیں دوست پیارے، کہاں وہ رہتے ہیں یہاں سے جا کر
وہ چل بے سارے باری باری، یہ باقی خلقت بھی چل بے گی
تو چشمِ عبرت سے دیکھ غافل، کبھی تو اپنی نظر اٹھا کر
چلے ہی جاتے ہیں قافلے سب یہاں کا ٹھہرا ہوا ہے یہ ڈھبا
کسی کا آنا کسی کا جانا، کبھی نہا کر کبھی رُلا کر
کبھی نکل کر تو جنگلوں میں، خدا کی قدرت کا دیکھ جلوہ
کہیں ہے اُونچا کہیں ہے نیچا، کہیں اندھیرا ہے جگمگا کر
کسی کا اقبال زور پر ہے، کسی پر ادھار چھا رہا ہے
کوئی ہے آتا کم اکما کر، کوئی ہے جاتا لٹ لٹا کر

کوئی ہے دکھیا کوئی ہے سکھیا، کوئی ہے خنداں کوئی ہے گریاں
 یہ غمزدہ غم گھٹا گھٹا کر، وہ خوش ہے خوشیاں منا منا کر
 غرض یہاں ہیں سب آتے جاتے، دن اپنے اپنے نبھاتے جاتے
 نہیں ہے رہنا یہاں کسی کو، کوچ اک دن ہے مٹ مٹا کر
 اگر ہوں اعمال اپنے اچھے، بُری نہیں ہے یہ زندگانی
 فرشتے اعمال نیک والے، نکال لیں گے بچا بچا کر
 نماز پڑھنا، قیام کرنا، رکوع کرنا، سجود کرنا
 کبھی کھڑے ہو کے گاہ بھٹک کر، زمین پہ ماتھا ٹکا کر
 جو خواب غفلت میں مست سوتے ہیں، بے خبر عاقبت سے اپنی
 جگا کے ان کو بھی ہوش میں لا، یہ نظم آؤر سُنا سُنا کر
 کوئدو



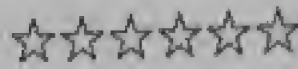
الرَّثَاءُ

لمولینا محمد اور لیس اکاوند حلوی رحمۃ اللہ علیہ صاحب التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح

وَحَفِظَ عَلَى حِفْظِ الْكِتَابِ وَسُنَّةِ	سَلَامٌ عَلَى حَفِظِ الْكِتَابِ وَسُنَّةِ
أُرِيدُ بِهِ نُورَ الْهِدَايَةِ أَنْوَارًا	أُرِيدُ بِهِ نُورَ الْهِدَايَةِ أَنْوَارًا
فَقَدْ كَانَ إِعْجَازًا لِدِينِ نَبِينَا	فَقَدْ كَانَ إِعْجَازًا لِدِينِ نَبِينَا
وَكَانَ إِمَامًا حَافِظًا وَمُحَدِّثًا	وَكَانَ إِمَامًا حَافِظًا وَمُحَدِّثًا
وَقَدْ كَانَ فَرْدًا حَافِظَ الْعَصْرِ جَامِعًا	وَقَدْ كَانَ فَرْدًا حَافِظَ الْعَصْرِ جَامِعًا
بِكَيْ عَالَمِ الْإِسْلَامِ طَرًّا وَاعْوَلًا	بِكَيْ عَالَمِ الْإِسْلَامِ طَرًّا وَاعْوَلًا
بِكَاهُ مَكَامِ الدَّرْسِ وَالْوَعْظِ حَاسِرًا	بِكَاهُ مَكَامِ الدَّرْسِ وَالْوَعْظِ حَاسِرًا
فَقَدْ كَانَ رُمْحًا سَمَّهَرِيًّا مُثَقَّفًا	فَقَدْ كَانَ رُمْحًا سَمَّهَرِيًّا مُثَقَّفًا
وَحَفِظَ وَحَبِطَ بَعْدَ شَيْخٍ مُبْجَلٍ	وَحَفِظَ وَحَبِطَ بَعْدَ شَيْخٍ مُبْجَلٍ
كَبَذَ مُبِينٍ فِي دُجَى اللَّيْلِ أَلِيلٍ	كَبَذَ مُبِينٍ فِي دُجَى اللَّيْلِ أَلِيلٍ
كَمِثِلِ الْبُخَارِيِّ أَوْ كُنْهَوَّابِ بْنِ حَنْبَلٍ	كَمِثِلِ الْبُخَارِيِّ أَوْ كُنْهَوَّابِ بْنِ حَنْبَلٍ
إِلَيْهِ انْتَهَى شَدُّ الْمَطَايَا وَارَاحِلِ	إِلَيْهِ انْتَهَى شَدُّ الْمَطَايَا وَارَاحِلِ
مَعَارِفِ أَعْلَامِ الْهُدَى وَالتَّفَضُّلِ	مَعَارِفِ أَعْلَامِ الْهُدَى وَالتَّفَضُّلِ
لِخَطْبِ جَلِيلٍ قَدْ أَنَاخَ بِمَنْزِلِ	لِخَطْبِ جَلِيلٍ قَدْ أَنَاخَ بِمَنْزِلِ
بَكْنُهُ لَوَاحِي الْأَرْضِ وَالْفَلَكَ الْعَلِيِّ	بَكْنُهُ لَوَاحِي الْأَرْضِ وَالْفَلَكَ الْعَلِيِّ
لِمِثْلِ مَسِيحِ الْكَادِيَانِ الْمُخْبَلِ	لِمِثْلِ مَسِيحِ الْكَادِيَانِ الْمُخْبَلِ

ر ابيض هديًا لكل منيهم
توفيت ياراس السق و تركني
شرحنا الآثار اذ في اشكلت
وعطر افق الارض من عرقلك الشدي
عليك سلام الله يا قبر انور
وكل سناغ في نبوة مرسل
لقدك ووية بدمع مسلسل
وقسرت ايات الكتاب المقتل
يسرى شداه روح منك ومنزل
ورحمته تشرى كرددق مجلجل

بفضلک یا مولی الوری قل لروحہ
ایاروح غبیدی هذه الجنة الذخلی



فارسی مرثیہ دروازہ بند

از پیر عبد القادر شاہ آثم مرحوم

کشمیر میں فارسی شاعری میں سوئس صدی کی پہلی تہائی تک دانشوروں کے اظہار خیال کا مؤثر ذریعہ تھی۔ سرینگر کی جامع مسجد کے چاروں طرف صدیوں سے علماء و فضلاء پیدا ہوتے چلے آئے ہیں، خاص کر محلہ ملارہ جو پانچ سو (۵۰۰) سال سے اہل علم کا مرکز چلا آیا ہے سرینگر کا "شیراز" کہلانے کا مستحق ہے۔ اس آخری دور میں بھی جامع مسجد کے گرد و نواح اور ملارہ اور پاندان وغیرہ محلوں میں فارسی شاعری کی شمعیں روشن تھیں۔ پیر عبد القادر شاہ آثم زبان و بیان پر استادانہ قدرت کے لحاظ سے ان سب میں ممتاز تھے۔ ایران کے متاخرین شعراء میں جیب قاتنی کی روانی کشمیر میں مرحوم آثم صاحب کے حصے میں آئی تھی۔ آپ کا سارا کلام اس حقیقت کا گواہ ہے اور حضرت علامہ کشمیری کی وفات سے متاثر ہو کر آپ نے بارہ ترکیب بند کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ ہر لحاظ سے قاتنی کے قصائد کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ حقائق اور جذبات و تاثرات کا یہ شہکار ذیل میں ہدیہ ناظرین ہے۔

پیر عبد القادر شاہ آثم مرحوم (ولادت ۱۳۱۵ھ وفات ۱۳۶۴ھ) کا شجرہ نسب حضرت خواجہ مسعود پانپوری تک منتهی ہوتا ہے جو دسویں صدی ہجری کے مشائخ میں مشہور و معروف گذرے ہیں۔

فلک از دیدہ انجم شدہ خوبار چرا روز گردیدہ مہذل شب تار چرا
 وہ پدہ شہر بشہر استیغہ عز اور داد است حلقہ ماتمیان کوچہ و بازار چرا
 فنجہ خونین جگرہ بہرین گل چاک است گشتہ پامال خزان رونق گلزار چرا
 پاسے رفتار نمائندہ است درین راہروان زوہ اند آئینہ سان پشت بدیوار چرا
 ہر یکے لوح کثان نعرہ زمان جانرذان عیش کم غصہ فزون سینہ ہد افکار چرا
 اشک آبی است چساں آتش سوزندہ شد نالہ آہی است ز آہی روش خار چرا
 عجمی و عربی عالم و جاہل یکساں رفتہ از صبر و سکون اندیکبار چرا
 ہر کجائے نگریم دیدہ گریانی ہست ہر کجائے گوش نهم نالہ و افغانی ہست

کاروان ماندہ برہ قافلہ سالار برفت ارتق قوم سر افتاد کہ ہر دار برفت
 حُججہ اللہ امام عرفاء و علماء وارث شاہ رسل صاحب اسرار برفت
 یادگار سلف آن خازن اخبار نبی ﷺ افتار خلف آن مخزن آثار برفت
 کان دین جان یقین حضرت استاذ زمان حامی شرع مبین عمدہ اخبار برفت
 سیدی معتمدی شاہ محمد ﷺ انور بگلستان جنان طوطی طیار برفت
 مطلع نور رخ انورش اللہ اللہ عالم افروز شدہ عالم انوار برفت

خلق محمود حسن داشت آن رُشد رشید
 یافت زان قاسم فیض نبوی دین تجدید

آنکہ میر فلک مذہب نعمانی بود حرف خرفش ادب و حکمت نعمانی بود
 آنکہ تحقیق حقائق بدقایق میکرد آنکہ در علم و عمل ملکیت و لائانی بود
 آنکہ گر منتہی روے بدو آوردے پیش او مجدی و طفیل و بہستانی بود
 آنکہ در فتنہ تاویل بعصر حاضر پشت اسلام و مددگار مسلمانی بود
 آنکہ در طے مقامات باطوار سلوک گویا ثانی آن شبلی و خرقائی بود

نظرش بر قدم و هوش بدم گوش بخت
خلوتش جلوتی محفل عرفانی بود
بضیا پاشی انوار علومش نازم
انجم انجمن ملک خدا دانی بود
صورتش مشرق اغرار ولی الهی
سیرتش آمر معروف در منکر نای

در غمش فقه جدا گردیده و تفسیر جدا
محشرستان نه همیں ضلع سہارنپور است
بیقرار است چو سیماب ازین ماتم سخت
سایہ اش تازہ سر از ہر د نظر برخاست
آو خافت بنا گاہ دریغادر دا
ماو ما مشعل دین آہ نہان شد بحجاب
مرگ خواہیست کہ ہر فرد بشرے بلیند
مرگ عال ہنگی ظلمت دُنیا باشد
مرگ عالم یقین محشر گہری باشد

وقت آن است اگر روح بخاری گرید
نسائی وار مسلم غم او مسلم راست
آہ تقریر مصفاہی موطا کہ کند
وائے آلودہ باندوہ ابو داؤد است
دل مشکوٰۃ ہی سوز و مرقات افتد
بحر موج رسد کز پئے آن عین العلم
صدمہ رحلتش از طبری و رازی پرسید
شیوہ قاضی بیضاست زیادتی گرید

باب خواہم کہ بیان ز نو آغاز کند
با اشارات لبش شرح شفا باز کند

کردی هر گاه بیان نکتہ قرآنی را
چوں بگفتار ہے آمدی آن کان حدیث
هر گجا تاختی آن ضعیف باطل افکن
بخلافت شده ممتاز چو از شیخ الہند
نسبش بود یار باب سلاسل محکم
توتیا دیدہ و ران کردہ خاک قدمش
روشنم خود نشدے عالم ربانی چیست
طلعت فرخ او سیر ندیدیم و برفت
شربتے از لب لعلش نچسیدیم و برفت

کے بود کے کہ دگر بزم حدیث آراید
کے بود کے کہ سر آید سخن از لب نوش
بہر سرکوبی دجال پرستان مشکل
حلقہ درس بخاریش زیادہ نرود
پدران علویہ کنان می گویند
آسمان اے ہمہ بیداد بدہ بارے داد
باز آن صیقل آئینہ دلاں را خوانم
صدر ایوان بہشت از چہ بہشتی مارا
سرد مہری نسزد گرم دگر گن جارا

ایک بودہ است ہمہ فقر و فنا شیوہ تو
دل مستغنی تو فخر ہمیلرد بفقر
صوفی صاف درون عارف بے لاف و گزاف
کہ ز آئینہ ضمیری تو ملکہ نشدی
طلعت پاک تو تصویر توکل سر دپا
تافتن روز غنا بہر خدا شیوہ تو
بذل و احسان و کرم جو و وسخا شیوہ تو
کس ندید است بجز صدق و صفا شیوہ تو
صد خطا شیوہ مابود و عطاء شیوہ تو
برقضا آمدہ تسلیم و رضا شیوہ تو

فصلاء پیش تو زانوے ادب نہ کردند
شرح اوصاف تو ہر چند مطول گویم
بود تا ب دو ہنگین وحیا شیوہ تو
مختصر کے شود یک شہ ادا شیوہ تو
بزم بگذاشتہ در عین رخ ول از چہ شدی
چہ خطا سرزدہ ازما تو ملول از چہ شدی

بصر زحمت سفر بستہ سختی دل ما
روضہ غلہ شد آراستہ از مقدم تو
برق حولان تو آتش زدہ در حاصل ما
مید مدخار مغیلان ہمہ از منزل ما
ساقی مصطفیٰ علم کفن پوش شدی
جام بگلستی و ب رہم زوہ مخفی ما
اے ہما زور پریدی ز لب بام جہان
زاغ طعیم مگر دای دل غافل ما
نیست امکان کہ رود مہر تو بیرون از سر
کہ سر شہد وفائے تو در آب و گل ما
زندہ زندہ جاوید بماندی از نام
مرگ تعبیر اگر کرد دل جاہل ما
باز آ باز کہ سر در قدمت اندازیم!

آب آہن کہ غم ورنہ بخارا فلکیم
دیدہ دریا غم و میر بحر فلکیم

سحرے گر بر ماہم چو صباے آئی
بمدارے عزیزان و قہیمان بارے
غم زدا عیش فزا عقدہ کفایے آئی
چہ شود مگر زورہ لطیف و عطاے آئی
خوب دانم کہ کڑا پاس پدر بیسار است
بہر او باز بیا مگر نہ بمانے آئی
بکشا چشم خدا بین الم اخوان بین
چشم دارند بفریاد وندائے آئی
اللہ اللہ کہ چہا غافل و نادانم من
پتھر ہرزہ سرایم تو کجائے آئی
رخت افگندہ در بار کہ خالص الخالص
کے بدین عالم فانی رہائے آئی
نز خود خواند تو اسید لولاک لقب
کے ازان شمس صبحی سوی نہ جائے آئی

سایہ طوبی او تسنیم تر خوش آمد
دولت سرمد دیدار خدا خوش آمد

<p>هست از عرف شذی مست دماغ عالم رفت در خواب فنا فتنه لاغ عالم شمع ایوان جنان چشم و چراغ عالم از طیبیان که کند مرهم دماغ عالم بے تو پژمردگی افتاد برآغ عالم یکجا رفته بهار و گل بارغ عالم سال بشمرد ولم آه چراغ عالم</p>	<p>اے مے فیض تو پر کرده ایارغ عالم کرد تبلیغ بلیغ مدد ملت و دین ظلمت آباد شد از رقتن تو عرصہ دہر ماہمہ سینہ فکاریم بدارغ غم تو یکجا جویمت اے لاله نعمانی را عند لیبان خبر از قمری و طوطی پرسند چارم ماہ صفر چہرہ نہفتی گم شام</p>
---	---

بر تو نازل ہمہ دم رحمت دادار شواد
قبر پاکت ہمگی مہبط انوار شواد

<p>وز پے خرمن دل آتش سوزان باشی رخسہ انداز درین گنبد گردان باشی ہم چو سنبل ہمہ جا سخت پریشان باشی دین آلف ہائیکشی طفل دبستان باشی تا کہ از صدق او صبغا جمع محبان باشی بہتر آن است خبردار ز فرمان باشی</p>	<p>تا کہ اشم ازین واقعہ گریان باشی تا کہ از اثر تیر جگر دود فغان باشی تا کہ لاله صفت غرقہ نبون دماغ بدل باشی تا کہ لوح رخ از اشک بشوی صدف بار باشی فاتحہ از راہ اخلاص یرد ہدیہ بیار باشی گل نفس ہمہ آمدہ توقیع قضا باشی</p>
---	---

برضا کوش در آئین قضا بود ہمین
صبر کن صبر کہ تقدیر خدا بود ہمین



آہ اے شیخ الحدیث!

(اُردو مرثیہ)

(از مولانا قاری جمال الدین صاحب لیب)

مولانا قاری جمال الدین صاحب المختص بلیب جن دنوں جامعہ اسلامیہ ڈھیلی میں تشریف
طالب علم تھے تو حضرت شاہ صاحب کی ایک اچانک رحلت پر ایک تعزیتی جلسہ میں موصوف نے
مندرجہ ذیل نظم پڑھی تھی۔

اپریل ۱۹۷۰ء میں یہ نظم ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں شائع ہوئی تھی اور اب مندر دارالعلوم کے
شکریہ کے ساتھ پھر بدینہ ناظرین ہے۔
کوندو

آہ اے شیخ الحدیث جامعہ فخرِ زمن

حامی دین متین اور ماہر ہر علم و فن

تیرے جانے سے ہر اک محفل کا رنگ جاتا رہا

اور خصوصاً جامعہ کا ہو گیا سونا چمن

تھا ترا ہر لفظ مومن کے لئے آبِ حیات

اور ہر نکتہ تھا باطل کے لئے دارورسن

ان کی رحلت سے بشیر الدین مرزا خوش نہ ہو

اُن کا ہر شاگرد ہے تیرے لئے دندان شکن

وہ تیرا درس بخاری اور تحقیق اثیق!

جس میں مانا تھا تجھے دُنیا نے یکتائے زمن

جس کی برکت سے نہ کچھ معمور ہے ہندوستان

بلکہ ہے مرہونِ منت آج تک چین و چین

یوں تو دنیا میں بہت آئے محدث اور فقیہ
 لا نہیں سکتا مگر ثانی برا پیرِ کھن
 مذتوں سے ہم نے چھوڑا تھا وطن جس کے لئے
 اور یہاں رہ کر اٹھائے سینکڑوں رنج و غم
 آہ وہ میراب گاہ تشنہ کا مانِ علوم
 سو رہا ہے قبر میں باندھے ہوئے سر سے کفن
 اس مری آہ و بے قاباں پر غیب سے آئی ہوا
 تو فراقِ شاہ میں اس طرح سے مجنون نہ بن
 تیری تسکین کے لئے کافی ہیں شبیر ❶ و سراج
 اپنے اپنے طرز میں ہر ایک ہے دُرِ عدل
 اور وہ ❷ حضراتِ بابرکت، جن پر مذتوں
 فیضِ انور شاہ کشمیری رہا سایہ بگن
 شیخ سے قلبی محبت ہے اگر تجھ کو لبیب
 پھر دُعائے خیر کا پابند رہ ہر دُعلیٰ



❶..... شبیر و سراج یعنی حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت مولانا سراج احمد رشیدی۔
 ❷..... مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا جلیل الرحمن سیوہاروی، مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا محمد اور میں سکھروڑی،
 مولانا محمد یحییٰ تھانوی، مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی سابق اساتذہ جامعہ اہمیل (یہ سب حضرات شاہ صاحب کے
 تلامذہ ہیں)

تتمات

تتمہ (۱)

حضرت شیخ الہند

(ولادت ۱۸۵۵ء، ۱۲۶۸ھ، وفات ۱۹۲۰ء، ۱۳۳۹ھ)

شخصیات کے تذکرے صرف ان کے اپنے کارنامہ ہائے حیات کو فراہم کر دینے سے ہی حاصل نہیں ہو جاتے۔ جن ہستیوں نے ان کی علمی اور روحانی تربیت کی، اور فیوض و برکات کے جن چشموں نے ان کے کمالات کی آبیاری کی ہے قاری کو ان سے متعارف کرانا بھی تذکرہ نگار کے فرائض میں شامل ہے۔

حضرت شاہ صاحب کا نسب تذکرہ کسی حد تک آپ کے حالات کی ابتداء میں مرقوم ہو چکا اور تتمہ ۲ میں حضرت الشیخ مسعود زورئی اور ان کی ذریات کے مشاہیر کی صورت میں مزید تفصیلات بھی آرہی ہیں لیکن شاہ صاحب کی ذات ستودہ صفات کو سمجھنے کے لئے نسب پس منظر سے بھی زیادہ جسی پس منظر پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے کتاب ہذا کے مختلف عناوین کے تحت ہم نے کوشش کی ہے کہ آپ کے اساتذہ کے حالات جس قدر بھی اور جہاں کہیں سے بھی میسر ہوں سمیٹ لئے جائیں لیکن ان اساتذہ میں سے ایک عظیم ہستی زبدۃ العلماء والحمد للہین حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی بھی ہے، جن کی حسن تربیت و تعلیم نے شاہ صاحب کے جوہر فطرت کو تابنا کی بخشی اس لئے یہ ضروری ہے کہ آپ کا تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ آجائے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے کمالات و حالات ایک بحر ہے کراں ہیں جن کو بیان کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب بھی ملکی نہیں ہو سکتی۔ محض آپ کی ذات گرامی کے تعارف کے طور پر ہم آپ کے پاکیزہ کوائف حیات کا مختصر سا خاکہ ذیل میں ہدیہ ناظرین کرتے ہیں:

خلاصہ حیات:..... حضرت شیخ الہندؒ دارالعلوم کے سب سے پہلے شاگرد ہیں، ان ہی کی نسبت کہا گیا ہے کہ جس نے (مدرسہ دیوبند کے قائم ہونے پر اس درس گاہ کے) سب سے پہلے استاد ملا محمود کے سامنے کتاب کھولی وہ محمود تھا ❶۔

❶ مولانا ملا محمود (م ۱۳۰۴ھ) علوم حدیث و فقہ کے بہت بڑے عالم و فاضل تھے ۱۲۸۳ھ میں جب حضرت نانوتوی نے اولاً پھر کی مسجد میں دارالعلوم کا مدرسہ قائم کیا تو اس وقت ملا محمود میرٹھ کے مطیع ہاشمی میں ملازم تھے۔ مدرسی کے لئے حضرت نانوتوی نے ملا محمود کو بلایا۔ الغرض یہ دارالعلوم کے سب سے پہلے مدرس ہیں حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن نے پھر کی مسجد کے پاس ایک درخت کے نیچے ان ہی سے سب سے پہلا سبق پڑھا تھا۔ اللہ اللہ استاد بھی محمود اور شاگرد بھی محمود (کوندہ)

حضرت شیخ الہند کی پیدائش ۱۸۵۱ء بمطابق ۱۲۶۸ھ میں بریلی میں ہوئی۔ جہاں ان کے والد ماجد مولینا ذوالفقار علی سرکاری محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے (آپ بھی بانیان دارالعلوم دیوبند میں سے تھے)۔ (نونا محمود نے) ابتدائی تعلیم اپنے مشہور عالم چچا مولینا مہتاب علی مرحوم سے حاصل کی۔ (فقد میں) قدوری اور (منطق میں) شرح تہذیب پڑھ رہے تھے کہ دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا، آپ اس میں داخل ہو گئے، نصاب دارالعلوم کی تکمیل کے بعد حضرت مولینا محمد قاسم نانوتوی کی خدمت میں روکر علم حدیث کی تحصیل فرمائی فنون کی بعض اعلیٰ کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔ ۱۸۷۳ء۔ ۱۲۹۰ھ میں حضرت نانوتوی کے دست مبارک سے دستار فضیلت حاصل کی۔ زمانہ تعلیم ہی میں آپ کا شمار حضرت نانوتوی کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا تھا، اور حضرت نانوتوی خاص طور سے شفقت فرماتے تھے، چنانچہ انکی اعلیٰ علمی اور ذہنی صلاحیتوں کے پیش نظر دارالعلوم کی مدرسے کے لئے اکابر مدرسہ کی نظر انتخاب آپ کے اوپر پڑی اور ۱۸۷۳ء۔ ۱۲۹۱ھ میں مدرس چہارم کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا جس سے بتدریج ترقی پا کر ۱۸۹۰ء۔ ۱۳۰۸ھ میں دارالعلوم کے (صدر المدرسین کے منصب پر فائز ہوئے۔

ظاہری علم و فضل کی طرح آپ کا باطن بھی آراستہ تھا، حضرت حاجی الداؤد اللہ مہاجرکتی سے خلافت حاصل تھی، دارالعلوم میں صدارت تدریس کا مشاہرہ اس وقت ۵ روپے تھا۔ مگر آپ نے ۵۰ روپے سے زیادہ کبھی قبول نہیں فرمائے۔ بقیہ ۲۵ روپے (ہر ماہ) دارالعلوم کے چندے میں شامل فرمادیتے تھے۔ آپ کی زبردست علمی شخصیت کے باعث طلباء کی تعداد ۲۰۰ سے بڑھ کر ۶۰۰ تک پہنچ گئی تھی۔ آپ کے زمانہ میں ۸۲۰ طلباء نے حدیث نبوی سے فراغت حاصل کی، حضرت شیخ الہند کے فیض تعلیم نے مولینا محمد انور شاہ کشمیری، مولینا عبید اللہ سندھی، مولینا منصور انصاری، مولینا حسین احمد مدنی، مولینا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولینا شبیر احمد عثمانی، مولینا سید اصغر حسین دیوبندی، مولینا سید فخر الدین احمد، مولینا محمد اعجاز علی امروہی، مولینا محمد ابراہیم بلیاوی، مولینا سید مناظر احسن گیلانی، مولینا احمد علی لاہوری۔ جیسے مشاہیر اور نامور علماء کی جماعت تیار کی۔

(تاریخ دیوبند از سید محبوب رضوی مطبوعہ علمی مرکز دیوبند ۱۹۷۲ء ص ۳۵۳-۳۵۴)

شیخ الہند کی سیاسی جدوجہد:..... حضرت شیخ الہند مولینا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس اللہ سرہ، چودہویں صدی ہجری کے نصف اول کے اعلیٰ علماء اور اولیاء کاملین میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ علم و فضل اور فرشتوں کے سے اوصاف تقویٰ و طہارت عطا کر رکھے تھے اور ان کمالات کے ساتھ ساتھ آپ کو میدان عمل کا شہسوار بھی بنایا تھا۔ آپ ایک طرف دارالعلوم دیوبند کی صدارت المدرسین کی مسند پر رونق افروز ہو کر قال اللہ وقال الرسول کی نہروں سے طالبان علوم و دین کے قلوب کو سیراب کر رہے تھے اور دوسری طرف وطن عزیز یعنی برصغیر کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے

لئے سیاسی جدوجہد میں اپنے زمانہ کے دیگر سیاسی رہنماؤں کے لئے علمی نمونہ تھے۔

برطانوی امپیریل ازم کے خلاف علم جہاد بلند رکھنا آپ کو اپنے اساتذہ اور پیران طریقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجرکی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد کنگواہی سے وراثت میں ملا تھا۔ اس وراثت کو آپ نے زندگی بھر سینے سے لگائے رکھا اور اسی جذبہ جہاد کی وجہ سے آخری عمر میں اپنی علالت اور ضعف پیری کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آپ نے ہجرت پھر قید و بند اور جلائے وطنی اور ہندوستان سے پانچ ہزار میل دور سمندر میں مالٹا نامی ایک جزیرہ میں نظر بندی و امیری کو لبیک کہا اور ان تمام مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا، آزادی ہند کی تحریک کے لئے حضرت شیخ الہند کی یہ قربانیاں آپ کے جلائے ہندوستان کے دیگر علماء اور ان سرفروش مسلمانان ہند کے لئے ایک روشن نمونہ بن گئیں جنہوں نے کبھی مجلس خلافت، کبھی نیشنل کانگریس اور جمعیتہ العلماء ہند کے جھنڈے کے نیچے اور کہیں مسلم لیگ، مجلس احرار اور دوسری حریت پسند تنظیمات میں شامل ہو کر انگریزی حکومت کی قوت قاہرہ کے خلاف اس وقت تک جنگ جاری رکھی جب تک کہ سامراجی طاقت نے اپنا بوریا بستر باندھ کر ساحل بمبئی کو الوداع نہ کہہ دیا۔

علمی اقدامات: ۱۹۱۳ء میں جب جنگ عظیم چھڑ گئی تو آپ کی جماعت کے مرکز یا غستان میں آپ کے متعدد معتمد کارکن عرصہ سے تنظیمی کام انجام دے رہے تھے۔ ان سرفروش کارکنوں کو آپ کا حکم پہنچا کہ اب میدان میں آجاؤ اور سربکف ہو کر کام شروع کرو۔ سرحد میں مجاہدین کے اجتماع کو دیکھ کر انگریزی فوج نے حملہ کر دیا۔ مجاہدین نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انگریزی فوج کے پلٹنوں کی پلٹنیں صاف کر دیں۔ حضرت شیخ الہند کے پاس جہاد کی کیفیات کی خبریں برابر آتی رہتی تھیں۔ اس اثنا میں کارکنان مراکز مجاہدین کا پیغام آیا کہ ہم رسد اور ایمونیشن (AMMUNITION) ختم ہو جانے کی وجہ سے سخت مجبور ہیں، جب تک ان دونوں چیزوں کا انتظام نہ ہو، جہاد حریت جاری نہیں رہ سکتا۔

حضرت شیخ الہند نے دوران جنگ مجاہدین سرحد کی تائید و اعانت کا ایک مرکز کابل میں قائم کرنا چاہا اور ارادہ کیا کہ مولانا عبید اللہ سندھی ❶ کو وہاں بھیج دیا جائے اور خود دنیا کے آزاد اور

❶ آپ سیالکوٹ میں ۱۰ مارچ ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے اور دین پور میں ۱۲ اگست ۱۹۴۳ء کو انتقال فرما گئے۔ آپ ایک سکھ خاندان کے چشمہ چراغ تھے۔ اوائل عمر میں ہی مشرف باسلام ہوئے۔ آپ کے باپ کے نام رام سنگھ، دادا کا نام جیپت رائے اور ان کے باپ کا نام گلاب رائے تھا۔ وطن اور نسل کے لحاظ سے آپ پنجابی تھے لیکن ابتدائی تعلیم و تربیت چونکہ سندھ میں حاصل کی تھی اس لئے عمر بھر سندھی کہلائے۔ دیوبند پہنچ کر علوم کی تکمیل حضرت شیخ الہند سے کی اور حضرت نے اپنے شاگرد کی بے چین اور انقلابی فطرت کے رجحانات کا اندازہ کر لینے کے بعد آپ کو اپنے سیاسی منصوبوں کا ہمارا ہالیا۔ آپ کے ارشاد پر ۱۹۱۵ء میں آپ ریشمی خطوط کی مہم کے سلسلہ میں وطن سے روانہ ہوئے۔ سات سال کابل میں رہے۔ سات مہینہ ماسکو (روس) میں تین سال انگور (ترکی) اور پھر تقریباً بارہ سال مکہ معظمہ میں۔ انگریزی حکومت نے ہند میں آپ کا داخلہ ممنوع کر رکھا تھا۔ جلائے وطنی کے پچیس برس گزارنے کے بعد مارچ ۱۹۳۹ء میں آپ ہندوستان واپس آئے۔

انگریزوں کے مخالف ممالک ترکی اور جرمنی وغیرہ سے امداد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے چنانچہ مولینا سندھی کے پاس حکم پہنچتا ہے کہ ”میں حجاز جانا ہوں تم کا بل پہنچو۔“

حضرت شیخ الہند کا سفر حجاز:..... پہلی عالمگیر جنگ زور پکڑ گئی تھی، جرمنی اور ترکی جو آپس میں حلیف تھے اور برطانوی اقتدار کے خلاف دوش بدوش لڑ رہے تھے، ہندوستان کے عوام خاص کر مسلم عوام کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں سیاسی تحریکوں کو دبانے کے لئے ایمر جنسی قوانین کا نفاذ کر کے مولینا آزاد، مولینا محمد علی، مولینا شوکت علی، لالہ لاجپت رائے اور اسی درجے کے رہنما ہر صوبے میں گرفتار کر کے اپنے اپنے گھروں سے دور مقامات میں نظر بند کر دیئے۔ گرفتار کئے جانے والے لیڈروں کی جو مہرست و انسرائے ہند کے پولیٹیکل محکمہ نے مرتب کی تھی اس میں حضرت شیخ الہند کا نام سر دفتر تھا، لیکن آپ گورنمنٹ کے فوری اداروں سے بے خبر تھے اور حج و عمرہ کی نیت سے حرمین شریفین کے سفر کی تیاری میں مصروف تھے۔

حکومت کی عبرتناک ناکامی:..... دارالعلوم میں صدر المدرسین کے منصب پر ذہن میں حضرت شاہ صاحب کو اپنی جانشینی کے لئے مقرر کر رکھنا بھی اسی سفر کی تیاری کا ایک حصہ تھا۔ اسی اثناء میں آپ کے فداکار مرحوم ڈاکٹر مختار احمد انصاری دہلوی کو اپنے ذرائع سے پتہ چل گیا کہ حکومت ہند نے حضرت شیخ الہند کی گرفتاری اور نظر بندی کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے حضرت شیخ الہند کو اطلاع دے دی لیکن حضرت شیخ الہند نے اپنے سفر کے پروگرام میں ذرہ بھر بھی تغیر و تبدل نہ کیا اور ہر چہ بادا باز ماکشتی درآب انداختیم کے مطابق آپ دپو ہند سے ماہ شوال ستمبر ۱۹۱۵ء ۱۲۳۲ھ میں رخصت ہوئے اور دارالعلوم کی صدر مدرس اور اپنی جانشینی کے لئے حضرت شاہ صاحب کا اعلان کر کے روانہ حجاز ہو گئے۔ اس اولوا العزمانہ اقدام سے حکومت ہند بوکھلا اٹھی اور اس کو حضرت شیخ الہند کے عزائم کے بارے میں وہی شبہ باقی نہ رہا۔ چونکہ حکومت ترکی ان دنوں جنگ میں سخت آہل بھی ہوئی تھی۔ اور حجاز پر ابھی ترکی خلافت کا تسلط موجود تھا۔ اس لئے حکومت ہند کو یقین ہو گیا کہ حضرت شیخ الہند وہاں جا کر ترکی اور جرمنی سے حریت ہند کے لئے امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، لہذا ان کو روکنا اور گرفتار کر لینا ضروری ہے۔ چنانچہ آپ کی گرفتاری کے احکام فوراً جاری کر دیئے گئے۔ لیکن بمبئی تک ہر جگہ آپ کے دیدار اور زیارت کے مشتاق ہزار ہالوگوں کا بے پناہ اثر دہاں تھا اور آپ پر ہاتھ ڈالنے سے بڑے ہنگامے کا خطرہ تھا۔ اس لئے حکومت کی ہمت نہ پڑی کہ مولینا کو بمبئی کے راستے میں گرفتار کیا جائے۔ اب حکومت کی سکیم یہ تھی کہ بمبئی میں قیام کے دوران راتوں رات آپ کی گرفتاری عمل میں لائی جائے۔ چنانچہ

گرفتاری کے لئے گورنمنٹ بمبئی کے نام گورنر یوپی نے ایک تار بھی بھیجا مگر وہ تار اس وقت پہنچا جب حاجیوں کا جہاز حضرت شیخ الہند کو لے کر ساحل بمبئی سے روانہ ہو چکا تھا۔ پھر گورنر مذکور نے بواسطہ مرکزی سرکار عدن کے گورنر کو تار دیا کہ مولینا محمود حسن کو جہاز سے اتار لو۔ مگر یہاں بھی کامیابی نہیں ہوئی جب تک جہاز جدہ پہنچ کر آپ کو مقدس سرزمین حجاز پر

امپریل ازم کے لمبے ہاتھ لیکن حکومت ہند نے حضرت مولینا کے ساتھ متعدد سی۔ آئی۔ ڈی بمبئی پہلے سے متعین کر دیئے تھے جو بظاہر حاجیوں کے ہمیں میں تھے تاکہ وہ تمام حرکات و سکنات کی نگرانی رکھیں مگر جہاز سے اترتے ہی بعض لوگوں نے ترکی پولیس کو اطلاع کر دی کہ فلاں فلاں اشخاص انگریزوں کے سی۔ آئی۔ ڈی ہیں ان کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ اس کے باوجود کچھ مخفی لوگ پھر بھی باقی رہ گئے جو آپ کی گرفتاری کے وقت تک اپنے خبث باطن کی ڈیوٹی انجام دیتے رہے۔

مولینا مدنی کی سیاست میں شمولیت مولینا سید حسین احمد مدنی کا ان دنوں مدینہ شریف میں مستقل قیام تھا اور آپ وہاں تعلیم و تدریس کے شغل میں مصروف تھے اس لئے ہندوستان کی سیاست میں ابھی باقاعدہ شریک نہیں ہوئے تھے۔ حضرت شیخ الہند کے جہاز پہنچنے پر جب آپ کے تازہ ارادوں سے واقف ہوئے اور آپ کے خیالات سے متاثر ہوئے تو عملی سیاست میں کود پڑے۔

قیام حجاز کی مصروفیات مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، طائف اور دیگر مقامات میں آزادی وطن کی جدوجہد کے سلسلے میں حضرت شیخ الہند، مولینا حسین احمد مدنی اور دیگر رفقاء نے کیا کیا اقدامات کئے۔ یہ ایک طویل اور دلچسپ باب ہے۔ حضرت شیخ الہند کا اس دوران قرآن شریف کے ترجمہ کے کام میں مصروف رہنا، دوبار حج بیت اللہ سے مشرف ہونا، مکہ میں وہاں کے گورنر غالب پاشا سے ملنا، ترکی کے وزیر جنگ اور مشہور و معروف ہیرو غاری انور پاشا اور چوتھے ڈویژن کے کماندار جمال پاشا سے مدینہ منورہ میں ملنا، اس سے تجربات حاصل کرنا، تحریرات کو نہایت رازداری سے وطن بھیجنا اور حضرت مولینا کا ترک اکابرین سے تحریک آزادی ہند کی حمایت حاصل کرنا، طائف روانہ ہونا اور اسی اثناء میں شریف حسین (دالی مکہ) کا انگریزوں سے ساز باز کر کے ترک خلیفہ کو المسلمین کے خلاف بغاوت کر دینا اور طائف میں حضرت مولینا کا محصور ہو جانا اس مدت قیام حجاز کی کچھ مختصر جھلکیاں ہیں۔

حرم مکہ میں گرفتاری اور قاہرہ میں سزا خلاصہ کلام یہ ہے کہ شریف مکہ نے انگریز حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے حضرت مولینا کو مکہ مکرمہ میں گرفتار کر کے ۲۴ صفر ۱۳۳۵ھ کو آپ کے رفقاء ہمیت جدہ پہنچایا اور انگریزوں کی فوجی حراست کے سپرد کر دیا آپ ۲۵ دن وہاں حراست میں رکھے گئے۔ ۸ ربیع الاول کو زیر حراست آپ سویز بھیجے گئے۔ ۲۲ کو وہاں

سے گورہ فوج کی حراست میں آپ کو قاہرہ بھیجا گیا اور مقام حیزہ کے سیاسی جیل منتقل ۵ میں داخل کر دیئے گئے حیزہ کے جیل میں تقریباً ایک مہینہ رکھنے اور بیانات لے لینے کے بعد امپریل ازم کے کارندوں نے فیصلہ کیا کہ آپ (حضرت شیخ الہند) اور آپ کے رفقاء میں سے مولینا سید حسین احمد صاحب مدنی، مولینا عزیز گل، حکیم نصرت حسین اور مولوی وحید احمد کو عالمگیر جنگ کے اختتام تک جلائے وطن اور نظر بند کر دیا جائے۔

مقام اسارت کے لئے مالٹا کا انتخاب چونکہ ہندوستان، مصر اور عرب سب جگہ انگریز دشمن تحریکات چل رہی ہیں ان تینوں ممالک میں شیخ الہند کا اثر و رسوخ ہے۔ اس لئے یورپ کے کسی انگریزی مقبوضہ مقام پر آپ کو نظر بند رکھا جائے۔ دلی سے لے کر لندن تک مشوروں اور بہت روکد کے بعد انگریز حکام نے یہ طے کیا کہ شیخ الہند کو براعظم ایشیا اور براعظم افریقہ کے بدلے براعظم یورپ میں نظر بند رکھا جائے اس غرض کے لئے ملک اٹلی میں رومہ سے قریب ایک سمندری جزیرہ "مالٹا" کا انتخاب کیا گیا جس میں جنگ شروع ہونے کے وقت سے ترکی اور جرمنی کے وہ فوجی افسر جنرل، کرنل اور انگریزوں کے بڑے بڑے مخالف لا کر نظر بند کئے جاتے تھے جو بدور ان جنگ گرفتار کر لئے جاتے تھے۔

یہ رہتہ بلند ملا جس کو مل گیا ☆ سر بوالہوس کے واسطے دارورسن کہاں؟

جزیرہ مالٹا کو حضرت مولینا محمود حسن اور آپ کے رفقاء کی منتقلی کا فیصلہ ہو جانے کے بعد ان کے پاسپورٹ مرتب کئے گئے۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ (۱۶ فروری ۱۹۱۷ء) کو ایک سمندری جہاز ان مقدس قیدیوں کو لیکر مالٹا کی طرف روانہ ہو گیا۔ جو ۲۹ کو مالٹا پہنچ گیا۔

جزیرہ مالٹا جزیرہ مالٹا نہایت سرد جگہ پر واقع ہے اور فروری کا مہینہ جس میں آپ وہاں پہنچے سرما کا ہی مہینہ شمار ہوتا ہے۔ حضرت شیخ الہند ہندوستان کے ایک گرم صوبے یوپی کے رہنے والے تھے سرد مقامات کی آب و ہوا آپ کی صحت کے لئے ضرر رساں تھی۔ ابتداء میں آپ کو اور آپ کے رفقاء کو مالٹا میں کسی مکان کے بجائے خیموں میں ہی رکھا گیا تھا جو سرد ہواؤں کے جھونکوں سے ہر وقت پھڑ پھڑاتے رہتے تھے۔ مولینا حسین احمد مدنی نے تحریر فرمایا ہے کہ سردی خیموں کے باہر تو انتہائی درجہ کی پڑتی ہی تھی مگر اندر بھی اس قدر پڑتی تھی کہ باوجود یکہ لکڑی کی چار پائیوں پر نیچے گدہ اور اوپر دو کھیل ہوتے تھے۔ پھر بھی آدھی رات کے بعد سردی کی شدت سے نیند نہیں آتی تھی۔ مگر حضرت حسب عادت ڈیڑھ دو بجے اٹھتے، پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر ٹھنڈے پانی سے وضو

کرتے اور چونکہ (ضعیف العمری کے باعث) پیشاب کے بار بار آنے کی تکلیف لاحق تھی شب بھر میں کئی کئی مرتبہ اور ار کی ضرورت پڑتی تھی۔ لیکن چونکہ عادت شریف ہر وقت باوجود رہنے کی تھی اس لئے شدت سرما کے باوجود آپ ہر بار تجدید و صوفر مالتے اور ذکر الہی میں مصروف ہو جاتے۔

رہائی اور واپسی وطن:..... بہر کیف ۲ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو تقریباً ۳۳ برس دو مہینہ مالٹا جیل میں رکھ کر وہاں سے روانہ کئے گئے۔ ۲۵ جمادی الثانی کو اگن بوٹ اسکندریہ پہنچا۔ ۸ بروز وہاں ٹھہرنے کے بعد ۱۳ رجب کو وہاں سے سویس کو روانہ کئے گئے۔ سویس میں اسیروں کے سنگو میں (سینگوں کے پہرہ میں پونے دو مہینہ تک انہیں رکھا گیا۔ الغرض ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ (مطابق ۸ جون ۱۹۲۰ء) کو میں ۳۳ برس سات مہینے کے بعد بمبئی پہنچا کر ان کو رہا کیا گیا۔

محبت و عقیدت کے مظاہرے:..... بمبئی میں مولینا شوکت علی اور ہزاروں اشخاص و ممبران خلافت کمیٹی نے آپ کا پر جوش استقبال کیا اور نعرے بکیر سے فضا کو گونجا دیا۔ مولینا عبد الباقی فرنگی محلی لکھنؤ سے اور گاندی جی احمد آباد سے آکر استقبال میں شریک ہوئے بمبئی کے دو دن کے مختصر قیام میں خلافت کمیٹی اور اہلیان شہر کی طرف سے حضرت شیخ الہند کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا گیا۔ آخر کار ۲۵ رمضان ۱۳۳۸ھ کو دہلی میں ۲۶ رمضان ۱۳۳۸ھ (۱۲ جون ۱۹۲۰ء) کو آپ دیوبند پہنچ گئے۔

مدت مدبری کی اسارت کی مشقتیں برداشت کر کے جب حضرت شیخ الہند ہندوستان واپس تشریف لائے تو جذبہ عزت اور انگریزی دشمنی میں کوئی کمزوری یا کمی نہیں آئی بلکہ آپ کے سینہ میں آزادی وطن کی مبارک آگ زیادہ بھڑکی اور آخر انگریز کے ساتھ ترک موالات کا فتویٰ دے دیا۔ جس سے ملک میں زبردست ہوجان پیدا ہو گیا حتیٰ کہ ایک موقع پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تک کو لوگ بند کرنے میں آمادہ ہو گئے۔

اپنے مرحوم رفیق سجن کی والدہ کی تعزیت:..... سفر حرمین اور مالٹا کی قید میں جو لوگ حضرت شیخ الہند کے رفیق تھے ان میں ایک بزرگ حکیم نصرت حسین صاحب بھی تھے۔ حکیم صاحب نہ صرف حضرت کے شاگرد بلکہ مخلص خادم بھی تھے۔ باوجودیکہ حکیم صاحب حضرت شیخ الہند کی سیاسی تحریک کے باضابطہ ممبر نہ تھے لیکن حکام برطانیہ نے بوکھلاہٹ میں آپ کو بھی شیخ الہند کے انقلابی رفقاء میں شمار کر کے حجاز مقدس میں گرفتار کر لیا اور مالٹا لایا کر حضرت کے ساتھ ہی نظر بند کر دیا۔ آپ وہیں پر بیمار پڑ کر انتقال کر گئے۔ (رحمۃ اللہ رحمۃ واسعہ)

حضرت شیخ الہند نے وطن واپس آ کر دیوبند میں چند دن قیام فرما کے ضروری سمجھا کہ مرحوم کے گھر واقع کوڑا جہاں آباد (ضلع فتح پورہ) میں جا کر حکیم صاحب مرحوم کی والدہ محترمہ اور دیگر

لواحقین کی تعزیت پرسی کی جائے چنانچہ حضرتؒ نے ایسا ہی کیا۔

دیگر مقامات کا سفر..... کوڑا جہاں آباد کے سفر کے ساتھ ہی حضرت شیخ الہندؒ آباد اور لکھنؤ وغیرہ مقامات پر بھی تشریف لے گئے۔ سخت علالت ہی میں ۱۶ صفر ۱۳۲۹ھ (۱۲۹ اکتوبر ۱۹۱۰ء) کو علیگڑھ میں مسلم پینشنل یونیورسٹی (جو کہ بعد میں) جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے موصوم ہوئی اور علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوئی کی بنیاد ڈالی۔

اس تقریب پر دعوت دینے والوں کے اصرار پر یہ فرما کر حضرت نے رضا مندی ظاہر کی کہ اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا۔ آپ ان دنوں اسقدر علیل تھے کہ ضعف و نقاہت کی وجہ سے خود چل بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ شخصوں کے کندھوں پر ٹیک کر چلنا ہوتا تھا۔ آپ کی طرف سے خطبہ صدارت آپ کے فیض یافتہ مولینا شبیر احمد عثمانی نے پڑھا جس کے مندرجہ ذیل فقرے قابل ذکر ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کی یادگار تقریر:..... (۱)..... میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پا۔ نے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جو ملک رہی ہے۔ لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جلد از جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے زرعے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند بستیوں کی مستیوں کا اور ان کے سامان حرب و ضرب کا۔“

(پھر چند سطور کے بعد ارشاد فرماتے ہیں)

(۲)..... ”اے نو نبالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس میں میری ہڈیاں جھکی جا رہی ہیں) مدرسوں و مدارس خفا ہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔“

(آگے چل کر اس خطبہ مبارک میں ارشاد فرمایا:)

(۳)..... آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہو گئے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم اور فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ الخ ۵

۵..... حتیٰ کہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اپنے زمانے میں فتویٰ دیا تھا کہ انگریزی پڑھنا علوم جدیدہ کا حاصل کرنا اسلام کی روایات اور روح کے بالکل مطابق ہے۔ (کوئٹہ)

جمیۃ العلماء کی صدارت علی گڑھ کے اس جلسہ میں شرکت اور جامعہ ملیہ کی سنگ بنیاد ڈالنے سے فراغت کے بعد آپ واپس دہلی تشریف لائے اور وہاں ۸۰، ۸۱ اور ۹ ربيع الاول ۱۳۲۹ھ کو جمیۃ العلماء ہند کے تاریخی اجلاس کی صدارت فرمائی اور آخر وہیں ۱۸ ربيع الاول ۱۳۳۹ھ (۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء) کو آپ نے اپنی جانِ حضرت جانِ آفرین کے سپرد کی۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ۔

رحلت شیخ الہند:۔۔۔ مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی کا بیان ہے کہ (جس کو مولینا جلیل صاحب نے نقل فرمایا ہے) کہ رحلت فرمانے سے کچھ دیر پہلے (حضرت شیخ الہند) نے تھوڑی دیر آنکھ کھول کر چھت کی طرف دیکھا پھر فرمایا کہ مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں ہے مگر افسوس ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں، تمنا تو یہ تھی کہ میں میدانِ جہاد میں ہوتا اور اعلاءِ کلمۃ الحق کے جرم میں میرے گلوے کئے جاتے۔ اس کے بعد بلند آواز سے اللہ اللہ سات مرتبہ کہا۔ آٹھویں مرتبہ آواز بلند ہوئی دیکھا تو زبان تالو سے لگی ہوئی تھی۔ (نقشِ حیات ج ۲۶۵۲)

حضرت شیخ الہند کی وفات حسرتِ آیات کی خبر شہرِ دہلی میں پھیل گئی تو آنا فانا تمام دکانیں بند ہوئیں۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کونٹھ کی سامنے میدان میں ہزاروں مسلمانوں کی جماعت نے نماز جنازہ پڑھی۔ اس کے بعد ریلوے اسٹیشن پر دوسری دفعہ نماز جنازہ پڑھی گئی پھر شہر میرٹھ اور چھاونی میرٹھ پر بھی نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ساڑھے سات بجے شام کو تابوت دیوبند اسٹیشن پر پہنچا۔ عقیدت مندوں کا جم غفیر عام تھا دوسرے دن صبح کی نماز صبح کو بعد جنازہ دارالعلوم میں پہنچایا گیا۔ جہاں حضرت شیخ الہند کے برادرِ مکرم مولینا حکیم محمد حسن صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی ۹ بجے صبح کا وقت تھا جب بقول مولینا سید حسین احمد مدنی شریعت و طریقت کے اس آفتابِ عالمِ کتاب کو (حضرت نانوتویؒ کی قبر مبارک کے قریب) ہمیشہ کے لئے نظروں سے چھپا دیا گیا۔

مولینا مدنی نے نقل فرمایا ہے (اس وقت ایک غمزدہ کی زبان نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔

منی میں کیا سمجھ کے چھپاتے ہو دوستو!

گنجینہٴ علوم ہے یہ منہج زر نہیں

تصانیف:۔۔۔ حضرت شیخ الہند نے بے شمار فیض یافتہ علماء و فضلاء یادگار مچھوڑے ان کے علاوہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ، جہد المقتل، احسن القری، اولہ کاملہ، ایضاح الاولیاء، الابواب والترجم، مختلف فتاویٰ اور متعدد سیاسی خطبات حضرت ممدوح کی تصنیفی یادگار ہیں۔

خراج تحسین:۔۔۔ جو جانبازی حضرت شیخ الہند نے دکھائی وہ تو کوئی اور کیا دکھائے گا۔ (مولینا

انور شاہ کشمیری) (بحوالہ دارالعلوم دیوبند، جولائی ۱۹۶۳ء، مقالہ مولینا نائل پوری)

حضرت شیخ الہند صرف تفسیر وحدیث، فقہ و اصول، منطق اور فلسفہ، حساب اور مساحت، ہیئت اور محمولات کے ہی بحر ذخائر نہیں تھے بلکہ ان کو ادبیات عربیہ و فارسیہ (اردو شعر و سخن، اساتذہ فن کے مقالات اور قصائد غزلیات اور مثنویاں وغیرہ اس قدر یاد اور اثر پھیں کہ سننے والا حیران ہو جاتا تھا۔ اور تعجب کرنے لگتا تھا کہ ان کے حافظ میں کس قدر بے شمار علوم اور محمولات کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔

مولینا سید حسین احمد مدنی (بحوالہ نقش حیات جلد ۱، ۱۳۲)

”میں نے حضرت شیخ الہند سے حضرت مولینا محمد قاسم کی حجت الاسلام پڑھی کتاب پڑھتے ہوئے کبھی کبھی یوں محسوس کرتا کہ جیسے علم اور ایمان میرے دل میں اوپر سے نازل ہو رہا ہے۔“ مولینا عبید اللہ سندھی (بحوالہ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ۲۶۶)

حلقہ درس کو دیکھ کر سلف صالحین اور اکابر محدثین کے حلقہ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ قرآن وحدیث حضرت کی زبان پر تھا اور ائمہ اربعہ کے مذاہب ازبر، صحابہ و تابعین فقہاء مجتہدین کے اقوال محفوظ تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں، نہ منہ میں کف آتا تھا، نہ مغلط الفاظ سے تقریر کو جامع الغموض اور بھدی بناتے تھے۔ نہایت سبک اور اہل الفاظ با محاورہ اردو میں، اس روانی اور جوش سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ دریا امنڈ رہا ہے۔ یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے ہزاروں دیکھنے والے موجود ہیں کہ وہی منحنی اور منکسر المزاج ایک مشت استخوان، ضعیف الجشہ مرد خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا مسند درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر خدا ہے جو قوت وشوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے۔ آواز میں کڑھکی آمیز بلندی نہ تھی لیکن مدرسہ کے دروازے تک بے تکلف قابل فہم آواز آتی تھی۔ لہجے میں تصنع اور بناوٹ کا نام نہ تھا۔ لیکن خدا تعالیٰ نے تقریر میں اثر دیا تھا۔ بات دلنشین ہو جاتی تھی اور سننے والا بھی یہ سمجھ کر اٹھتا تھا کہ وہ جو فرما رہے ہیں حق ہے۔

مولینا میاں اصغر حسین دیوبندی (حیات شیخ الہند بحوالہ تاریخ دارالعلوم دیوبند ۳۵۴، ۳۵۵)

- ۱۔ مولینا محمود حسن صاحب کی صحبت مغنمات میں سے ہے۔
- ۲۔ بخاری شریف مولینا محمود حسن صاحب سے پڑھنا
- ۳۔ مولینا محمود حسن صاحب کی ذات قدسی نمونہ سلف ہے۔ ان کے اخلاق کا مطالعہ رکھو۔ اقتباساً۔ مکتوب حضرت مولینا عبدالحی لکھنوی۔ بنام فرزند ارجمند مولینا ڈاکٹر عبدالعلی چشتی (بحوالہ حیات عبدالحی ۳۵۰، ۳۵۱)

نتیجہ (۲)

حضرت الشیخ بابا مسعود زوری

آپ کا زمانہ ولادت جہاں تک آپ کی تاریخ پیدائش کا تعلق ہے کشمیر کی وہ تاریخی کتابیں جن میں آپ کا تذکرہ آتا ہے خاموش ہیں۔ اندازاً آپ کی ولادت دسویں صدی ہجری کے ربیع الاول میں ہوئی چاہئے۔ آپ نے حضرت میر احمد کرمانی سہروردی کے دست مبارک پر بیعت کر لینے کے بعد دنیائی تعلقات ترک کر دیئے دینی انقلاب اور ترک دنیا سے قبل آپ ایک کامیاب تاجر کی حیثیت میں شہرت عام حاصل کر چکے تھے۔ اپنے ہم پیشہ تاجروں اور امراء دربار میں اپنی شخصیت کا سکہ اس حد تک بٹھا رکھا تھا کہ تاجر لوگ آپ کے ملک التجار کے لقب سے پکارنے لگے تھے اور امراء دربار میں سے ایک بڑے فوجی امیر ملک علی چک نے (جو آگے چل کر بادشاہ بھی بنا اور علی شاہ چک کہلایا) اپنی بیٹی آپ کے عقد میں دے دی تھی، (آپ کے دو مشہور ترین فرزند الشیخ بابا عبداللہ اور الشیخ بابا حاجی اسی روجہ محترمہ کے لڑکے تھے) مال و دولت کا رواج تجارت کی یہ ترقی، اپنے زمانہ کے روسا و امراء میں اثر و رسوخ اور حصول وجاہت کے لئے زندگی کے تجربات اور پختہ سن و سال کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان واقعات کو ملا کر تاریخ نہ سہی مگر زمانہ پیدائش کا اندازہ کر لینا مشکل نہیں۔

حضرت میر سید احمد کرمانی کا کشمیر میں اس وقت درود ہوا ہے جب سلاطین کشمیر میں سے محمد شاہ اور فتح شاہ امراء دربار کی سازشوں سے یکے بعد دیگرے بار بار معزول اور بار بار تخت نشین ہوتے تھے۔ (یہ ڈرامہ کئی سال تک چلتا رہا اور اس میں محمد شاہ پانچ بار اور فتح شاہ تین بار تخت نشین ہوئے) اس لئے حضرت کرمانی کی کشمیر میں رونق افروزی ۹۴۵ھ کے ماقبل یا مابعد زمانہ میں متعین ہوتی ہے۔ یہی زمانہ حضرت شیخ بابا مسعود کے ترک دنیا اناامت الی اللہ اور سلسلہ سہروردیہ میں بیعت و تربیت حاصل کرنے کا ہے۔ اگر اس موقع پر آپ کی عمر تیس سال بھی مان لی جائے تو آپ کی پیدائش لگ بھگ ۹۱۵ھ سے ۹۲۰ھ کے مابین متصور ہوگی۔

آپ کے دینی انقلاب کے عوامل یہ امر محقق ہے کہ انقلاب کے اسباب اور عوامل ہوتے ہیں اور دینی انقلاب تو زیادہ سے زیادہ موثر عوامل کا تقاضا کرتا ہے۔ یوں ہی بیٹھے بٹھائے کوئی دولت مند تاجر اور بڑا امیر شخص اپنی دولت دنیا کو لات نہیں مار سکتا۔ جب حضرت مسعود زوری نے دولت و شہرت سے بیزار ہو کر فقیری اختیار کی اور پھر صوفیائے کرام کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔ اس وقت کشمیر کے شاہمیری سلاطین کا اقتدار چراغ سحری تھا۔ دیگر اہل بصیرت کی طرح آپ نے بھی کشمیر کی سیاسی بساط پر محمد شاہ اور

فتح شاہ کے مہرے پٹے ہوئے دیکھے اور ان کے جانشینوں سلطان ابراہیم سلطان شمس الدین، اسماعیل شاہ، ابراہیم شاہ ثانی، نازک شاہ اور اسماعیل شاہ ثانی کی ڈگر گاتی ہوئی حکومتیں اور نازک شاہ کے دور میں مرزا حیدر کا شغری کی سربراہی وغیرہ سب کچھ دیکھا تھا اور امراء سلطنت کے ایک گروہ کا تشیع کی طرف جھک جانا اور پھر حبیب شاہ پر اس کے حقیقی ماموؤں کے ہاتھوں شاہمیری سلاطین کا خاتمہ اور چکوں میں سے غازی چک، حسین چک اور علی چک اور آخر الذکر کے بیٹے یوسف شاہ چک اور اس کے بیٹے یعقوب چک کا یکے بعد دیگرے کشمیر میں بادشاہت کرنا اور ان کی حکومت کا دولت مستعجل ثابت ہونا اور مغل اعظم جلال الدین اکبر کا کشمیر کو سلطنت ہندوستان میں شامل کر لینا یہ تمام عبرتناک تغیرات ہیں جو حضرت مسعود نے چشم خود دیکھے۔ مسعود صاحب کے حساس قلب کے لئے یہ واقعات عبرت و غلطت کا ایک فرد اپنے اندر لئے ہوئے تھے۔ اس لئے یہ تاریخی ماحول آپ کے ذہنی انقلاب کا سب سے مؤثر سبب اور عامل تھا۔

خلاصہ حیات :..... کشمیر میں دسویں صدی ہجری کے صوفیاء کرام کو آج کے مجاوروں اور گندی نشینوں پر قیاس کرنا اپنے آپ کو بڑے مغالطے میں ڈالنا ہوگا۔ اس وقت صوفی، ربی و مشائخ حسب مراتب قوم کے اجتماعی امور میں رہنمائی نہ پا رہے تھے۔ حتیٰ کہ سیاسی امور سے بھی وہ لاتعلق نہ رہتے تھے۔ اسلئے حضرت مسعود بھی اجتماعی زندگی سے واسطہ رکھتے تھے۔ قوم کی اجتماعی زندگی میں آپ کے سرگرم حصہ لینے کے حالات اور آپ کی زندگی کے اہم واقعات سے آپ کا زمانہ یہ بھی بالکل متعین ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ ۹۵۰ھ میں آپ ایک باجاہت تاجر ہیں تو ۹۶۰ھ میں تارک الدنیا زاہد و عابد ہیں اور ۹۷۰ھ میں شیخ وقت ہونے کے لحاظ سے سلسلہ سہروردیہ کے عظیم الشان پیران طریقت حضرت سید احمد کرمانی اور سید محمد مسافر کرمانی کی خلافت کا تاج زیب سر کئے ہوئے ہیں ۹۸۰ھ اور ۹۹۰ھ میں آپ دیگر مشائخین وقت حضرت سلطان العارفین مخدوم شیخ حمزہ، حضرت ایشان علامہ شیخ یعقوب صرئی، حضرت مخدوم احمد قاری، اور حضرت بابا داؤد خاکی وغیرہم کے دوش بدوش ان خراب حالات کی اصلاح کرتے ہوئے دیکھے جا رہے ہیں جو چک خاندان کے پہلے اور دوسرے تشدد پرست حکمرانوں سے شیعیت کو آڑ بنا کر سیاسی اغراض براری کے لئے پھیلا دیئے تھے اور جن کی وجہ سے کشمیر کے عوام ہرج و مرج میں مبتلا تھے اور ملک میں عدل و انصاف اور امن و امان کا فقط نام ہی باقی رہ گیا تھا۔ حضرت شاہ کرمان سے بیعت :..... حضرت مسعود کے ذہن میں جو انقلاب آیا تھا اس نے ترک دنیا کی صورت اختیار کر لی۔ آپ اپنی تجارت کے شغل کو ترک کر کے اور دست از ہمدست کشیم و قلندر تثنیم کے مطابق اپنی قیمتی جائیدادیں چھوڑ کر مرشد کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ آپ کی جائے سکونت واقع زردہ سے جڈ پھل کا قلعہ بالکل قریب تھا اور آپ کے کانوں تک میر شمس الدین

عراقی کی شہرت بھی پہنچ چکی تھی۔ چونکہ میر عراقی ابتداء مستور الحال تھے اور اعضاء کو آپ پر کبرویت کا گمان بھی تھا۔ اس لئے شاہ و نادر ہی کسی کو معلوم تھا کہ آپ شیعیت کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ حضرت مسعودؒ نے بھی میر عراقی کے پاس جانے کا ارادہ کیا لیکن وہاں جانے سے قبل ہی آپ کو کسی غیر معمولی اشارے سے اصلیت معلوم ہو گئی اور آپ نے یہ ارادہ ترک کر دیا لیکن روح کی پیاس بجھانے کے لئے آپ نے اس پر بھی تلاش جاری رکھی۔ آخر کار تقدیر الہی رہبر بنی اور آپ محلہ بلبل ننگر میں حضرت سید السادات شاہ کرمان میر سید احمد کرمانی کی خدمت میں پہنچ گئے۔ چند ابتدائی امتحانات سے مرشد روشن ضمیر کو حضرت مسعودؒ کی استعداد کا اندازہ ہو گیا اور پھر بیعت اور سلوک کے مدارج طے ہونے لگے اور تربیت و ریاضت کی منازل طے کر کے آپ اپنے مرشد کے محبوب ترین مرید اور دست راست بن گئے اور نہ صرف بذات خود اس مشن کی تکمیل میں وقف ہو گئے۔ جس کے لئے حضرت کرمانی نے کشمیر کو اپنا وطن بنا لیا تھا بلکہ اپنے بیٹوں کو بھی آبائی شغل تجارت اور کاروبار کی بجائے علم دین حاصل کرنے پر کمر بستہ کیا اور اس طرح سے انکی زندگیاں بھی دین کی حفاظت و اشاعت کی نذر کر دیں۔

حضرت مسعودؒ کے تین مرشد: علم سلوک کی رو سے طالب کے ایک پیر بیعت و تربیت ہوتے ہیں ایک پیر صحبت اور پیر خلافت۔ بعض اوقات تینوں مرحلے ایک ہی شخصیت کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن حضرت بابا مسعودؒ کی ان تین مرحلوں میں تین بزرگوں سے واسطہ رہا۔ حضرت میر سید احمد کرمانی آپ کے وہ مرشد تھے جن سے آپ بیعت بھی ہوئے اور جنہوں نے آپ کی تربیت بھی فرمائی۔ لیکن مرشد کی ہدایت کے مطابق آپ نے مرشد کے ایک بڑے خلیفہ حضرت سید جلال الدین کے ساتھ سالہا سال تک صحبت رکھی اس لئے سید جلال الدین آپ کے پیر صحبت تھے۔ حضرت میر سید احمد کرمانی کے فرزند سید محمد مسافر کرمانی تھے۔ جو آپ کے خلیفہ اعظم بھی تھے۔ حضرت میر نے اپنے فرزند کو یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ سلسلہ سہروردیہ کرمانیہ کی خلافت شیخ مسعود کو عطا کر دینا چنانچہ ۹۷۹ھ میں حضرت سید محمد مسافر کرمانی نے حضرت شیخ بابا مسعودؒ کو خلافت پر مضاد یا۔

آباء و اجداد: حضرت مسعودؒ کے والد کا نام جنید تھا اور جنید کے والد قاسم تھے جن کو تجارتی اور کاروباری حلقوں میں "قاسم میمون" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ قاسم کے والد عبد اللہ تھے اس امر کی وضاحت پہلے بھی آچکی ہے۔ اور خود حضرت مولانا نور شاہ کشمیریؒ کی تحریرات سے بھی اس کی تائید پیش ہو چکی ہے کہ یہ خاندان کشمیر میں لاہور سے، لاہور میں ملتان سے اور ملتان میں بغداد سے مستقل ہوتا ہوا چلا آیا تھا، ہر نئے وطن میں کئی کئی پشتیں گزرتی تھیں۔ اس لئے یہ سفر کئی سو برس میں پورا ہوا ہوگا۔ حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مسعودؒ کی اولاد کی دوسری شاخوں کے اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت مسعودؒ

نسب نامہ اور چاکر حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت پر مبنی ہوتا ہے۔ حضرت امام صاحب کے مشہور فرزند حماد تھے اور حماد کے دو بیٹے اسماعیل اور ابو حنیان، حضرت مسعود کا نسب نامہ ابو حنیان سے متصل ہوتا ہے۔ دوسری روایت یوں ہے کہ امام ابو حنیفہ کے دادا کا نام بھی نعمان تھا۔ اس نعمان اول کے دو فرزند تھے۔ ثابت بن نعمان زوطی (امام صاحب کے والد ماجد) اور حارث بن نعمان زوطی۔ حضرت امام ابو حنیفہ تو ثابت کی اولاد ہیں مگر حضرت شیخ مسعود زورئی کے آباء کرام حارث کی اولاد ہیں۔ ان روایات کے علاوہ مسلسل شجرہ ہائے نسب بھی اکثر شاخوں میں منتقل ہوتے چلے آ رہے ہیں جو نظریات بالا کے موید ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب و الیہ المرجع والمآب۔

اولاد:..... اکثر تو اربع کشمیر میں حضرت مسعود کے حسب ذیل چار فرزندوں کا تذکرہ آتا ہے۔
(۱) الشیخ بابا عبداللہ الجانی:..... آپ کا شمار اپنے زمانہ کے علماء و اقیام میں ہوتا ہے۔ نصف سے زیادہ مسعودیان کشمیر کا سلسلہ آپ ہی کے ذریعہ حضرت مسعود تک پہنچتا ہے۔
(۲) الشیخ بابا حاجی:..... اس وقت زورہ میں مسعودیوں کے جو گھر آباد ہیں ان کی اکثریت حضرت حاجی کی اولاد سے ہیں۔
(۳) الشیخ بابا ابراہیم:..... آپ کی اولاد ضلع اسلام آباد کے آکھرن (کلا گام) وغیرہ دیہات میں آیا ہے۔

(۴) بابا یحییٰ:..... آپ کی اولاد کھر و شار میں آباد ہے۔
(۵) بابا یوسف:..... آپ کا تذکرہ صرف ایک تاریخی کتاب ”خوارق السالکین“ مصنفہ ملا احمد بن عبدالصبور ہادی میں ملتا ہے۔
خلاصہ یہ کہ ان سب حضرات کو کشمیر کے تذکرہ ہائے صوفیاء کرام میں مورخین نے اپنے وقت کے صالحین اور اولیاء کرام میں شمار کیا ہے۔

حضرت بابا مجنون زورئی:..... آپ بابا حاجی کے فرزند تھے۔ اپنے علمی کمالات اور روحانی درجات میں آپ اپنے بنی ائمہ سے ممتاز تھے۔ آپ نے تعلیم کی تکمیل سرینگر کے بعد سیالکوٹ لاہور اور دہلی میں جا کر کی جو گیارہویں صدی ہجری میں مشہور علمی مراکز تھے تفسیر و حدیث اور فقہ کے علاوہ علم طب یونانی بھی آپ نے حاصل کیا اور کشمیر میں آپ طب یونانی کے بانی اور استاذ اول ثابت ہوئے۔ قریباً تین سو یا ساڑھے تین سو سال تک وادی کشمیر میں لاکھوں لوگوں کے علاج کا دار و مدار اور طب یونانی پر رہا جو بابا مجنون کے احسانات میں شمار ہوتا ہے۔ ظاہری علوم ادیان اور علوم ابدالان کے جامع ہونے کے باوجود حضرت بابا مجنون کی سب سے زیادہ توجہ علم سلوک کی طرف تھی۔

صاحب اسرار الابرار محدث بابا داؤد مشکوئی بابا مجنون کے شاگردوں اور فیض یافتہ گان میں نمایاں تھے۔ جب مجنون صاحب کے فرزند اور خلیفہ بابا محمد آبرو آپ کی حیات میں ہی وفات پا گئے تو آپ نے حضرت مشکوئی کو اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر کیا۔ ۱۰۶۶ھ میں آپ نے رحلت کی اور اپنے بزرگوں کے پہلو میں محو ستراحت ہو گئے۔

حضرت مسعود زواج تھے:..... اسرار الابرار میں علامہ داؤد مشکوئی نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت سلطان العارفین مخدوم شیخ حمزہ کشمیری اور حضرت بابا مسعود زوری کے درمیان باہم مجالست و موانست بہت زیادہ تھی اور ایک دوسرے کے کمالات سے واقف تھے۔ مگر دونوں میں ایک فرق تھا۔ حضرت مخدوم صاحب مجرد تھے اور تجرد و تنہائی کو تامل پر ترجیح دیتے تھے۔ لیکن حضرت بابا مسعود متامل تھے۔ چار بیبیوں کے شوہر اور کثیر الاولاد تھے۔ حضرت مخدوم صاحب حضرت مسعود کے روحانی کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ:

”بابا مسعود زوری اگر زواج یعنی متعدد بیبیوں کے شوہر نہ ہوتے تو مشائخ کشمیر میں ان کے رتبے کو کوئی بھی نہ پہنچ سکتا۔“

حضرت مسعود کا مدفن:..... حضرت مسعود زوری اور آپ کے بڑے دونوں فرزندوں اور آپ کے پوتے بابا مجنون اور آپ کے ایک خلیفہ بابا اسحاق کا مدفن و مزار نرورہ میں زیارت علم صاحب کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ کشمیر کے دیگر مشائخ کے برعکس ان بزرگوں کے مقابر پر کوئی تعمیر یا سقف نہیں ہے۔ یہ فلک نیلی فام کی کھلی چھت کے سایہ میں آرام فرما ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

تحریک حریت کشمیر اور مسعودیان محلہ نرورہ:..... کشمیر کی سیاسی تحریک میں وادی بھر کے مسعودیوں کی طرح نرورہ کے مسعودیوں نے بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔ سیاسی تحریک ۱۹۳۱ء میں ابتداء جموں اور سرینگر کے دو شہروں کی تحریک تھی۔ پریس اور اخبارات کا اس زمانے میں وجود ہی نہ تھا اور دیہاتی علاقوں میں تعلیم بھی معدوم تھی۔ ایسے حالات میں کشمیر میں گاؤں گاؤں اور گھر گھر تک پھیلا ہوا پیری مریدی کا سسٹم تحریک کے حق میں آب حیات ثابت ہوا کشمیر میں پیری مریدی کا رواج آٹھویں صدی ہجری سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ اس کے مطابق گاؤں کے ہر گھر کا موروثی پیر سال میں دو بار یا کم از کم ایک بار گاؤں کا دورہ کرتا ہے اور چند دن اپنے مریدوں کے گاؤں میں رہ کر اپنی علمیت اور قابلیت کے مطابق وعظ و نصیحت تبلیغ و تعلیم اور تعویذ و تلقین کے ساتھ ساتھ نذر و نیاز بھی حاصل کرتا ہے۔ ۱۹۳۱ء کی سیاسی تحریک میں چونکہ علماء اور پیر زادگان طبقہ پیش پیش تھا اس لئے قریباً تمام پیر صاحبان تحریک حریت کے نہایت موثر مبلغ ثابت ہوئے یہ دیہات میں پھیل کر اپنے مریدوں میں سیاسی تحریک

کو مقبول بنانے میں ناقابل فراموش کارنامہ انجام دے گئے۔ ان میں سادات گیلانی، اندرانی (نکاتی) بخاری و قادری و نقشبندی اور پیر زادگان مہدوی، مسعودی، رفیعی، ہمدانی کالمی و ریشی اور خاندان واعظان، مفتیان و مولویان کا حصہ اس قدر نمایاں رہا ہے کہ اس کی تفصیلات کے لئے ایک کتاب ہونی چاہئے۔

محلہ نرور و سرنگر کے مسعودیوں میں سے حافظ کلام اللہ پیر قمر الدین (م ۱۳۷۳ھ) پیر سلام الدین (م ۱۳۷۵ھ) پیر ظیل اللہ شاہ (م ۱۳۹۲ھ) حافظ پیر قاسم شاہ (م ۱۳۹۳ھ) اور پیر سیف الدین صاحب وغیرہ ابتداء تحریک سے ہی مبلغین و عوت آزادی بن کر دیہات کے لوگوں میں جاگیر شاہی کے خلاف کام کرتے رہے اور قومی مطالبات کو گاؤں کے لئے بے خبر لوگوں کے ذہنوں پر نقش کر کے ان کو قومی جدوجہد کے دھارے میں صف آرا ہو جانے کے لئے تیار کرتے رہے۔

مرشد مسعود میر سید احمد کرمانی:۔۔۔۔۔ کرمان ملک ایران کا قدیم سے ایک مشہور شہر ہے اور اس علاقے کا مرکز رہا ہے۔ جو آج کے بلوچستان کے جنوب مغربی ضلع قلات کی سرحدوں سے نکرتا ہے۔ سادات کے بعض خاندان دوسری و تیسری صدی ہجری میں ہی کرمان میں آباد ہو گئے تھے۔ ان میں بڑے بڑے مشہور عالم، عارف اور تاجر پیدا ہوئے۔ ساتویں صدی ہجری کے نصف اول میں سید محمود اور سید احمد دو بھائی تجارت پیشہ تھے جن کے اونٹوں کے قافلے کرمان سے ایرانی، عراقی اور عربی مال لیکر ملتان سے گزرتے ہوئے لاہور تک آتے تھے۔ ملتان اسوقت سلسلہ سہروردیہ کا مرکز تھا۔ حضرت شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی کے سب سے بڑے خلیفہ حضرت مخدوم بہاؤ الدین زکریا ملتانی کی ذات مرجع خاص و عام تھی یہ کرمانی سید بھی ملتان میں آپ کے سلسلہ میں داخل ہو گئے۔ چونکہ سلسلہ سہروردیہ کے ہی ایک بزرگ حضرت سید شرف الدین بلبل شاہ نے ۷۲۵ھ میں سب سے پہلے سرزمین کشمیر میں اسلام کا پرشور درخت نصب کیا اس لئے آٹھویں، نویں اور دسویں صدی ہجری میں جو علماء فقراء اور اولیاء اس درخت کی آبیاری کے لئے کشمیر آتے رہے ان میں سلسلہ سہروردی کی مختلف شاخوں کے ساتھ تمسک کرنے والوں کی اکثریت ہے۔ دسویں صدی ہجری کے حضرت شاہ احمد کرمانی کی شخصیت تو مشہور و معروف ہے۔ آپ سے قبل آئے ہوئے کرمانی سادات میں سے کئی ایک سید احمد کرمانی سید محمد کرمانی اور سید محمود کرمانی ہیں جو وادی کشمیر کے متعدد علاقوں میں اپنے مشن یعنی تبلیغ دین اور اصلاح خلق کا فریضہ ادا کر کے محو خواب ہیں۔ سب کرمانیوں کے نام کتب تواریخ میں کہاں؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ایں ہمہ نو اکدل کے مقبرہ میں سید محمد کرمانی اور سید احمد کرمانی، بچہ گام میں سید احمد کرمانی اور سید محمد کرمانی اور مقبرہ، ملانازک تاشوانی، اندردنی قلعہ سرینگر، مقبرہ سازگری پورہ سرینگر اور موضع ہائی گام علاقہ سوپور ہر ایک میں کم از کم ایک ایک محمد کرمانی کی موجودگی کا تذکرہ آج بھی اوراق تواریخ کشمیر کی زینت ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کشمیر میں اسلام کو پھیلانے کی مہم پر سالکین کا جو لشکر مصروف کار تھا۔ اس میں کرمانی سادات کی کتنی بڑی تعداد شامل تھی۔ ان کرمانی سادات میں سے اکثر کا تعلق سہروردیت اور کبرویت سے تھا۔ اور کشمیر کو آتے ہوئے ملتان اور لاہور۔ ان کی پہلی منزلوں کا کام دیتے تھے۔ کشمیر میں کرمانی سادات کا نام جس عظیم الشان شخصیت کے وجود سے روشن تر ہوا وہ ہیں حضرت میر سید احمد کرمانی سہروردی۔

دسویں صدی ہجری کے نصف اول تک کشمیر کے مسلمان صرف اہلسنت والجماعہ کے مسلک پر تھے۔ سلطان فتح شاہ کے زمانہ میں امامیہ مذہب یا شیعہ مسلک کا چرچا پہلی بار ہوا جب ایران کے صفوں داعیوں میں سے ایک داعی میر شمس الدین عراقی نے اس مسلک کی اشاعت کے لئے سرینگر کے محلہ جڈی بل میں ایک مرکز قائم کیا۔ اس وقت حضرت میر سید احمد کرمانی ملتان، لاہور، دہلی اور آگرہ وغیرہ میں اہل سنت والجماعہ کے طریقہ کی حمایت میں سرگرم تھے جب آپ کو معلوم ہوا کہ کشمیر میں شیعہ سنی اختلافات نے سر اٹھایا ہے تو آپ کشمیر چلے آئے اور بلبل لنکر میں حضرت بلبل شاہ صاحب کی خانقاہ میں بیٹھ کر سنی کی حمایت کا فریضہ انجام دینے لگے۔ اس کے بعد کشمیر کو آپ نے اپنا مستقل مرکز بنالیا اور تاحیات یہیں رہ کر علمی اور روحانی فیوض کے دریا بہاتے رہے اور وفات کے بعد مقبرہ سلاطین میں مدفون ہوئے ہیں مقبرہ کے جنوب مشرقی گوشے میں آپ کا مرقہ شریف زیارت شاہ کرمان کے نام سے مشہور ہے۔ (جبکہ جنوب مغربی گوشے میں حضرت شیخ بہاؤ الدین صاحب کا مزار ہے)۔ زیارت شاہ کرمان کی چھت کے نیچے تین قبریں ہیں۔ ایک خود حضرت میر سید احمد کرمانی اور دوسری آپ کے فرزند میر سید محمد مسافر کی اور تیسری آپ کے خلیفہ سید جلال الدین کی۔ حضرت شاہ کرمان کی وفات ۹۷۶ھ یا اس سے کچھ قبل متصور کی جاتی ہے۔

مسعودی مشاہیر

حضرت الشیخ بابا مسعود زوری کا تذکرہ آپ کی اولاد کے مشاہیر کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ مشاہیر تقریباً پانچ سو سال کی مدت کے طویل زمانہ پر پھیلے ہوئے ہیں اور ان میں علماء و صلحاء کی اتنی بڑی تعداد شامل ہے کہ ان سب کو تلاش کرنا اور سمیٹ لینا بہت مشکل ہے اور چونکہ کتاب کا موضوع بھی ان میں سے شخص واحد (حضرت علامہ انور شاہ کشمیری) کی ذات ہے اس لئے دیگر مشاہیر مسعودیہ کا استیعاب اپنی حدود سے تجاوز کا سبب ہو سکتا ہے۔ بایں ہمہ ہم نے

بطور مشق نمونہ از خروارے چند ایک ایسے حضرات کا تعارف یہاں پر مختصر ترین الفاظ میں کر دیا ہے جو زمانہ قریب میں عوامی زندگی پر اپنے علم عمل اور اقدامات سے اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔

حضرت بابا عبدالغفورؒ

(م ۱۱۰۵ھ)

بارہ مولہ سے دریاجہلم وادی کو چھوڑ کر سرسبز پہاڑوں کے ایک گہرے درے میں داخل ہو جاتا ہے اور قصبہ منظر آباد تک جنگلات سے ڈھانپی ہوئی اونچی دیواروں کے درمیان شور مچاتا ہوا تیزی کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ بارہ مولہ سے کوئی سات میل آگے جا کر جہلم کے دائیں کنارے پر اوڑی تحصیل کے علاقہ میں پیریاں نام کے گاؤں میں ایک زیارت گزشتہ تین سو سال سے مرجع عوام چلی آتی ہے۔ یہ بابا عبدالغفورؒ ابن بابا عبدالرحیمؒ ابن بابا علیؒ ابن بابا عبداللہؒ ابن حضرت شیخ بابا مسعودؒ روری کی زیارت ہے۔ جو پہلے سلسلہ سہروردی کے کاملین میں سے تھے اور ملتان جا کر حضرت الشیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے خلفاء سے فیضیاب ہوئے تھے۔ بعد ازاں حضرت بعد علی قلندرؒ سے متاثر ہو کر بقیہ زندگی مجذوبانہ اور قلندرانہ کیفیت میں بسر کی۔ آپ کی اپنی اولاد میں سے کوئی بلوغ کو نہیں پہنچا آپ کے برادر کی اولاد ہمیشہ آپ کے فیض کی وارث رہی ہے۔ اسی شاخ میں سے موجودہ سجادہ نشین پیر محمد مقبول فرزند پیر سیف الدین ہیں۔ حضرت بابا عبدالغفورؒ کی کرامات جو اس علاقہ میں زبان زد خاص و عام چلی آتی ہیں ان کو ایک طرف چھوڑ کر آپ کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ اس علاقہ کے دیہات کے عوام میں اسلام کی محبت اور دین کی پابندی اب تک نمایاں طور پر قائم ہے۔

قاضی شاہ عبدالکبیرؒ

(وفات تقریباً م ۱۲۵۰ھ ۱۲۶۰ھ)

آپ نے کشمیر پر لاہور کی خالصہ حکومت کے زمانہ میں لولاب سے دل برداشتہ ہو کر علاقہ درادہ (نیلم) کی سکونت اختیار کر لی، اس وقت اس علاقہ پر ایک نیم آزاد جاگیردار راجہ منصور خان حکمران تھا جس نے آپ کے علم و تقویٰ سے متاثر ہو کر آپ کو اپنی قلمرو کا قاضی مقرر کر دیا آپ زندگی بھر اس مطب پر فائز رہے۔ درمیانی عمر ہی میں وفات پائی اور اپنے بعد محمد شاہ، منور شاہ محی الدین شاہ، مکر شاہ، موسیٰ شاہ اور معظم شاہ کچھ بیٹے چھوڑ گئے، جن سے آپ کی زیارت وادی نیلم اور وادی لولاب میں پھیلی۔ آپ کے سب سے چھوٹے بیٹے مولینا معظم شاہ واپس لولاب آئے اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایک سے ایک قابل فرزند عطا کئے جن میں سے امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کو خدا تعالیٰ نے عالمگیر شہرت کا مستحق بنایا۔

بابا نعمت اللہ صاحب

دودھ دن (کیواڑہ) کے مسعودی پیروں کے جد امجد پیر نعمت اللہ رحمۃ اللہ علیہ ریاضت کیشی، قلندری اور مجذوبہ ریت کا عجیب معجون مرکب گزرے ہیں۔ آس پاس کے پہاڑوں میں مسلسل بارہ سال تک خلوت گزین رہنے کے بعد واپس متاہل زندگی کی طرف رجوع کیا تو خدا تعالیٰ نے آپ کو آٹھ فرزند عطا کئے جو علم و عمل میں نمونہ آباء کرام تھے۔ حضرت بابا مسعود زوری تک بابا نعمت اللہ کا شجرہ نسب یوں ہے:

بابا نعمت اللہ ابن بابا کمال، ابن بابا شکر الدین، ابن بابا غلام نبی، ابن بابا عبد اللہ مدنی، ابن بابا مومن، ابن شیخ بابا تقی الدین، ابن شیخ بابا عبد اللہ، ابن حضرت شیخ بابا مسعود زوریؒ اس علاقہ کے دیہات، دودھ دن، ٹکری، ہیری، گلگام، میرٹاگ، ہائی ہامہ، ہامہ، ڈولی پورہ، مقام اور ترہگام وغیرہ کے مسعودی پیران ہی پیر نعمت اللہ صاحب کی اولاد ہیں۔ نعمت اللہ کا مزار جنگلوں کے درمیان ایک اونچی اور پر فضا پہاڑی پر واقع ہے۔

پیر شاہ محمد صالح

(مقریباً ۱۳۲۰ھ)

آپ لولاب کے موضع سایہ دن میں پیدا ہوئے۔ حضرت بابا مسعود زوریؒ تک آپ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ شاہ محمد صالح ابن شاہ عبدالشکور، ابن بابا عبدالرزاق ابن بابا غلام رسول، ابن بابا صدیق اللہ، ابن بابا عمر، ابن بابا علی، ابن الشیخ بابا عبد اللہ، ابن الشیخ بابا مسعود زوریؒ ضروریات دین کی تعلیم کے بعد آپ عبادت اور ریاضت میں مصروف تھے نو عمری میں ہی متاہل بھی ہو گئے۔ زراعت کو ذریعہ معاش بنایا۔ اسی اثنا میں ۱۲۳۳ھ میں کشمیر پر لاہور کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کا قبضہ ہو گیا۔ زراعت پیشہ لوگوں کے لئے زمین کا قبضہ عذاب جان بن گیا پیداوار کا اکثر حصہ حکومت کو دے کر نہ جان محفوظ تھی۔ اور نہ عزت۔ اکثر لوگ گھریا چھوڑ کر وادی کشمیر کو خیر باد کہنے لگے۔ شاہ محمد صالح بھی ترک وطن کر کے ضلع مظفر آباد کے علاقہ دراوہ میں لوات نام کے گاؤں میں چلے گئے اور جنگل کاٹ کاٹ کر نئی زرعی زمین حاصل کی۔ وہاں آپ کو خدا تعالیٰ نے بہت ذہین بیٹے عطا کئے جن کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر کے مشاہیر وقت کے زمرہ میں شامل کر دیا۔ مولوی مختار شاہ، پیر رحمت اللہ شاہ، قاضی عبدالاحد شاہ اور پیر احمد شاہ اپنے معاصرین کے لئے قدم قدم پر قابل رشک ثابت ہوئے اپنے علم و عمل سے دین کی بھی خدمت کرتے رہے اور دینی و جاہلیت سے بھی

بہرہ ور ہے۔ جب نیاز مانہ آیا تو شاہ محمد صالح کے پوتوں نے کشمیر کی سیاسی تحریکات میں پہلی صف میں پہنچ کر تاریخی رول ادا کیا۔ شاہ محمد صالح نے ۱۳۲۰ء سے کچھ قبل لوات ہی میں وفات پائی۔

پیر سیف اللہ شاہ دودھوئی

جناب پیر سیف اللہ شاہ فرزند پیر نور الدین ابن شکر الدین آپ بابا نعمت اللہ کے نبی اعمام میں سے تھے۔ اپنے علم اور زہد و تقویٰ کے لئے مرجع خلافت تھے۔ آپ ہی کی دختر بلند اختر مال دیدی صاحبہ تھیں جن کو فخر المحدثین حضرت علامہ انور شاہ کی والدہ بزرگوار بننے کا شرف حاصل ہوا۔ سیف اللہ صاحب نے مدت تک حضرت شاہ صاحب گواچی نگرانی میں رکھا اور اپنے گاؤں کے متصل سہیو رہ گاؤں کے مشہور معلم مولوی غلام محمد صاحب جندل سے آپ کو تعلیم دلواتے رہے۔ علامہ جلیل حضرت شاہ صاحب کی چینی ساخت جس سانچے میں ڈھالی گئی اسکی تربیت میں آپ کے نانا پیر سیف اللہ شاہ مرحوم کا براہ راست دخل تھا۔

مولوی سمندر شاہ (فاضل دیوبند)

مسعودیوں کی اس شاخ سے پیر لہ اور پیر حسین شاہ دو بھائی ڈولی پورہ گاؤں میں رہتے تھے۔ موخر الذکر کے ایک فرزند سمندر شاہ تھے۔ جنہوں نے دیوبند میں تکمیل علوم کر کے امتیازی سند حاصل کیں۔ اور واپس آ کر تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ مگر ابھی اپنی سیکسوں کو علمی جامہ نہ پہنا سکے تھے کہ بعالم جوانی ہی اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

حضرت پیر عبدالغفار شاہ رحمۃ اللہ علیہ

(م ۱۳۳۰ھ)

بیسویں صدی عیسوی کے پہلے رابع میں حضرت پیر عبدالغفار شاہ صاحب مسعودی لاہور میں مرجع خاص و عام تھے۔ حضرت شیخ مسعودی ضروری تک پیر صاحب مرحوم کا سلسلہ نسب بصورت ذیل ہے:

پیر عبدالغفار شاہ ابن پیر احمد شاہ، ابن پیر مصطفیٰ شان ابن نور شاہ، ابن فاضل شاہ۔ ابن پیر عبدالوہاب، ابن بابا عبدالقادر، ابن بابا ظاہر، ابن بابا یعقوب، ابن الشیخ بابا عبداللہ، ابن الشیخ بابا مسعود ضروری رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت پیر عبدالغفار شاہ صاحب مسعودیوں کی اس شاخ کے گل سرسبز تھے جو کامراج ضلع بارہمولہ کے گاؤں ترکہ پورہ میں مقیم ہے۔ حضرت بابا عبدالقادر اس گاؤں میں مقیم ہو گئے تھے۔ ترکہ پورہ کے

علاوہ چک شملو ہوا اور اس پاس کے بعض دوسرے دیہات میں بھی اس خاندان کے افراد آباد ہیں۔ ملحقہ علاقوں کے لوگ ان کے موروثی مرید ہیں۔ بابا عبدالقادر کے ایک فرزند بابا صاحب لکھوئی ہامہ کے کوئٹل مقام گاؤں میں تھے خود تو لاؤلد تھے لیکن آپ کے بھائی بابا عزیز الدین کی اولاد اب بھی اس گاؤں میں آباد ہے۔ جن میں پیر شاہ مرحوم ماضی قریب میں اور پیر حکیم طیب شاہ زمانہ جال میں غیر معمولی شخصیتیں میں پیدا ہوئی ہیں۔ خود بابا صاحب لار کے موضع جگہ گورہ کے اوپر پہاڑ کے دامن میں مدفون ہیں۔

کشمیر سے باہر سب سے اول پیر عبدالغفار کے دادا پیر مصطفیٰ شاہ گئے جو ابتدائے عمر میں حصول فیض باطنی کے لئے بغداد و ملتان، وغیرہ مراکز کا دورہ کرتے رہتے تھے اور آخر عمر میں لاہور سے قریب باری علاقہ میں مقیم ہو گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ ان کے بعد ان کے فرزند پیر احمد شاہ ترقہ پورہ چھوڑ کر لاہور چلے گئے اور محلہ تکیہ سادھواں میں مقیم ہو گئے۔ پیر عبدالغفار شاہ نو عمری میں ہی باپ کے ہمراہ لاہور گئے۔ وہیں آپ کی تعلیم و تربیت کے مراحل طے ہوئے اور وہیں آپ کی شادی بھی ہو گئی لیکن بیوی کوئی دو سال کے بعد ایک بیٹا (محمد اشرف) چھوڑ کر وفات پا گئی۔ اس کے بعد پیر صاحب عمر بھر بھر در ہے اور اپنا سارا وقت عبادات اور ریاضت شاقہ میں صرف کرنے لگے۔ جب عوام کا رجوع آپ کی طرف ہو گیا تو آپ نے مدرسہ غوثیہ کے نام سے لاہور میں ایک دارالعلوم قائم کر دیا۔ جس میں تفسیر قرآن، حدیث نبوی اور فقہ حنفی کی تعلیم بہت اعلیٰ پیمانہ پر دی جاتی تھی۔ آپ کی ساری زندگی اس قدر پاکیزہ اور مثالی زندگی تھی کہ لاہور جیسے نکتہ چین شہر کے لوگ آپ کے گرویدہ تھے۔ درود شریف اور نعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعے مرتب کرنا اور چھاپ چھاپ کر عوام میں بلا قیمت تقسیم کرنا آپ کا محبوب مشغلہ تھا پابندی سنت اور تقویٰ میں آپ سلف صالحین کا نمونہ تھے۔ آپ کا لباس ایک لمبے کرتے تھے بند اور کشمیری ٹوپی تک محدود تھا اور کھانا اس قدر سادہ اور قلیل کہ حیرت ہوتی تھی۔ آپ اس پر زندہ کیسے ہیں۔ طویل عمر پا کر آپ نے ۱۳۷۰ھ میں انتقال فرمایا۔ حضرت مولینا محمد انور شاہ صاحب دیوبند سے آپ کی تقریبات فاتحہ میں شمولیت کے لئے لاہور تشریف لے گئے تھے۔ لاہور میں پیر عبدالغفار شاہ صاحب کی وفات کے بعد آپ کا فرزند پیر اشرف شاہ آپ کا خلیفہ بنا جس نے کئی سال کے بعد آپ کا تابوت سابق قبر سے نکال کر لاہور کے باہر کل بیگم کے باغ علاقہ مزنگ میں منتقل کر لیا اور وہاں اس پر روضہ تعمیر کر کے خود بھی وہیں رہائش اختیار کر لی۔ پیر عبدالغفار شاہ صاحب کے علمی فیضان کو آپ کے برادر زادہ فاضل اجل پیر عبداللہ شاہ (فرزند رسول شاہ) نے جاری رکھا۔ آپ لاہور کی مسجد قاضی خان کے خطیب بھی تھے۔ ترکہ پورہ اور چک شملو ہہ میں پیر صاحب کے اقرباء میں بہت سے حضرات نے علمی ترقی اور شہرت نیک حاصل کی ان میں سے مرحوم مولینا پیر عبدالکبیر شاہ مسعودی فاضل دیوبند (سابق استاد جامعہ مدینہ العلوم حضرت بل) اور پیر غلام حسن شاہ صاحب ایڈیشنل انسپکٹر جنرل پولیس کشمیر و حال سکیولنس کمیشنر قابل ذکر ہیں۔

پیر احمد شاہ

(م ۱۹۶۵ء)

شاہ محمد صالح کے فرزند پیر احمد شاہ صاحب نے سیاست میں سرگرم حصہ لینے کی ذمہ داری اپنے بیٹوں خاص کر مولینا محمد سعید مسعودی اور مولوی محمد انور مسعودی پر ڈال رکھی تھی اور بذات خود بزرگ خاندان کے طور رہتے تھے۔ ۱۹۸۷ء تک سیاست میں آپ کے بیٹوں کے حصہ لینے کی وجہ سے آپ کی ذات پر حکومت نے کبھی اعتراض نہیں کیا لیکن ۱۹۹۷ء میں جب آپ کے گاؤں موضع لوات پر قبائلوں کا قبضہ ہو گیا تو آپ سے اس بات پر باز پرس کی گئی کہ آپ کے دو بیٹے محمد سعید اور محمد انور کیوں سرینگر میں کشمیر کی اس حکومت کا ساتھ دے رہے ہیں؟ چنانچہ قبائلوں نے اس بناء پر پیر احمد شاہ صاحب کو حراست میں لیا اور اپنے ہیڈ کوارٹر پر لے جا کر سترہ دن تک نظر بند رکھا۔ جب آپ کو واپس اپنے گھر جانے کی اجازت دی گئی تو آپ نے بیٹوں اور بھتیجیوں کو گرفتار شدہ اور سارے عیال کو خوف زدگی اور پریشانی میں پایا۔ آخر کار آپ نے ترک وطن کا فیصلہ کیا اور زمین مکانات، مال مویشی اور ہر قسم کی جائیداد چھوڑ کر راتوں رات گھر کے سب چھوٹے بڑے انسانوں کو اپنے ساتھ لیکر نکلے اور دریائے کشن گنگا کو عبور کر کے میز فائر لائن کے اس طرف آئے وادی کشمیر میں پہنچ کر ترہگام کے پاس گوگلوسہ نام کے ایک گاؤں میں مقیم ہو گئے۔ جہاں قریباً اٹھارہ سال مزید رہ کر ۱۹۶۵ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ

مولینا غلام مصطفیٰ مسعودی

آپ پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل اور منشی فاضل تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ سے بھی آپ کو شرف تلمذ حاصل تھا اور یو بند و ڈابھیل میں کئی سال تک آپ کی صحبت میں رہے تھے۔ اس دوران آپ نے تفسیر حدیث میں خاص خدافت پیدا کی۔ شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد کشمیر چلے آئے۔ عملی سیاست میں حصہ لیا۔ ۱۹۴۲ء میں سال بھر کے لئے ریاست سے جلائے وطن کئے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں مظفر آباد سے کشمیر اسمبلی کے ممبر چنے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں قبائلوں نے آپ کو اپنی برادری کے چار دیگر افراد (مولوی محمد یوسف شاہ ابن پیر امیر شاہ، مولوی عزیز الرحمن بن پیر عبد اللہ شاہ، پیر موسیٰ شاہ فرزند قاضی عبد الکبیر، فیروز شاہ ابن پیر احمد شاہ) سمیت گرفتار کر کے صوبہ سرحد میں انک کے مشہور قلعہ میں سال بھر قید رکھا۔ جنوری ۱۹۴۹ء میں وہاں سے رہا ہو کر جموں پہنچے اور جموں سے

ہوائی جہاز میں سرینگر آرہے تھے کہ ہانہال کے پہاڑ کی ایک اونچی چوٹی سے یہ جہاز ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا اس حادثہ کا شکار ہونے والے ۲۵ مسافروں میں تین مسعودی علماء (مولینا غلام مصطفیٰ، مولوی عزیز الرحمن اور مولوی محمد یوسف) بھی تھے تینوں فضلاء پنجاب یونیورسٹی) اور تینوں ہی تحریک حریت کشمیر کے سرگرم مجاہد تھے۔

مولینا غلام مصطفیٰ صاحب ایک آتش بیان مقرر تھے عوامی جلسوں کے علاوہ ان کی ہنگامہ خیز تقریروں سے قانون ساز اسمبلی کے ایوان میں سنانا چھا جایا کرتا تھا اور سرینگر جیسا مغرور وزیر اعظم بھی آپ کی جرات دہلیری اور صداقت بیان کا لوہا ماننا تھا۔ آپ کا اکلوتا فرزند عبداللہ شاہ کشمیر کے محکمہ بجلی میں ملازم ہے۔

مفکر کشمیر حضرت مولینا محمد سعید مسعودی مدظلہ العالی

حضرت شیخ بابا مسعود ندوویؒ کی اولاد میں سے چند مشاہیر کو جب اس تہمتہ میں شامل کرنے کا ارادہ ہوا تو میں نے چاہا کہ تحریک حریت کشمیر کے ایک عظیم مجاہد اور علم و فضل کی ایک مثالی شخصیت مولینا محمد سعید مسعودی قبلہ کے حالات بھی اس میں شامل کئے جائیں مگر وہ اپنی افتاد طبع کی وجہ سے اس پر راضی نہ تھے اور بار بار اپنی نسبت کچھ لکھنے سے منع کرتے رہے۔ آخر بہت کچھ جیل و جھٹ اور میرے اصرار پر مجبور ہو کر آپ نے ایک نشست میں اپنی زندگی کے مختصر حالات خود بیان فرمائے جن کو نہایت اختصار کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

پیر احمد شاہ صاحب مسعودیؒ کا ذکر اوپر آچکا ہے آپ کے پانچ فرزند ہیں جو سبھی زندہ موضع لوات وادی نیلم میں ماہ شوال ۱۳۲۱ھ جنوری ۱۹۰۳ھ میں آپ کا پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام آپ نے محمد سعید رکھا۔ اس زمانہ میں علاقہ بھر میں کہیں سکول کا وجود نہ تھا۔ محمد سعید کے اولین استاد اس کے ماں اور باپ تھے۔ قرآن پاک اور فارسی کے مدارج تک کتابیں والد ماجد اور والدہ محترمہ نے پڑھائیں۔ بعض اسباق اپنے عم محترم مولوی مختار شاہ، اپنے نانا پیر لہ شاہ اور اپنے ماموں پیر عبد الجبار شاہ مرحوم سے بھی پڑھے۔ لواب سے قریب ایک دوسرے گاؤں کٹھ پیراں میں ایک درس گاہ تھی جس میں مولوی ظہور الحق اور مولوی محمد اسرائیل (فاضل دیوبند) درس دیتے تھے۔ جن سے صرف نحو اور فقہ کی بعض کتابیں پڑھیں تعلیم کی دوسری منزل ضلع ہزارہ کے مانسہرہ، داتہ اور بھوئی گاڑاں کی درس گاہیں تھیں جن کے بعد لاہور کا رخ کیا اور اچھرہ کے مدرسہ قمریہ اور لاہور کے مدرسہ لہمانیہ سے منطق و فلسفہ اور فقہ و اصول کی تکمیل کے بعد ۱۳۴۰ھ ۱۹۲۲ء میں اورینٹل کالج لاہور کے درجہ مولوی فاضل میں شامل ہوئے اور ۱۹۲۳ء میں وہاں سے فراغت حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء

میں واپس وطن آکر متاثر زندگی شروع کی۔ ۱۹۲۷ء میں مظفر آباد ہائی سکول میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۲۸ء میں پرنس آف ویلز کالج جموں میں ۱۹۲۹ء میں ایس، پی، کالج سرینگر میں اور ۳۱، ۱۹۳۰ء میں ہری سنگھ ہائی سکول رعناواری سرینگر میں تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد فروری ۱۹۳۲ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور کشمیر کی تحریک آزادی سے وابستگی اختیار کر کے سنوئل جیل کی راہ لی اور بقول ان کے یہ سیاست کا نقشہ کچھ اس بری طرح سے سر پر سوار ہوا کہ ہمیشہ کے لئے سیاست سے چپک کر رہ گئے۔ علم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے بانیوں اور ممتاز رہنماؤں میں شمار ہوتے رہے نیشنل کانفرنس کے قیام ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۳ء تک مسلسل پندرہ سال اس کے جنرل سیکرٹری رہے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کشمیر میں شاید ہی کوئی ایسا پرائم منسٹر ہوا ہوگا کہ جس کے دور میں آپ جیل نہ گئے ہوں بعد کے زمانہ میں کبھی کشمیر اسمبلی کے ممبر، کبھی ہند کی کانسیٹی چیونٹ اسمبلی کے ممبر اور کبھی ممبر پارلیمنٹ رہے۔ نیز کئی اخباروں کے مدیر بھی رہے اور بھی نہ جانے کون کون سے پاپڑ نیلے۔ ۱۹۵۳ء کے بعد بخشی وزارت کے زمانہ میں ۳ سال، صادق وزارت کے حکم سے ساڑھے تین سال اور قاسم وزارت کے آرڈر سے صرف دو ماہ قید میں رہے جب آپ کی عمر ۷۰ سال سے متجاوز ہوئی۔ تو یہ سب ہنگامے ختم ہو گئے اور زمانے کی بے رحمی کو دیکھ کر اب آپ نے ۱۹۷۲ء سے گوشہ نشینی اور خاموشی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور بس۔

آپ کے چار بھائیوں میں سے مولوی محمد انور شاہ مسعودی (سابق ایم ایل اے) اور مولوی نظیر احمد (سیکرٹری) محکمہ جنگلات سیز فائر لائن کے اس طرف ہیں اور مولوی فیروز شاہ مولوی محی الدین شاہ موضع لوات علاقہ درادہ میں ہیں جو آزاد کشمیر کا ایک حصہ ہے۔

مولینائے محترم مسعودی صاحب کے دو فرزند بشیر احمد اور شبیر احمد ہیں۔ دونوں ایم اے، ایل ایل بی ہیں۔ کوئی ۲۰ سال ہوئے بشیر احمد مسعودی امریکہ چلے گئے وہاں یونیورسٹی سے مزید تعلیمی سند حاصل کرنے کے بعد اسی ملک کو اپنا وطن بنا کر وہیں رہ پڑے اور آج کل ریاست انڈیانا میں سوشل ایڈوائزری بورڈ کے ڈائریکٹر ہیں ایک امریکن نو مسلم پروفیسر زبیدہ جو سے کے ساتھ شادی بھی وہیں کی ہے اور اب ایک بیٹے (عمر سعید) اور بیٹی (حنیفہ) کے باپ ہیں۔ شبیر احمد کشمیر ہائی کورٹ کے ایڈووکیٹ ہیں اور گاندربل میں مقیم ہیں۔ پیشہ وکالت کے ساتھ ساتھ مثال زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سطور بالا اس وقت میں نے سپرد قلم کی تھیں جب کتاب ہذا کا پہلا ایڈیشن زیرِ ترتیب تھا اور ان دنوں مولینائے گزشتہ نشینی اور خاموشی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا تھا۔ اب اپریل ۱۹۷۷ء میں قریباً پانچ سال کی عزت نشینی کے بعد مولینا دوبارہ سیاست میں سرگرم عمل ہوئے مولینا کن حالات میں اور

کن وجوہات کی بنا پر ازسرنو میدان عمل میں آئے ان کی تفصیلات میں جانا اس وقت طول کلام ہوگا۔ مولینا اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ آپ کی ذات گرامی پر مشتمل کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ اس لئے ان سطور میں آپ کی ہمہ پہلو ہستی کا کیا حق ادا ہو سکے گا؟ آپ ایک وسیع النظر محقق اور مفکر ہیں۔ سیاسی میدان کے ازمودہ کار اور بے لوث رہنما ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ آپ خاندان انوری کے ایک مایہ ناز عالم اور بزرگ ہیں بقول مولینا سعید احمد اکبر آبادی آپ حضرت شاہ صاحب کے لئے صاحب البیت ہیں۔ کشمیری عوام کے لئے بالعموم اور اولاد شیخ مسعود کے لئے بالخصوص آپ کا وجود گرامی مقننات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں تادیر سلامت رکھے۔ پورے غیر منقسم ہندوستان کے ارباب علم و فضل آپ کے تفکر و تدبر کے معترف ہیں۔

مولینا محمد انور شاہ مسعودی

آپ پیر احمد شاہ مسعودی مرحوم کے دوسرے فرزند ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والدین سے اور کچھ پیراں کی درس گاہ کے علاوہ بڑے بھائی سے حاصل کی متاثر ہو جانے کے بعد محکمہ جنگلات کی بعض غیر سرکاری فرموں میں ملازم رہے۔ اس کے بعد تجارت کا شغل اختیار کیا۔ ۱۹۳۲ء میں کشمیر کی سیاسی تحریک کے سلسلہ میں گرفتار اور سزایاب ہوئے۔ اس کے بعد سیاست سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کی مظفر آباد ضلع کی شاخیں ہمیشہ آپ کی سرگرم نمائندگی کا فائدہ اٹھاتی رہیں۔ انتخابات کے وقت تنظیمی امیدوار کی کامیابی آپ کی دماغی کاوشوں کی مرہون منت تسلیم کی جاتی تھیں۔ قبائلی حملے اور قبضے کے وقت آپ کو گھریلو ترک کر کے وادی میں منتقل ہونا پڑا جب پیر احمد شاہ صاحب اور کنبہ کے سب لوگ جلانے وطن ہو کر سیر فائر لائن کے اس طرف آ گئے تو آپ ان کی پابجائی۔ ازسرنو بحالی اور پرورش کے لئے وقف ہو کر رہ گئے۔ یہی زمانہ تھا جب آپ کو اپنے والد بزرگوار کی خدمت کرنے اور دعائیں لینے کا خاص موقعہ میسر ہوا۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۸ء تک آپ کشمیر اسمبلی کے اور اس کے بعد اپر ہاؤس کے ممبر رہے۔ آپ کی عوامی مسائل پر بے لاگ تقریریں سب سے خراج تحسین حاصل کرتی رہیں۔ مدت سے آپ نے سیاسی سرگرمیوں کو خیر آباد کہہ دیا ہے اور حج سے واپسی کے بعد اپنا زیادہ وقت تلاوت اور عبادت کی نذر کرتے ہیں آپ کا صرف ایک فرزند پیر زادہ مطیع اللہ (سلمہ) ہے جو ابھی تک مصروف تعلیم ہے۔

مولوی نذیر احمد مسعودی

پیر احمد شاہ صاحب کے سب سے چھوٹے اور پانچویں فرزند مولوی نذیر احمد ہیں جو ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں ملی اور اس کے بعد مظفر آباد ہائی اسکول اور رمناداری ہائی اسکول سے

پڑھتے رہے انہیں پی کالج سرینگر سے بی ایس سی پاس کرنے کے بعد ڈیرہ دون کے جنگلات کالج سے ڈی ڈی آر کیا اور جنگلات میں رہنبر ہو گئے۔ قبائلی حملہ کے زمانہ میں انڈین افواج اور عوام کے درمیان لیزان کے طور پر فرائض انجام دیئے۔ پھر کئی سال ڈپٹی کنسرویٹر رہے اور چند سال سے کنسرویٹر جنگلات کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ محکمہ کے تجارتی شعبہ لمبرنگ ڈیپارٹمنٹ کے جنرل مینجر کے فرائض انجام دینے کے بعد اب اس محکمہ کے سب سے بڑے منصب یعنی چیف کنسرویٹر جنگلات کے عہدہ پر فائز ہو چکے ہیں۔

طالب علم کی حیثیت میں آپ نے مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کی جدوجہد میں براہ راست حصہ لیا اور سٹوڈنٹ لیڈر کی حیثیت سے ۱۹۳۸ء میں گرفتار ہو کر سزایاب ہوئے۔ لیزان آفیسر کی حیثیت سے جو کام کیا وہ بھی بڑی حد تک سیاسی نوعیت کا کام تھا۔

مولوی مفتی عبد الجبار شاہ

آپ تاحیات جامع مسجد سوپور کے خطیب اور امام رہے۔ حضرت شاہ صاحب نے جب بارہ مولہ میں مدرسہ فیض عام قائم کیا تو اس کے اولین طلباء میں عبد الجبار صاحب بھی تھے اگرچہ تعلیم کی تکمیل کا موقع نہ ملا تھا لیکن اپنی محنت ریاضت اور اوصاف کے ذریعہ اس کی کمی پوری کر لی تھی۔ شمالی کشمیر میں آپ کا فتویٰ کلم آخر کا درجہ رکھتا تھا۔ زندگی بھر حضرت شاہ صاحب کے ساتھ اپنا علمی تعلق قائم رکھا۔

مولوی غلام محمد حنفی سوپور

آپ کشمیری زبان کے شاعر تھے۔ حنفی آپ کا تخلص تھا۔ آپ کا بڑا کارنامہ قرآن شریف کا بربان کشمیری ترجمہ تھا۔ جو افسوس ہے کہ چھپ نہ سکا اس کے علاوہ بھی آپ کے اقرباء کے پاس آپ کی کچھ غیر مطبوعہ کتابیں ہیں۔

مولینا محمد یسین شاہ

آپ مولوی غلام محمد حنفی کے بے حد ذہین فرزند تھے۔ آپ دارالعلوم دیوبند اور امرتسر کے بعض مدارس کے تعلیم یافتہ تھے ۱۹۳۱ء میں جب کشمیر کی سیاسی تحریک نے جنم لیا تو مولینا یسین صاحب نے اپنی شعلہ ہار تقریروں سے قصبہ سوپور اور شمالی کشمیر کے دیہات میں ایک زلزلہ پیدا کر دیا۔ مسلم کانفرنس کو

عوام میں جو ہر دلعزیزی نصیب ہوئی۔ اسمیں آپ کی فصیح و بلیغ تقریریں سب سے زیادہ ذمہ دار تھیں۔

الحاج پیر غلام حسن شاہ

حضرت الشیخ بابا مسعودی نروریؒ کی اولاد میں سے الحاج پیر غلام حسن شاہ ریاست جموں و کشمیر کے ایڈیشنل انسپکٹر جنرل پولیس (جو آج کل انہی کرپشن مہم میں دیکھائیں کھسٹ کے عہدے پر فائز ہیں ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک ہیں۔ شیخ مسعودیؒ کی ذریت میں سے بابا عبدالحمیدؒ اور بابا عبدالقادرؒ کی جو شاخ ترگہ پورہ اراں کے قرب و جوار کے مواضعات چک شتلو ہمد وغیرہ میں آباد ہے۔ آپ اس کے لئے موجب فخر ہیں۔ والد صاحب کی طرف سے آپ کا شجر نسب بابا عبدالحمیدؒ اور والدہ کی طرف سے بابا عبدالقادرؒ کے ساتھ ملتا ہے، لاہور کے مشہور اہل اللہ بزرگ حضرت پیر عبدالغفار شاہ مرحوم (جن کا مختصر تذکرہ کتاب ہذا کے صفحہ ۷۰۲، ۱۰۷ پر ہے) آپ کی والدہ محترمہ سر وہ خاتون (متوفی ۱۹۳۵ء) کے غم محترم تھے۔ پیر عبدالغفار صاحب کے دوسرے بھائی پیر رسول شاہ آپ کے نانا تھے پیر عبدالغفار صاحب کے تذکرے میں یہ بات عرض کی گئی کہ آپ کے علمی فیضان کو آپ کے برادر زادہ عبداللہ شاہ (فرزند رسول شاہ) نے جاری رکھا آپ لاہور کی مسجد قاضی خان کے خطیب تھے۔ آپ کے ہاں کشمیریوں کا تانا بانہا رہتا تھا۔ حصول علم کے لئے کشمیر کے جو طلبا لاہور جایا کرتے تھے۔ پیر عبداللہ شاہ کی تمام شفقتیں ان کے لئے وقف رہا کرتی تھیں۔ تحریک حریت کشمیر کے سلسلے میں یہاں کے جو سیاسی زعماء عمائدین لاہور جایا کرتے تھے اکثر و بیشتر پیر عبداللہ شاہ کے ہاں ہی قیام پذیر ہوتے تھے۔

پیر غلام حسین شاہ کے والد ماجد پیر محمد مقبول شاہ (متوفی ۱۹۳۳ء) اپنے علاقے میں نہایت ہی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ علاقہ کامراج بالخصوص ترگہ پورہ، چک شتلو ہمد اور اس سے ملحق دیہات کے جن لوگوں نے پیر محمد مقبول صاحب مرحوم کو قریب سے دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ آپ علم و عمل اور زہد و تقویٰ کے لحاظ سے اپنے اسلاف کرام کا نمونہ تھے۔ قرآن حدیث اور فقہ پر آپ کی گہری نگاہ تھی۔ علم و حدیث میں آپ کو علاقہ سوپور کے مشہور عالم مولینا احمد صاحب سیلو سے باضابطہ شرف تلمذ حاصل تھا۔ آپ کو امام العصر حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ کی ذات گرامی کے ساتھ بے پناہ عقیدت تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ جب دیوبند سے کشمیر تشریف لاتے تھے تو حضرت شاہ صاحبؒ کی وعظ و تلقین کی مجالس میں شریک ہونا آپنی سعادت عظمیٰ سمجھتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری چند سالوں میں جب حضرت شاہ صاحبؒ فتنہ قادیانیت کی سرکوبی کے لئے کمر بستہ ہوئے تو کشمیر کی ضرورت کے پیش نظر آپ نے دعوت حفظ ایمان نام سے چھوٹے چھوٹے ٹریکٹ مرتب فرمائے تھے۔ داوی کشمیر کے

اطراف و اکناف میں حضرت شاہ صاحبؒ کے جو محب و معتقد عامۃ المسلمین میں ان رسالوں کی تقسیم کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ان میں پیر محمد مقبول صاحب مرحوم بھی پیش پیش تھے۔ مولوی حفیظ اللہ شاہ، محمد مظفر شاہ۔ غلام حسن شاہ اور محمد یسین شاہ۔ آپ کے چار فرزند ہیں۔ آپ کی بیٹی فوت ہو چکی ہے۔ اور دوسری کا نکاح پیر غلام محمد نسیم (ساکن نوپورہ جاگیر تحصیل بارہ مولہ) کے ساتھ ہوا ہے۔

پیر غلام حسن شاہ کی پیدائش کا سال ۱۹۲۶ء ہے۔ جدید تعلیم کے منازل طے کرنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں جبکہ وادی کشمیر کے عوام قبائلی حملہ کے نتیجہ میں اجڑے ہوئے اور تباہ حال تھے اور اپنی از سر نو آبادی کے لئے نوجوانان قوم کی اعانت اور امداد کے محتاج تھے۔ پیر غلام حسن شاہ صاحب نے محکمہ پولیس میں اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ آپ نے پولیس میں سب انسپکٹر کے چھوٹے سے عہدے سے ابتداء کر کے محض اپنی محنت، دیانت اور ذہانت کے بل بوتے پر ترقیات کی منزلیں اپنے معاصرین کے مقابلے میں حیرت انگیز تیز رفتار کے ساتھ طے کیں۔ آپ جس طرح کلکتہ انسٹی ٹیوٹ میں پولیس آفیسر کی ٹریننگ کے موقع پر ہندوستان بھر کے امیدواروں میں ممتاز رہے تھے اسی طرح اپنے محکمہ میں بھی قدم قدم پر امتیازات نے آپ کا ساتھ دیا۔

قومی خدمات میں آپ کے تاریخی کارناموں میں سے سوپور شہر کو فوجہ خانے کی لعنت سے نجات دلانا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس شہر کے وائل دو ب نام کے محلہ کو زمانہ دراز سے چٹکلہ اور فوجہ خانہ جات کے طور سے استعمال کیا جا رہا تھا۔ آپ نے اپنے چند ایک دوسرے خداترں ہمنواؤں بالخصوص خواجہ غلام رسول صاحب لون (مالک نیولائٹ ہوٹل سوپور) کی اعانت اور اشتراک سے ایک ایسی اصلاحی مہم چلائی کہ اس ناپاک مرض کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ اہل سوپور نے بھی آپ کے اس کارنامہ کی یہ قدر کی کہ اس محلے کا نام تبدیل کر کے آپ کے شکریہ کے طور پر آپ کے نام پر اس کو ”شاہ آباد“ کے نام سے پکارنے لگا اور وہاں سکول اور مسجد تعمیر کر کے اس آبادی کی کایا ہی پلٹ دی۔

۱۹۶۳ء میں پیر غلام حسن شاہ زیارت حرمین شریفین اور فریضہ حج کی ادائیگی سے مشرف ہو چکے ہیں۔ ۱۹۷۴ء سے ریاست میں رشوت ستانی کا خاتمہ کرنے کے لئے حکومت نے آپ کو وکیلنس کمشنر مقرر کر رکھا ہے اور اب تک آپ سینکڑوں ریشیوں کو کیفر کردار تک پہنچا چکے ہیں۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مارچ ۱۹۷۷ء میں جموں و کشمیر قانون ساز اسمبلی کو توڑ کر پہلی بار ریاست پر گورنر راج نافذ ہوا۔ لیکن لائیڈ آرڈر کی گزرتی ہوئی صورت حال سے نئے امتحانات کرانا ناممکن نظر آرہا تھا۔ چونکہ پیر غلام حسن شاہ کئی سال تک نیک نامی اور کامیابی کے ساتھ ڈی آئی جی کشمیر کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ اس لئے ریاستی گورنر مسٹر ایل۔ کے جہانے اپنے مشیر مسٹر بنرجی کے

مشورہ پر شاہ صاحب کی خدمات حاصل کیں۔ شاہ صاحب نے اپنے سابق تجربات سے فائدہ اٹھایا اور نہایت تدبیر کے ساتھ صورت حال کا مقابلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر کی تاریخ میں پورے تیس سال بعد پہلی بار آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ماحول میں انتخابات ہوئے۔ انتخابات کے نتائج نکلنے کے کوئی ایک ہفتہ بعد شاہ صاحب اپنے عہدہ پر واپس لائے گئے۔

نتیجہ (۳)

حضرت شاہ صاحبؒ اور مسئلہ سیادت

از عبد الرحمن کوندہ

وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ تقیکم

(الحجرات - ۱۲)

امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری کے اپنے اقوال و تحریرات، آپ کے والد ماجد کے ارشادات اور کشمیر کی معتبر تاریخ کی ورق گردانی کے بعد حقیقت اور صداقت کے متلاشی سوانح نگار کو اس نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی چیز مانع نہیں رہتی کہ آپ لفظ سید کے مرد و مشہور اصطلاحی معنوں میں سید نہ تھے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو بے نقاب واقعات کے ہوتے ہوئے بھی تسلیم نہ کرنا کھلا مکابرہ ہے۔ اس سلسلے میں ذیل کے نکات پر نظر رکھنی چاہئے۔

(۱) حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی بعض تعنیفات کے خاتمہ پر اپنے نام کے ساتھ اپنے آباؤ

اجداد کا شجرہ نسب حضرت شیخ مسعود نروریؒ تک اپنے قلم سے بصورت ذیل تحریر فرمایا ہے:

”محمد انور شاہ بن مولانا محمد معظم شاہ بن شاہ عبدالکبیر بن شاہ عبدالخالق بن شاہ محمد اکبر بن شاہ

حیدر بن شاہ محمد عارف بن شاہ علی بن شاہ عبداللہ بن شیخ مسعود نروریؒ لکشمیری الہی۔“

اس طرح سے آپ نے اپنے شجرہ نسب کو سو سو صدی ہجری کے کشمیری مشائخین اسلام میں سے ایک بزرگ حضرت شیخ مسعود نروریؒ تک ثبت جریہ (RECORD) کر کے کسی قسم کی تاویل اور کھینچا تانی کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی۔

(۲) حضرت شیخ مسعود نروریؒ کو تذکرہ الاولیاء کشمیر کے تمام مصنفین نے ان اولیاء کرام و مشائخ

عظام میں شمار کیا ہے جنہا سید نہ تھے۔ ملاحظہ ہوں:

(۱) اسرار الابرار مصنف حضرت بابا داؤد مشکوئی (۱۰۹۷ھ) (۲) خوارق الساکین

مصنف ملا احمد بن اصبور ہادی (م ۱۱۰۹ھ) (۳) واقعات کشمیر مصنفہ خواجہ اعظم دیدہ مری (م ۱۱۷۹ھ) (۴) خسہ ملا بہاؤ الدین متو (م ۱۲۲۸ھ) (۵) اسرار الاخیار (تاریخ کشمیر کی جلد ثالث) مصنفہ پیر حسن شاہ کھویہا می (م ۱۳۱۶ھ) (۶) تحائف الابرار المعروف تاریخ کشمیر مصنفہ حاجی محی الدین مسکین سرائے ملی (تاریخ تصنیف ۱۳۲۱ھ) (۷) تاریخ اقوام کشمیر از منشی محمد دین فوق (م ۱۳۲۶ھ) (۸) تاریخ اقوام پونچھ از منشی محمد دین فوق

حضرت شیخ مسعود زوری دسویں صدی ہجری کے خاتمہ کے بزرگ ہیں اور آپ کے تذکرہ نگار فاضل مورخین وہ لوگ ہیں جن کا سلسلہ گیارہویں، بارہویں، تیرہویں اور چودہویں صدی یعنی پوری چار صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ جب حضرت مسعود زوریؒ کو معتبر ترین مصنفین نے چار سو سال تک کشمیر کے ان مشائخ میں شمار کیا جو سادات نہ تھے اور حضرت موصوف کے بیٹوں پوتوں وغیرہ فضلاء نے ان تحریرات کو مسلم ٹھہرایا۔ نہ کبھی ان کی تردید میں کوئی حرف لکھا اور نہ ہی کبھی دعوائے سیادت کیا تو آج اس کے خلاف ادعا کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے؟

یہ وہ مصنف ہیں جو ذاتی تقویٰ، صداقت بیانی اور تاریخ و انساب کے علوم میں مہارت تامہ کے لحاظ سے مرتبہ علیا پر تسلیم کئے گئے ہیں۔ خاص کر کتاب اسرار الابرار کے مصنف حضرت علامہ بابا داؤد مشکواتیؒ اپنے ذات کے اکابر محدثین و فقہاء میں سے تھے۔ مشکوٰۃ شریف متنا و سند ابرنوک زبان ہونے کی وجہ سے ”مشکوٰتی“ آپ کا لقب بن گیا تھا۔ آپ حضرت شیخ مسعود زوری کے پوتے یعنی حضرت بابا مجنون زوری کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ اس لئے اکابر خاندان مسعودیہ کے حسب و نسب سے آپ کی واقفیت براہ راست تھی۔ جب حضرت مشکواتیؒ نے حضرت بابا مسعود زوری کا بابا عبداللہ کا، بابا حاجی کا اور بابا مجنون کا تذکرہ مشائخ و علماء نے اس باب میں لکھا جو سادات میں نہ تھے، اگر کوئی اور اس کے برعکس تصور کرے تو یہ محض جرأت بے جا ہوگی۔

(۳) کشمیر کے مشائخین، عرفاء اور علماء کے تذکرے تحریر کر نیوالے مصنفین کرام کا متفقہ اصول یہ ہے کہ یہ اپنی کتابوں میں جب کشمیر کے بندگان دین کے حالات لکھنا شروع کرتے ہیں تو سادات غیر سادات مشائخ، ریشیان، علماء اور شعراء کے طبقات قرار دیکر الگ الگ ابواب میں الگ الگ طبقات کے حالات لکھتے ہیں۔ پہلا باب مشائخ سادات کے لئے، دوسرا باب غیر سادات مشائخ کے لئے، تیسرا باب کشمیر کے ایک مخصوص صوفی سلسلہ کے لئے ہے جس کو ریشیوں کا سلسلہ کہا جاتا ہے۔ چوتھا باب عام علماء کے لئے اور پانچواں

شعراء کے لئے خاص کر دیا جاتا ہے۔ ان سب کتابوں کا گہرے غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر مصنف نے حضرت شیخ مسعود زوریؒ کا تذکرہ اور علماء و صلحاء میں سے آپ کے فرزندوں اور پوتوں کا تذکرہ پوری احتیاط اور پابندی کے ساتھ اپنی کتابوں کے ان ابواب میں کیا ہے۔ جو غیر سادات مشائخ و علماء کے لئے مخصوص ہیں۔ ان مصنف حضرات نے حضرت مسعودؒ کی بزرگی کے جو دیگر نکات ہیں وہ پوری فراغ دلی سے لکھے ہیں اور اگر سیادت کا کوہ نور بھی آپ کے تاج ولایت کی دولت میں شامل ہوتا تو یہ مصنفین جو آپ کے عقیدت مند اور مداح ہیں، اس حقیقت کو آشکار کرنے سے ہرگز غافل نہ رہتے فتدبر ولا تلکن من الغافلین۔

(۴) حضرت شیخ مسعود زوریؒ کی اولاد کو کشمیر میں دسویں صدی ہجری کے نصف ثانی سے آج چودہویں صدی کے آخر تک ساڑھے چار سو سال کی مدت میں غیر معمولی پھیلاؤ نصیب ہوا ہے۔ اس طویل مدت میں علم و فضل اور دینی روحانی پیشوائی کے امتیازات کا تسلسل جہاں اس نسل پر خدا تعالیٰ کی عنایات میں سے ہے وہاں انکی کثرت تعداد بھی عطیہ قدرت ہے اور وادی کے شہری و دیہاتی علاقوں میں حضرت مسعود کو اپنا جد امجد ماننے والے اس وقت تقریباً پانچ ہزار افراد ہیں۔ ان میں سینکڑوں ہیں جو قدیم و جدید ہر قسم کے علوم کے زیور سے آراستہ ہیں۔ فضلاء دہلی، پٹنہ، پنجاب یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی سے عربی، فارسی اور اردو زبان کے فضلاء بی اے، ایم اے، بی ایس سی، بی ٹی، ایل ایل بی، ایم بی بی ایس وغیرہ وغیرہ۔ سیاسی لیڈر، سماجی کارکن، واعظ، مفتی، خطیب، وکیل، ڈاکٹر، حکیم، پروفیسر، تاجر، مدرسین، ایڈیٹر، صوفی، سرکاری عہدوں کے منصب دار وغیرہ۔ غرض زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ لیکن اس بات پر یہ سب آج کل حقیقی سیادت کے علاوہ بعض اوقات مضموعی طریقوں سے دعوائے سیادت کر کے لوگ اپنی شہرت اور وجاہت کا ذریعہ بناتے رہتے ہوں۔ اس دنیا میں ان ہزاروں مسعودیاں کشمیر کا یہ کہنا کہ ”ہم سید نہیں ہیں بلکہ ہم خاک پائے اہلیت ہیں۔“ اس مسئلہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

(۵) حضرت شاہ صاحبؒ کے والد بزرگوار مولانا معظم شاہ صاحبؒ کی علمی وسعت صرف تفسیر وحدیث، فقہ اور دینی علوم تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ علم وتاریخ اور علم انساب وغیرہ میں بھی آپ کی مہارت مسلم تھی۔ اور ان امور میں بھی آپ کی تحقیقات حرف آخر کا درجہ رکھتی

تھی۔ آپ ہمیشہ اپنی اور تمام اولاد حضرت شیخ مسعود نوری کی سیادت کا انکار کرتے رہے۔ اور حضرت شیخ مسعود نوری کے خاندان کی سیادت و عدم سیادت کی بحث پر آپ بغیر کسی لگی لپٹی کے فریاد کرتے تھے۔ نوری پیر صاحبان کا ادعائے سیادت (اگر کہیں ہو تو) بالکل لٹلا ہے۔ اس سلسلہ میں جو خط آپ نے مورخ منشی محمد دین ملوک مرحوم کے سوالات کے جواب میں لکھوایا تھا اور کچھ آگے جا کر ملاحظہ کیجئے۔

(۱) حضرت شیخ شاہ صاحبؒ کو دیکھنے والوں اور بقدر وسعت آپ کے ارشادات و مواظفہ حسنہ سے استفادہ کرنے والوں میں سے سرینگر میں ہمیں ایک عمر رسیدہ اور علم دوست بزرگ الحاج سید مبارک شاہ گیلانی صاحب فطرت سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے بیان کیا کہ۔ ایک بار کسی اخبار نویس نے حضرت شاہ صاحبؒ کے اسم گرامی کے ساتھ لفظ ”سید“ لکھا تھا تو حضرت نے اس کی تردید میں مقامی اخباروں میں ایک بیان بھیجا، جس کے الفاظ تھے کہ: ”میں رسول اللہ ﷺ کی آل و اولاد کا غلام ہوں اور محبتِ عترت ہوں مگر سید نہیں ہوں۔“ اس سے بعض لوگوں کا آپ کو سید کہنا اور آپ کا سید ہونے سے انکار کرنا دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۷) مشہور مورخ و مصنف منشی محمد دین فوق نے حضرت شاہ صاحبؒ کے زمانہ حیات میں ہی آپ کے حالات پہلے اخبار کشمیری لاہور میں اور بعد ازاں اپنی کتاب مشاہیر کشمیر (مطبوعہ لاہور ۱۹۳۰ء) میں سپرد قلم کئے تھے۔ کئی سال بعد جب فوق صاحب تاریخ اقوام کشمیر مرتب کر رہے تھے تو آپ نے اس میں بھی ”خاندان مسعودیہ انوریہ“ کے عنوان کے تحت چند صفحات حضرت شاہ صاحبؒ کے ذکر جمیل کے لئے وقف کئے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے محامد و مناقب کے ساتھ ساتھ بعض تاریخی حقائق کی بھی نقاب کشائی کی۔ اس موقع پر سیادت کے بارے میں فوق صاحب نے لکھا ہے کہ:

”کشمیر میں شیخ مسعود نوریؒ بہت بڑے اہل اللہ بزرگ گزرے ہیں۔ وہ حضرت شیخ المشائخ، سر سید احمد کرمائی کے خلیفہ اعظم تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے حالات کشمیر کی تاریخوں میں درج ہیں بلکہ اکثر میں ان کے تبرکات کا بھی ذکر ہے لیکن شیخ مسعود کی ذریات جو سرینگر، لولاب، بجمبار، ترگہ پورہ، مظفر آباد، لاہور اور پونچھ وغیرہ مقامات میں پھیلی ہوئی ہے۔ آپ کے حسب و نسب کے متعلق بہت کچھ اختلاف رکھتی ہے۔ اور مصیبت یہ ہے کہ پرانے تذکرہ نویسوں نے بھی اس امر

کے متعلق کوئی خاص توضیح نہیں کی اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ان کو سید بتاتا ہے کوئی قریشی اور کوئی نو مسلم۔

زمانہ موجودہ میں شیخ مسعود کی اولاد سے ایک عظیم الشان اور فاضل اجل بزرگ شیخ الحدیث مولانا محمد انور شاہ کشمیری دیوبندی گزرے ہیں جو ہندوستان کے دارالعلوم عربیہ دیوبند اور ڈابھیل کے صدر مدرس بھی تھے۔ آپ نے اپنی اکثر تصانیف عربیہ میں اپنا شجرہ شیخ مسعود نوری تک لکھ کر یہ تحریر فرمایا ہے کہ ”ان کے (یعنی شیخ مسعود نوری کے) بزرگ بغداد سے ملتان، ملتان سے لاہور اور لاہور سے کشمیر آئے تھے۔ انہوں نے (یعنی شاہ صاحب نے) کسی بزرگ کے نام کے ساتھ ”سید“ کا لفظ نہیں لکھا۔ البتہ لاہور کی جو شاخ آپ کو سید لکھتی ہے۔ اس نے شیخ مسعود نوری کے فرزند شیخ عبداللہ کو سید عبداللہ لکھا ہے۔ جیسا کہ شجرہ سے معلوم ہوگا۔ شیخ عبداللہ کے تین بیٹے تھے۔ بابا علی، بابا رضا اور بابا یعقوب۔ بابا علی کی ذریات سے مولانا انور شاہ شیخ الحدیث ہیں جنہوں نے نہ کبھی اپنے نام کے ساتھ ”سید“ کا لفظ لکھا نہ کبھی سید کہلوانا پسند کیا۔ اس لئے نہیں کہ خدا خواستہ وہ اس لفظ کو اچھا نہ سمجھتے تھے بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے کہ وہ حضرت علیؑ کی ذریات سے نہیں تھے۔ لیکن بابا یعقوب یعنی بابا علی کے بھائی کی اولاد کی ایک شاخ ۱۰ ذکے کی چوٹ اپنے آپ کو سید الحسنی الحسنی لکھتی اور کہلوانی ہے۔ میں نے اس بارہ میں مولانا محمد انور شاہ شیخ الحدیث مرحوم کے والد محترم پیر محمد معظم شاہ اور مولانا مرحوم کے بھائی پیر محمد سلیمان شاہ کو ایک خط ۸ دسمبر ۱۹۴۴ء کو لکھا جس کا جواب مجھے ۲۴ دسمبر کو ملا۔ اس خط سے چونکہ بہت سے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے اس کا اندراج مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مولانا معظم شاہ کا مکتوب ۵

”پیر زادگان کشمیر کے چار فرقے ہیں۔ اولاد سید جو کشمیر میں مختلف خطابوں، اور عرفوں سے بھی مشہور ہیں، فرقہ ثانیہ پیر زادگان کرمانیہ جو شیخ مسعود نوری کی اولاد سے ہیں۔ چونکہ آپ حضرت سید احمد کرمانی کے فیض باطنی سے بہرہ اندوز اور ان کے خلیفہ خاص تھے۔ اس لئے ان کی اولاد کو پیر زادگان کرمانیہ کہتے ہیں۔ فرقہ ثالثہ،

۱۔ پوری شاخ نہیں بلکہ صرف لاہور میں ایک گھر ہے۔ حضرت پیر عبدالغفار شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزند پیر محمد اشرف شاہ نے اپنے نام کے ساتھ سید لکھنا شروع کیا پیر عبدالغفار کے یک جدی پیروں کی اولاد تحصیل ہندو دارہ کے موافق ترکہ پورہ، چک مٹلو ہندو غیرہ میں آباد ہے۔ کشمیر بھر کے باقی مسعودیوں کی طرح ان کو بھی سیادت کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ خود پیر عبدالغفار شاہ صاحب مرحوم نے بھی اپنے آپ کو کبھی سید نہیں کہلویا ہے۔

۲۔ یہ خط مولانا معظم شاہ صاحب نے اپنے فرزند پیر سلیمان شاہ صاحب مرحوم سے لکھوایا ہے (کوندو)

مخدومی یہ فرقہ حضرت سلطان العارفين شيخ حمزہ مخدوم کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی بابا علی رینہ کی اولاد میں شمار ہوتا ہے۔ فرقہ رابعہ خطائی، اس کی نسبت تحقیق معلوم نہیں غالباً ان کے اسلاف شہر خطا سے آئے ہوں گے۔

”بابا“ کا لفظ کسی خاص ذات سے وابستہ نہیں۔ یہ بزرگی اور احترام کا لفظ ہے۔ جو ہر صالح اور خدا پرست بزرگ خصوصاً عمر رسیدہ کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے لیکن کشمیر میں جن آدمیوں کے علاوہ بابا غریب و مساکین کے باپ یعنی مردی و فیاض کو بھی کہتے ہیں۔ بلکہ باب کا لفظ بھی جس کے معنی کشمیری میں ”باپ“ کے ہیں، بابا سے نکلا ہے۔ (مثلاً) بارہ مولہ کے خواجہ عزیز جو ککرو جو رئیس الروسا تھے۔ اپنے ننگر عام کی وجہ سے ”عزہ بابا“ کہلاتے تھے۔ آج کشمیر میں جو باب زادے یعنی بابا فرقہ کے لوگ ہیں انکی ذاتیں اور گوتیں دراصل مختلف ہیں:

کرمانی پیر زادگان یعنی شیخ مسعود کی اولاد کا تعلق رشتہ داری فرقہ سادات سے بھی ہے۔ چنانچہ شیخ مسعود کی ایک بی بی سید زادی تھیں۔ نیز شیخ الحدیث مولانا نور شاہ کا نکاح بھی گنگوہ ضلع سہارنپور کے ایک سید گھرانہ میں ہی ہوا تھا۔ مخدومی پیر زادگان کے ساتھ بھی کرمانی پیر زادگان کے تعلقات مناکحت پائے جاتے ہیں۔

اب یہ سوال باقی ہے کہ کرمانی پیر زادگان یعنی اولاد شیخ مسعود سید ہے یا نہیں اس کے متعلق تحقیق شدہ امر یہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث شاہ صاحب مرحوم کے پاس پنجاب اور ہندوستان کے بعض اقطاع کے لوگوں نے اس کے متعلق جب کبھی گفتگو کی تو انہوں نے نہ اپنے آپ کو سید کہلانا پسند کیا اور نہ کسی کا کہنا اس بارہ میں مانا۔ اور نہ اپنی کسی تصنیف میں اپنے سلسلہ نسب کو سادات سے منسلک کیا۔ بلکہ ہر ایسے شخص پر جو غیر سید ہو کر سید کہلانا چاہتا تھا۔ اپنی علاقہ یا رانگی کا اظہار کیا کرتے تھے۔

الغرض شیخ مسعود کی ذریت جہاں کہیں بھی ہے وہ سید نہیں ہے۔ اقلب اور اکثر جوہ یہی ہیں کہ شیخ مسعود امام العالم ابو حنیفہ کی اولاد سے ہیں۔ جیسا کہ قبلہ والد کے مرتبہ شجرہ سے جو ان کے فرزند اکبر حضرت شاہ صاحب مرحوم کا صحیح شدہ ہے اور جس کی ایک نقل ارسال کر رہا ہوں سے معلوم ہوگا۔ جس قدر حضرت شاہ صاحب مرحوم کو علم و تاریخ اور آیات کی صحت اور ان کے ضعف پر عبور تھا۔ اس کو عرب و عجم ہر جگہ قبولیت حاصل ہے اس لئے یہ شجرہ بڑی محنت سے صحیح کیا گیا ہے۔

حضرت والد ماجد کی رائے بھی یہی ہے کہ نزدیکی پیر صاحبان کا ادعائے سیادت باطل غلط ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے سوانح حیات فاضل اجل مولانا محمد یوسف (بنوری) استاذ جامعہ ذابھیل نے بزبان عربی۔ ”نصفحة العنبر من هدى الشيخ الانور“ نام سے ایک ضخیم کتاب

میں لکھتے ہیں۔ اس میں بھی صاحب مصنف نے حضرت کی سیادت کے متعلق وہی روش اختیار کر رکھی ہے۔ جو حضرت قبلہ نے اپنی تصانیف میں کی ہے۔

فوق صاحب کا تبصرہ:..... آگے چل کر فوق صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ”حضرت قبلہ شیخ الحدیث عموماً شاہ صاحب“ کے نام سے مشہور تھے۔ لیکن کشمیر میں یہ ضروری نہیں کہ شاہ کا لفظ صرف سید کے ساتھ ہی ہو۔ وہاں بایزادے اور بعض اور لوگ بھی ”شاہ“ کہلاتے ہیں جو درحقیقت سید نہیں ہیں مگر ہندوستان میں شاہ کا لفظ چونکہ سادات کے ساتھ ہی لکھا جاتا ہے۔ اس لئے آپ کے اکثر تلامذہ (اہل کشمیر کے سوا) انکو (یعنی حضرت شاہ صاحب کو) اپنے خیال میں سید ہی سمجھتے رہے اور اسی بناء پر انکے صاحبزادے مولینا ازہر شاہ جو دیوبند ہی میں رہتے ہیں اور کشمیر کے حالات و رسومات سے عموماً ناواقف ہیں۔ اپنے آپ کو اپنی تصانیف اور اپنی تحریروں میں ”سید“ لکھا کرتے ہیں حالانکہ ان کے والد (مرحوم) حضرت شاہ صاحب اور ان کے جد امجد مولینا پیر محمد معظم شاہ مرحوم اور ان کے چاروں چچاؤں نے جو بفضل خدا اس وقت بحالت حیات ہیں، کبھی سیادت کا دعویٰ نہیں کیا اور اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر تاریخ ”نگارستان کشمیر“ کے مصنف نے جو حضرت شاہ صاحب مرحوم کے شاگرد ہیں، نہ صرف شاہ صاحب کو سید انور شاہ لکھا بلکہ ان کے والد پیر معظم شاہ کو بھی سید معظم شاہ اور جن کے جد اعلیٰ الشیخ مسعود کو بھی سید مسعود لکھ دیا ہے۔

(تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم از ص ۲۰۶ تا ص ۲۱۰ از منشی محمد الدین فوق مطبوعہ لاہور جولائی ۱۹۴۲ء)

یہ ہے مالہ (ما علیہ) اس بحث کا جو حضرت شاہ صاحب کو ”سید“ کہنے یا لکھنے سے پیدا ہوئی ہے۔ اب مصنف نگارستان کشمیر ہوں یا مصنف تاریخ دیوبند۔ مولانا انظر صاحب ہوں یا مولینا ازہر صاحب غرض جو کوئی بھی حضرت شاہ صاحب کو ”سید“ قرار دیتا ہے۔ اپنے فعل کا خدا تعالیٰ کے سامنے اور خلق اللہ کے سامنے خود جواب دہ ہے۔

اس تتمہ کا تتمہ:..... اہل علم کے ہر ایک طبقہ الانور کا متمسک کو تاریخی تحقیق کا شاہکار تسلیم کیا ہے اور صاحب سوانح کے حسب نسب کے بارے میں حرف آخر قرار دیا ہے۔ البتہ حضرات محترم مولینا ازہر شاہ و مولینا انظر شاہ تتمہ کے مضمون کی صداقت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی خالص ذاتی مصلحتوں کی وجہ سے اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ الانور چھپنے کے بعد دونوں صاحبوں نے حضرت شاہ صاحب کی سوانح پر ایک ایک کتاب شائع کی ہے۔ جناب مولینا ازہر صاحب کی کتاب نئی نہیں ہے۔ ”حیات انور“ کا قدیم چرچہ ہے جس کو چند مضامین کے اضافے کے ساتھ سر نو شائع کر دیا ہے۔ البتہ مولینا انظر شاہ صاحب کی کتاب ”نقش دوام“ ایک مستقل تصنیف ہے۔ جس میں حضرت شاہ

صاحب کے علمی و عملی خصائص کو فاضل مصنف نے اپنے مخصوص انداز تحریر کے آئینہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے اپنی اس تصنیف لطیف میں الانور اور اسکے مؤلف کا نام لینے کے بغیر ہی حضرت شاہ صاحب کے حسب و نسب اور مسئلہ سیادت پر ہماری تحقیق کو ہدف ملامت بناتے ہوئے غیظ و غضب کے اظہار میں پورے چار صفحات (۲۲ تا ۲۰) صرف کر دیئے ہیں لیکن خود بھی جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا خلاصہ مفہوم یہی ہے کہ شاہ صاحب کا شجرہ نسب حضرت شیخ مسعود زوری تک ہی مستند ہے اور شیخ مسعود زوری عام شہرت کے لحاظ سے حضرت امام ابو حنیفہ کے خاندان سے مانے جاتے ہیں نہ کہ خاندان اہل بیت النبی سے مولینا نظر شاہ صاحب کا یہ اعتراف حق موصوف کی عالمانہ احتیاط اور خدا ترسی کا ثبوت ہے جس کے لئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ نقش دوام میں حضرت شاہ صاحب کے نام کے ساتھ ”سید“ لکھنے سے اجتناب کر کے صرف ”محمد انور شاہ“ پراکتفا کیا ہے۔ یہ طریقہ کار عند اللہ بھی مولینا نظر شاہ صاحب کے لئے موجب اجر ہے۔ اور اس سے ان تاریخی مقالات کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے جو لفظ سید پر مولینا از ہر صاحب کے بے جا اصرار سے پھیل سکتے اور بہت سے موجودہ آئندہ اہل قلم کی بے راہ روی کا موجب بن سکتے تھے نقش دوام کے زیر حوالہ صفحات میں مولینا نظر صاحب نے جو خلاف حقیقت باتیں لکھی ہیں (مثلاً یہ کہ حضرت شاہ صاحب کی والدہ سیدہ تھیں۔ وغیرہ ان پر قلم اٹھانے کا یہ موقع نہیں اور ہمیں امید ہے کہ وہ ان امور کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے الانور پر ایک مزید نگاہ ڈالیں گے اور اپنی ان غلط فہمی کی بھی تصحیح فرمائیں گے۔ عبد الرحمن کوندو۔

ختم شد



کتابیات

(BIBLIOGRAPHY)

عربی، فارسی اور اردو

- ۱۔ آثار السنن: نظمیر حسن شوق بیہودی۔ احسن المطابع عظیم آباد ۱۲۳۱ھ
- ۲۔ آثار الصنادید: سرسید احمد خان۔ سنٹرل بک ڈپو دہلی ۱۹۶۵ء
- ۳۔ آزاد کی تقریریں: انور عارف نیوتاج آفس دہلی
- ۴۔ آزاد کی کہانی خود اس کی زبانی: مرتبہ عبدالرزاق طبع آبادی، دہلی ۱۹۵۸ء
- ۵۔ ابوالکلام آزاد: پہلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند ۱۹۵۸ء
- ۶۔ ازالۃ الرین فی الذب عن قرة العین: مولانا نور شاہ کشمیری ۱۳۳۰ھ
- ۷۔ الاضافات الیومیہ من الافاضات القومیہ مطبوعہ کراچی
- ۸۔ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح: حضرت مولانا نور شاہ کشمیری مطبوعہ دہلی ۱۲۳۴ھ
- ۹۔ العرف الشذی علی جامع الترمذی: مرتبہ مولانا محمد چراغ صاحب مطبوعہ دیوبند ۱۳۳۲ھ
- ۱۰۔ النور القائض علی نظم الفرائض: حضرت علامہ نور شاہ کشمیری، کتب خانہ فخریہ مراد آباد ۱۳۶۶ھ
- ۱۱۔ انوار الباری شرح صحیح بخاری ۱۳ جلد: از مولانا سید احمد رضا بجنوری، مکتبہ ناشر العلوم، بجنوری یو۔ پی۔
- ۱۲۔ انوار المحمود فی شرح سنن ابی داؤد: مولانا محمد صدیق نجیب آبادی، مطبوعہ دہلی ۱۹۳۷ء
- ۱۳۔ اکفار الملحدين فی ضروریات الدین: حضرت العلامة مولانا نور شاہ کشمیری، دہلی ۱۲۵۰ھ
- ۱۴۔ انسائیکلو پیڈیا (اردو) فیروز سنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۶۲ء
- ۱۵۔ البوادر النوادر: مولانا شرف علی تھانوی، مطبوعہ ۱۳۶۵ھ
- ۱۶۔ الفاروق: مولانا شبلی نعمانی، آستانہ بک ڈپو دہلی
- ۱۷۔ البدور الطالع بهاسن من بعد القرآن السابع: قاضی محمد شوکانی طبع قاہرہ، مصر۔
- ۱۸۔ الرحمة الغیثیة بالترجمة اللیثیة فی مناقب سیدنا الامام الیث بن سعد از ابن حجر عسقلانی طبع مریہ بولاق مصر ۱۳۰۰ھ
- ۱۹۔ بسط الیدین لنیل الفرقدین: مولانا نور شاہ کشمیری بجنور ۱۲۵۱ھ
- ۲۰۔ اختر درخشاں: از مولوی سید محمد باقر الموسوی الصفوی کشمیری ۱۳۹۰ھ
- ۲۱۔ پرانے چراغ: از مولانا سید ابوالحسن علی ہمدانی مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنؤ۔
- ۲۲۔ تبرکات آزاد: غلام رسول مہر عثمانیہ بک ڈپو حیدر آباد۔
- ۲۳۔ تاریخ اعظمی (واقعات کشمیر): خولید محمد اعظم دیکھ مری ۱۳۲۳ھ

- ۲۴۔ تاریخ بڈ شاہی: محمد الدین فوق ظفر برادر لاهور۔ ۱۹۳۰ء
- ۲۵۔ تاریخ کبیر کشمیر: حاجی محمد الدین مسکین سرائے بل۔ ۱۳۱۰ھ
- ۲۶۔ تاریخ اقوام کشمیر: منشی محمد الدین فوق، مطبوعہ لاهور ۱۹۳۳ء
- ۲۷۔ تاریخ اقوام پونچھ: منشی محمد الدین فوق، ظفر برادر لاهور ۱۹۳۳ء
- ۲۸۔ تاریخ دیوبند: سید محبوب رضوی، علمی مرکز دیوبند ۱۹۷۷ء
- ۲۹۔ خاک بابری: ظہیر الدین بابر (بادشاہ) مطبوعہ دہلی ۱۹۲۴ء
- ۳۰۔ تاریخ نگارستان کشمیر: قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی ۱۹۳۴ء
- ۳۱۔ تاریخ حسن مولفہ: پیر غلام حسن کھویہا، جلد اول، دوم، وچہارم۔ شائع کردہ ریسرچ اینڈ پبلی کیشن ڈیپارٹمنٹ حکومت جموں و کشمیر۔
- ۳۲۔ تبلیغ رسالت: جلد ہفتم، مولفہ میر قاسم علی قادیان۔
- ۳۳۔ تذکرۃ الواعظ: منشی محمد شاہ سعادت۔ ۱۹۳۱ء
- ۳۴۔ تحفۃ الاسلام: مولانا انور شاہ کشمیری مدینہ پریس بجنور ۱۳۵۱ھ
- ۳۵۔ تذکرۃ اولیاء کشمیر (ترجمہ تاریخ حسن): مطبوعہ گوہ نور پریس سرینگر۔ ۱۹۶۰ء
- ۳۶۔ ترجمان السنہ: مولانا بدر عالم میرٹھی۔ دہلی ۱۹۳۸ء
- ۳۷۔ تفسیر شافی: مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری
- ۳۸۔ تذکرۃ شاہ ولی اللہ: مناظر احسن گیلانی۔ لاهور ۱۹۳۶ء
- ۳۹۔ تذکرۃ الرشید: مولانا عاشق الہی میرٹھی۔
- ۴۰۔ تذکرہ علماء ہند: رحمان علی، لکھنؤ ۱۹۱۴ء
- ۴۱۔ تذکرۃ ابوالکلام آزاد: مرتبہ مالک رام ساہتیہ اکادمی ۱۹۶۸ء
- ۴۲۔ تحفہ محبوبی (سوانح حضرت شیخ حمزہ کشمیری): از خواجہ غلام محمد الدین مالک و مدیر "اخبار کشمیر" امرتسر۔
- ۴۳۔ حجۃ اللہ البالغہ: حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی: حمایت الاسلام لاهور ۱۳۰۲ھ
- ۴۴۔ حسن العزیز (ملفوظات حضرت تھانوی) شائع کردہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون (یو۔ پی)
- ۴۵۔ حیات انور: مولانا محمد ازہر شاہ قیصر، جید برقی پریس دہلی ۱۹۵۵ء
- ۴۶۔ حیات عبدالحی: مولانا سید سلیمان ندوی، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۷۰ء
- ۴۷۔ حیات شبلی: مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۳۳ء
- ۴۸۔ حیات شیخ الہند: اصغر حسین دیوبندی، دیوبند ۱۳۳۹ھ
- ۴۹۔ حدائق الحنفیہ: از مولانا فقیر محمد صاحب چٹلمی، مطبع منشی نول کشور لکھنؤ ۱۹۰۶ء
- ۵۰۔ خاتمہ الخطاب: مولانا انور شاہ کشمیری، مدینہ پریس بجنور ۱۹۵۳ء
- ۵۱۔ خاتم النبیین: مولانا انور شاہ کشمیری، مدینہ پریس بجنور ۱۹۵۳ء

- ۵۲۔ خزان الاسرار: مولانا نور شاہ کشمیری، مدینہ پریس، بجنور ۱۹۵۴ء
- ۵۳۔ دعوت حفظ ایمان: حصہ اول و دوم، مولانا نور شاہ کشمیری ۱۳۵۱ھ
- ۵۴۔ دیوان حالی: مولانا اطاف حسین حالی، دہلی ۱۹۵۰ء
- ۵۵۔ روشن مستقبل: طفیل احمد، دہلی ۱۹۴۵ء
- ۵۶۔ ذکر آزاد: عبدالرزاق طبع آبادی، مطبوعہ کلکتہ۔
- ۵۷۔ روکد او دار العلوم ۱۳۳۰ھ مطبوعہ دیوبند۔
- ۵۸۔ روداد حسن: مرتبہ محمد الحسن ندوی، مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء
- ۵۹۔ روض الراحین: مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی۔
- ۶۰۔ سوانح احمدی (سوانح حضرت سید احمد شہید بریلوی) مولوی محمد جعفر تھانی۔
- ۶۱۔ ستر نامہ شیخ الہند (اسیر مالٹا) از مولانا سید حسین احمد مدنی، دینی بک ڈپو، اردو بازار دہلی ۱۹۴۷ء
- ۶۲۔ سوانح قاسمی: مولانا مناظر احسن گیلانی، دیوبند ۱۳۷۳ھ
- ۶۳۔ سیرت انور: مسعود احمد قاسمی، ادارہ ہادی دیوبند، یو پی
- ۶۴۔ سیرۃ الصمان: حصہ اول، مولانا شبلی نعمانی، مفید عام پریس آگرہ ۱۸۹۴ء
- ۶۵۔ سہم الغیب فی کبید اہل الریب: مولانا نور شاہ کشمیری، دہلی ۱۳۵۲ھ
- ۶۶۔ سیرت سید احمد شہید از مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ لکھنؤ ۱۳۶۸ھ
- ۶۷۔ سید احمد شہید: از غلام رسول مہر، لاہور ۱۹۵۴ء
- ۶۸۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک: (یعنی حزب ولی اللہ دہلوی کی اجمالی تاریخ کا مقدمہ) از حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، سندھ ساگر اکادمی لاہور، ۱۹۴۴ء
- ۶۹۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات: مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۵۰ء
- ۷۰۔ صدغ النقباب عن حساسة الفتنجاب: مرتبہ مولانا محمد ادریس سکھوڑوی، دیوبند ۱۹۲۵ء
- ۷۱۔ ضرب الخاتم علی حدث و العالم: مولانا نور شاہ کشمیری، دہلی ۱۳۳۵ھ
- ۷۲۔ عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام: مولانا نور شاہ کشمیری، مجلس علمی کراچی ۱۳۸۰ھ
- ۷۳۔ علماء حق: مولانا سید محمد میاں دیوبندی، کتب خانہ فخریہ مراد آباد ۱۹۳۶ء
- ۷۴۔ علماء ہند کا شاندار ماضی: مولانا سید محمد میاں، دہلی ۱۹۵۷ء
- ۷۵۔ فتاویٰ ثنائیہ: مرتبہ مولانا محمد داؤد راز
- ۷۶۔ فتاویٰ عزیزی: حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی، مہتابی پریس دہلی ۱۳۱۱ھ
- ۷۷۔ فتح المسلم بشرح صحیح مسلم: مولانا شبیر احمد عثمانی، مدینہ پریس بجنور ۱۳۵۲ھ
- ۷۸۔ فصل الخطاب فی مسئلۃ ام الكتاب: مولانا نور شاہ کشمیری۔ دہلی ۱۳۴۸ھ
- ۷۹۔ فیض الباری علی صحیح البخاری: مرتبہ مولانا بدر عالم میرٹھی، مطبع حجازی قاہرہ ۱۹۳۸ء

- ۸۰۔ فیصلہ مقدس بہاولپور: مطبوعہ بہاولپور، جولائی ۱۹۳۵ء
- ۸۱۔ فقہ قادیانیت: مولانا صفو الرحمن صابر، ادارۃ السنت والجماعت حیدرآبادی
- ۸۲۔ کلیات اقبال: نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۵۳ء
- ۸۳۔ کلیات شیخ الہند: مطبع قاسمی دیوبند ۱۳۳۰ھ
- ۸۴۔ کشف الستور عن صلوة الوتر: مولانا نور شاہ کشمیری، دہلی ۱۳۵۳ھ
- ۸۵۔ کلیات شبلی: معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۳۰ء
- ۸۶۔ کتاب التعریفات: سید شریف علی جرجانی طبع مصر۔
- ۸۷۔ منشورات دارالعلوم دیوبند: مولانا نور الحسن، دیوبند ۱۳۹۴ھ
- ۸۸۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت: مولانا مناظر احسن گیلانی۔
- ۸۹۔ مشاہدات و معارف (ترجمہ فیوض الحرمین): حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، مترجم، پروفیسر محمد سرور سندھ ساگر اکادمی لاہور، ۱۹۴۷ء
- ۹۰۔ مفتی اعظم کی یاد: مرتبہ حفیظ الرحمن واصف، دہلی ۱۳۸۶ھ
- ۹۱۔ مولانا نور شاہ کشمیری حیات اور علمی کارنامے: قاری محمد رضوان اللہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۷۴ء
- ۹۲۔ مکتوبات شیخ الاسلام (مولانا حسین احمد مدنی کے مکتوبات): ۳ جلدیں، مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی۔
- ۹۳۔ مکمل تاریخ کشمیر: ۳ جلد، از شی محمد دین فوق۔
- ۹۴۔ شاہیر کشمیر محمد الدین فوق: ظفر برادر لاہور، جولائی ۱۹۳۰ء
- ۹۵۔ مکاتیب طیب (حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب کے مکتوبات) مطبوعہ دیوبند۔
- ۹۶۔ مرقاة الطام الحدوث العالم: مولانا نور شاہ کشمیری، مدینہ پریس بجنور ۱۳۵۱ھ
- ۹۷۔ مشککات القرآن: مولانا نور شاہ کشمیری، جمال پریس دہلی ۱۳۳۷ھ
- ۹۸۔ معارف السنن: مولانا محمد یوسف بنوری، مجلس علمی کراچی ۱۳۸۳ھ
- ۹۹۔ مصباح اللغات: مرتبہ ابوالفضل عبدالحفیظ بلیادی، مکتبہ برہان، دہلی ۱۹۵۵ء
- ۱۰۰۔ مرقاة المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح: ملا علی قاری، مطبع میمند، مصر ۱۳۰۹ھ
- ۱۰۱۔ منتخب التواریخ: عبدالقادر بدایونی، ۳ جلد کلکتہ ۱۸۶۸ء
- ۱۰۲۔ نقش حیات: مولانا سید حسین احمد مدنی، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۴ء
- ۱۰۳۔ نطق انور: مولانا سید احمد رضا بنوری، مکتبہ ناشر العلوم، بجنور، (یو۔ پی)
- ۱۰۴۔ نیل الفرقان فی مسئلۃ رفع الیدین: مولانا نور شاہ کشمیری، مجلس علمی ۱۳۵۰ھ
- ۱۰۵۔ لفحۃ العنبر من ہدی الشیخ الانور: مولانا سید محمد یوسف بنوری، مجلس علمی ڈابھیل ۱۹۳۳ء
- ۱۰۶۔ نزہۃ الخواطر: جلد ۸، مولانا سید عبدالحی لکھنوی، حیدرآباد، ۱۹۴۴ء
- ۱۰۷۔ ورد الموبدین: بابا داد دھاکا، مطبع محمدی لاہور، ۱۳۰۶ھ

۱۰۸۔ یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ: مولانا محمد ازہر شاہ قیصر دیوبند ۱۹۷۵ء
۱۰۹۔ یادِ رنگاں، طبع کراچی ۱۹۵۵ء

(۲) مخطوطات

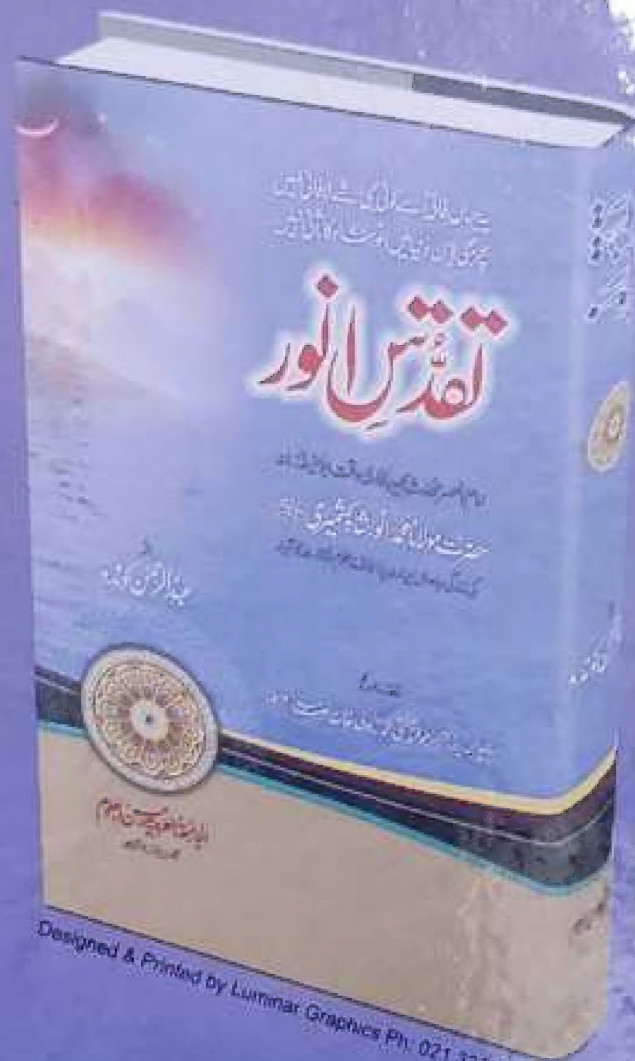
- ۱۔ اسرار الابرار: بابا داد و مشکوٰۃ ۲۔ تاریخ کشمیر ملک حیدر چاؤدرہ۔
- ۳۔ خوارق الساکین، اخوند ملا احمد بن عبد الصبور۔ ۴۔ فتاویٰ الکبرہ: شیخ عبد الوہاب کشمیری
- ۵۔ فتاویٰ قادریہ: میر سید حسین قادری منطقی۔ ۶۔ خمسہ بہائیہ: ملا بہاء الدین متو۔

(۳) رسائل و جرائد

- ۱۔ ماہنامہ ”الرشید“ لاہور، فاضل حبیب اللہ (شاہ عالم مارکیٹ لاہور) مارچ ۱۹۷۸ء
- ۲۔ ماہنامہ ”الرشید“ لاہور، دارالعلوم دیوبند نمبر، نومبر ۱۹۷۶ء
- ۳۔ ماہنامہ ”الانور“ مولانا محمد نور الدین اختر کشمیری (جون یا جولائی ۱۹۳۳ء غالباً)
- ۴۔ ماہنامہ ”برہان“ دہلی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۷۴ء تا ستمبر ۱۹۷۷ء)
- ۵۔ ماہنامہ ”تجلی“ دیوبند، مولانا عامر عثمانی (مرحوم) ۱۹۶۸ء
- ۶۔ ”چٹان“ لاہور، شورش کشمیری (مرحوم) ستمبر ۱۹۷۵ء
- ۷۔ ماہنامہ ”دارالعلوم“ دیوبند، مولانا محمد ازہر شاہ قیصر، (۱۹۶۳ء تا جولائی ۱۹۷۶ء)
- ۸۔ ماہنامہ ”معارف“ اعظم گڑھ، شاہ معین الدین احمد، سید صباح الدین عبدالرحمن، (جون ۱۹۳۳ء، مارچ ۱۹۷۶ء)
- ۹۔ ”نقوش“ لاہور، لاہور نمبر، محمد طفیل، ادارہ فروغِ اردو لاہور ۱۹۶۱ء
- ۱۰۔ ”نقوش“ لاہور، شخصیات نمبر، ایضاً ۱۹۵۹ء
- ۱۱۔ ماہنامہ ”الفرقان“ لکھنؤ، مولانا محمد منظور نعمانی، اپریل ۱۹۷۷ء تا دسمبر ۱۹۷۷ء

ENGLISH BOOKS

1. A History of Kashmir,
by P. N. Koul Bamzai - Delhi - 1962.
2. A Holiday in the Happy Valley,
by Major T. R. Swinburne - London 1907.
3. Beautiful Valleys of Kashmir and Ladakh,
by Samsarchand Koul - 1942.
4. Early History and Culture of Kashmir,
by Dr. Sunil Chandra Ray - 1957.
5. "Islam and Ahmadism"
by Dr. Sir Moh'd Iqbal - Lucknow - 1974.
6. "KASHIR" by Dr. Ghulam Mohi-ul-Din Sufi - Delhi - 1974.
7. Kashmir (An Historical Introduction),
by James P. Ferguson - London - 1961.
8. Kashmir in Sunlight and Shade,
by C. E. Tyndale Biscoe.
9. Kashmir under the Sultans,
by Mohibbul Hasan - Calcutta - 1959.
10. The Encyclopaedia of Islam,
by B. Lewish, Ch. Pellat and J. Schacht.
Vol. II (C-G) Luzac and Co - London 1965.
11. The Jammu and Kashmir Territories,
by Frederic Drew (London 1875).
12. The Reconstruction of Religious thought in Islam,
by Dr. Sir Moh'd Iqbal - Lahore 1962.
13. The Valley of Kashmir,
by Walter R. Lawrence (London - 1895).
14. History of Srinagar (1846-1947), A Study in Socio-
Cultural change by Dr. Mohammad Ishaq Khan, (Under
Publication).



Designed & Printed by Lummar Graphics Ph. 021 32727730

الجامعۃ الغزالیۃ | حیدرآباد

www.ahsanululoom.com